مارچ 2020

پاکیزہ

شیریں حیدر کا نیا ناول "آمرے" (سال نو کا تحفہ)

اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

مکمل ناول

منی ناول

عورت کہانی

افسانے

خصوصی مضامین



مستقل عنوانات

زندگی کبھی، کبھی انسان کو ایسے کربناک حادثے سے دوچار کر دیتی ہے کہ اس کا اپنی ذات اور ارد گرد کے لوگوں پر سے اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے۔ اس حادثے کی وجہ بعض اوقات اس کی اپنی توقعات بھی ہوتی ہیں جو وہ کسی بے نام تعلق سے وابستہ کر لیتا ہے۔ وہ جذبے جو رشتوں کے توسط سے دل میں بسیرا کریں ان کی پزیرائی تو مذہب اور معاشرہ دونوں کرتے ہیں، ان کی حق تلفی پر جواب طلبی بھی کی جا سکتی ہے مگر وہ دلی تعلق جنہیں رشتوں کی سند نہ حاصل ہو، انہیں کسی عدالت سے بھی سزا نہیں سنائی جا سکتی، سوائے ضمیر کی عدالت کے۔ جبکہ وہ رشتے جنہیں تعلق کا نام بھی دے دیا جائے کبھی کبھی وہ اپنے جائز حق سے بھی محروم کر دیے جاتے ہیں۔ اور ان کی جوابدہی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ دنیا دار العمل ہے جہاں انسان کے دو ہی امتحان ہیں، ایک شکر کا دوسرے صبر کا۔۔۔ مگر جب حضرتِ انسان حسد یا ہوس کی خاطر تقدیر سے لڑنے کی ٹھان لے تو پھر اس کے اپنے فیصلے ہی اس کی آزمائش بن جاتے ہیں۔

حادثوں میں گزری ہے راس بس تباہی ہے ۔۔۔۔ زندگی کی چاہت میں زندگی گنوائی ہے
خواب اب نہیں میرے، نیند تک پرائی ہے ۔۔۔۔ عارضی محبت تھی مستقل نبھائی ہے

امیدوں، جذبوں، فیصلوں اور احساسِ جرم پر مبنی کچھ ایسے کرداروں کی کہانی جو دل سے دیکھتے، دل سے سنتے اور دل سے ہی سوچتے ہیں

میرا سارا زنگ اتار دو

سلسلے وار ناول

افشاں آفریدی



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیرازی ولا میں مقیم مظفر اور سائرہ کی بیٹی ردا کی منگنی اس کی مرضی سے آصف کے ساتھ ہوتی ہے جس میں یو ایس اے سے تین سال بعد واپس آ کر مظفر صاحب کا یتیم بھتیجا عکرمہ بھی شریک ہوتا ہے۔ عکرمہ آئی کیپ میں لیکچررشپ اور icmap میں ایوننگ کلاسز لینے لگتا ہے۔ دُرِّمکنون، سائرہ بیگم کی بھانجی تھی جس کی ذمے داری مظفر احمد نے اس کے ماں باپ کے انتقال کے بعد اٹھالی تھی۔ عکرمہ دادی سے کہتا ہے کہ چچا جان کو دُرِّمکنون کی تعلیم شروع کرادینی چاہیے۔ مظفر، عکرمہ سے درمکنون کو پڑھانے کا کہتے ہیں۔ ایک رات درمکنون کی طبیعت خراب ہونے پر دادی اسے سکون آور دوا دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا بتاتی ہیں۔ عکرمہ، زوہا، ردا اور درمکنون کو شاپنگ پر لے کر جاتا ہے تو زوہا بتاتی ہے کہ زارا (مظفر صاحب کی دوسرے نمبر کی بیٹی) کے ساتھ اس کی نند خولہ آرہی ہے اور شاید وہ دادی کو پسند ہے۔ دُرِّمکنون سوچتی ہے کہ کیا واقعی وہ اپنے آنسوؤں سے اپنے محسنوں کی خوشی کو دھندلا رہی ہے۔ اسٹڈی میں درمکنون کو دیکھ کر آنسو بہاتے مظفر شیرازی، عکرمہ کے ذہن میں ہلچل مچائے ہوئے تھے۔ مظفر صاحب نے اپنی نئی ول بنوانی تھی وہ لے کر عکرمہ نکلتا ہے تو زاویار کا شیری کے ساتھ رویہ دیکھ کر سوچتا ہے کہ کوئی عورتوں کے ساتھ اس طرح بھی برتاؤ کرتا ہے۔ خولہ، عکرمہ کا لیپ ٹاپ لینے جاتی ہے تو درمکنون کو اس کی باتوں سے اپنے بدصورت رویے کا احساس ہوتا ہے۔ خولہ، درمکنون سے عکرمہ کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اگر آپ اس گھر میں بہو بن کر آئیں تو بہت خوش رہیں گی، اس جملے کو سن کر عکرمہ ایک انجانے سے احساس سے دوچار ہوا تھا۔ سائرہ بیگم، عکرمہ کو بھی شام کو گھر پر رہنے کا کہتی ہیں۔ عکرمہ کو زاویار سے مل کر یاد آ جاتا ہے کہ اس نے صفدر صاحب کے آفس کے باہر اسے دیکھا تھا اور لڑکی سے اس کا خراب برتاؤ بھی یاد آ جاتا ہے (درمکنون کی تباہی کا ذمے دار) زاویار کو دیکھ کر دُرِّمکنون بے ہوش ہو جاتی ہے۔ مظفر صاحب، سائرہ بیگم سے کہتے ہیں کہ وہ درمکنون کو کمرے میں لے جائیں۔ درمکنون کے بے ہوش ہونے پر مظفر صاحب چراغ پا ہو جاتے ہیں اور سائرہ بیگم بھی یہ عہد کر لیتی ہیں کہ کم از کم ردا کی شادی تک وہ اس معاملے کو نہیں چھیڑیں گی۔ درمکنون سوچ رہی تھی کہ زاویار بنا کسی احساس جرم کے کس اطمینان سے نئی زندگی شروع کرنے جا رہا ہے۔ عبید اور ان کی فیملی ردا کی شادی پر نہیں آرہے تھے اس خبر سے دادی کافی دلگرفتہ تھیں...... درمکنون کو پتا چلتا ہے کہ دادی نے خولہ کے رشتے سے منع کر دیا ہے تو اسے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ عینی، درمکنون سے ملنے آتی ہے اور اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے، عکرمہ کو یہ جان کر شاک لگتا ہے کہ درمکنون کے خوف اور وحشت کی وجہ اظہار بھائی ہیں، ولی اپنی بات پکی ہونے کی مٹھائی لے کر آتا ہے۔ شہرین، میمونہ بیگم کو زاویار کے متعلق بتاتی ہے تو وہ سوچتی ہیں کہ آغا جان اور شہریار سے بھی اس کا دل صاف ہو جائے گا۔ جلال انصاری، شہریار کو کہتے ہیں کہ وہ زاویار کو کال کریں۔ عاصمہ، زاویار کے باپ شہریار سے طلاق لے چکی تھیں۔ وہ شہرین کو اپنے دوسرے شوہر عثمان کے انتقال اور مومنہ کی شادی کا بتاتی ہیں اور اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی ہیں۔ شہریار انصاری، زاویار کو فون کرتے ہیں اور زاویار کے بدتمیزی سے جواب دینے پر فون بند کر دیتے ہیں۔ میمونہ بیگم، شہرین کو بتاتی ہیں کہ آغا جان چاہتے ہیں کہ خولہ کی یا شہرین کی شادی زاویار سے ہو جائے۔ زاویار تین سال پہلے کے اس منظر سے کسی طرح نکل نہیں پار ہا تھا۔ زاویار، نازیہ سے کہتا ہے کہ وہ دُرِّمکنون سے ملنا چاہتا ہے تو نازیہ ہامی بھر لیتی ہیں۔ شیری عاصمہ لاج پہنچتی ہے تو اسے زاویار کے ایکسیڈنٹ کا پتا چلتا ہے۔ وہ مولا بخش کے ساتھ ہی اسپتال جاتی ہے پھر زاویار کی حالت دیکھ کر خولہ کو فون کر کے بلاتی ہے تو زارا بھابی، اظہار بھائی اور خولہ کے ساتھ عکرمہ بھی اسپتال آتا ہے۔ عاصمہ، زاویار کو دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جاتی ہیں، رات تک مومنہ اور مہران بھی کراچی آ گئے تھے۔ تین سال بعد آغا جان، زاویار کے سامنے تھے اور ان کے انداز بھی خاصے بدل گئے تھے، ان کے ساتھ شہریار اور عینی بھی تھے۔ آغا جان، زاویار سے کہتے ہیں کہ گزرے دنوں کو بھول جاؤ اور اپنا دل صاف کر لو...... لیکن وہ کہتا ہے کہ کچھ نقصان ناقابلِ تلافی ہوتے ہیں اور خود کو بلا کر باہر چلا جاتا ہے۔ شیری کھانا لے کر آتی ہے تو اس کو بتاتی ہے دُرِّمکنون، زارا بھابی کی کزن ہے اور وہ اس کے لیے ہاں کب کر رہا ہے وہ اور عینی جا کر اسے زاویار کے نام سے چھیڑیں گی۔ جس پر زاویار غصہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اس کے معاملات سے دور رہے اور کسی سے کچھ نہ کہے۔ آغا جان نے عاصمہ سے کہا کہ وہ زاویار کو شہرین کے لیے راضی کریں اور وہ یہ سوچ کر پریشان تھیں کہ وہ یہ کیسے کریں گی۔ نازیہ انہیں کہتی ہیں اگر انہیں دُرِّمکنون پسند ہے تو مہران کے لیے بات کر لیں لیکن یہ بات عاصمہ کو صحیح نہیں لگتی۔ خولہ، شہرین کو اسپتال جانے سے روکتی ہے لیکن وہ اس کی بات نہیں سنتی۔ شہری، خولہ سے پوچھتی ہے کہ اس نے عکرمہ کے بجائے طارق کے لیے ہامی کیسے بھر لی۔ عکرمہ سے دستبردار ہونا خولہ کے لیے تکلیف دہ تھا ضرور لیکن وہ یہ بات کسی سے بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ عاصمہ، زاویار کو سمجھاتی ہیں کہ آغا جان کے لیے جو کدورت اس کے دل میں ہے وہ نکال دے لیکن زاویار کہتا ہے کہ وہ یہ نہیں کر سکتا۔

اب آگے پڑھیے

قسط نمبر15

ہر سمندر کا ایک ساحل ہے
ہجر کی رات کا کنارہ نہیں
وہ نہیں ملتا ایک بار ہمیں
اور یہ زندگی دوبارہ نہیں

رات دھیرے، دھیرے بھیگ رہی تھی۔ ہر شے پر جیسے سکوت چھایا ہوا تھا۔ دکھ، افسوس، ملال جیسے خون کا حصہ بن کر اس کی رگ، رگ میں دوڑ رہے تھے۔ بستر سے اٹھ کر وہ اضطراری انداز میں بالوں میں انگلیاں پھنسائے کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔

رات کا غالباً آخری پہر تھا اور وہ اسپتال کی بے کیف خاموشی میں اب تک نیند کی مہربان آغوش کا منتظر سلگتی آنکھوں میں گزرے لمحوں کی چنگاریاں لیے رتجگے کے تکلیف دہ تجربے سے ایک بار پھر گزر رہا تھا۔ گزرے سالوں کی گرد سے جس دکھتے سلگتے ماضی کو چھپا رکھا تھا۔ ''حال'' کے تند و تیز جھونکوں سے وہ ایک مرتبہ پھر صاف ہو کر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔ جسے وہ تمام تر طاقت صرف کر کے بھی نظر انداز نہیں کر پا رہا تھا۔

بھاری ساعتوں کا بوجھ اٹھاتی مضمحل، ملول اور پژمردہ رات، دھیرے، دھیرے ڈھل رہی تھی۔ اور آتی ہوئی سحر کے ساتھ، ساتھ چراغِ دل جیسے بجھتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے عینی جو کچھ اسے بتا کر گئی تھی وہ ذہن سے گویا چپک گیا تھا۔ شہرین اس کے نہ چاہنے پر بھی عینی کو دُرِ مکنون سے ملا لائی تھی۔ مگر یہ شکر تھا کہ زاویار کے پرپوزل سے متعلق اسے مطلع نہیں کیا تھا۔

زاویار نے سانس روک کر دزدیدہ نظروں سے سامنے بیٹھی عینی کو دیکھا تھا۔ جس کے چہرے سے دبا، دبا جوش صاف عیاں تھا۔ یقیناً وہ دُرِ مکنون کے یوں اچانک دوبارہ مل جانے پر از حد مسرور تھی۔ اس کی تعریفیں کرتے تھک نہ رہی تھی۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ عینی شروع سے ایسی ہی تھی۔ زاویار کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دینا عادت تھی اس کی۔ اتنی ذہنی ہم آہنگی اور دلی قربت اس کی اپنی چھوٹی بہنوں سے بھی نہ تھی جتنی کہ زاویار کے ساتھ تھی۔

لہٰذا اس وقت بھی وہ دُرِ مکنون سے ہونے والی ملاقات کی ایک، ایک تفصیل اسے سناتے ہوئے خود میں ایسی مگن تھی کہ سامنے بیٹھے زاویار انصاری کے چہرے پر در آیا کرب کا سیاہ رنگ بھی اسے نظر نہیں آ سکا تھا۔

''مگر بہت بدل گئی ہے وہ...... جتنی خوب صورت ہوگئی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ خاموش رہنے لگی ہے وہ۔ سچ بڑی اجنبی لگی مجھے۔ پتا ہے بھائی، زارا بھابی کی بہن زوہا باجی نے بتایا کہ صوفیہ آنٹی اور انکل کی ڈیتھ کے بعد وہ بہت بیمار ہوگئی تھی۔ کئی ماہ تو ڈینائل (denial) میں رہی اور جب کافی دن بعد وہ ان کے گھر شیرازی ولا آئی تو بالکل چپ رہتی تھی۔ کئی ہفتوں اس نے کسی سے بات نہیں کی۔ والدین کی ڈیتھ نے اسے اندر سے کچھ ایسا جذباتی صدمہ پہنچایا ہے کہ وہ آج تک اس جھٹکے سے باہر نہیں نکل سکی ہے۔''

عینی افسردگی سے بتا رہی تھی۔

زاویار نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

''والدین بھی کیا شے ہوتے ہیں۔ جب ساتھ ہوتے ہیں تو پتا ہی نہیں چلتا کہ ان کو کھو کر ہم اس قدر shattered بھی ہو سکتے ہیں۔ ٹوٹ بھی سکتے ہیں۔''

'' والدین ہی نہیں۔ اس نے تو اپنی سب سے قیمتی چیز بھی گنوا دی ہے میری بے خبر بہن۔ کاش تم جان سکتیں

کہ صرف والدین ہی نہیں۔ وہ تو سب کچھ گنوا چکی ہے۔ اور میرے ہاتھوں یہ سب ہوا ہے۔ اگر تمہیں پتا چل جائے تو شاید تم مجھے دیکھنا بھی گوارا نہ کرو۔'' لب بھینچے غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے وہ احساس پر پڑنے والی ہر ضرب کو اس کی پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

''اب کیا کر رہی ہے وہ؟'' بہ مشکل وہ پوچھ سکا تھا۔ بہت ساری ہمت مجتمع کر کے یہ الفاظ نکلے تھے اس کے لبوں سے۔

''پچھلے ڈھائی تین سال تو کچھ نہیں پڑھا ہے اس نے۔ البتہ اس سال بی کام کے پیپرز دینے کی تیاری کر رہی ہے۔ وہ بھی سب کے بہت اصرار کرنے پر۔''

اس کے ذہن میں اس خبر سے جھماکا سا ہوا۔ شاید دوبارہ ملنے کی سبیل نکل سکے۔

''کہاں پڑھ رہی ہے وہ......؟''

گو کہ وہ یہ سوال کرنا نہیں چاہ رہا تھا مگر کیے بنا رہ بھی نہیں سکا۔

عینی نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ جس نے اس لمحے اپنا چہرہ بے تاثر سا بنا لیا تھا۔ جس پر وہ مطمئن سی ہو کر بتانے لگی۔

''اب پرائیویٹ ایگزام دے گی۔ گھر پر ہی پڑھتی ہے۔ زارا بھابی کے کزن ہیں عکرمہ ان سے۔ ویسے یہ عکرمہ صاحب بھی خاصے اسمارٹ ہیں۔ آپ کو تو پتا ہی ہو گا زارا بھابی ان سے ہی خولہ آپی کی شادی کروانا چاہ رہی تھیں کہ بیچ میں آغا جان کا حکم آ گیا۔'' عینی کے وضاحت سے بتانے پر اسے عکرمہ شیرازی یاد آ گیا۔

''ہوں، معلوم ہے مجھے۔ ملا بھی ہوں میں اس سے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا......!'' عینی نے استعجاب کا اظہار کیا۔ ''کہاں ملے وہ؟''

''یہیں اسپتال میں۔ ایک دو بار اظہار بھائی کے ساتھ آیا تھا۔'' نظر چراتے ہوئے اس نے شیرازی ولا جانے کا قصہ حذف کر دیا تھا۔

''آئی سی، ویسے وہ کافی سویٹ نیچر کے ہیں۔ خولہ آپی بتا رہی تھی کہ اپنے چچا کے کہنے پر بہت محنت کر رہے ہیں اس کے ساتھ۔'' عینی کی پسندیدگی اس کی گفتگو سے عیاں تھی۔

''تم نے اس سے پوچھا، کیا وہ خوش ہے وہاں؟'' غیر محسوس طریقے سے اس نے عینی کو ''عکرمہ'' کے موضوع سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ جس میں اسے کامیابی ہوئی۔

''ہاں، پوچھا تھا میں نے۔'' عینی اس کے سوال پر گہری سانس بھر کر کہنے لگی۔ ''سب اس کا بہت خیال بھی رکھتے ہیں۔ اب وہ پہلے سے بہتر ہے۔ ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔''

''آہ، ایک ایسے گھر میں جہاں کوئی محرم رشتہ نہ ہو۔ ایک جوان لڑکی کا رہنا۔ اذیت ناک ہی ہو سکتا ہے۔ ایسے حالات اور ایسی صورتِ حال میں انسان محض کمپرومائز ہی کر سکتا ہے۔ خوش نہیں رہ سکتا۔ آہ میں نے اسے والدین کی بنائی محبت بھری چھاؤں سے نکال کر کس برزخ میں دھکیل دیا ہے۔''

ملال اور پچھتاوؤں کے ناگ اس کے احساس کو ڈس رہے تھے۔ چہرے پر زردی کھنڈ رہی تھی۔ عینی اسے دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔

''زوی بھائی، آپ ٹھیک تو ہیں۔ کیا بہت تکلیف ہو رہی ہے......؟'' بھائی کی محبت اور فکرمندی نے اسے یک دم الرٹ کر دیا تھا۔

متردد لہجہ تشویش زدہ تھا۔

''ہوں، آئی ایم ناٹ فیلنگ ویل۔ پلیز تھوڑی دیر کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' کسی گہرے کنویں سے آواز آئی تھی گویا۔

عینی اسے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ لہٰذا وہ مزید کچھ پوچھنے کی خواہش لیے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

عینی کے جانے کے بعد اس کے کچھ کولیگز بھی اسے وزٹ کرنے آئے۔ مولا بخش بھی آیا مگر پھر وہ کسی سے ڈھنگ سے مل نہ سکا۔ نہ ہی کسی کی بات پر دھیان لگا سکا۔ گو کہ بہت کوشش کی۔ اور اس وقت سے لے کر اب تک وہ اسی کرب میں ڈوبا ہوا تھا۔

دل کہتا دُرِ مکنون کا کہا مان کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ اپنے جرم نہ سہی اپنی محبت کا واسطہ تو دے سکتا تھا ناں وہ اسے شاید ایک بار پھر غور کرنے کا سوچ لیتی۔ تو وہ اس کے زخموں کی چارہ گری کرنے کا موقع پا لیتا۔ دل میں ہزار ارمان، سیکڑوں امیدیں جگا رہے تھے۔ مگر دوسری طرف اس کا ذہن اس کا استدلال تھا۔

جو ایسی کسی بھی غلط فہمی اور خوش فہمی سے آزاد تھا۔ اور اس کا استدلال بتا چکا تھا کہ اب دُرِ مکنون کی زندگی میں، اس کے دل میں اور اس کی نظر میں زاویار انصاری کا کوئی مقام نہیں۔ وہ نظر سے گر چکا تھا۔

اور جو نظر سے گر جاتے ہیں وہ دل میں کبھی کوئی مقام حاصل نہیں کر پاتے۔ خواہ کتنی ہی محبت کیوں نہ جتائیں۔ دل کھول کر کیوں نہ دکھائیں۔

وقت اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے...... اور اب لکیر پیٹنے کے علاوہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔

کل شام شہریار صاحب لاہور فلائی کرنے والے تھے۔ لہٰذا صبح ان سے اور آغا جان سے ملاقات متوقع تھی۔ مگر اس وقت اس کا ذہن چٹیل میدان کے مانند ہو رہا تھا۔ اعصاب پر نہ ٹوٹنے والا سناٹا طاری تھا۔

آج اس نے بغیر اسٹک کی مدد کے اسپتال میں کافی چہل قدمی کی تھی۔

لہٰذا اب پیر میں ہلکا، ہلکا درد بھی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بیچارگی سے سج، سج قدم اٹھاتا بیڈ پر آلیٹا۔

آج چھوٹے بھائی، مہران کی غیر موجودگی کے باعث وہ اٹھ کر کمرے میں گھوم پھر رہا تھا۔ پھر بہت کوشش کرنے پر بھی فجر تک نیند کی دیوی اس پر مہربان نہیں ہوئی اور سپیدہ پھیلنے کے بعد کہیں جا کر اس کی آنکھ لگ سکی۔ تب بھی گھنٹے بھر سے زیادہ سو نہیں سکا تھا وہ۔

نرسز اور ڈاکٹرز کی آمد و رفت شروع ہوئی تو آنکھ کھل ہی گئی۔ سات بج رہے تھے۔

وہ کسلمندی سے اٹھ بیٹھا۔ شدید تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔

اور یہ تھکن جسم و جاں کا مسئلہ نہیں تھی۔ بلکہ روح و دل میں اتری محسوس ہوئی۔

''صبح بخیر۔'' عاصمہ نہ جانے کب سے آئی ہوئی تھیں۔ اس کے جاگنے پر قریب چلی آئیں۔

''آپ...... اتنی صبح!'' اس نے استعجاب سے انہیں دیکھا۔

''ان فیکٹ، کل رات تم نے زبردستی مہران کو گھر بھیج دیا تھا۔ اس لیے فکر سے ساری رات ٹھیک سے نیند نہیں آسکی۔ صبح جلدی آنکھ کھل گئی تو سوچا تمہارے پاس آجاتی ہوں۔'' ممتا اور متفکر...... اسے ان پر پیار آنے لگا۔

وہ ناشتے کی ٹرے اٹھا کر اس کے قریب آبیٹھیں۔

زاویار نے اس لمحے دل کو رقیق ہوتا محسوس کیا تھا۔

محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ جسے بھی اسیر کرلے وہ اپنے محبوب کے لیے مٹنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ پھر خواہ وہ محبت رشتے کے توسط سے دل کو اسیر کرے یا بغیر کسی ناتے کے دل کی مکین بنے۔

''تمہارے پاپا کی فلائٹ ہے آج۔ وہ تم سے ملنے آئیں گے۔ اس لیے بھی میں ذرا جلدی آئی تاکہ ان کے آنے سے پہلے یہاں سے نکل سکوں۔''

وہ خاموشی سے بیٹھا اُن کے کہنے پر ناشتا زہر مار کر رہا تھا کہ انہوں نے پھر کہا تھا۔ ''بیٹا تم بھی ذرا اچھی طرح مل لینا ان سے۔ تمہارے والد ہیں وہ۔'' اس نے ہاتھ روک کر ذرا کی ذرا انہیں دیکھا۔

سادہ سا چہرہ، تفکر بھری آنکھیں اور پُر امید نظریں......

''کیسی فراخ دل اور وسیع الظرف عورت ہیں آپ۔ جس شخص نے آپ کو زندگی کا سب سے بڑا دکھ دیا۔ ایسا دکھ جسے آپ آج تک اپنے وجود کا حصہ بنائے ہوئے ہیں۔ جس نے آپ کو مجھ سے جدا کر دیا۔ اس انسان کے لیے آپ کس طرح اچھا سوچ لیتی ہیں۔ کیسے کر لیتی ہیں آپ ایسا؟''

ملامت تھی اس کے لہجے میں یا شاید حیرت۔

عاصمہ خفیف سی ہو گئیں۔

''وہ سب پرانی باتیں تھیں بیٹا۔ بس ہمارے نصیب میں یہی لکھا تھا۔ مل کر بچھڑنا اور پھر اپنے، اپنے رستے چل دینا۔ یوں بھی راستہ الگ کرنے کا فیصلہ میرا تھا ان کا نہیں۔ وہ مجھے اپنے گھر سے نکال نہیں رہے تھے۔ ہاں مگر دھوکا دیا تھا انہوں نے مجھے۔ مگر اس فعل کو بھی میں کب کا معاف کر چکی۔'' اس کے گھنے بالوں والے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتی وہ سچائی سے کہہ رہی تھیں۔

زاویار کی آنکھوں میں الجھن اور متفق نہ ہونے کا عندیہ تھا۔

''یوں بھی میں تقدیر کو مانتی ہوں بیٹا۔ زندگی نے اگر مجھ سے کچھ چھینا تو پھر بہت کچھ دے بھی دیا اور خاص طور پر جب سے تم میرے پاس آئے ہو۔ میرے سارے گلے، تمام شکوے مٹ چکے ہیں۔ انصاری انکل ہوں یا تمہارے پاپا...... مجھے اب کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ میرا صرف ایک نقصان ہوا تھا کہ تم مجھ سے چھین لیے گئے تھے اور اب جبکہ تم میرے ساتھ ہو زوی تو یقین کرو۔ میری ساری کلفتیں مٹ چکی ہیں۔ تم میرا انعام ہو۔ اور جب اللہ بندے پر اپنا فضل کرے ناں تو اسے بھی شکر گزاری اپنا لینی چاہیے۔'' وہ اپنے تئیں کس قدر مطمئن تھیں۔

زاویار بران کے لفظوں نے خاصا اثر کیا۔ اس کی خاموشی اشارہ تھی کہ بات دل میں گھر کر رہی ہے۔

پھر کافی دیر وہ اس سے اسی قسم کی باتیں کرتی رہیں۔ اور پھر شہریار صاحب کے آنے سے پہلے ہی لوٹ گئیں۔

ان کے سمجھانے کا اثر تھا کہ جب وہ اس سے ملنے آئے تو اس نے اپنے منفی جذبات کے اظہار پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا۔

یوں بھی کل سے دل پر ایک رقت سی طاری تھی۔ ایک احساسِ جرم دھرا تھا سینے پر۔ آغا جان بھی ساتھ تھے۔

آج وہ دونوں کافی دیر اس سے باتیں کرتے رہے جن کے مختصر جواب دیتے ہوئے اس کا لہجہ نفرت کے زہر سے خالی تھا۔

شہریار انصاری باپ تھے۔ محبت کرتے تھے اس سے مگر ہر بار اس کی ہٹ دھرمی اور بے لحاظی انہیں اس سے دور کر دیتی تھی۔ لٰہذا آج جب وہ خلافِ معمول اور خلافِ عادت طنز کے بغیر بات کر رہا تھا وہ اٹھ کر اس کے پاس چلے آئے۔

''میں ڈاکٹر سے مل کر آیا ہوں۔ وہ بہت مطمئن ہے تمہاری طرف سے۔ تمہارے stitches تیزی سے ٹھیک ہو رہے ہیں۔ ساتھ ہی کل تمہارے ہاتھ کا پلستر بھی اتر جائے گا۔ تم نے بہت جلد کور کیا ہے۔'' وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر بولے تھے۔

''جی۔''

''ڈسچارج ہو جاؤ تو لاہور آنا میرے پاس۔ مستقل طور پر نہ سہی ملنے تو آ سکتے ہو۔'' وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ انہوں نے رسان سے جملہ مکمل کر لیا۔

وہ اس وقت شدید جذباتی غلبے کا شکار تھا۔ لہٰذا دماغ کے ڈپٹنے کے باوجود دل کے کہنے پر سر جھکا کر ان کو اثبات کا عندیہ دے گیا۔

''کوشش کروں گا۔''

''ہرگز نہیں......'' کے بجائے یہ سننے کو ملا تھا۔

شہریار انصاری فرطِ مسرت سے بے اختیار ہوتے ہوئے اسے سینے سے لگا گئے۔ آج نہ جانے کتنے سالوں کے بعد انہوں نے اسے خود سے لگایا تھا پھر بھی ان دونوں کے لیے ایک دوسرے کالمس کس قدر مانوس تھا۔ وہ بھی انسان تھا۔ گوشت پوست کا بنا۔ اسے لگا وہ دس سال پرانا زاویار ہے۔ جسے بابا کے سینے سے لگ کر سکون ملتا تھا۔ اسے لگا اگر وہ ذرا دیر اور ان کے شفقت بھرے بازوؤں میں گھرا رہا تو ان کے پُرحدت وجود کا لمس اس کے اندر کا سارا غبار باہر نکال دے گا۔

''آپ اپنا خیال رکھیے گا۔''

ایک جھٹکے سے اپنا آپ ان سے علیحدہ کرتے ہوئے وہ کھڑا ہوا۔ کہنا کیا چاہ رہا تھا منہ سے نکل کچھ گیا تھا۔ شہریار صاحب نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

کمرے کی مانوس فضا بھی اسے حد درجہ بوجھل اور اجنبی لگ رہی تھی۔

''مجھے اپنا خیال رکھنے کی بھلا کیا ضرورت۔ میرا بیٹا جوان ہے۔ اب تو اسے میرا خیال رکھنا ہے۔'' باتوں، باتوں میں وہ اسے بہت کچھ جتا گئے تھے۔

اس کی آنکھوں میں شکوے اترنے لگے تو سر جھکا۔

''آخر کیوں ہم اپنے مجرموں کو معاف کرنے کا حوصلہ نہیں کر پاتے۔ کیوں تنگ دل بن جاتے ہیں۔ اتنے کہ خود سے محبت کرنے والوں کی کوتاہیاں اور غلطیاں ہمیشہ کے لیے دل کا زخم بنا کر ان کی نگہداشت کرتے رہتے ہیں تمام عمر۔ کیوں نہیں ہم بھول جاتے۔ نظر انداز کر پاتے، اپنوں کے دیے دکھ کیوں ان پر ساری زندگی بین کرتے رہتے ہیں۔'' کوئی اس کے اندر بول رہا تھا۔ دل کی عدالت میں احتجاج بلند ہو رہا تھا۔

''شاید اس لیے کہ ہمیں ملنے والے ہر درد کا درماں نہیں ہوتا۔ ہر غلطی کی تلافی اور ہر نقصان کا ہرجانہ بھرنا کبھی، کبھی ناممکن ہوتا ہے۔ جیسے دُرِ مکنون کو جو دکھ، اذیت اور کرب میں نے دیا۔ اسے کسی سحر، کسی جادو سے بھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ یہ زخم نہیں ناسور ہے۔ سرطان ہے۔'' اس کا ذہن۔ اس کا استدلال دلیلیں دینے لگا۔

''جیسے آغا جان کا دیا ہوا دکھ۔ گویا کسی نے میرے دل کو، ضمیر کو کسی کند چھری سے ذبح کر ڈالا تھا۔ کیسے بھول سکتا ہوں میں۔ کوئی معمولی نقصان تو نہیں ہوا تھا میرا۔ یہ تو صدیوں میں بھی نہ بھر پائے گا وہ خسارہ ہے۔ ہر کوئی ماما کی طرح نہیں ہوتا کہ فراخدلی اور خندہ پیشانی کا مظاہرہ کر سکے۔ یوں بھی یہ تو جرم کی نوعیت پر منحصر ہے کہ اسے تعزیر سے نوازا جائے یا معافی سے۔ آغا جان کی طرف محض میری ماں کو مجھ سے دور کرنے کا حساب نہیں نکلتا بلکہ میری زندگی، میری روح میں اتری اس نازک سی لڑکی کا بھی بہت سا قرض بنتا ہے جو آج میری بدولت زندہ درگور ہے۔ کیسے معاف کر دوں میں انہیں......؟ اور آخر کیسے اور کیوں......؟''

آغا جان کا ہاتھ تھامے پاپا کو کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر اس کے ذہن و دل میں گویا جنگ سی چھڑی تھی۔اور عموماً عقل اور جذبات کی جنگ میں فتح ہمیشہ جذبات کی ہوتی ہے۔

زاویار انصاری نے بھی اپنے دل کو پگھلتا محسوس کیا تھا۔مگر ساتھ ساتھ اندرونِ ذات بہت سے احتجاج بھی سر پٹخ رہے تھے۔ذہنی خلفشار اور اندرونی انتشار سے تنگ آ کر اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

☆......☆......☆

ساڑی پریس کرنے کے بعد جس وقت وہ سائرہ بیگم کی خواب گاہ میں داخل ہوئی دل خواہ مخواہ دھڑکے جا رہا تھا۔جب سے وہ زاویار انصاری سے مل کر آئی تھی۔ہمہ وقت یہی خدشہ، یہی دھڑکا لگا رہتا کہ اب یا تب سائرہ بیگم کی عدالت میں حاضری لگنی ہے۔اور آج کئی دنوں بعد بالآخر غالباً وہ وقت آ ہی پہنچا تھا۔

اصغری نے جب یہ پیغام دیا کہ بڑی بیگم نے اسے ساڑی استری کرنے کے بعد اپنے کمرے میں بلایا ہے۔وہ ذہن کو کسی ایک نقطے پر مرتکز نہیں کر پا رہی تھی۔

''آخر کیوں بلایا ہوگا انہوں نے۔کہیں زاویار انصاری کی خالہ نے اس کی کوئی شکایت تو نہیں کر دی۔یا کہیں ایسا تو نہیں ہوگیا کہ زاویار انصاری اپنے وعدے سے مکر گیا ہو۔اس نے ''ہاں'' تو نہیں کہہ دی کہیں''۔اور اس خدشے کے ساتھ ہی اس کا دل جیسے رک کر دھڑکا تھا۔

''اگر ایسا ہوگیا تو کیا کرو گی دُرِ مکنون......؟ کیا واقعی۔''حرام موت'' کو گلے لگا لو گی تم......؟''

سوالات کے جھکڑ سے چلنے لگے تھے دل و دماغ میں۔

بہ مشکل اس نے ساڑی استری کی اور دھڑکتے دل سے سائرہ بیگم کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

''یس۔'' کی آواز کے ساتھ ہی وہ گلا تر کرتی اندر چلی آئی۔

''یہ لیجیے، یہ پریس کر دی ہے میں نے۔''

سامنے ہی وہ صوفے پر بیٹھی غالباً اسی کی منتظر تھیں۔اس کے اندر داخل ہوتے ہی گہری نظر سے اسے دیکھا۔ان کی نظروں میں کچھ تھا وہ پزل سی ہوگئی۔

''تھینکس۔'' عجیب لٹھ مار سا لہجہ تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ طنز کیا ہے یا واقعتاً وہ ممنون ہیں۔

''اسے وہاں بیڈ پر رکھ دو اور یہاں آ کر بیٹھو۔'' اب کے ذرا تحکم سے کہا تو وہ کسی معمول کی طرح ہدایت پر عمل کر کے ان کے سامنے رکھے صوفے پر آ بیٹھی۔

''ابھی نازیہ کا فون آیا تھا۔'' انہوں نے ہاتھ میں لیا کارڈلیس فون اس کے سامنے لہرایا۔

ایک سنسنی سی اس کے رگ و پے میں اتری اس لمحے۔نظر اٹھانے کا یارا نہ ہوا۔چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔جبکہ وہ اسے ہی بغور دیکھ رہی تھیں۔

''مبارک ہو تمہیں۔زاویار نے انکار کر دیا ہے۔'' طنزیہ کٹیلا لہجہ اس کے دل میں ترازو ہو گیا۔

نظر کے ساتھ، ساتھ سر بھی مزید جھک گیا تھا۔

''تمہیں تو خوشی ہوئی ہوگی ناں یہ خبر سن کر۔'' اس کی خاموشی انہیں تلملا گئی تھی۔''کیا تمہیں ذرا سا بھی احساس ہے کہ مظفر کے لیے کس قدر پریشانی کا باعث ہو تم۔اپنی تین بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہونے جا رہے تھے وہ کہ مزید تمہاری ذمے داری ان کے سر ڈال دی گئی اور نبھانے کی حتی المقدور کوشش کر رہے ہیں وہ۔ان کے ساتھ، ساتھ اس گھر کا ہر شخص تمہارے لیے فکر مند ہے۔مگر بدلے میں تم کیا کر رہی ہو......؟ کیا دے رہی ہو ہمیں......؟''

ان کا لہجہ گویا آتشیں بھالے کی طرح لگا تھا اسے۔

وجودِ احساس پر زبردست ضرب پڑی تو سارا احتجاج نمکین پانی کی صورت پلکوں کی منڈیروں پر آرکا۔

''تمہاری لائف سیٹ کرنے کی مسلسل کوشش کر رہی ہوں میں اور تم اسے ناکام بنائے دے رہی ہو۔ آخر تم کیوں مظفر کے اعصاب پر سوار رہنا چاہتی ہو۔ کیوں نہیں انہیں سکون کی زندگی گزارنے دے رہی ہو۔''

پچھلے دنوں خود کو صبر کا جو سبق انہوں نے پڑھایا تھا۔ آج نازیہ کی فون کال کے بعد ایک مرتبہ پھر وہ اسے بھول گئی تھیں۔

''تمہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ میں نے تمہیں زاویار سے کیوں ملوایا تھا۔ کیونکہ میں چاہتی تھی کہ تمہارے اور اس کے بیچ میں انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہو جائے مگر تم نے جانے اس لڑکے سے کیا کہا کہ وہ انکار کر بیٹھا ہے۔ پہلے تو تم نے اس دن بے ہوش ہو کر خواہ مخواہ کا سین کری ایٹ کیا اور جب بعد میں، میں نے کسی نہ کسی طرح معاملہ سنبھال لیا تو پھر بنا بنایا کام تم بگاڑ آئیں۔'' وہ سخت برافروختہ تھیں۔

دُرِ مکنون لبوں کے گوشے کچلتے ہوئے بہ مشکل اس نمکین سیال کو بہنے سے روک رہی تھی جو اس وقت پلکوں کی باڑ پھلانگنے کو مچل رہا تھا۔ سینے میں گویا ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔

''آخر تم کیوں نہیں سمجھ رہیں کہ تمام عمر لوگ تم سے رشتۂ ہمدردی نہیں نبھا سکیں گے۔ کبھی نہ کبھی تمہیں اس عارضی پناہ گاہ کو چھوڑ کر جانا ہی ہوگا۔ یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔ اس بات کو گرہ سے باندھ لو تم۔ جیسے تمہارے پیرنٹس تمہیں چھوڑ گئے۔ کبھی نہ کبھی ہمیں بھی جانا ہوگا۔''

اس کی چپ انہیں جھنجلانے پر مجبور کرگئی۔ تاہم بات انہوں نے پتے کی کی تھی۔

درِمکنون نے بے اختیار نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ناگواری اور نفرت کی چنگاریاں سی پھوٹتی محسوس ہوئیں اسے سائرہ بیگم کی آنکھوں سے۔
اس نے ان کی ساری پلاننگ خراب کر دی تھی۔ اس گھر سے اسے نکالنے کی جو چال وہ چل رہی تھیں اس میں بہت بڑا رخنہ پیدا کر دیا تھا اس نے۔
بے بسی اور بیچارگی کی انتہا تھی۔
اسے اپنا آپ اس لمحے کسی گداگر کے مانند محسوس ہو رہا تھا۔ جو سائرہ بیگم کے آگے اپنے کشکول، اپنے کاسۂ سوال کو حد درجے ذلت اٹھانے کے باوجود دراز کیے ہوئے تھا۔
اس پر اپنے والدین کا ذکر۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی۔
باوجود ہزار کوشش، سسکیاں اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی تھیں۔
سائرہ بیگم نے بیزاری سے اس کے جھکے ہوئے گھنے بالوں والے سر کو دیکھا۔
''تمہارے رونے سے یہ حقیقت تبدیل نہیں ہوگی لڑکی۔ معاملہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری، مظفر اور اماں کی زندگی جب تک ہے۔ تبھی تک تم اس گھر میں رہ سکتی ہو پھر اس کے بعد کیا ہوگا۔ کیا عکرمہ کی بیوی یا سیف کی فیملی تمہیں برداشت کرے گی اس گھر میں......؟'' ان کا سوال کڑا اور حقیقت پر مبنی تھا۔
دُرِمکنون نے ہتھیلی کی پشت سے رخساروں پر بہتی نمی رگڑ کر صاف کی۔
''نو وے۔'' اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا تھا انہوں نے۔
''اس بھول میں بھی کبھی نہ رہنا کہ عکرمہ یا سیف کی فیملیز تمہیں یہاں اپنے ساتھ رکھنے پر راضی ہوں گی۔ آج کل کی لڑکیاں ساس سسر کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔ کجا کہ ایک ایسی لڑکی کو جھیلنا جس کا کوئی حقیقی رشتہ بھی نہیں ہو کسی سے۔'' الفاظ تھے کہ برچھیاں۔ اسے اپنے پہلو میں خون رستا محسوس ہو رہا تھا۔
ایک ذلت وہ تھی جو اس نے ایک درندے کے ہاتھوں اٹھائی تھی اور ایک تذلیل یہ تھی جس کا اسے اپنی ماں جیسی ہستی کے مقابل سامنا تھا۔
سیف اس کا کزن تھا عکرمہ نہ سہی۔ کم از کم اس سے تو کسی نہ کسی حوالے سے رشتہ بنتا تھا اس کا مگر سائرہ بیگم کی گفتگو نے گویا اس کا بھی امکان ختم کر دیا تھا۔
''لہٰذا اس بات کو سمجھو لڑکی۔ آج میں اور مظفر تمہارا گھر بسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نہ رہے تو زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے لیے تنہا رہ جاؤ گی تم۔ اس معاشرے میں اکیلی لڑکی لوگوں کے لیے تر نوالے سے کم نہیں ہوتی۔ اس کا ''تمہیں'' تو باقاعدہ ''تجربہ'' بھی ہے۔'' تیکھے پن سے کہتے، کہتے بے دردی سے گہرا طنز کیا تھا انہوں نے۔
اس کے اندر سب کچھ گویا جل تھل ہو گیا تھا۔
ایسا طعنہ......ایسی بے حسی اور سفاکیت......خود پر قابو پانے کی کوشش میں اس پر لرزہ طاری ہو گیا تھا اس لمحے۔
سائرہ بیگم نے اس کے مرتعش وجود کو استہزائیہ نظروں سے دیکھا۔
''لہٰذا جو میں کر رہی ہوں اس میں دشواریاں پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرو۔ عمر میں تو تم کم ہو مگر تجربہ تو تمہیں کسی سن رسیدہ عورت سے زیادہ ہے ناں۔ جان رکھو۔ عورت کی حفاظت اللہ نے مرد کے ذریعے ہی کروائی ہے۔ بھائی اور باپ تو تمہارے ہیں نہیں اور بیٹا تمہیں ابھی مل نہیں سکتا۔ لہٰذا شوہر کے سہارے سے ہی زندگی گزارنی ہوگی تمہیں۔ میں نے نازیہ سے کہہ دیا ہے کہ وہ کوئی اور پرپوزل دیکھے تمہارے لیے۔ اس دوران تم بھی اپنا مائنڈ میک اپ کر لو۔ ابھی عمر اور حسن کی دولت ہے تمہارے پاس زیادہ وقت گزر گیا تو یہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس لیے

دیرمت کرو اور وقت کا فائدہ اٹھاؤ۔ یہ تو میں رشتے میں تمہاری ماں کی بہن ہوں۔ اس لیے یہ سب کر بھی رہی ہوں ورنہ ہمارے معاشرے میں گھر سے بھاگی ہوئی اور اغوا شدہ لڑکی میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ دونوں ہی ذلت کا جلتا ہوا نشان سمجھی جاتی ہیں میری بات تم اچھی طرح سمجھ لو۔''

وہ اس کے دل پر قدم دھرتے ہوئے بے حسی سے کہے جا رہی تھیں۔ یہ دیکھے بغیر کہ سامنے بیٹھا وجود گویا زلزلے کی زد پر تھا۔

''اپنے گھر میں پناہ دینا تو دور کی بات کوئی سر پر دستِ شفقت رکھنے والا نہیں ہوتا۔ اس گھر میں اور اس دنیا میں تمہارا کوئی محرم رشتہ باقی نہیں رہ گیا۔ سوائے تمہارے ان تایا کے جو فارن میں بسترِ مرگ پر پڑے اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ میری زندگی میں ہی تم اپنی منزل کو پالو۔ نہیں تو بقیہ زندگی راستے کی دھول بن کر رہ جاؤ گی۔''

آنے والے مستقبل میں درپیش خطروں کا ادراک اس کے حوالے کرتے ہوئے وہ آج اپنی اور مظفر صاحب کی موت اور اس دنیا سے چلے جانے کا ذکر بالخصوص کر گئی تھیں۔ وگرنہ عام حالات میں وہ موت کے بارے میں سوچنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔

نہ جانے نازیہ نے ایسا کیا کہہ دیا تھا انہیں کہ ان کی گفتگو میں کئی بار یہ موضوع زیرِ بحث آیا تھا۔ یا غالباً وہ اسے بہلا پھسلا کر نہ سہی ڈرا سہا کر ہی اپنے مقصد میں کامیاب ہونا چاہ رہی تھیں۔ بہرحال کچھ بھی تھا جو بات عکرمہ اور دادی نے دبے لفظوں میں اس سے بارہا کہی تھی۔ وہ آج بالکل کھلے الفاظ میں سائرہ بیگم کی تیغ صفت زبان نے اس کی سماعتوں میں مانند زہر انڈیل دی تھی۔

''بہرحال اب جاؤ تم یہاں سے اور جانے سے پہلے یہ اپنا چہرہ صاف کرو۔'' سائڈ ٹیبل پر رکھے ٹشو باکس سے ایک ٹشو کھینچ کر نکالا اور اسے تھمایا۔

''ہر بات پر آنسو بہانے مت بیٹھ جایا کرو۔ جو میں نے کہا ہے اسے سمجھو اور عمل کرو۔ میں چاہتی ہوں کہ مظفر اور میں جتنی جلدی تمہاری ذمے داری سے عہدہ برآ ہو جائیں اتنا ہی ہمارے اور تمہارے حق میں بہتر ہے۔ تاہم تم یہ مت سمجھنا کہ ہم تمہیں کسی کنویں میں دھکیل دیں گے۔ دیکھ بھال کر تمہاری پسند اور خوشی کے مطابق ہی فیصلہ کریں گے مگر اس کے لیے تم بھی کوآپریٹ کرو تو بہتر ہے۔''

غصے میں بہت کچھ کہہ دینے کے بعد اچانک ہی انہیں اس کے اعصاب کی نزاکت کا خیال آیا۔ کل ردا کے نکاح کی تقریب تھی گھر میں۔ ایسے میں اگر دُرِمکنون کو اسٹریس کے باعث کوئی دورہ پڑ گیا تو لینے کے دینے بھی پڑ سکتے تھے۔ بالخصوص مظفر صاحب نے انہیں خبردار کر رکھا تھا کہ اب وہ دُرِمکنون پر کسی بھی طرح کا جبر نہیں کریں گی۔

غصے میں اچھی طرح اسے سنانے کے بعد جوش کا خمار اترا تو انہوں نے ہوش میں آتے ہی نرمی اور بیزاری سے اسے سمجھایا۔

جواباً وہ محض نظر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

''اُف، لڑکی ہے یا حسن کا مجسمہ۔ صوفیہ اور زاہد میں تو کسی سے بھی مشابہ نہیں ہے۔'' اس کی درد کا عنوان بنی مڑی ہوئی پلکوں والی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ سوچے بنا نہ رہ سکی تھیں۔ جبکہ دُرِمکنون کی گلہ آمیز نظریں ان کے اندر اپنے الفاظ پر ندامت جگانے لگی تھیں۔

''اینی وے، اب تم جاؤ۔'' انہوں نے بے اختیار نظر چرائی تھی۔

دُرِمکنون یوں اٹھی جیسے ابھی گر پڑے گی۔ دکھتے دل اور تھکے قدموں سے باہر آنے میں گو کہ اسے بہت مشقت

کرنی پڑی تھی۔ مگر وہ مزید ان کے سامنے رکنا نہیں چاہ رہی تھی۔ جو کچھ سن لیا تھا۔ جتنا زہر اپنے اندر اتار لیا تھا اس نے۔ اسے لبِ مرگ کرنے کے لیے وہ ہی کافی تھا۔

لاؤنج خالی پڑا تھا۔ وہ شکستہ قدموں سے کچن میں چلی آئی۔

پانی سے گلاس بھر کر وہ وہیں کرسی پر گر سی گئی۔

''کس قدر بے حیت ہوں میں...... اتنی ذلت اس درجہ تذلیل سہنے کے باوجود زندہ ہوں۔ آخر میں مر کیوں نہیں جاتی۔ کیا کمی ہو جائے گی۔ اس بے درد دنیا میں۔ اس ''شیرازی ولا'' میں میری موت سے۔ میرے چلے جانے سے۔ کیوں ہوں میں اس قدر ڈھیٹ۔ ایسا پہاڑ سا دکھ اٹھانے اور در بدر ہونے کے باوجود کس درجہ.... بے غیرتی سے زندہ ہوں۔ سانس لے رہی ہوں۔'' گھونٹ، گھونٹ پانی پیتے ہوئے وہ اپنے آنسوؤں کا زہر بھی پینے کی کوشش میں تھی۔ مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ اس نے سسکیاں روک لیں اور اس نمکین گرم سیال کو آنکھوں سے بہہ جانے دیا جو سینے میں لاوے کی طرح پک رہا تھا۔

سائرہ بیگم کے لبوں سے نکلا ایک، ایک لفظ کسی ہتھوڑے کی طرح احساس پر ضرب لگائے چلا جا رہا تھا۔ سماعتوں پر کوڑے کے مانند برس رہا تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ حسبِ عادت سب اپنے، اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے۔ لہٰذا اسے دکھ بہا دینے کا موقع مل گیا تھا۔ مگر کب تک بالآخر آنسو بھی خشک ہو گئے۔ دوپٹے سے چہرہ صاف کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی اوپر جانے کا قصد کر رہی تھی کہ لان کی طرف کھلنے والے دروازے کو کھول کر اندر آتے سیف سے نظریں چار ہوئیں۔

''ہیلو۔ کیا حال ہیں......؟'' حسبِ معمول وہ کرکٹ کھیل کر لوٹا تھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے یوں ہی سر ہلا دیا۔

''پریشان لگ رہی ہیں۔ کل کے فنکشن کے لیے شاپنگ مکمل نہیں ہے آپ کی یا پارلر سے اپائنٹمنٹ نہیں ملا ہے آپ کو......؟''

فریج سے پانی کی بوتل نکال کر وہ اس کے سامنے ہی کرسی پر آ بیٹھا تھا۔ اس کی ''پریشانی'' سیف کے نزدیک محض اس حد تک ہی ہو سکتی تھی۔ عموماً وہ اس سے کم ہی مخاطب ہوتا تھا۔

گو کہ ابتدا میں جب وہ یہاں آئی۔ سیف نے کئی بار اس سے دوستانہ گفتگو کرنے کی کوشش کی مگر جب جواب میں خاموشی پائی تو خود ہی پیچھے ہٹ گیا۔ اب بھی وہ کبھی کبھار ہی بات کرتا تھا اس سے۔ جس کا وہ مختصر جواب دے دیا کرتی تھی۔

نہ جانے اس وقت اس کے چہرے پر کیا درج تھا وہ غیر ارادی طور پر استفسار کر بیٹھا تھا۔

''نہیں ایسی بات نہیں، آئی ایم او کے۔''

''گویا کہ پارلر یا مزید شاپنگ کا کوئی اسٹریس نہیں ہے آپ کو۔'' غٹاغٹ پانی پی کر وہ اس کے مقابل اٹھ کھڑا ہوا۔

''نہیں۔'' وہ بہ مشکل مسکرا سکی۔

''دیٹس لائیک اے ویری گڈ گرل۔ آپ لڑکی نہیں کوئی اینجل لگتی ہیں مجھے۔ نہ اور لڑکیوں کی طرح سارا دن سجنے سنورنے اور اوٹ پٹانگ فیشن کرنے کا شوق ہے آپ کو۔ نہ ہر دوسرے دن پارلر میں جا کر خود کو کارٹون بنانے کا۔ یو آر اے پرفیکٹ گرل۔'' ستائشی انداز خلوص سے بھرپور تھا۔

دُرِمکنون جھینپ سی گئی۔

''ویسے آپس کی بات ہے۔ بقول شاعر

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی
آپ ویسے ہی بہت نائس لگتی ہیں۔ آرٹیفیشل بیوٹی کی ضرورت نہیں۔ بس ذرا خوش رہا کریں۔ مسکرایا کریں، مسکرانے سے صحت اچھی رہتی ہے۔ جیسے کہ میری ہے۔" سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ قدرے جھک کر بولا تو دُرِمکنون کے لبوں پر بے اختیار تبسم بکھر گیا۔

"یہ ہوئی ناں بات۔"

اپنی بات کا تاثر اس کے چہرے پر دیکھ کر سیف کھل سا گیا۔

"چلیں اب اسی بات پر ایک کپ شاندار سی چائے تو بنا دیجیے۔ پلیز منع مت کیجیے گا۔" کان کھجا کر یک دم وہ اپنے مطلب پر اتر آیا تھا۔

دُرِمکنون نے بھویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"سچ کہہ رہا ہوں، مکھن نہیں لگا رہا جو کہا ہے وہ حلفاً کہا ہے۔ البتہ چائے کا معاملہ الگ ہے۔ اس وقت سخت تھکا ہوا ہوں اور ساتھ میں بھوک بھی ہے۔" ہاتھ اٹھا کر کہتے ہوئے گویا اسے یقین دلایا۔

"اوکے بیٹھ جاؤ، میں بنا کر دیتی ہوں۔"

سیف کی باتوں نے دل پر لگے زخم پر کچھ وقت کے لیے مرہم سا رکھ دیا تھا۔ اس کی توجہ بٹ گئی تھی۔ تاہم پھر بقیہ وقت اس کی اوٹ پٹانگ باتوں کو بظاہر سنتی ہوئی، اس کے لیے چائے کے ساتھ سینڈوچ بناتی دُرِمکنون دلگرفتہ سی سوچ میں ڈوبی رہی۔ اس کی زبان سے نکلا لفظ "اینجل" اسے اندر سے اُدھیڑ گیا تھا۔" اور جو اسے خبر ہو جائے کہ کس قدر ناپاک وجود ہے میرا تو سو بار تھوکے اپنی سوچ پر۔ اپنی اس رائے پر جو اس نے میرے بارے میں بنائی ہوئی ہے۔ یا اللہ تیرا شکر ہے کہ کم از کم کسی کے سامنے سہی۔ تو نے مجھ پر ستاری کی چادر ڈال رکھی ہے۔" ملال بھری سوچ کے ساتھ ہی تشکر بھی ابھرا دل میں۔ کیونکہ سیف کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو اس کے ساتھ ہونے والے حادثے سے بے خبر تھے۔ شیرازی ولا میں ردا اور سیف کو اس اندوہناک حادثے سے لاعلم ہی رکھا گیا تھا۔ ابتدا میں شیرازی صاحب نے صرف والدہ اور بیوی کو ہی بتایا تھا۔ اگر دُرِمکنون کو وقتاً فوقتاً دورے نہ پڑتے تو زوہا اور عکرمہ کو بھی پتا نہیں چل پاتا۔ کچھ اس میں سائرہ بیگم کے بے حس اور سفاک مزاج کا بھی دخل تھا کہ ان کے لبوں سے گاہے بہ گاہے نکلنے والے فقرے اس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی خبر کا عنوان بن جاتے تھے۔

زارا ان کی بڑی بیٹی تھی۔ لہٰذا اس سے تو وہ کوئی بات نہیں چھپاتی تھیں۔ صلح مشورے بھی ہوتے تھے اس سے۔ زوہا کی بات اور تھی۔ کچھ تو دوسرے نمبر کی بیٹی سے ان کو بہت لگاؤ نہیں تھا۔ دوسرے جس طرح اس نے دُرِمکنون کی حمایت کی، وہ اس سے کبیدہ خاطر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھیں۔ تاہم ان کا یہ بھی بڑا احسان تھا کہ سیف اور ردا سے انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ گھر کے دامادوں تک بھی یہ خبر نہیں جانی چاہیے۔ یہ ان کا حکم تھا۔ ان کے بہت سے احسانات میں یہ احسان دُرِمکنون کے لیے سب سے بڑا تھا کہ انہوں نے اس کے دکھوں کا بازار نہیں سجایا تھا۔

"مگر میں نے خود ہی اپنے چہرے کو نیون سائن بنا رکھا ہے۔ درد ہی درد سجا نظر آتا ہے ہر دیکھنے والے کو مگر کیا کروں یا اللہ۔ جیسے سانس لینے اور روکنے پر میرا اختیار نہیں۔ ایسے ہی اس درد کو خود سے جدا کرنا بھی ناممکن ہے میرے لیے۔ تو کرم فرما۔ رحم کر اے میرے رب۔ مجھے زندگی دی ہے تو ہمت بھی دے یا اللہ۔"

سیف کو چائے اور سینڈوچ کے ساتھ انصاف کرتا دیکھتی، وہ دل ہی دل میں اپنے معبود سے مخاطب تھی۔ دعا کر رہی تھی۔

گاڑی پورٹیکو میں روکتے ہی اس کی نظر لان کے پاس کھڑی شہرین پر پڑی تھی۔ جو اس وقت کانوں میں ائرفون لگائے اپنے سیل کے بٹن پش کرتے ہوئے غالباً کسی کو میسج ٹیکسٹ کرنے میں مصروف تھی۔

بریک کی آواز پر سر اٹھا کر متوجہ ہوئی۔ دوستانہ سی مسکراہٹ نے لبوں کا احاطہ کیا تو عکرمہ بھی مروت و اخلاق کا تقاضا نبھاتے ہوئے قریب چلا آیا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام۔ کیسے ہیں آپ......؟''

کانوں سے ائرفون نکالتے ہوئے وہ خوشدلی سے بولی۔

''اللہ کا شکر ہے۔ آپ سنائیں۔ کیسی ہیں آپ......؟''

''ایک دم فرسٹ کلاس۔''

''اور آپ کے کزن......زاویار، کیا حال ہے ان کا اب۔ مزاج کیسے ہیں ان کے......؟''

''وہ ٹھیک ہے پہلے سے بہت بہتر ہو گیا ہے۔ سر اور پیر کی انجریز بھی heal ہو چکی ہیں۔ بلکہ کل شام تک اس کے شولڈر کا پلستر بھی اتر جائے گا۔'' زاویار کے بارے میں رپورٹ دیتے ہوئے وہ خاصی خوش لگ رہی تھی۔

عکرمہ نے بغور اسے دیکھا۔ جو بے فکری سے بالوں کی لٹیں کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے اس سے مخاطب تھی۔

گو یہ ان کی پہلی بالمشافہ گفتگو تھی مگر شہرین کے انداز میں ابتدائی ملاقاتوں والا فطری تکلف نہیں تھا۔

''البتہ اس کا مزاج مت پوچھیں۔ بارہ مسالوں کی تیزی ہے اس میں۔'' وہ کہہ کر خود ہی ہنسی۔

''ہوں......ان فیکٹ۔ اس طرح کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے عموماً انسان کے مزاج میں تھوڑا بہت چڑچڑا پن پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ بٹ ڈونٹ وری۔ وہ کور کر لیں گے۔''

''ٹھیک کہا آپ نے۔'' عکرمہ کے تجزیے پر اس نے متفق ہوتے ہوئے سر ہلایا۔ ''ویسے آپ نے دوبارہ وزٹ نہیں کیا اسے۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ میں دو بار بعد میں بھی آیا تھا۔ انظہار بھائی کے ساتھ۔ البتہ پچھلے ویک ٹائم نہیں نکال سکا۔'' اس کا لہجہ معذرت خواہانہ سا تھا۔

''ہوں، گھر میں شادی جو ہے آپ کے۔ دسیوں کام ہوتے ہوں گے۔ یوں بھی شادی کے گھر میں اتنی مزیداری مصروفیت ہوتی ہے کہ بندے کا ادھر ادھر جانے کو دل ہی نہیں کرتا۔''

''اب اس بارے میں میری رائے ذرا مختلف ہے۔ میرے حساب سے یہ خالصتاً لڑکیوں والا ایونٹ ہوتا ہے۔'' اس نے ہلکے سے مسکراہٹ کے ساتھ شانے اچکائے۔

''یہ تو ہے۔ سچ میں تو خوب انجوائے کرتی ہوں یہ سارے فنکشنز۔ خاندان میں کہیں بھی شادی ہو میں پہنچ جاتی ہوں۔ دو دن پہلے اور ولیمے تک وہیں خیمہ لگا کے بیٹھی رہتی ہوں۔ ماما تو بہت چڑتی ہیں میری اس عادت سے۔'' خوشگوار موڈ میں وہ بڑے مزے سے اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ عکرمہ کے لیے اس کا انداز کچھ نیا نہیں تھا۔ اس کی اپنی کئی اسٹوڈنٹس اسی مزاج کی تھیں۔

وہ محض مسکرایا۔

''ویسے آج شام نکاح کا فنکشن ہے۔ آپ بھی تو غالباً انوائٹڈ ہیں۔''

''جی، زارا بھابی نے بلایا ہے اس لیے آنا ہی پڑے گا۔ یوں بھی عینی، دُرِ مکنون سے ملنے کو بے چین ہے۔ آج کل میری جان کو ہٹلر ہوئی ہے کہ اسے دُرِ مکنون سے ملوا لاؤں۔ لہٰذا اسے بھی لانا ہوگا آج پھر میری پرسنل پسند تو ہے

ہی۔خوب صورت سے کپڑے زبردست سی جیولری اور ڈھیر ساری انجوائے منٹ۔'' وہ فریش انداز میں شانے پر آئی لٹ جھٹک کر بولی تھی۔

عکرمہ ایک بار پھر مسکرا دیا پھر اخلاق سے بولا۔

''اچھی بات ہے مگر آپ اندر آئیے۔فنکشن بھلے شام کو سہی مگر شیرازی ولا میں مہمانوں کو ہم ہر وقت ویلکم کرتے ہیں۔''

''ارے نہیں اس وقت نہیں۔میں تو بس اس خولہ کی بچی کو پک کرنے آئی تھی۔باہر اس لیے کھڑی ہوں کہ محترمہ ذرا جلدی سامان سمیٹ کر باہر نکل آئیں۔اندر جا کر بیٹھی تو موصوفہ ریلیکس ہو جائیں گی اور پندرہ منٹ کے بجائے گھنٹا لگے گا نکلتے نکلتے۔آپ کو پتا نہیں ان محترمہ کا۔تیار ہونے میں بہت وقت لیتی ہیں'' ہرہائی نیس'' آج تو یوں بھی خاص تیاری ہے۔''

بے فکری سے اپنے باہر کھڑے ہونے کا جواز دیتے ہوئے آخر فقرہ خاصی معنی خیزی سے بولا تھا اس نے۔جسے لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکلتی خولہ نے بہ خوبی سنا تھا۔

''معنی......؟'' اس نے بھویں سکیڑ کر بلا ارادہ پوچھ لیا تھا۔

''ارے آپ کو نہیں پتا......؟''

اس کے سوالیہ انداز پر شہرین نے تعجب سے استفسار کیا تو وہ بھی نفی میں سر ہلا گیا۔

''ایسی کوئی خاص بات نہیں۔اسے تو مذاق کرنے کی عادت ہے۔'' خولہ اس دوران نزدیک آچکی تھی۔

نظروں ہی نظروں میں شہرین کو گھورتے ہوئے اس نے پاس آکر ٹہوکا دیا مگر شہرین حسب روایت اس کے ٹہوکے اور شعلہ بار نظروں کو نظر انداز کر گئی تھی۔

''ارے واہ......خاص کیوں نہیں ہے۔'' چہک کر کہتے ہوئے خولہ کی طرف ذرا کی ذرا دیکھا اور پھر عکرمہ کی جانب رخ موڑ کر بولی۔

''ان فیکٹ، میرے بھیا آرہے ہیں آج۔گویا ان موصوفہ کے ہونے والے منگیتر۔یہ آرائش و زیبائش اسی وجہ سے ہے۔''

بلیو کلر کے خوب صورت سے سوٹ میں ملبوس، ہلکے ہلکے میک اپ اور نازک سی جیولری کے ساتھ خولہ عام دنوں کے مقابلے میں واقعی زیبائش کا تاثر دے رہی تھی۔

عکرمہ کے ذہن سے یک دم کوئی بوجھ سرکا تھا اس لمحے۔یک دم مسکرا کر اس کی طرف دیکھا جیسے اس کی توثیق چاہ رہا ہو۔

خولہ نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں تاسف یا ملال کا ذرا سا بھی رنگ نہیں تھا۔

کوئی چیز جیسے سینے میں چھن سے ٹوٹی۔لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے کیا کچھ نہ سوچ لیا تھا۔مگر خود کو ظاہر نہ ہونے دینا تھا۔نہ صرف اس کا خود سے عہد تھا بلکہ فطرتاً بھی وہ کچھ ایسی ہی تھی۔

اپنے دل کی بات آسانی سے دوسرے کے حوالے کرنا اس کا مزاج نہ تھا۔خصوصاً اس پچویشن میں جبکہ بات انا اور خودداری پر بھی آرہی ہو اور دل کے بعد اپنی عزتِ نفس پر ٹھوکر وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔جبھی خود کو کمپوز کر کے بہ مشکل تبسم لبوں پر سجا سکی۔

''آئی سی۔'' اس کی مسکراہٹ ہی جواب تھی۔عکرمہ متانت سے مسکرا دیا۔

"congrats" خلوص سے کہتے ہوئے اس نے دیکھا تو یک دم نہ چاہتے ہوئے بھی باوجود کوشش کے

لمحہ بھر کے لیے خولہ کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا تھا۔
''تھینکس۔''
جواباً وہ نظر چرا گئی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں شرماہٹ اور محجوبیت کے بجائے ایک واضح پھیکا پن تھا۔ جسے چھپانے کے لیے اس نے اپنے شولڈر بیگ میں ہاتھ مارتے ہوئے ڈارک شیڈز نکال کر آنکھوں پر جما لیے تھے۔
کچھ تھا جو عکرمہ شیرازی کی عمیق نظروں سے چھپ نہیں سکا تھا۔ خود میں عجیب سا محسوس کرتے ہوئے وہ یک دم سنجیدہ نظر آنے لگا تھا۔
''اوکے...... پھر ہم چلتے ہیں۔ مبارک سلامت تو ان شاء اللہ چلتی رہے گی۔ میں مٹھائی لاؤں گی ناں آپ لوگوں کی طرف تو پھر تسلی سے بات کریں گے۔ فی الحال تو ہم کو اب نکلنا چاہیے۔''
وہ دونوں خود کو سنبھالنے میں لگ گئے تھے۔ اچانک ہی ان کے درمیان خاموشی بولنے لگی تھی۔ جسے شہرین نے چہکتی ہوئی آواز سے توڑا۔
''ضرور۔'' وہ اخلاقاً کہتا انہیں کار تک چھوڑنے آیا۔
''اللہ حافظ۔''
''اللہ حافظ۔'' الوداعی کلمات کے ساتھ ہی وہ زن سے گاڑی اڑا لے گئی تو عکرمہ گہری سوچ میں ڈوبا اندر چلا آیا۔ خولہ کی آنکھوں میں تیرتا ملال اس کے اندر چپ کا جال بچھا گیا تھا۔
گھر میں خاصی خاموشی تھی۔ کچن سے باہر آتی دُرِمکنون کے سلام کرنے پر وہ اس طرف متوجہ ہوا۔
''سب گھر والے کہاں ہیں......؟'' سلام کے جواب کے بعد پوچھا۔
''میمی خالہ اور ردا باجی کے ساتھ سب لوگ پارلر گئے ہیں۔''
''آپ نہیں گئیں......؟''
''نہیں۔''
''کیوں؟''
''ضرورت نہیں تھی۔'' بے ساختہ منہ سے نکلا تھا اور پھر اپنے ہی جملے پر وہ شرمندہ ہو گئی تھی۔ ''مطلب میرا موڈ نہیں تھا۔'' وضاحت دیتے ہوئے وہ پشیمان سی تھی۔ عکرمہ زیرِ لب مسکرا دیا۔
''دادی کہاں ہیں......؟''
''ڈرائنگ روم میں ہیں۔ کوئی گیسٹ آئی ہوئی ہیں ان کے پاس۔''
''اوکے۔'' وہ سر ہلا کر اوپر کی جانب چل دینے کو تھا کہ دُرِمکنون نے عقب سے پکار لیا۔
''دادی نے کہا تھا جب آپ گھر لوٹیں تو فریش ہو کر ڈرائنگ روم میں چلے جائیں۔''
''کیوں؟''
''شاید ان کی مہمان آپ سے بھی ملنا چاہ رہی ہیں۔''
''کون آیا ہے؟''
''غالباً کوئی طاہرہ آنٹی ہیں۔'' ذہن پر زور ڈالتے ہوئے اس نے اطلاع دی۔
''کیا واقعی! طاری آنٹی آئی ہیں......؟'' جواباً عکرمہ کے چہرے پر خوشی سی پھیل گئی۔
دُرِمکنون نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سر ہلایا تو وہ اوپر جانے کے بجائے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ قدموں کی رفتار بتا رہی تھی کہ کمرے میں موجود ہستی یقیناً اس کے لیے بہت اہمیت کی حامل تھی۔

دُرِمکنون نے قدرے استعجاب سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ عموماً کسی سے بھی ملنے کے لیے عکرمہ اس قدر بے تاب نظر نہیں آیا کرتا تھا۔

''آخر یہ کون ہیں جن کے لیے یہ اتنے ایکسائٹڈ لگ رہے تھے۔'' وہ اسے مطلع کرنے کے لیے ہی کچن سے باہر آئی تھی۔

کام ہو چکا تھا سو وہ واپس اندر چلی آئی۔ چائے اور ریفرشمنٹ تیار تھا اس نے اصغری کو ٹرالی سیٹ کرنے میں مدد دی اور با دلِ ناخواستہ ٹرالی دھکیلتی ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ اندر کا ماحول بہت خوشگوار تھا۔

عکرمہ، طاہرہ آنٹی کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ جو اس کے کندھے کو شفقت سے تھپتھپاتے ہوئے مشفق نظروں سے دیکھتی گویا تھیں۔

''ماشاء اللہ کتنا وجیہہ نکلا ہے اپنا عکرمہ۔ ہیں ناں اماں۔'' طاہرہ بیگم کی ستائش پر وہ قدرے جھینپ گیا تھا۔

''ہوں، ماشاء اللہ سے صحیح کہا تم نے۔'' دادی خوشدلی سے مسکرائیں۔

''آپ نے بہت سال بعد دیکھا ہے ناں اس لیے ایسا خیال کر رہی ہیں۔ ورنہ کوئی خاص چینج نہیں آیا ہے مجھ میں۔'' وہ متانت سے کہہ رہا تھا۔

''واقعی چینج تو کوئی نہیں آیا ہے تم میں۔ جیسے منکسر المزاج تم پہلے تھے۔ ویسے ہی اب بھی ہو۔'' طاہرہ آنٹی بردباری سے ہنس پڑیں۔

''آپ کیا یہ قصیدہ پڑھنے کے لیے یہاں آئی ہیں؟''

''یہی سمجھ لو۔'' اس کے سوال پر وہ پھر سے مسکرا دی تھیں۔

''اینی وے، یہ بتائیے آپ کتنے دنوں کے لیے آئی ہیں......؟''

عکرمہ نے اندر آتی دُرِمکنون کو دیکھ کر قصداً موضوع بدلا تھا۔

''اس بار کتنے دنوں نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے لوٹ آئی ہوں۔''

جواباً طاہرہ آنٹی نے جو خبر سنائی اس نے دادی سمیت اسے بھی حیرت زدہ کر دیا۔

''کیا واقعی......؟'' وہ خوشگوار حیرت سے پوچھ بیٹھا تھا۔

طاہرہ نے مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے اثبات کا عندیہ دیا تو دادی اور عکرمہ خوشی سے ہنس پڑے۔

''یہ بہت اچھا کیا تم نے طاہرہ۔ سچ تمہارے گھر پر نظر پڑتی تھی تو دل بہت اداس ہو جاتا تھا۔ شفقت (عکرمہ کی مما جان) کی زندگی میں تو دونوں بنگلوں کے بیچ کا یہ دروازہ جو تم دونوں کے بے انتہا اصرار پر بنوایا گیا تھا۔ ہر وقت کھلا ہی رہتا تھا۔''

''بالکل سچ کہا دادی آپ نے۔ بلیومی طاری آنٹی۔ آپ کی واپسی مجھے گویا پھر سے زندہ کر گئی ہے۔''

دُرِمکنون نے دیکھا عکرمہ کے تمکنت بھرے چہرے پر بے پناہ خوشی پھیلی ہوئی تھی۔ جیسے کسی بچے کے میلے میں بچھڑ جانے کے بعد اچانک اس کے ہاتھ میں اس کی ماں کا آنچل آ جائے تو وہ مسرت کے بے پایاں احساس سے لبریز ہو کر کچھ کہہ ہی نہ پا رہا ہو۔ عکرمہ کی حالت اسے ایسی ہی لگی۔

دُرِمکنون کا تعارف کچھ دیر پہلے ہو چکا تھا۔ اس نے چائے بنا کر ان کی طرف بڑھائی تو وہ چونکیں۔

''شکریہ بیٹا۔''

ان کا مہذب انداز محض مروت ہی نہیں درحقیقت شفقت بھرا تھا۔

کپ تھامتے ہوئے بے اختیار ان کی نظریں دُرِمکنون کے جھکے سر سے پھسلتی ہوئی۔ اس کی گھنی مڑی ہوئی

پلکوں پر آکر رک سی گئیں۔
''شکر کتنی......؟ آئی ایم سوری میں ڈالنا بھول گئی۔'' وہ کچھ نروس سی ہو رہی تھی۔ ہر نئے شخص سے ملنے پر اس کی کیفیت کچھ اسی طرح کی ہو جاتی تھی۔
''شکریہ بیٹا۔ میں چائے میں شکر نہیں لیتی۔'' طاہرہ بانو نے اب کی بار بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
''پھر بھی کس قدر میٹھی نیچر ہے آپ کی۔'' عکرمہ بے اختیار بول گیا تھا۔''آپ میں مما جان کا پرتو دکھتا ہے۔ ویسے ہی سنجیدہ لہجہ، متین انداز اور سادہ سی مسکراہٹ۔'' وہ بہت محبت سے کہہ گیا تھا۔
طاہرہ اور دادی سمیت دُرِ مکنون نے بھی اسے بغور دیکھا تھا۔
''کیسی ہستی ہوتی ہے ماں بھی کہ عکرمہ جیسا بندہ بھی اپنی مما جان کو یاد کر کے اداس سا ہو گیا۔ حالانکہ انہیں دادی اور چچا کی بے تحاشا محبت بھی حاصل ہے۔ ایسے میں اگر میں اس بھری دنیا میں تنہا رہ جانے کے باعث اپنے والدین کی یاد میں سوگوار رہتی ہوں تو پھر کیوں اسے ناشکری کے خانے میں فٹ کیا جاتا ہے؟'' اپنے دھیان میں سرخ مرطوب لبوں کے گوشے کچلتے ہوئے اس نے دادی کی طرف بھی کپ بڑھا دیا تھا۔
''مجھے بھی تم نادر سے کم پیارے نہیں ہو بیٹے۔'' طاہرہ بانو کی آنکھیں اس درجہ محبت پر جھلملا سی گئیں۔ انہوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر عکرمہ کی فراخ پیشانی چوم لی۔ دُرِ مکنون کو یہ جذباتی منظر اندر سے چھو گیا۔ کچھ تھا جس نے اسے پلکیں جھپکے بغیر ان دونوں کو دیکھتے جانے پر مجبور کر دیا تھا اور اس کی یہ محویت طاہرہ بانو سے مخفی نہ رہ سکی تھی۔
''تھینکس آنٹی!''
دُرِ مکنون کو لگا عکرمہ نے اس کی موجودگی کے باعث یک دم خود کو کمپوز کر لیا تھا۔ وگرنہ اس وقت وہ یقیناً کسی جذباتی غلبے کا شکار تھا۔ شاید اسے وہاں سے چلے جانا چاہیے۔
اس سوچ کے ساتھ ہی اس نے باہر کی جانب قدم بڑھائے تو یک دم طاہرہ بانو نے اسے پکار لیا۔
''بیٹا، کیا آپ ہمارے ساتھ چائے نہیں پئیں گی......؟''
مشفق لہجہ پاؤں کی زنجیر بنا تو اس نے دادی کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ جن کے پیار سے اشارہ کرنے پر وہ سہج، سہج کر قدم اٹھاتی طاہرہ بانو کے پاس چلی آئی۔
عکرمہ نے اٹھ کر اس کے لیے جگہ خالی کی تو وہ نروس سی ان کے پاس آبیٹھی۔
''پڑھتی ہیں آپ......؟''
''جی۔''
''کیا کر رہی ہیں۔''
''بی کام پارٹ ون کے ایگزامز کی تیاری۔''
''ویری گڈ۔ میں نے کل دیکھا تھا آپ کو۔ وہ آپ ہی تھیں تو جو لو برڈز کے پنجرے میں پانی رکھ رہی تھیں......؟'' طاہرہ بانو نے رسمی سوالات کے بعد کہا تو وہ قدرے چونکی۔ اور سر اثبات میں ہلا دیا۔
ان کی اس بات سے اسے یاد آیا کہ پچھلے لان میں رکھے قد آدم سائز کے پنجروں کے پاس ایک دروازہ ہے۔ پچھلے تین سال اس نے اس کو مقفل ہی دیکھا تھا۔
تو گویا طاہرہ آنٹی پچھلے بنگلے کی مالک ہیں۔
''وہی تو میں کہوں عکرمہ اور زوہا نے تو کب کے سارے برڈز اڑا دیے تھے۔ اب جو کئی سال بعد واپس وطن لوٹ کر آئی تو ان پنجروں کو آباد دیکھ کر اچھا لگا۔'' وہ رسانیت سے کہہ رہی تھیں۔

''جی بس اسٹڈیز کی وجہ سے ٹائم ہی نہیں ملتا تھا۔ ویسے اب یہ نئے برڈز درمکنون نے جمع کیے ہیں اور یہ خود ہی ان کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔'' عکرمہ نے اس کے خاموش رہنے پر کہا تھا۔

طاہرہ بانو اس بات پر قدرے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

''آپ آج کل یہیں رہتی ہیں، آئی مین۔ شیرازی ولا میں......؟''

ہر نیا شخص اسی قسم کے سوالات کرتا تھا۔ گو کہ وہ اس سوال کی کسی حد تک لاشعوری طور پر منتظر بھی تھی۔ تاہم پھر بھی یک دم اس کی جبیں پر قطرۂ انفعال ابھر آئے۔

''جی۔''

''ان فیکٹ دُرِمکنون کے والدین اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اس لیے مظفر اسے لاہور سے یہاں اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔'' دادی نے مختصراً اس کے بارے میں بتایا۔

طاہرہ بانو کو اس کے چہرے پر لکھے گداز نے افسردہ کر دیا۔

''چلو اچھا ہی ہوا ناں۔ ردا گھر سے رخصت ہو رہی ہے۔ ایسے میں ایک اور بیٹی اس گھر میں چلی آئی ہے۔ لہٰذا رونق اور برکت اب کہیں جانے والی نہیں۔'' طاہرہ بانو نے مسکرا کر مثبت جملہ کہا تو وہ یونہی نظر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

''ویسے میری کوئی بیٹی نہیں۔ ایک ہی بیٹا ہے۔ وہ اپنے فیملی کے ساتھ نیوزی لینڈ میں سیٹل ہے۔ میں بھی پچھلے پانچ سالوں سے وہیں تھی مگر اب دل اکتا گیا تو یہاں چلی آئی ہوں۔ تم میرے پاس آیا کرنا اچھا ہے۔ میرا بھی دل لگا رہے گا۔'' گہری سمندر صفت آنکھوں میں انہیں بے پناہ درد ڈیرا ڈالے نظر آیا تو وہ محبت سے کہنے لگی تھیں۔

''یوں بھی اتنے بڑے گھر میں اکیلے رہنا بڑا مشکل ہے۔'' اپنی تنہائی کا ذکر وہ بڑے آرام سے کر گئی تھیں۔

''تو کیا نادر واپس نہیں آئیں گے؟'' دادی نے استفسار کیا۔

''نہیں، اگلے تین سال تک تو وہ اپنی جاب چھوڑ نہیں سکتا۔ کانٹریکٹ سائن کیا ہوا ہے۔ اس کے بعد دیکھیں۔ اگر یہاں سے کچھ اچھی آفر ہوئی تو آجائے گا۔''

''تب تک تم یہاں کیا کرو گی......؟''

دادی کو نادر کے بارے میں سن کر تاسف ہوا تھا۔ فکرمندی سے پوچھنے لگیں۔

''میں نے آدھے پورشن میں کلینک سیٹ کرنے کا سوچ لیا ہے۔ یوں بھی میرے لیے تو تین کمرے کافی ہیں۔ اب دوبارہ سے پریکٹس شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ باقی اوپر کا پورشن میں نے نادر کے لیے سیٹ کرانا ہے۔ اب ویکیشن پر تو آئے گا ہی ناں وہ۔''

وہ بیٹے کے بارے میں بات کرتے، کرتے قدرے افسردہ ہو جاتی تھیں۔ دُرِمکنون نے ان کی تنہائی کو محسوس کیا۔

''ان شاء اللہ۔ ضرور آئے گا۔'' دادی نے حوصلہ افزا انداز میں کہا تھا۔ عکرمہ البتہ چپ چاپ سن رہا تھا۔

اسے بھی نادر کی اس بے پروائی اور بے اعتنائی کا افسوس ہوا تھا۔ طاہرہ آنٹی یوں بھی بیوگی کے بعد سے بہت اکیلی ہو گئی تھیں۔ اسی لیے اس کے پاس چلی گئی تھیں۔ ارادہ تو یہی لے کر گئی تھیں کہ بیٹے اور بہو کو واپس لائیں گی مگر ان کی تنہا واپسی گواہ تھی کہ بیٹے نے ان کی بات مانی نہیں تھی۔

''چلیے، اب آپ اپنے بارے میں بتائیں بیٹا کہ کون سے کالج سے گریجویشن کر رہی ہیں......؟''

طاہرہ بانو نے پہلو میں بیٹھی دُرِمکنون کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی اپنائیت سے پوچھا تھا۔ جس پر وہ عکرمہ کو دیکھنے لگی تھی۔

''ان فیکٹ، طاری آنٹی دُرِمکنون تھوڑا لیٹ ہو گئی ہیں۔ اس لیے فی الحال تو پرائیویٹ اگزام کی تیاری گھر پر

ہی کر رہی ہیں۔ بٹ فائنل کے لیے کسی نہ کسی کالج میں ریگولر کلاسز جوائن کر لیں گی۔'' عکرمہ نے کچھ ایسے انداز میں جواب دیا کہ طاہرہ بیگم اس کے چہرے سے کچھ پا کر خاموش ہو گئیں۔

خود کو موضوع گفتگو بنتا دیکھ کر دُرِ مکنون بے چین ہونے لگی تھی۔ جسے محسوس کر کے دادی نے اسے بہانے سے وہاں سے اٹھا دیا تو وہ متشکر نظریں ان پر ڈال کر پہلی فرصت میں ڈرائنگ روم سے نکل کر اوپر دادی کے کمرے میں جا کر مقید ہو گئی۔ عکرمہ بھی چینج کرنے کے خیال سے معذرت کرتا اٹھ گیا تھا۔ اس کی شخصیت میں نہ جانے کیسا سحر اور اسرار محسوس ہوا کہ طاہرہ بانو اس کے بارے میں پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔

''یہ کون ہے اماں؟ اور اتنی افسردہ کیوں ہے۔ پتا نہیں مجھے ایسا کیوں لگا جیسے یہ اندر سے ٹوٹی ہوئی، بکھری ہوئی ہے بیچاری سب ٹھیک تو ہے ناں......؟''

طاہرہ بانو پچھلی دو دہائیوں سے ایک مایہ ناز سائیکالوجسٹ تھیں۔ ان کی کاؤنسلنگ سے کئی لوگ شفایاب ہوئے تھے۔ انہیں ایک ہی نظر میں دُرِ مکنون کی نفسیاتی الجھن دکھائی دے گئی تھی۔

دادی نے گہری سانس بھر کر کچھ سوچا تو ایسا لگا جیسے طاہرہ بانو ان کے لیے امید کی کرن بن کر آئی ہوں۔ دُرِ مکنون کے لیے وہ مسیحا کا کام دے سکتی تھیں۔ یہ خیال ان کے اندر توانائی سی بھر گیا۔

''بتا دوں گی۔ سب تفصیل سے بتا دوں گی۔ بس یوں سمجھ لو آگ کا دریا پار کر کے آئی ہے یہ بچی یہاں تک۔ مظفر کے دوست اور سائرہ کی بھانجی ہے دُرِ مکنون۔ خزاں نے اس کا باغ اجاڑ ڈالا تھا۔ سو آج تک بہار کا انتظار کر رہی ہے۔''

دادی بہت دل سوزی سے بولی تھیں۔ اور پھر مختصراً انہوں نے اس کے ساتھ ہونے والے سانحے کی روداد انہیں سنائی تو وہ اپنی جگہ ساکت سی رہ گئیں۔ اس قدر سنہرا وجود اور کیسا سیاہ نصیب تھا۔ طاہرہ بانو کو اس کی گھنی مڑی ہوئی پلکوں والی آنکھوں میں جسے دکھ کے بارے میں پتا چلا تو وہ تاسف میں گھر گئیں۔

''بس آج کل عکرمہ اسے پڑھا رہا ہے۔ کوشش کر رہا ہے کہ وہ کم از کم اپنی پڑھائی ہی مکمل کر لے۔ نارمل زندگی کی طرف لانے کی جدوجہد تو سبھی کر رہے ہیں۔ مگر دُرِ مکنون کا ردِ عمل بہت سلو (slow) ہے۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔

عکرمہ جب تک فریش ہو کر واپس آیا دادی طاہرہ بانو کو دُرِ مکنون سے متعلق سب کچھ بتا چکی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے براہ راست عکرمہ سے استفسار کیا تھا۔

''دُرِ مکنون کا ٹریٹمنٹ کون کر رہا ہے عکرمہ؟'' جواباً عکرمہ نے تفصیل بتا ڈالی۔

''ہوں۔'' طاہرہ بانو پرخیال انداز میں سر ہلا کر کچھ سوچنے لگی تھیں۔

☆......☆......☆

''یہ کیا فضول حرکت تھی تمہاری......؟'' گاڑی کے مین روڈ پر آتے ہی خولہ نے انتہائی ناراضی سے اسے دیکھا تھا۔

''کون سی فضول حرکت......؟'' ٹرننگ پر دھیان سے کار موڑتے ہوئے شہرین کی اس کی طرف بے دھیانی عروج پر تھی۔

خولہ نے خشمناک نظروں سے اسے گھورا۔

''یہی عکرمہ کو سب کچھ بتانے کی حرکت۔ تمہیں آخر کیا ضرورت تھی بکواس کرنے کی۔''

''ارے واہ! اس میں بکواس والی کیا بات ہے۔ میرے بھائی کی منگنی ہونے والی ہے .... میں کیا کسی کو بتاؤں بھی نہ۔'' اس نے منہ پھلایا۔

''ضرور بتاؤ۔ ریڈیو پر اعلان کر دو تم۔'' اسے ایک دم غصہ آ گیا تھا۔

''اعلان بھی ہو جائے گا ڈیئر تم فکر نہ کرو۔ آگے، آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔ میرے بھیا کی منگنی ہے۔ کوئی عام

موقع (occassion) نہیں۔'' شہرین کو اس کا غصہ مزہ دے گیا۔ جلانے والے لہجے میں بولی۔
''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہرایرے غیرے کو پکڑ پکڑ کر بتانا شروع کر دو گی تم۔'' خولہ جھنجلا کر بولی تھی۔
''خیر اب ایسا بھی نہیں۔ ہر کسی کو نہیں بتایا میں نے۔ اینڈ بائی داوے ایرے غیرے تم نے کس کو کہا......؟ اگر آغا جان بیچ میں ظالم سماج بن کر نہ آئے ہوتے تو ابھی یہ ''ایرے غیرے'' بڑے قریبی رشتے دار بننے والے ہوتے آپ کے۔''
اپنی صفائی دیتے دیتے وہ اسے چھیڑ گئی تھی۔ خولہ نے لمحے بھر کے لیے لبوں کو دانتوں تلے دبایا تھا۔ اپنا بھرم رکھنا ضروری تھا ورنہ آج شاید لبوں سے کچھ.. نکل جاتا۔
''قریبی رشتے دار بنتے تو میرے بنتے ناں۔ تمہارا کیا تعلق تھا جو تم اتنی بے تکلفی دکھا رہی تھیں۔'' خولہ کا پارہ نیچے ہی نہیں آ رہا تھا۔
جواباً شہرین نے سڑک سے ذرا کی ذرا نظر ہٹا کر اسے شوخی سے دیکھا تھا۔
''جیلس ہو رہی ہو......؟'' سوال تھا یا تیر۔ سیدھا دل میں پیوست ہوا تھا۔ خولہ نے جل بھن کر دھموکا جڑ دیا۔
''بکومت۔''
''کمال ہے، ہم کچھ کہیں تو بکواس اور آپ کہیں تو فرمان۔ یہ اچھا انصاف ہے۔'' شہرین اچھے موڈ میں تھی۔
خولہ شیشے کے پار دوڑتی بھاگتی ٹریفک کو خاموشی سے دیکھنے لگی تو ذرا تھوڑے وقفے بعد شہرین نے اسے پھر مخاطب کر لیا۔
''ویسے بندہ ہے بڑا زبردست۔ اگر تم جیلس ہو رہی ہو تو کچھ ایسا برا بھی نہیں۔'' وہی شوخ شریر انداز تھا۔
خولہ نے تیغ صفت نظریں اس پر جمائیں۔
''انسان بن جاؤ تم۔ ذرا شرم کرو تمہارے بھائی کی منگ ہوں میں اب۔ اور تم میرا نام کسی اور کے ساتھ لے رہی ہو''۔ اس کی ملامت پر شہرین ڈھٹائی سے ہنس پڑی تھی۔
''چلو تمہارے ساتھ نہ سہی مگر نام تو لیا جا سکتا ہے ناں عکرمہ شیرازی کا۔''
رازدارانہ انداز تھا۔ سگنل پر کار روکتے ہوئے وہ پُرسکون تھی۔
خولہ نے چونک کر بغور اسے دیکھا اور جو سمجھا اس پر متحیر سی رہ گئی۔
''کیا مطلب...... آر یو کریزی شیری......؟''
''تو اس میں کریزی ہونے والی کیا بات ہے۔ جب تک موصوف تمہارے ''ہو سکنے والے'' شریکِ حیات تھے۔ تب تک تو بندی نے دل کو سنبھالے رکھا تھا مگر اب......''
بات لمحے بھر کے لیے ادھوری چھوڑ کر اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر حیرانی سے دیکھتی خولہ کو نگاہوں کے فوکس میں لیا۔
''مگر اب موصوف ''ریزرو'' نہیں کسی کے نام پر تو...... تو......'' معنی خیزی سے جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔
''تو......؟'' خولہ نے بھرپور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔
''تو یہ مائی ڈیئر کہ دل تو بندی بھی رکھتی ہے سینے میں۔'' اس کا انداز ہنوز برقرار تھا۔
''آر یو سیریس شیری......؟'' خولہ نے عمیق نظروں سے پرکھا۔
جواباً مصنوعی گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے گویا کچھ سوچا تھا پھر مسکرا کر بولی۔
''فی الحال تو نہیں ہوں مگر ہو سکتا ہے سیریس ہو ہی جاؤں۔''
کچھ تھا اس کی آنکھوں میں جس کے باعث خولہ اس کی شرارت کو پا گئی تھی۔ جبھی سکون کی سانس بھرتے ہوئے

اسے ڈپٹا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے سیریس ہونے کی اور اگر ہونا ہی ہے تو زاویار کے لیے سنجیدہ ہو جاؤ۔ آغا جان کی مہم ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ تمہیں ٹھکانے لگا کر ہی جائیں گے وہ لاہور، یہ یاد رکھنا۔'' گویا اس نے متنبہ کیا۔

شہرین جل ہی گئی اس کی بات پر تلملا کر فوراً بولی۔

''بڑے افسوس کی بات ہے خولہ۔ ذرا پاس نہیں تمہیں ہماری دوستی کا۔ بجائے اس کے کہ میرا خیال کرو۔ تم بھی مجھے اس جنگلی بلے کے حوالے کرنا چاہتی ہو۔ جو مجھ سے جان چھڑانے کے سارے طریقے آزما رہا ہے۔''

''وہ تم سے نہیں۔ ان فیکٹ ذمے داری سے بھاگ رہا ہے۔ مگر تم فکر مت کرو ٹھیک ہو جائے گا وہ۔ اور جو نہیں ہوا تو آغا جان مار، مار کر سدھار ہی لیں گے اسے۔''

''ہوں، ایسا ہی تو چوزہ ہے ناں وہ۔'' وہ چڑ کر بولی تو خولہ مسکرا دی۔

☆......☆......☆

اسپتال کی سرخ عمارت کے عقب میں بنی مصنوعی جھیل اسے بہت متاثر کرتی تھی۔ پانی کے قریب آنے پر وہ اپنے اندر کے ڈپریشن کو کچھ دیر کے لیے سہی کم ہوتا محسوس کرتا تھا۔

آج اس کا یہاں آخری دن تھا۔

اندر ماما اس کا سامان سمیٹ رہی تھیں۔

مہران ڈاکٹرز سے آخری رپورٹ اور دواؤں کے علاوہ فزیوتھراپی کے بارے میں ہدایات لے رہا تھا۔ جبکہ مومنہ، ماما کی مدد کے لیے اندر ان کے پاس موجود تھی۔

وہ ان سب سے نظر بچا کر باہر نکل آیا تھا۔

گزرے کئی ہفتے اس نے یہاں بیٹھ کر گزری اور آنے والی زندگی کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا۔ وہ الگ بات کہ ابھی تک کسی نتیجے پر پہنچنا اس کے لیے ناممکن ہی رہا تاہم یہ ''گوشۂ عافیت'' اس کے ذہن و دل میں اپنا رنگ جما چکا تھا۔

گو کہ جو کچھ اس کے اور دُرِ مکنون کے درمیان گزر چکا تھا۔ اس کے نتیجے میں یقین تھا کہ وہ اس کی عیادت تو دور کی بات اب مرنے پر بھی نہیں آئے گی مگر ذہن و دل کی کسی گہرائی میں لاشعور کی کسی ان چھوئی تہ میں امید کا ہلکا سا شائبہ غالباً موجود تھا۔

وہ امید آج جبکہ وہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے والا تھا۔ آپ ہی آپ وجود کی گہرائیوں میں کہیں دفن ہوتے ہوئے اسے ایک بار پھر اندر تک زخمی کر گئی تھی۔

عینی کی آمد اور اس کے بارہا دُرِ مکنون کا تذکرہ کرنے کے باعث وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا منتظر رہا تھا اور آج جب اس انتظار نے دم توڑا تو وہ خود میں اترتے ہوئے تاسف کو محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔ اور اس احساس کو ذہن سے جھٹکنے کی سعی کرتے ہوئے کچھ اور سوچنے کی کوشش کرنے لگا تھا کہ کندھے پر نازک سے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے گردن گھما کر دیکھا۔

مومنہ کھڑی تھی۔

''بھائی آپ یہاں ہیں، میں آپ کو کہاں، کہاں نہیں ڈھونڈ آئی۔'' بینچ کے عقب سے نکل کر وہ سامنے چلی آئی تھی۔

''ہوں۔ بس ذرا فریش ہوا لے رہا تھا۔'' اس نے نظر چرا لی تھی۔

جواباً مومنہ گہری سوچ سمیت اسے خاموشی سے دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے زوی بھائی۔ آپ اداس ہیں کیا......؟'' وہ قریب آئی تھی۔
''نہیں، بالکل نہیں۔'' اس نے نرمی سے اس کا خیال رد کیا تو وہ مسکرا دی۔
''ہونا بھی نہیں چاہیے۔ اتنے دنوں بعد تو آپ گھر جا رہے ہیں۔ شکر ہے اللہ کا۔''
''ہوں۔ تم بتاؤ تم لوگوں نے سب سامان سمیٹ لیا......؟''
اس نے قصداً موضوع بدلا تھا۔
''جی۔ اور مہران نے آپ کی میڈیسن اور فزیوتھراپی کا سارا ٹائم ٹیبل سمجھ لیا ہے۔ لہٰذا اب چلیے یوں بھی آپ کے دادا اور عینی آپ سے ملنے آئے ہوئے ہیں۔''
اس نے اطلاع دی تو وہ سر ہلاتا اٹھ کھڑا ہوا۔
صبح ہی شہریار صاحب کا فون آیا تھا۔ میمونہ پھپو اور شہرین ابھی کچھ دیر پہلے ہی مل کر گئی تھیں کہ آغا جان اور عینی چلے آئے۔
''ان فیکٹ آپ کے دادا آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہے ہیں۔'' ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ دونوں اسپتال کی اندرونی عمارت کے اندر داخل ہوئے تو مومنہ نے دبے لہجے میں مطلع کیا۔
حسبِ توقع وہ بری طرح چڑا تھا۔
''کیا مطلب' کیوں چاہ رہے ہیں، کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔ میں کوئی اسکول گوئنگ بچہ کہ میری ذات کے متعلق فیصلے دوسرے کریں گے۔'' یک دم ہی بپھر اٹھا تھا وہ۔
مومنہ نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''ان فیکٹ آپ کی صحت کی خوشی میں گھر پر میمونہ آنٹی نے کوئی پارٹی رکھی ہے کل شام کو۔ ابھی وہ آئی تھیں تو ماما سے کہہ کر گئی بس مگر آپ کی ناراضی کے خیال سے ماما نے آپ سے ذکر نہیں کیا اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ عینی اور آپ کے دادا آپ کو لینے آئے ہیں۔'' اس کا یوں بیچ راہ میں رک کر سخت تیوروں کا اظہار کرنا مومنہ کو ساری بات بتانے پر مجبور کر گیا۔
جواباً وہ گہری سانس کھینچ کر بہ مشکل اپنے غیظ و غضب پر قابو پاتا کمرے کی طرف بڑھا تھا۔
''السلام علیکم بھائی کیسے ہیں آپ......؟'' عینی دروازے پر موجود تھی۔ خوشدلی سے کہتی اس کے شانے سے آ لگی۔
''وعلیکم السلام ٹھیک ہوں میں۔ تم سناؤ کیسی ہو۔''
مومنہ کو اندر جانے کا راستہ دیتے ہوئے وہ بھی اندر چلا آیا۔ اور اندر موجود آغا جان کو سلام کیا۔
''میں بہت خوش ہوں کیونکہ آج آپ گھر آ رہے ہیں۔''
عینی کی خوشی واقعی دیدنی تھی۔
''گھر نہیں آ رہا میں ''اپنے گھر'' جا رہا ہوں!'' جواباً اس نے پُرسکون مگر قطعی انداز میں ''اپنے گھر'' پر زور دے کر کہا تو کمرے میں موجود تمام نفوس یک دم خاموشی کے زیرِ اثر آ گئے۔
''لیکن زوی بیٹا میں......!''
''پلیز ماما......!'' عاصمہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ یک دم اس نے ہاتھ اونچا کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہہ کر انہیں خاموش کرا دیا۔ ''میں نے کہا ناں کہ فی الحال میں...... گھر جانا چاہتا ہوں وہ بھی ''اپنے''۔''
عاصمہ بیگم کا دل جہاں اس ''اپنائیت'' کے مظاہرے پر مسرت سے بھرا وہیں آغا جان کے سامنے شدید پشیمانی سے ان کا سر جھک گیا۔ وہ ان ہی کی طرف بڑی امید سے دیکھ رہے تھے مگر زاویار نے انہیں اس معاملے سے قطعاً بے دخل کر دیا تھا۔

لمحے بھر کے لیے انہوں نے خاموشی سے پوتے کے چہرے پر بیزاری کے تاثرات کو پڑھا اور پھر کچھ سمجھ کر بولے۔

''ٹھیک ہے، بیٹا آج تم گھر جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ مگر کل شام کو میمونہ بٹی نے تمہاری صحت کی خوشی میں جو پارٹی رکھی ہے اس میں ضرور آجانا۔ نہیں تو سارے مہمانوں کے سامنے شرمندگی ہوگی اسے۔''

مفاہمت آمیز لہجہ، سمجھوتا کرتا انداز اور جھکی ہوئی کمر......

''یہ آغا جان ہیں......؟'' زاویار کو خود سے سوال کرنا پڑا۔

کچھ تھا ان کے لہجے، انداز اور آنکھوں میں کہ زاویار انصاری نے اپنی اکڑ کا خول چٹختا ہوا محسوس کیا۔

دل تو چاہا پوچھے کہ ''انہوں نے مجھ سے پوچھ کر فنکشن رکھا تھا......؟''

مگر اس سے زیادہ بے مروتی کا اظہار مومنہ اور عینی کی موجودگی میں وہ کر نہیں سکا۔ ضمیر نے کچوکے لگائے تو اسے سر جھکانا ہی پڑا۔

''میری پوری کوشش ہوگی آنے کی۔'' انکار نہ کرتے ہوئے بھی وہ کہہ گیا تھا۔

عینی بے اختیار اس کے قریب چلی آئی۔ اس کی آنکھیں آغا جان اور اپنی اس تذلیل پر لبالب بھر گئی تھیں۔ عاصمہ اور مومنہ کے سامنے شدید اہانت کا احساس ہوا تھا اسے۔

''پلیز بھائی ایسا مت کریں۔ کیا ہماری آپ کی نظر میں ذرا سی بھی اہمیت نہیں رہی۔ آخر ایسا کیا گناہ کر دیا ہم نے کہ آپ نہ صرف یہ کہ ہمیں چھوڑ کر یہاں چلے آئے ہیں۔ بلکہ ہم سے کسی بھی طرح کا کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے آخر کیوں بھائی......؟''

کچھ تو وہ چھوٹی تھی اس پر بلا کی زود رنج بھی۔

زاویار اس کے آنسوؤں پر بے چینی محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔

بے اختیار کندھے سے لگی عینی کے سر پر اس کا ہاتھ آرکا تھا۔

مومنہ اور عاصمہ اس دوران چپ چاپ کمرے سے نکل گئیں۔

''تمہیں کیا پتا میری بہن کہ گناہ تم سے نہیں مجھ سے ہوا ہے ایسا گناہ کہ جیتے جی اس کی سزا سے مجھے مفر نہیں ہے۔ اور اس برزخ میں جو عذاب میں جھیل رہا ہوں اس کے لیے میں خود کو آغا جان اور پاپا کسی کو بھی معاف نہیں کر سکوں گا۔'' یہ بات وہ صرف سوچ سکا تھا۔

''عینی پلیز۔ آنسو بہانا بند کرو۔ تمہیں پتا ہے ناں کہ مجھے تمہارے رونے سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔'' اس نے گہری سانس بھر کر بے بسی سے کہا تھا۔

آغا جان اسے عمیق نظروں سے گویا پڑھ رہے تھے۔

''اور جو آپ کی بے مروتی اور غیریت سے ہمارا دل دکھتا ہے۔ اس کا کیا..؟ کیا آپ کو ذرا بھی پروا ہے ہماری۔''

''یہ بے مروتی اور غیریت میرے اندر اچانک کسی خود رو پودے کی طرح نہیں اگ آئی ہے عینی۔ کچھ وجوہات ہیں اس کے پیچھے۔'' بات وہ عینی سے کر رہا تھا مگر شاکی نظریں آغا جان کا حصار کر رہی تھی۔ جس پر انہوں نے بے اختیار نگاہوں کا زاویہ بدلا تھا۔

''تو کیا آپ ان ''وجوہات'' کی بنا پر مجھ کو بلکہ ہم سب کو ڈس اون کر دیں گے بھائی......؟ کیا یہ زیادتی نہیں ہے......؟''

عینی کا سوال کڑا تھا۔ وہ خود پر ضبط نہیں کر پا رہی تھی پھر سے رو پڑی تھی۔ زاویار نے بے اختیار اسے خود سے لگا لیا۔

''نہیں گڑیا یہ ''زیادتی'' نہیں ہے۔ زیادتی تو وہ ہے جو ''میں'' کسی کے ساتھ کر گزرا ہوں۔ کاش تمہیں بتا سکتا۔ کس برزخ میں جلتا ہے تمہارا بھائی اور اس گناہِ عظیم کی طرف مجھے دھکیلنے والے لوگوں کو کس طرح معاف

کردوں۔ کیسے بھلا دوں وہ سب.....؟" آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے ایک شدید اذیت کو اپنے اندر اترتا محسوس کیا تھا۔ ذہن و دل میں خیالات کے جھکڑ چل رہے تھے تاہم لب خاموش تھے۔

عینی نے بے اختیار سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کا لہجہ پُر امید تھا۔

"تو پھر آپ آئیں گے ناں بھائی۔ میں جانتی ہوں آپ کی ناراضی پاپا اور آغا جان سے ہے۔ اس سارے قصے میں ہم سب کا کیا قصور.....؟ میمونہ پھوپی کی بھلا کیا غلطی ہے.....؟"

وہ اسے گویا کٹہرے میں لے آئی تھی۔

زاویار نے لب بھینچ کر خود کو مزید تلخ جملے کہنے سے روکا اور عینی کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے خود سے الگ کیا۔

"پلیز منع مت کریں۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا عینی پیش بندی کے طور پر بول پڑی تھی۔ جواباً اسے راضی ہونا پڑا۔

"او کے، او کے۔ میں آجاؤں گا۔ مگر آج نہیں اور پلیز اب تم اس بات پر کوئی بحث نہیں کرو گی۔"

عینی نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر اس بار اسے ٹوک دیا تھا لہٰذا اسے خاموش ہونا پڑا تاہم وہ اسے کل کے لیے راضی کر چکی ہے۔ اس خیال سے ہی وہ بہت خوشی محسوس کر رہی تھی۔

آغا جان کو تفاخر سے دیکھتی۔ عینی کی ہنسی زاویار کو اپنی بے بسی کا عنوان لگ رہی تھی۔ جبکہ آغا جان ممنونیت سے اسے دیکھتے کمرے سے نکل گئے تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ اس وقت ان کی موجودگی اسے اندر سے سلگا رہی ہے۔

"تھینک یو بھائی یو آر گریٹ۔" عینی ایک بار پھر اس کے کندھے سے آلگی تھی۔

ذرا دیر پہلے جو خفت اور تذلیل اس نے محسوس کی تھی اس کا گویا کہ ازالہ ہو گیا تھا۔

زاویار جواباً شفقت سے مسکرا رہا تھا۔

"اٹس مائی پلیور۔" بے دلی سے سہی اس نے کہہ دیا تھا۔

"مجھے معلوم ہے آپ بہت نائس ہیں بھائی۔ میری خاطر آپ نے کڑوا گھونٹ پیا ہے۔ مگر یقین کریں آغا جان بھی بہت محبت کرتے ہیں آپ سے۔ گزرے سالوں میں کوئی دن ایسا نہیں ..کہ جب آغا جان نے آپ کے کمرے میں کچھ ٹائم نہ گزارہ ہو۔ آپ ان سے خفا ہیں بھائی مگر وہ آج بھی اتنی ہی محبت کرتے ہیں۔ بہت بدل گئے ہیں وہ پچھلے کچھ سالوں میں نہ پہلے جیسا غصہ رہا ہے نہ پہلے جیسا طنطنہ۔ پہلے تو وہ چھپ کر آپ کے کمرے میں جایا کرتے تھے۔ شاید ہم سب کے سامنے شرمندگی ہوتی تھی انہیں آپ کو یاد کرتے ہوئے مگر اب تو وہ ببانگِ دہل کہتے ہیں کہ آپ کے بغیر وہ خود کو ادھورا محسوس کرتے ہیں۔" عینی اسے ساتھ لیے بیڈ پر آبیٹھی تھی۔

پھر کتنی ہی دیر وہ اسے آغا جان اور پاپا کے بارے میں بتاتی رہی اور وہ چپ چاپ سنتا رہا بظاہر اس کی جانب متوجہ مگر دل ہی دل میں وہ سود و زیاں کے حساب میں الجھا ہوا تھا۔

"آپ کو پتا ہے طارق بھائی بھی آگئے ہیں کراچی۔ ابھی میں ان سے مل کر آرہی ہوں۔ میمونہ پھوپی نے خولہ آپی کی بات طے کر دی ہے ان سے۔ کل شاید سب کے سامنے اعلان بھی کر دیا جائے۔ سچ بڑا مزہ آئے گا۔"

وہ خوشی خوشی بتا رہی تھی۔

"بلکہ ہوسکتا ہے کہ ring exchange ceremony بھی ہوجائے۔"

"معلوم ہے مجھے۔ شہرین اور تمہیں تو بلاوجہ کا کریز ہے شادی اور منگنیوں کے فنکشنز اٹینڈ کرنے کا۔" وہ کسی خیال سے نکل کر ہلکے سے مسکرایا۔

"بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے۔ آج ہم زارا بھابی کی سسٹر کے نکاح پر

انوائٹڈ ہیں۔زبردست رہے گا۔وہاں دُرِمکنون بھی ملے گی۔سچ۔میرا تو دل گارڈن،گارڈن ہورہا ہے۔آج کا دن کتنا اچھا ہے۔'' عینی کا جوش اور خوشی دیکھنے لائق تھی۔

زاویار نے دُرِمکنون کے ذکر پر دل کی ایک بیٹ مس ہوتی محسوس کی۔سوچ کا دھارا عینی کی گفتگو کے نتیجے میں ایک بار پھر اسی جانب مڑ گیا۔جس سے بچنے کے لیے اس نے خود کو عینی کی طرف قصداً متوجہ کیا تھا۔

☆......☆......☆

مہمانوں کی آمد شروع ہوچکی تھی۔نہ نہ کرتے بھی سائرہ شیرازی نے اچھے خاصے مہمان مدعو کرلیے تھے۔لان اور نیچے کا لاؤنج اب بھرنے کو تھے۔

عینی نے آنے کا اسے فون پر ہی بتا دیا تھا لہٰذا وہ اس کی منتظر تھی۔البتہ وہ اتنی جلدی چلی آئے گی اندازہ نہیں تھا۔

گرے اور شاکنگ پنک کلر کے کنٹراسٹ کی کلیوں والے لمبی اے لائن شرٹ کے ساتھ ہم رنگ ٹراؤزر اور نازک سے کام والے دوپٹے میں ملبوس وہ اس وقت اپنے طور پر تیار ہوکر بچوں کو لیے ایک طرف بیٹھی تھی کہ عینی کی آمد اسے لاشعوری طور پر خوش کرگئی۔

زاویار کی بہن ہونے کے ساتھ،ساتھ وہ اس کی سب سے اچھی دوست بھی تھی اور بہ حقیقت وہ کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کرپارہی تھی۔

''ٹھیک ہی تو ہے۔آخر عینی کا اس میں کیا قصور۔تمہارا مجرم تو زاویار انصاری ہے۔عینی نہیں پھر اس سے.... بے رخی برتنے کا مطلب۔''شعور نے اسے ٹوکا تو وہ مزاحمت نہ کرسکی۔

یہی وجہ تھی کہ اس وقت جب عینی بالخصوص اس سے ملنے اس تقریب میں آئی،وہ اپنے اندر پھیلتی خوشی کو محسوس کرتے ہوئے خلوص سے مسکرادی۔

''اُف تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں دری۔نیچے سب مہمان آچکے ہیں۔''سلام دعا کے ساتھ ہی عینی نے انتہائی فکرمندی سے کہا تھا۔

''میں تیار ہوں عینی۔''

''کیا خاک تیار ہو۔صرف کپڑے چینج کیے ہیں۔بائی داوے تمہاری جیولری کہاں ہے......؟میک اپ کیوں نہیں کیا......؟کم آن دُری۔یہ تمہاری کزن کی شادی ہے۔ارے اللہ کی بندی ذرا تو جوش دکھاؤ۔کیوں زارا بھابی......؟میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں۔''اسے ٹھیک ٹھاک لتاڑتے ہوئے اس نے پاس سے گزرتی زارا بھابی کو مخاطب کرلیا تو دُرِمکنون جزبز ہوکر رہ گئی۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم عینی۔اپنی اس دوست کو کچھ تم ہی عقل سکھاؤ۔دیکھو ذرا کتنی سادی بیٹھی ہے یہ۔ہمارے ساتھ پارلر بھی نہیں گئی۔یہ کپڑے بھی اس نے بہ مشکل زوہا اور دادی کے کہنے پر چینج کیے ہیں۔''زارا نے لگے ہاتھوں عینی کے سامنے رونا رو دیا تو وہ عینی کی استعجابیہ نظروں پر شرمندگی سے نظر چرا گئی۔

''آصف کے گھر والے بس آتے ہی ہوں گے تم اسے ذرا ڈھنگ سے تیار کرو جب تک میں ایمن کو چینج کرواتی ہوں۔''زارا عینی کو اس کی ذمے داری سونپ گئی۔

پھر اس نے لاکھ سر پٹخا مگر عینی کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔جس نے زبردستی اسے کمرے میں لاکر نفاست سے اس کا لائٹ پنک میک اپ کیا۔دادی کی لائی ہوئی جیولری پہنادی۔

آخر میں چوڑیاں اس کی کلائیوں میں پہنانی چاہیں تو اس نے ہاتھ کھینچ کر انتہائی بے بسی سے دیکھا تھا۔

کچھ تھا اس کی آنکھوں میں۔عینی نے چونک کر اسے بغور دیکھا۔دُرِمکنون کا مضمحل انداز اسے حیران کرگیا تھا۔

''کیا بات ہے دُرّی، تمہیں تو کتنا شوق ہوا کرتا تھا جیولری کا۔ ڈھیر ساری کانچ کی چوڑیوں کا۔ نازک سی رنگز کے کتنے ہی باکسز ہوا کرتے تھے تمہارے پاس۔ سچ ہم تو رشک کرتے تھے تم پر۔ تم اکلوتی بیٹی ہو آنٹی کی اس لیے تمہاری ہر خواہش پوری ہوا کرتی ہے۔''

عینی سوال کرتے، کرتے بلا ارادہ اس کا ماضی چھیڑ گئی تھی۔

''پھر اب کیا ہو گیا تمہیں۔ اتنا بدل کیوں گئی ہو۔'' حقیقتاً عینی دُرِّ مکنون کی اس کایا پلٹ پر انگشت بدندان تھی۔

''سب شوق سارے ارمان سمجھو ماما اور بابا کے ساتھ ہی دفنا دیے ہیں میں نے۔ اور اب میرا کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہتا عینی۔ کچھ بھی......'' نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو اس کی نوکِ مژگان سے لڑتے جھگڑتے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔ وہ بات جو وہ کسی اور سے کہتی نہیں تھی عینی کے سامنے لبوں سے نکل گئی تھی۔ عینی لمحے بھر کے لیے چپ سی ہو گئی پھر گہری سانس بھر کر اس کا شانہ تھپکا۔

''میں سمجھ سکتی ہوں دُرّی۔۔۔! تم پر کیا قیامت بیتی ہے مگر یہ بھی تو دیکھو تمہارے اس طرح سوگوار رہنے سے زارا بھابی اور پوری فیملی کتنی فکرمند ہے۔ سب پروا کرتے ہیں تمہاری۔ انکل آنٹی کے بعد اللہ نے تمہیں جن لوگوں سے ملایا ہے تمہیں ان کا بھی تو خیال کرنا ہوگا ناں۔'' عینی اس وقت اسے کسی بڑے کی طرح سمجھا رہی تھی۔

''چلو ناں پلیز۔ اب یہ چوڑیاں پہن لو۔ دیکھو ذرا تم سے زیادہ تو میں تیار ہوں۔ لہٰذا کچھ تو بیلنس کرو یار۔ لوگ کیا سوچیں گے کہ دلہن تمہاری کزن ہے یا میری۔'' عینی کے پاس اسے راضی کرنے کے پرانے مجرب نسخے موجود تھے۔ چنانچہ بادلِ ناخواستہ دُرِّ مکنون کو اس کے کہنے پر عمل کرنا ہی پڑا۔

اور اس سے پہلے کہ عینی مزید کچھ منواتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ لہٰذا عینی کو اس کے ساتھ آنا ہی پڑا۔

''ماشاء اللہ چشم بددور۔''

باہر آتے ہی اس کا سامنا اظہار صاحب سے ہوا۔ جن کا تبصرہ بے ساختہ تھا۔ اس نے اپنے اندر سر اٹھاتے تنفر کو شدت سے محسوس کیا تھا۔ شدید غیظ وغضب سے بھری نگاہ اٹھی تھی ان کی طرف۔

''بھئی عینی تم نے تو آج کمال کر دیا۔'' جواباً وہ کھسیا کر بظاہر تو عینی سے مخاطب تھے مگر خباثت بھری نظریں بار، بار دُرِّ مکنون کا چہرہ چھونے کی جسارت کر رہی تھیں۔ اور وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی ان کے لفظوں میں چھپے مطلب۔

''سچ اجی بھائی۔ کیا بہت خوب صورت لگ رہی ہوں میں۔'' عینی کی سادہ طبیعت یک دم خوش ہو گئی تھی۔ وہ شاید نظروں اور لہجے کی گہرائی ماپنے کی صلاحیت رکھتی نہیں تھی مگر دُرِّ مکنون کا روم، روم اس بیہودگی پر غصے سے جھلس رہا تھا۔

''لگ کیا رہی ہو تم تو ہو ہی اچھی۔'' عینی کے سوال پر ایک بار پھر انہوں نے...... بھرپور نظروں سے دُرِّ مکنون کو دیکھا تھا اور پھر عینی کو جواب دے کر مسکرا دیے تھے۔

''تھینک یو۔ اجی بھائی۔'' عینی نے خوشی سے کہا پھر یک دم دُرِّ مکنون کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ ''اسے بھی تو دیکھیں اجی بھائی۔ اسے بھی میں نے ہی تیار کیا ہے۔ اچھی لگ رہی ہے ناں اپنی دُرّی......؟''

اس کا سوال اتنا غیر متوقع اور اچانک تھا کہ دُرِّ مکنون کوئی سدِباب نہ کر سکی۔ اور اظہار صاحب نے اسے اپنی فاتحانہ نظروں کی گرفت میں لے لیا۔

اس لمحے دُرِّ مکنون کو اپنا چہرہ جیسے شعلوں کی تپش سے جلتا محسوس ہوا۔

''یہ تو ہیں ہی خوب صورت۔ تم نے تو حسن کو دو آتشہ کر دیا ہے۔''

عجیب سا لہجہ تھا۔ اس سے بھی زیادہ کراہت آمیز نظریں۔

دُرِّ مکنون بے اختیار عینی سے ہاتھ چھڑاتی نیچے جاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھی تو عینی بے پروائی سے ان کا شکریہ ادا

کرتے اس کے پیچھے چلی آئی۔

"سچ کتنی پاگل ہو تم دُرّی۔ ابھی بھائی تمہاری تعریف کر رہے تھے اور تم بھاگ آئیں۔"

"مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں عینی، پلیز۔" باوجود کوشش کے اس کا انداز تلخ ہو گیا تھا۔

"کیا مطلب اچھی نہیں لگتیں۔ ارے ساری لڑکیاں تعریفی نظریں اور ایسے کمپلیمنٹ سننے کے لیے مرتی ہیں اور تم کہتی ہو تمہیں اپنی تعریف سننا اچھا نہیں لگتا۔ صحیح بات ہے بھئی بھلا تمہیں کیا پتا تعریف کی اہمیت کا۔ تمہیں ہمیشہ سے جو یہ سب کچھ بن مانگے ملتا رہا ہے ناں۔ اس لیے قدر نہیں ہے تمہیں۔" عینی کا تبصرہ بے لاگ تھا۔ وہ محض ہونٹ کاٹ کر سیڑھیوں پر دھیرے، دھیرے قدم رکھنے لگی تو وہ اس کے کان کے قریب سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔

"ویسے آپس کی بات ہے، میں نے آتے ہوئے نیچے دیکھا تھا تمہاری آنٹی کے ریلٹیوز میں خاصے چارمنگ لڑکے ہیں۔ ٹھیک ٹھاک چانسز ہیں یہاں۔ مجھے امید ہے کہ خاصا مزہ رہے گا آج۔" عجیب لاابالی پن تھا اس کے لہجے میں۔ دُرِمکنون کے لبوں پر بھولی بھٹکی مسکراہٹ آرکی۔ کتنے عرصے بعد کسی نے اس سے ایسی خالص لڑکیوں والی بات کہی تھی۔ یہ بے فکری اور شوخی اسے بے اختیار مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

"ویسے یہ زارا بھابی کا بھائی سیف چھوٹا ہوگا ہم سے یا بڑا۔" اس کی مسکراہٹ عینی کی حوصلہ افزائی کا سبب بنی تھی۔ اب اس نے باقاعدہ سوال کرنے شروع کر دیے تھے۔

"چھوٹا ہے وہ۔ ابھی انٹر کر رہا ہے۔"

"اوہ۔" اسے افسوس سا ہوا۔

"ویسے ہائیٹ اچھی ہے اس کی۔" ساتھ، ساتھ تبصرہ بھی حاضر تھا۔

"اور یہ اپنے مسٹر عکرمہ۔ خاصے اسمارٹ ہیں۔ خولہ آپی کے ساتھ اچھی جوڑی بنتی ان کی ہے ناں......؟"

"ہوں"......اس نے گہری سانس بھری تھی۔

"مگر آغا جان کا تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ بالکل اچانک حکم صادر کر دیا انہوں نے اور آج طارق بھائی کراچی بلوائے گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کل کی پارٹی میں ان دونوں کی منگنی کر دی جائے۔" عینی کی فراٹے بھرتی زبان اس کی معلومات میں اضافہ کیے دے رہی تھی۔

"کل کی پارٹی......؟ کیا مطلب......؟" اس نے بے اختیار استفسار کیا تھا۔

"ان فیکٹ زوی بھائی صحت یاب ہو کر آج اسپتال سے ڈسچارج ہو گئے ہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" عینی نے اسے بتایا تو بے ساختہ اس کے لب ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔

"بس اسی خوشی میں میمونہ پھپو نے گھر میں فنکشن رکھا ہے اور گمان غالب ہے کہ کل اس فنکشن میں طارق بھائی اور خولہ آپی کی منگنی کی رسم بھی ادا کر دی جائے گی۔"

"اچھا۔" عینی کی مسرت پر وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔

"صرف اچھا نہیں بلکہ بہت اچھا۔ یہ سینئر کزنز کی شادیاں ہوں تو ہماری باری بھی آئے ناں۔ خواہ مخواہ اب تک ہمیں بچی، بچی کہہ کر نظر انداز کر رکھا ہے بزرگوں نے۔" عینی نے خاصی بیزاری سے دکھڑا رو دیا تھا۔

مگر کچھ تھا اس کے انداز میں دُرِمکنون کو کئی سال بعد اچانک اور بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔ نقرئی گھنٹیوں کی آواز سے مشابہ ہنسی تھی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر کھڑے عکرمہ اور ولی نے بے اختیار گردن گھما کر آواز کی سمت نظر اٹھائی تھی۔ ہنستی ہوئی دُرِمکنون کا حسن اور ہنسی دونوں کو حیران کر گئی۔ درحقیقت وہ اس وقت مبہوت کیے دے رہی تھی۔

جامہ زیبی گویا ختم تھی اس پر۔ اس پر مستزاد حسن کو دو آتشہ کرتا سنگھار، جیولری اور سب سے بڑھ کر اس کے احمریں

لبوں پر بکھری مسکراہٹ۔ گزرے دنوں کی سادگی کے برعکس دُرِ مکنون اس وقت نگاہوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ عکرمہ لمحے بھر کے لیے نظر نہیں ہٹا سکا۔ حتیٰ کہ ولی نے کھنکھار کر متوجہ کیا تو جیسے خود میں لوٹا۔

''کہتے ہیں تجھ کو لوگ مسیحا مگر یہاں
اک شخص مر گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد''

ولی کے شرارت اور شوخی سے پڑھے گئے اس شعر نے اسے خفت سے دوچار کیا تھا۔

''دس بار کہا ہے کہ بے تکا مت ہانکا کرو۔''

اس کے کندھے پر دھپ جماتے ہوئے اس نے قصداً توجہ ہاتھ میں پکڑے سیل کی طرف مبذول کر لی۔

''کہہ لو، کہہ لو...... مگر یاد رکھنا دوست۔ یہ ولید حسن کی آنکھیں ہیں۔ کبھی دھوکا نہیں کھا سکتیں۔''

''بلاشبہ آپ تو گویا اتھارٹی ہیں اس ''سبجیکٹ'' پر۔'' وہ مسکراہٹ دبا کر سر ہلاتے ہوئے بولا تو ولی نے اسے بغور دیکھا۔

''میری بات مان یار۔ تو ذرا ایک بار پھر اپنی آئی سائیٹ چیک کرا لے۔ مجھے یقین ہے دور بین کے گلاسز ہی سوٹ کریں گے تجھے۔'' اچھا خاصا جلا بھنا لہجہ تھا اس کا۔

عکرمہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

''کم آن یار۔ اب تم دادی کی طرح ہر لڑکی کو اس نظر سے دیکھنا بند کرو۔''

''ہاں۔ مگر کم از کم تم تو اس نظر سے لڑکیوں کو دیکھنا شروع کرو۔ تم نے کیا آبِ حیات پی رکھی ہے یا اگلی دس بارہ صدیوں تک جینے کی گارنٹی حاصل ہے تم کو جو اس قدر سکون سے بیٹھے ہوئے ہو۔'' ولی نے فوراً لتاڑا تھا اسے۔

جواباً وہ خاموشی سے مسکرا دیا تھا۔

''ایمان سے بڑے گھامڑ ہو تم۔'' ولی نے بڑے تاسف سے سر جھٹکا تھا۔

پھر بقیہ وقت وہ اس کا سر کھاتا رہا۔ ہر دوسری لڑکی پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے عکرمہ کو اپنے طور پر راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جس سے عکرمہ کو یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ دادی اور زوہا کے مشورے کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ولی اس کے سر پر سوار تھا۔

ردا پر پل شرارہ سوٹ میں بہت جچ رہی تھی۔ آصف کے گھر والے آئے تو یک دم ہلچل سی مچ گئی تھی۔

شہرین اور خولہ باہر لان میں تھیں۔ وہ دونوں بھی ان کے پاس آ بیٹھیں۔ عکرمہ ولی کی معیت میں وہاں آیا تو بلا ارادہ دُرِ مکنون کا شہرا وجود اس کی نگاہ کا مرکز بنا۔ آج وہ نہ صرف پوری محفل میں سب سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ بلکہ اس کے ساتھ عینی اور شہرین کے شوخی بھرے فقرے اسے مسکرانے اور کبھی کبھار ہنسنے پر مجبور کر رہے تھے۔

مظفر شیرازی کی نگاہ اس کی تلاش میں بھٹکی تو وہ اسے عینی کے پاس مسکراتا بیٹھا دیکھ کر دل میں اترتی مسرت کو نظر انداز نہ کر سکے۔

''یہ کون ہے ماں؟'' انہوں نے اپنے ساتھ کھڑی اماں کو مخاطب کر کے عینی کی طرف سوالیہ اشارہ کیا تو دادی نے مختصراً اس کا تعارف کرا دیا۔

''بڑی پیاری بچی ہے۔ اس کی آمد سے دُرِ مکنون کو میں نے پہلی بار مسکراتے ہوئے دیکھا ہے۔'' وہ حقیقی خوشی سے لبریز لہجے میں بولے تو دادی نے متبسم انداز میں سر ہلا دیا۔

نکاح کے بعد سائرہ بیگم نے اسے لے جا کر کچھ لوگوں سے بطورِ خاص ملوایا۔ وہ خالی الذہن سی لوگوں کو نپے تلے جواب دیتی رہی۔ جو اسے پچھلی کئی دنوں میں سائرہ شیرازی نے ازبر کرا دیے تھے۔ ان کی بات ماننا اس کی

مجبوری تھی۔ اور شاید یہ سلسلہ یوں ہی طول پکڑتا چلا جاتا اگر مظفر صاحب کی نظر گھبرائی، گھبرائی سی دُرِ مکنون پر نہ پڑ جاتی۔ جو سائرہ کی معیت میں کھڑی کافی سراسیمہ دکھائی دے رہی تھی۔

''عکرمہ ذرا دُرِ مکنون کو میرے پاس بھیجنا۔'' انہوں نے قریب سے گزرتے عکرمہ سے کہا تو اس نے مظفر صاحب کی نظروں کے تعاقب میں نگاہ دوڑائی اور اسے ذرا فاصلے پر کچھ لوگوں میں گھرا پایا۔

''دُرِ مکنون آپ کو چچا جان بلا رہے ہیں۔'' نپے تلے قدم اٹھاتا وہ قریب پہنچا تو سب سے سلام دعا کے بعد اسے پیغام پہنچایا۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ وہ فوراً ساتھ چل پڑی۔

سائرہ بیگم نے محسوس تو کیا مگر نظر انداز کر گئیں یوں بھی ان کا مقصد تو پورا ہو ہی گیا تھا۔

مظفر شیرازی نے ان دونوں کو سامنے سے ساتھ آتے ہوئے دیکھا تو دل میں ایک خیال کسی کوندے کے مانند لپکا۔ دونوں پہلو بہ پہلو چلتے انہیں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ سر جھٹک گئے۔

جو انہیں نظر آرہا تھا وہ اماں اور عکرمہ کو بھی تو دکھائی دے رہا تھا۔ گویا جب ان کی جانب سے کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ دونوں ایسا نہیں چاہتے۔ اور جب اماں اور عکرمہ ایسا نہیں چاہ رہے تو انہیں بھی دل پر جبر کرنا تھا۔ کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

اِدھر خولہ کی نظروں نے ان دونوں کا پیچھا کیا۔

اور نہ جانے کیوں آج اسے دُرِ مکنون سے عجب طرح کا حسد محسوس ہوا تھا۔ عکرمہ شیرازی کی توجہ کا ارتکاز اس نے کئی بار دُرِ مکنون کی جانب محسوس کیا تھا اور یہ بات اتنی آسانی سے فراموش کیے جانے لائق نہیں تھی۔

منفی اور شک کے ملے جلے احساسات نے اسے جھلسایا تو وہ یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے تم کہاں چلیں۔'' شہرین لامحالہ متوجہ ہوئی تھی۔

''بس اندر جا رہی ہوں میرا دل نہیں لگ رہا۔''

''لگے گا بھی کیسے...... طاری بھائی جو یہاں نہیں۔'' شہرین اٹھ کر اس کے ساتھ ہی اندر کی طرف بڑھ گئی تو عینی سامنے سے آتی ہوئی دُرِ مکنون کو دیکھنے لگی۔

''چیک کر لیں۔ نبض چل رہی ہے آپ کی۔ سانس آ رہی ہے اب۔'' ساتھ چلتے ہوئے عکرمہ نے جب اس کے چہرے کی اڑتی ہوئی ہوائیاں دیکھیں تو کہے بنا نہ رہ سکا۔

دُرِ مکنون پہلے حیرت اور پھر شرمندگی سے اسے دیکھنے لگی۔

''کم آن ٹیک اٹ ایزی۔ سادہ سے لوگ ہی تو تھے وہ، کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا آپ کو۔ بہر حال جائیں چچا جان نے بلایا ہے آپ کو۔'' نرمی سے کہتے ہوئے اس نے گویا اسے سائرہ بیگم کے پاس سے بلا کر لانے کی وجہ سمجھائی۔ تو دُرِ مکنون نے غیر اختیاری طور پر اپنے چہرے پر مخروطی انگلیاں پھیر کر گویا چہرے پر اتر آنے والے تاثر کو زائل کرنے کی لاشعوری سعی کی۔ ہاتھ اونچا کرنے کی وجہ سے اس کی کلائیوں میں پڑی چوڑیاں کھنک اٹھی تھیں۔ پرفیوم کی خوشبو اس کے گرد گھیرا بنائے ہوئے تھی۔ عکرمہ نے سر جھٹک کر خود کو دوسری طرف متوجہ کیا اور لمبے، لمبے ڈگ بھرتا ذرا فاصلے پر کھڑے ولی کی طرف چلا آیا جو بظاہر سعد سے محوِ گفتگو ہوتے ہوئے بھی درحقیقت اس کی جانب ہی متوجہ تھا۔ اس کے نزدیک آنے پر ولی کی شوخ نظروں نے اس کا گھیراؤ کیا تھا۔ جس کو مکمل طور پر نظر انداز کرتا وہ سعد سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گیا۔

دُرِ مکنون، شیرازی صاحب کے پاس آئی تو انہوں نے اسے یونہی باتوں میں لگا لیا ذرا دیر بعد عینی بھی اس کے

پاس چلی آئی تھی۔

''خیریت، کیا باتیں ہورہی تھیں موصوف سے۔'' مظفر صاحب کے دوسری طرف جاتے ہی وہ تقریباً اس کے کان میں گھس کر بولی تھی۔ دُرِ مکنون کی خفگی نے اسے دیکھا۔

''عینی پلیز مجھ سے ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے وحشت ہوتی ہے۔''

''دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا۔ تعریفیں تمہیں اچھی نہیں لگتیں۔ چھیڑ چھاڑ سے تمہیں وحشت ہورہی ہے۔ تم کسی اچھے سے سائیکاٹرسٹ سے کیوں نہیں کنسلٹ کرتیں۔''

عینی نے آنکھیں دکھائیں تو وہ سائیکاٹرسٹ کے ذکر پر نظر چرا گئی۔

تمہیں کیا پتا اے دوست۔ مجھے تو سالوں ہوگئے ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے ماہرِ نفسیات سے علاج کراتے۔'' وہ خود میں گم پھر سے ہونٹ کچلنے لگی تھی کہ کندھے پر نرم دباؤ محسوس کر کے پلٹی۔

طاہرہ بانو سامنے ہی کھڑی تھیں۔

دوپہر میں ان سے ہونے والی ملاقات نے اس پر نسبتاً بہتر تاثر چھوڑا تھا۔ کچھ ساتھ کھڑی عینی کے سامنے بھی اسے مروت نبھانا تھی۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام جیتی رہو۔'' انہوں نے اس بار تفصیلی جائزہ لیا اس کا اور پھر ایک دو رسمی باتوں کے بعد وہ سائرہ بیگم کی طرف بڑھ گئیں۔

''یہ کون تھیں؟'' عینی نے آنکھیں گھمائیں۔ تو اس نے مختصر تعارف کرایا۔

''یہ نیبر (پڑوسی) ہیں بیک اسٹریٹ پر گھر ہے ان کا۔''

''کوئی بیٹا ہے ان کا......؟'' عینی کا اگلا سوال خاصا غیر متوقع تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ہنسی آگئی۔

جسے کلک کی آواز کے ساتھ ولی نے کیمرے میں محفوظ کرلیا تھا۔

جو ابھی، ابھی زوہا اسے پکڑا کر گئی تھی۔

☆......☆......☆

کوشش کے باوجود بھی تو بھولتا نہیں
تیرے بغیر کیا کروں کچھ سوجھتا نہیں
ہوتی ہے صبح و شام مگر اس کے باوجود
ہے چاند تیری یاد کا جو ڈوبتا نہیں

اسپتال سے گھر آنے کے بعد وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا تھا۔ ماما سے کہہ دیا تھا اس نے کہ کچھ دیر وہ آرام کرے گا۔ یوں بھی لنچ میں ابھی وقت تھا۔ نازیہ اور مومنہ اس کے ساتھ گھر چلی آئی تھیں۔ اس نے محسوس کیا کہ گھر میں سب خوش تھے مگر اس کے اندر جیسے سناٹے اترے ہوئے ہوں۔

راکنگ چیئر کو گردش دیتے ہوئے اس کا ذہن تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا کہ موبائل کی رنگ ٹون نے اسے متوجہ کرلیا۔

ڈسپلے پر مولابخش کا نام جگمگا رہا تھا۔

اس نے گہری سانس کھینچ کر موبائل کان سے لگالیا۔ اس کی خیریت پوچھنے کے بعد مولابخش بے تابی سے کچھ بتا رہا تھا۔

''آر یو شیور مولا۔ کہیں سنی سنائی تو نہیں....'' کرسی کی گردش رک گئی۔
''نہیں صاحب، میں نے پورا پتا کرایا ہے۔''
''خبر کس نے لیک (leak) کی ہے۔'' اس کی آنکھیں شدتِ غضب سے سرخ ہونے لگیں۔
''وہاں کا منشی ہے۔''
''تم اسے جانتے ہو۔''
''جی، اعتبار کا بندہ ہے۔''
''سرفراز کو فون کیا تم نے؟'' وہ اب اٹھ کھڑا ہو گیا تھا۔
''جی وہ نکل رہے ہیں۔''
''تم کہاں ہو......؟''
''میں بس وہیں ہوں۔ آپ جلدی آجائیں......''
''فکر مت کرو، میں پہنچ رہا ہوں تم ایڈریس لکھواؤ۔''
اس نے سر جھٹک کر کہا تھا پھر رائٹنگ ٹیبل تک آیا۔ اضطراری کیفیت میں اس نے ایڈریس لکھا تھا۔ ایڈریس کراچی سے کافی دور کا تھا۔ زاویار کی آنکھیں جیسے جلنے لگی تھیں۔
''تم ذرا خیال رکھنا۔ مجھے اتنی دور آنے میں وقت لگ جائے گا۔ سرفراز کو کہنا میرے آنے تک وہیں رکے۔''
''جیسا حکم صاحب۔'' مولا بخش مؤدب تھا۔
''ویسے کب سے ہے وہ وہاں؟'' اس نے لب بھینچ کر پوچھا تھا۔
''سنا ہے کل رات سے۔''
''اُف کل رات ...... گویا کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔'' اس خیال کے ساتھ ہی اس کے اندر جیسے پھرتی سی بھر گئی۔ بعجلت موبائل آف کر کے اس نے اپنی کار کی چابی تلاش کی۔ جو حسبِ معمول سائڈ ٹیبل کی دراز میں دھری تھی۔ اس نے ضرورت کی چند اشیا ساتھ لیں۔ کپڑے بدلنے کا وقت تھا نہ ضرورت۔ وہ کسی سیلابی ریلے کے مانند باہر کی طرف بڑھا تھا۔
کچن سے آتی کھانے کی خوشبوؤں اور مہران سمیت بقیہ تینوں خواتین کی خوش گپیوں کی آوازوں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔
اسے معلوم تھا اگر انہیں ذرا بھی بھنک پڑ جاتی ...... کہ وہ گھر سے نکل رہا ہے تو ہرگز نہ جانے دیتے۔ اور رکنے کا یہ موقع نہیں تھا۔
کار انتہائی تیزی سے ریورس کرتے ہوئے اس کا ذہن مولا بخش کی دی ہوئی اطلاع میں اٹکا ہوا تھا۔
''ارے یہ کار کس نے نکالی ہے؟'' کچن میں موجود عاصمہ بیگم کار اسٹارٹ ہونے کی آواز پر حیران پریشان سی باہر نکلی تھیں۔ باقی سب بھی چلے آئے۔ مگر جب تک وہ سب پورٹیکو تک پہنچے۔ زاویار زن سے کار اڑا لے جا چکا تھا۔
''زوی...... زوی رکو۔ کہاں جا رہے ہو......؟''
پیچھے سے سب نے پکارا تھا مگر بے سود تھا۔ کار اپنے پیچھے دھواں اڑاتی تیزی کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔
''یا اللہ خیر کرنا......''

(جاری ہے)



کچرا

جبینا

"تمکین، معاذ، مراد...... اِدھر آؤ تینوں......"
صدف کی دہاڑ نما آواز اُن تک پہنچی تو تینوں اپنے، اپنے ویڈیو گیمز کمرے میں رکھ کر ماں کے پاس چلے آئے۔

"جی ماما......!"

"یہ کیا ہے......؟" صدف نے ہاتھ آگے کر کے انہیں دکھایا جس میں کچھ دبا ہوا تھا۔

"جوس کے ڈبے ماما......" سب سے پہلے مراد نے زبان کھولی۔

"صرف جوس کے ڈبے نہیں بلکہ خالی ڈبے......
کچرا جو آپ لوگوں نے اوپر سے پھینکا اور وہ ہمیشہ کی طرح میرے دروازے کے عین سامنے آ کر گرا۔" اس سے پہلے کہ صدف کچھ اور پوچھتی...... پاس ہی کھڑے تیمور صاحب انہیں کڑے تیوروں سے گھور رہے تھے۔
"چلیں...... سوری کریں انکل سے اور پرامس بھی کہ آئندہ آپ لوگ ایسا نہیں کریں گے۔" صدف نے بچوں کو مخاطب کیا۔
"سوری انکل...... سوری ماما......" تینوں نے یک زبان ہو کر اپنی، اپنی زبان کھولی ساتھ ہی معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر معصوم ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ نمایاں ہو گئی۔
"ٹھیک ہے...... آج تو تم لوگوں کو چھوڑ دیتا ہوں۔ اگلی شکایت تم لوگوں کے پاپا سے لگاؤں گا سمجھے......!" تیمور صاحب جاتے، جاتے مڑے......
"اور ہاں مسز عامر اپنے بچوں کو اچھے سے سمجھا دیجیے گا ورنہ بغیر نوٹس بھجوائے آپ لوگوں کو مکان خالی کرنا پڑے گا۔" انہوں نے کئی بار دی گئی دھمکی کو دُہرانا ضروری سمجھا۔ "مجھے گندگی، بدنظمی اور شور بالکل پسند نہیں اور یہ بات میں نے آپ لوگوں کو مکان دیتے وقت ہی واضح کر دی تھی۔"
"او کے تیمور صاحب، آئندہ آپ کو ان شاء اللہ کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" تیمور صاحب باہر کی طرف جا چکے تھے صدف بھی دروازہ بند کرنے آئی۔ ہاتھ میں پکڑے جوس کے خالی ڈبے ڈسٹ بن میں ڈالے اور کچن میں چلی آئی۔
بچے دوبارہ اپنے کھیل میں مگن ہو چکے تھے اس نے دوبارہ انہیں ڈانٹنا مناسب نہ سمجھا۔ دوپہر کے کھانے میں ابھی کچھ وقت تھا لہٰذا اس نے یہ "سیگمنٹ" کھانے کے بعد کا رکھا آج بچوں کا آف تھا اور وہ ان کی چھٹی خراب کرنا نہیں چاہتی تھی مگر ایک ماں ہونے کے ناتے انہیں سمجھانا بھی ضروری تھا۔
"ابھی اٹھنا نہیں تم لوگ۔" کھانے کے برتن اٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔ "میں برتن کچن میں رکھ کر آ رہی ہوں۔
"جی ماما......" سب سے بڑے بیٹے مراد نے سعادت مندی کا ثبوت دیا اور ماں کے کچن سے واپس آنے تک تینوں اپنے طور پر جواب کے لیے تیار ہو چکے تھے...... انہیں معلوم تھا ماں نے کیوں روکا ہے۔
"ہاں...... اب بتاؤ یہ کیا حرکت کی آج تم لوگوں نے......" وہ سہولت سے ان کے پاس بیٹھ گئی اور بچوں سے دوستانہ انداز میں پوچھنے لگی۔
"چلو تمکین تم بتاؤ۔" وہ بیٹی سے مخاطب ہوئی دونوں لڑکے کبھی کبھار ایک دوسرے کا راز رکھ لیتے تھے مگر تمکین من و عن سچ بولتی اسی لیے صدف نے براہِ راست بیٹی سے پوچھا۔
"وہ ماما......" وہ ذرا جھجکی۔ "وہ بھیا نے کہا تھا۔ تینوں ایک ساتھ جوس کے خالی ڈبے نیچے پھینکتے ہیں پھر دیکھیں گے سب سے پہلے زمین پر کس کا ڈبا گرا......"
"اصل میں ماما...... ہم لوگ تو میتھ کا وہ اصول چیک کر رہے تھے کہ جو چیز جتنا وزن اور حجم رکھتی ہے اس کے حساب سے جگہ گھیرتی ہے۔" معاذ نے اپنے حساب سے عقلمندی کی بات کی۔
"مگر یہ اصول تو بحری جہازوں، کشتیوں اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کے لیے پانی کی جگہوں پر استعمال ہوتا ہے۔" صدف نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ "اچھا چلو...... پھر کیا نتیجہ نکالا تم لوگوں نے......؟"
"ہم تو یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ کس کا ڈبا پہلے زمین کو چھوتا ہے۔ اور بس ماما تینوں ڈبے ایک ساتھ زمین پر گرے اور کچھ دیر بعد مکان مالک آ گئے شکایت لے کر۔" آخری جملے پر تینوں بچے کھی، کھی کر کے ہنسنے لگے وہ بھی مسکرا دی۔
"دیکھو بچوں تجربہ تو ٹھیک ہے مگر تمہارا طریقہ غلط تھا، آئندہ خیال رکھنا۔ تم لوگوں کو پتا ہے ناں دوسروں کے دروازے کے آگے کچرا پھینکنا کتنی بری بات ہے...... اور تیمور انکل تو صرف ہمارے مکان مالک ہی نہیں پڑوسی میں شمار ہوتے ہیں اور پڑوسیوں

کے بہت حقوق ہوتے ہیں انہیں تنگ کرنا گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔آپ لوگوں کوتو یہ بات معلوم ہے ناں......" وہ بہت رسانیت سے انہیں سمجھارہی تھی۔

"سوری ماما...... آئندہ ہم ایسا نہیں کریں گے۔"

"شاباش...... چلو اب تم لوگ اپنا، اپنا ہوم ورک مکمل کرلو......" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کہیں کوئی پرابلم لگے تو میں یہاں فریج صاف کررہی ہوں، یہیں آجانا۔"

شام کو باپ نے بھی بہت سہولت سے انہیں سمجھادیا تھا۔ان کے بچے ویسے شریر نہیں تھے مگر اس روز نہ جانے کیا سوجھا جو یہ کر بیٹھے تھے۔دوسرے دن بچوں کواسکول بھیج کر وہ صفائی میں مشغول ہوگئی۔تھوڑی دیر میں مکان مالک کی بیوی صبا آنٹی آگئیں، بہت اچھی عورت تھیں مگر اس وقت بہت شرمندہ لگ رہی تھیں۔

"صدف، اپنے انکل کی بات کا برا نہ ماننا،تمہیں تو پتا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی غصہ کرنے لگے ہیں اور پھر کبھی، کبھی بلڈ پریشر بھی ہائی ہوجاتا ہے۔بس لے دے کے ایک یہی مکان ہی عمر بھر کی پونجی ہے۔تین بیٹوں کا ساتھ ہے،بس تم دل پرمت لینا۔"

"ارے نہیں آنٹی، ایسی تو کوئی بات نہیں...... غلطی میرے بچوں کی ہی تھی اور پھر بڑے بچوں کونہیں سمجھائیں گے تو کون سمجھائے گا۔" اس نے بھی کھلے ظرف کا ثبوت دیا...... کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد آنٹی چلی گئیں اور وہ پھر سے اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

تیسرے دن دوپہر کو ابھی بچوں کو اسکول سے آئے کچھ دیر گزری تھی کہ نچلے پورشن سے کچھ شور سنائی دیا تو اس نے ٹیرس پر کھڑے ہوکر نیچے جھانکا۔

فرسٹ فلور والی افشین اور تیمور صاحب کی مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔

"ابھی، ابھی میں نے باہر کے سارے حصے کی صفائی کی، فرش دھویا اور آپ کے بچے جوتوں سمیت وہاں سے گزر کر آئے ہیں سب گندا کردیا۔"

"انکل اب اسکول سے آتے ہوئے جوتوں پر مٹی اور کیچڑ تو لگا ہوگا ناں...... گلیوں میں بارش کا پانی

زندگی

ہم اور ہماری زندگی
دریا کناروں کی طرح
ہیں ساتھ بھی اور دور بھی
باہم بھی اور مجبور بھی
ملنے کی خواہش ہے بہت
لیکن ہے طوفاں درمیاں
رہبر نہ کوئی رازداں
بہتے چلے جاتے ہیں ہم
نا ئہ کوئی کارواں
کوئی نہیں جو ساتھ دے
سارے غموں کومات دے
کیوں اس قدر مجبور ہیں؟
کیوں زندگی سے دور ہیں؟
کیوں اس قدر تنہا ہیں ہم؟
اِک بے نشاں رستہ ہیں ہم
اِک دھند ہے چھائی ہوئی
کچھ بھی نظر آتا نہیں
ڈھونڈیں کسے
جائیں کدھر!
کوئی نہیں ہے ہم سفر
ہم اور ہماری زندگی
دریا کناروں کی طرح

کلام: یمنیٰ احمد، کراچی

کھڑا ہے اور کیچڑ کی تو بات ہی نہ کریں۔اب یہ قالینوں پر سے چل کر تو نہیں آتے۔" وہ بھی افشین تھی صدف نہیں۔

"انکل آپ بھی اسی راستے اسکول جائیں آئیں تو آپ کو پتا چلے۔" افشین کے چھ سالہ بیٹے عماد نے کہا...... صدف کو اپنی ہنسی روکنا مشکل ہورہا تھا۔

"اب اس عمر میں، میں اسکول جاؤں گا۔" تیمور صاحب کا غصہ سوا ہوگیا۔رخ بچے کی طرف کرلیا۔

"آپ خود ہی نہیں جائیں انکل ہمارے ساتھ چلیں ایسے جوتے پہن کر......" دوسرے بچے کامران کی آواز آئی۔

"لاحول ولاقوۃ!" تیمور صاحب کا پارہ مزید ہائی

ہوا واپس سیڑھیوں کی طرف مڑے دھپ، دھپ...... اور پھر واپس پلٹے۔

''اگر یہی حالت رہی تو میں آپ لوگوں کو نوٹس دیے بغیر مکان خالی کروالوں گا۔'' انہوں نے اپنا مخصوص جملہ دُہرایا اور گراؤنڈ فلور پر اپنے گھر کے اندر چلے گئے...... یہ روز، روز کا معمول تھا کرایہ داروں کی طرح اب ان کے اپنے گھر والے بھی اس معمول کے عادی ہوتے جا رہے تھے یا ہو چکے تھے۔ اگلا ایک ہفتہ آرام سے گزر گیا۔

☆☆☆

''ارے احمق...... گدھے، نامعقول یہ...... یہ کیا......'' اس دن بلڈنگ والے پھر ایک تماشا دیکھ رہے تھے اب مخاطب واقعی وہ گدھا تھا جو کچرے والی گدھا گاڑی کو کھینچ رہا تھا اور یہاں سے گزرتے ہوئے کچھ خالی شاپر دودھ کے ڈبے نیچے گر گئے تھے۔

''روکو...... روکو...... اپنے گدھے کو......'' گدھا گاڑی والے کو غضبناک انداز سے مخاطب کرتے ہوئے وہ چیخ رہے تھے اور یہی نہیں اپنے دونوں بازو پھیلا کر گدھا گاڑی کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ راستہ رکا تو گدھا رک گیا۔

''کیا ہو گیا صاحب؟'' گدھا گاڑی والا منمنایا اس کی نظر ابھی گرے ہوئے کچرے پر نہیں پڑی تھی۔

''کیا کر دیا...... مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ وہ دیکھو زمین پر کتنا گند گرا کر جا رہے ہو تم...... اٹھاؤ اسے ورنہ میں جانے نہیں دوں گا۔''

''ٹھیک ہے صاحب......'' وہ نیچے اتر آیا۔

''آپ بھی ایسے ہی غصہ ہو رہے ہو جانور ہی تو ہے۔''

''وہ جانور ہے، تم تو انسان ہو، تمہیں تو پتا ہونا چاہیے گندگی بری چیز ہے۔'' تیمور صاحب دہاڑے۔

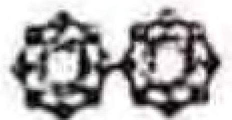
''پتا ہے صاحب...... اسی لیے تو پورے علاقے کی صفائی کا ذمہ اٹھایا ہے۔'' ساتھ ہی زمین پر پڑا کچرا اٹھا کر اس نے گاڑی میں ڈالا اور اس پر بیٹھ گیا۔ گدھا ہش، ہش کا اشارہ پاتے ہی چل پڑا۔ ساتھ ہی اوپر سے برآمد شدہ سر ہنستے ہوئے اپنے، اپنے پورشن میں واپس چلے گئے۔

☆☆☆

شہر بھر میں ہفتہ صفائی کا اعلان ہوا تو تیمور صاحب نے ہر، ہر کرایہ دار کے گھر جا کر ایک نیا لیکچر صفائی ستھرائی پر دیا اور خود بھی مصروفِ عمل ہو گئے۔ اس دن وہ صبح سے بڑا سا نیکر، بنیان پہنے بالٹی مگ اور پائپ لیے بیرونی حصے کو چمکانے میں مصروف نظر آئے۔ کام ختم ہوا تو ایک تنقیدی اور توصیفی نظر اپنے کام پر ڈالی۔ مطمئن ہونے پر اپنے آلات، اٹھائے گھر کے اندر رکھے اور باتھ روم میں گھس گئے۔ جمعہ کا دن تھا سو تیاری بھی اسی حساب سے تھی۔ کچھ ہی دیر میں سفید کرتا شلوار میں ملبوس نمازی ٹوپی پہنے گھر سے برآمد ہوئے۔

''ارے ...... ارے کم بختو...... میری ساری محنت برباد کر دی...... تم لوگوں کو بھی آج ہی ادھر سے گزرنا تھا۔'' مگر دور جاتے بیلوں میں سے کسی نے ان کی آواز نہیں سنی ہاں ان کی گردنوں میں پڑی گھنٹیوں کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں...... اور بیرونی حصے میں یہاں سے وہاں...... گوبر کی ڈھیریاں ایک لائن کی شکل میں نظر آ رہی تھیں...... اوپر کے پورشنز سے دبی، دبی ہنسی کی آواز آ رہی تھی جن میں صدف اور اس کے بچے...... افشین کے بچے بھی شامل تھے اور تو اور تیمور صاحب کے عین پیچھے دروازے کی اوٹ میں کھڑی ان کی مسز صبا آنٹی بھی مسکرا رہی تھیں، وہ سب کو سن چکے تھے۔ مڑ کر دیکھنا یا سر کو اوپر کر کے ان سب کو کچھ کہنا بیکار اور باعث شرمندگی تھا۔ نماز کو بھی دیر ہو رہی تھی سو مسجد کا رخ کیا کہ بے عیب اور پاکیزہ تو صرف اس کی ذاتِ مقدس ہے۔

صدف نے ٹیرس سے ہٹتے ہی قہقہہ لگایا، بچے بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بات اب اتنی بھی پریشان کُن نہ تھی کہ جس کو سوچ کر خون جلایا جاتا...... آپ کا کیا خیال ہے بہنو!





عیادت

فرح ریاض چیمہ

''احسان میاں ...... تمہیں بتانا میرا فرض تھا......سو میں نے پورا کیا۔اب آنا ہے یانہیں تمہاری مرضی ......''

افضال بھائی کی بات سن کر احسان میاں جاؤں یا نہ جاؤں والی کشمکش میں پھنس گئے۔ لیکن یہ کشمکش قدرے سلجھ گئی۔ جب افضال بھائی نے بتایا کہ کل سے ان کی بڑی بہن شائستہ باجی بھی آئی ہوئی ہیں۔

''کیا......شائستہ باجی کل ہی آگئی تھیں۔آپ نے مجھے بتایا ہی نہیں ......آپ کو مجھے کل ہی ساری بات

بتا دینی چاہیے تھی۔'' احسان نے قدرے تشویش سے کہا۔

''تو آج بتا دیا ناں..... تم تو ایسے فکر کر رہے ہو جیسے صدیاں بیت گئیں۔'' افضال نے مصنوعی سی مسکراہٹ لہجے میں بھرتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

''اچھا تو میں فون رکھتا ہوں۔'' ہونہہ رشتے تو بس نام کے ہی رہ گئے ہیں، موصوف ناراض تو ایسے ہو رہے تھے جیسے راتوں رات ہم نے سب کچھ ہڑپ کر لیا ہو۔ بندہ کچھ تو مروت سے کام لے، آخر میں اس کا بڑا بھائی ہوں۔'' افضال نے فون رکھ کر خود کلامی کرتے ہوئے سلگتے دل کا سارا دھواں نکال دیا۔

''حد ہے..... شائستہ باجی ایک دن پہلے ہی آ بیٹھیں اور محض حجت تمام کرنے کے لیے مجھے بھی فون کر دیا..... مجال ہے جو مجھے آنے کا ایک بار بھی کہا ہو..... آخر میرا بھی کچھ حق بنتا ہے، بڑی ہوشیاری سے کہہ دیا ''آنا ہے یا نہیں تمہاری مرضی.....'' جانا تو پڑے گا۔ آخر میں بھی حقدار ہوں..... نہ گیا تو نقصان اپنا ہی ہے۔'' احسان میاں بھی کسی پر احسان کر کے راضی نہ ہوتے تھے، صرف اسی کام میں ہاتھ ڈالتے جہاں سے کچھ فائدے کا امکان ہو۔

اتنے میں سلمٰی بیگم اپنے بے حد خوب صورت اور ریشمی بالوں کو جوڑے کی شکل میں گھماتے ہوئے جمائیاں لیتی، احسان کے پاس آ کھڑی ہوئیں..... دونوں میاں بیوی چالیس سے اوپر کے تھے، احسان کی تھوڑی بہت توند نکل آئی تھی۔ لیکن سلمٰی تو آج بھی ٹپ ٹاپ سی تھیں..... اپنی سترہ سالہ جوان بیٹی کے پہلو میں کھڑی اس کی بڑی بہن ہی لگتی تھیں اور انہیں اپنی خوب صورتی اور فٹنس کا پورا ادراک بھی تھا اسی لیے کسی کو جلدی خاطر میں نہ لاتیں۔ اپنے شوہر کا نام انہیں بالکل نہ بھاتا تھا، دراصل ان کی اعلیٰ کلاس کے ساتھ مماثلت نہیں رکھتا تھا۔ اسی لیے اپنی ماڈرن سوچ کی تسکین کے لیے سلمٰی نے احسان کو ''حانی'' میں بدل دیا۔

''کیا بات ہے حانی، صبح، صبح کس کا فون تھا۔ سب خیریت تو ہے؟'' سلمٰی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرے لیے ایک کپ اسٹرانگ سی کافی بنوا دو..... سر بہت دکھ رہا ہے۔'' وہ صوفے پر آ بیٹھے اور کریم بی بی کو بلند آواز میں کافی کا آرڈر دے کر سلمٰی بھی صوفے پر آ بیٹھیں۔

''اب کچھ بتاؤ گے بھی کہ بات کیا ہے؟'' سلمٰی نے دوبارہ پوچھا۔

''ابا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں، افضال بھائی کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ کل رات ICU میں گزاری ہے۔ شائستہ باجی بھی آئی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ابا جی کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' احسان کو اتنا افسردہ دیکھ کر سلمٰی بھی کچھ غمگین سی ہو گئیں۔

''اوہ..... یہ تو بہت دکھ کی بات ہے۔''

''ہاں وہ تو ہے..... مگر مجھے تو یہ پریشانی کھائے جا رہی ہے کہ اگر ابا جی کل بیمار تھے تو مجھے کل ہی اطلاع دیتے۔ اور تو اور..... باجی شائستہ بھی راتوں رات ہی پہنچ گئیں۔''

''لیجیے بی بی جی۔'' اتنے میں کریمن بی بی کافی لے آئی تھیں۔

''تم پریشان نہ ہو حانی، آج سنڈے ہے ہم بھی ابا جی کی عیادت کو چلتے ہیں۔'' کافی کا کپ احسان کو پکڑاتے ہوئے سلمٰی حوصلہ دینے کے انداز میں بولیں۔

''مجھے تو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ افضال بھائی اور شائستہ باجی نے جائیداد کے کاغذات پر ابا جی کے دستخط نہ کروا لیے ہوں۔ اسی لیے تو مجھے رات کو اطلاع نہیں دی۔ اگر میرے ساتھ کسی نے بھی ناانصافی کی تو میں بھی انہیں عدالت میں گھسیٹوں گا، دیکھنا تم.....'' اس وقت ٹھنڈے مزاج احسان کا غصہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔

''ریلیکس ..... حانی..... ریلیکس..... تمہارا حق کوئی کیسے چھین سکتا ہے..... میں ہوں ناں تمہارے ساتھ.....'' سلمٰی نے نہایت نرم لمس سے احسان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر لہجے کو بلا کی نرمی میں لپیٹ کر اپنے شوہر کی پریشانی کو غائب کر دیا۔ وہ موقع کی مناسبت سے ڈھلنا خوب جانتی تھیں۔

''میں تمہارے کپڑے ریڈی کرتی ہوں، جلدی سے فریش ہو جاؤ پھر ناشتا کر کے نکلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں انفصال بھائی کو اپنے آنے کی اطلاع دیے دیتا ہوں...... '' کریم بی بی کو ناشتا بنانے کا کہہ کر سلمیٰ اپنی فول پروف تیاری کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

''کیا پہنوں...... کیا پہنوں...... یہ بھی نہیں...... یہ بھی نہیں...... ہاں یہ کلر پرفیکٹ ہے۔'' قیمتی ملبوسات سے مزین اپنی وارڈ روب کو اچھی طرح کھنگالنے کے بعد سلمیٰ نے ایک نہایت شوخ اور خوب صورت کلر کے لباس کا انتخاب کیا اور اپنے ساتھ لگا کر خود کو آئینے میں ہر زاویے سے دیکھنے لگی۔ کبھی بالوں کو دائیں طرف گراتی اور کبھی پیچھے کی طرف......

''اس کلر میں، میں زیادہ سلم اور جوان نظر آتی ہوں۔'' سلمیٰ نے خود کی نظروں میں ہی اپنی خوب تعریف کی۔ اگلے ہی لمحے احسان کمرے میں داخل ہوئے۔

''میرے کپڑے تیار ہیں؟''

ان کی بات کا جواب دیے بغیر سلمیٰ نے پہلے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

''حانی، دیکھو یہ کلر مجھ پر کیسا لگ رہا ہے۔'' وہ ایک ماڈل کی طرح دوپٹا پھیلائے احسان کے سامنے آکر کھڑی ہو گئیں۔ وہ اپنی کھلی ہوئی بیوی کو دیکھ کر کھل سے گئے۔

''یار...... تم پر تو ہر رنگ جچتا ہے، تم کچھ بھی پہن لو ہمیشہ کی طرح حسین لگو گی......'' من چاہی تعریف سننے کے بعد سلمیٰ نے شوہر کی توجہ اپنے زیورات کی طرف کروائی۔

''اچھا...... حانی...... ذرا جیولری سلیکٹ کرنے میں بھی میری مدد کرو پلیز......'' احسان کافی عجلت میں تھے لیکن ان کی کیا مجال کہ وہ بیگم کو انکار کر سکتے۔

''تم یہ والا سیٹ پہنو...... یہ کافی مہنگا لگتا ہے اور ڈیزائن بھی بالکل جدید ہے اور ہاں...... پچھلے مہینے جو نئے کنگن بنوائے تھے وہ بھی لازمی پہننا......'' شوہر سے مشورہ کر لینے کے بعد وہ خاصی مطمئن ہو گئیں۔

''حانی آپ کے کپڑے میں نے استری کر دیے ہیں۔ انفصال بھائی کو ہمارے آنے کی اطلاع دے دی ہے ناں؟'' سلمیٰ نے لپ اسٹک شیڈ چیک کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں میں نے فون کر دیا تھا اور اب جلدی تیار ہو جاؤ، ابا جی کی حالت کافی خراب ہے، انفصال بھائی نے بتایا کہ صبح سے آنکھیں ہی نہیں کھول رہے۔ جب تک ابا دنیا میں ہیں، ہم میں سے کسی کو ایک پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔ ہو سکتا ہے، ہمیں وہاں ایک دو دن رکنا پڑے۔ میں اپنے حصے کے تمام کاغذات لے کر ہی جاؤں گا اور موقع ملتے ہی ابا جی کے دستخط کروالوں گا۔'' شوہر کی بات اچھے سے سمجھ لینے کے بعد سلمیٰ نے دوسری ملازمہ رقیہ کو آواز دی۔

''رقیہ جلدی سے اسما اور بلال کو جگا دو...... مجھے کہیں جانا ہے۔ میں انہیں ناشتا کروا کے جاؤں گی......'' اپنے قیمتی لباس، جیولری اور مہنگے برینڈ کے پرس کو ایک جگہ ایک ساتھ رکھتے ہوئے انہوں نے ملازمہ سے کہا۔

''بیگم صاحبہ آپ کسی پارٹی میں جا رہی ہیں؟'' ان کی اتنی زرق برق تیاری دیکھ کر ملازمہ نے پوچھ ہی لیا، ویسے بھی رقیہ، کریم بی بی کی نسبت زیادہ باتونی تھی اور ہر بات میں سوال کرنے کی وجہ سے کئی بار سخت ڈانٹ بھی کھا چکی تھی۔ اس کی یہ بات سن کر سلمیٰ کو تپ چڑھ گئی۔

''اب تم یہاں کھڑی سوال کرتی رہو گی۔ یا جاؤ گی بھی، جاؤ اور بچوں کو جگاؤ...... ہر بات پر نظر رکھتی ہے۔'' رقیہ منہ ہی میں کچھ بڑبڑاتی وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

''آپ کو کیا ضرورت تھی، احسان اور سلمیٰ کو فون کر کے ابا جی کے بارے میں بتانے کی اور تو اور...... شائستہ باجی راتوں رات ہی پہنچ گئیں۔ جیسے ہم نے ان کے حصے کی جائداد اپنے نام کروالی ہو، جسے دیکھو بٹوارے کی پڑی ہے، باپ کی تو کسی کو فکر ہی نہیں۔'' جب بھی کوئی عیادت کرنے آتا تو انفصال کی بیوی رخسانہ ایسے ہی چیختی چلاتیں۔

''تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے تمہیں سب سے زیادہ فکر ہے ابا جی کی......'' انفصال نے بھی طنز کا تیر

چھوڑا جو ٹھیک نشانے پر لگا اور رخسانہ جل بھن گئیں۔

"میں بتائے دیتی ہوں، اپنے بچوں کا حق کسی کو ہڑپ نہیں کرنے دوں گی، آخر بیس سال خدمت کی ہے میں نے سسر کی، میں بھی دیکھتی ہوں، کون آتا ہے میرے راستے میں۔" چیختی چلاتی، کاٹ دار نظروں سے راستے میں کھڑی نند کو گھورتے ہوئے رخسانہ وہاں سے چلی گئیں اور شائستہ باجی خاموشی کا بت بنی سامنے کھڑے اپنے بڑے بھائی کو دیکھتی رہ گئیں۔

"رخسانہ زبان کی تیز ہے لیکن دل کی بری نہیں، تم اس کی بات کا برا مت ماننا، وہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے، بیس سال تک اس اکیلی نے ہماری ماں کو سنبھالا اور اب ابا جی کو بھی ہمارے ساتھ رہتے بیس سال ہو گئے ہیں۔ احسان تو اپنی فیملی کو لے کر چلا گیا کہ اس کی بیوی کو جوائنٹ فیملی سسٹم پسند نہیں...... سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا۔ جائداد میں حصہ لینے سب وقت پر پہنچ جائیں گے لیکن میرا بوجھ بانٹنے کوئی نہیں آیا تھا۔" آج افضال نے بھی اپنے دل کی دبی ہوئی باتیں کہہ ڈالی تھیں۔

"کیا کہا آپ نے..... بوجھ..... ماں، باپ بھی کسی کے لیے بوجھ ہوتے ہیں بھلا..... ابا جی آپ کے لیے بوجھ ہیں.....؟" شائستہ بھرائے ہوئے نم لہجے میں بول رہی تھی اور افضال بے حسی کی مورت بنے سب سن رہے تھے..... "بھائی میں رات کے رات اپنا حصہ لینے نہیں پہنچی ہوں بلکہ میں تو صرف اپنے باپ کو دیکھنے آئی ہوں، جب آپ نے بتایا کہ وہ ICU میں ہیں تو رہا نہیں گیا اور فوراً چلی آئی۔ مجھے کوئی حصہ نہیں چاہیے بھائی....." کچلتے ہوئے دل کے ساتھ شائستہ اپنے والد کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور ان کا جھریوں سے بھرا ہوا نحیف ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بوسہ دیا۔ انہوں نے دھیرے، دھیرے آنکھیں کھولیں لیکن کچھ بھی کہہ نہ پائے۔

"بابا جان..... اچھا میں چلتی ہوں، میں آپ کو دیکھنے آتی رہوں گی اور اگر کسی دن نہ آسکی تو فون پر بات ہو جایا کرے گی۔" شائستہ کی بات سن کر بابا نے دھیرے، دھیرے بہ مشکل گردن موڑی اور اپنی بیٹی کو التجائیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ بیٹی تم نہ جاؤ..... انہیں کوئی بیماری نہ تھی بس وہ تو اپنوں کی بے توجہی اور اکیلے پن کا شکار تھے۔ بیٹی کے آنے سے ان کے گرد کھنچا تنہائی اور سناٹوں کا حصار ٹوٹا تھا۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزارنا چاہتے تھے لیکن کسی کے پاس بھی اتنا وقت نہیں تھا کہ کوئی اپنے قیمتی لمحات میں سے چند لمحے ان کے ساتھ گزار سکتا۔ افضال صاحب کا بڑا جنید اپنا قیمتی وقت دوستوں کی نذر کرتا یا اپنے بوڑھے دادا پر اپنے نئے موبائل فون کو ترجیح دیتا اور چھوٹا بیٹا فہد اپنے قیمتی وقت کو ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر نوڈلز اور چپس وغیرہ کھانے میں گنوانا زیادہ پسند کرتا۔ دو، تین ملازمائیں ہونے کے باوجود بقول رخسانہ بیگم ان کے پاس سارا دن سر کھجانے کی فرصت نہ ہوتی تھی۔ افضال تو آفس سے لوٹتے ہی کچھ دیر آرام کرتے اور پھر شام سے رات تک دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں کی محفل جمتی۔ ایک ہی چھت تلے رہنے کے باوجود کئی، کئی دنوں تک بوڑھا باپ پوتے، پوتیوں اور بہو، بیٹے کی شکل تک کو ترس جاتا۔ اگر اس گھر میں پرانے ملازم رحیم بابا نہ ہوتے تو ان کے بوڑھے والد کب کے تنہائی کے ہاتھوں مارے جا چکے ہوتے۔

"بابا جان آپ کو پتا ہے، احسان آ رہا ہے آپ سے ملنے...... جب آپ کے سب بچے آپ کے سامنے ہوں گے تو آپ بالکل تندرست ہو جائیں گے۔" شائستہ نے دعائیہ انداز میں کہا۔

"احسان آ رہا ہے....." ایک کانپتی ہوئی، نحیف سی آواز نکلی، اپنے چھوٹے بیٹے کے آنے کی خوشی اتنی زیادہ تھی کہ مردہ جسم میں جیسے کسی نے روح پھونک دی ہو، جب شائستہ نے اپنے والد کے کپکپاتے لبوں سے یہ جملہ سنا تو خوشی کے مارے آنکھیں چھلک گئیں۔

"بابا جان..... آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے، بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ اب میں یہاں اور نہیں رک سکتی، بچے گھر میں اکیلے ہیں، مجھے جانا ہو گا، میں پھر آؤں گی آپ سے ملنے۔" شائستہ اپنے بے بس

باپ کو کمرے میں اکیلا چھوڑ کر بھاگنے کے سے انداز میں کمرے سے باہر نکل گئی۔ یہاں ایک، ایک لمحہ انہوں نے اذیت میں گزارہ تھا۔ وہ اپنے باپ کی ایسی حالت پر پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ اب آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی تھیں۔

''بھائی...... میں بابا جان کو دیکھنے کبھی کبھار ہی آیا کروں گی، زیادہ تر فون پر ہی حال پوچھ لوں گی اور جہاں تک رہا میرے حصے کا سوال...... تو مجھے جائداد میں سے حصہ نہیں چاہیے، میرا حصہ آپ رکھ لیں یا آدھا احسان کو دے دیں آپ کی مرضی...... اچھا بھابی میں چلتی ہوں۔'' بھائی، بھابی کا رویّہ اس قدر ترش تھا کہ شائستہ کو جانا ہی پڑا۔

''اپنا حصہ دے کر گئی ہے تو ہم پر کوئی احسان نہیں کر کے گئی...... ہر بیٹی ایسا ہی کرتی ہے...... بہنیں اپنا حصہ اپنے بھائیوں پر قربان کر دیتی ہیں اور احسان کون ہوتا ہے آدھے حصے کا حقدار، اس نے آج تک کیا ہی کیا ہے اپنے باپ کے لیے...... ایک تو ہم بیمار باپ کے علاج پر خرچ کریں اور جو عیادت کرنے آتے ہیں ان کی آؤ بھگت کے لیے خرچہ الگ سے کریں۔ آج سلمیٰ اور احسان آ رہے ہیں، ان کی مہمان نوازی بھی بہت مہنگی پڑے گی اور پتا نہیں وہ کتنے دن یہاں رہیں گے۔''

جب رحیم بابا، آغا جی کے لیے سوپ لے کر ان کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ وہ دھیرے، دھیرے اٹھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رحیم بابا نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا اور سہارا دے کر بیٹھنے میں ان کی مدد کی۔

''احسان آ رہا ہے، میرا بیٹا آ رہا ہے۔'' بیٹے کے آنے کی خبر سن کر ہی بجھتے ہوئے دیے میں پھر سے تیل پڑ گیا۔ بوڑھے باپ کے بیمار چہرے پر رونق آ گئی۔ پچھلے دو دن سے انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا کہ اچانک بیٹی کی آمد اور پھر بیٹے کی آمد کا سن کر دھیمے، دھیمے باتیں کرنے لگے تھے۔ رحیم بابا خوشی کے مارے بھاگتے ہوئے باہر آئے۔

کشمیر اور اس کا حسن

آج جب ہر طرف اس کا ذکر ہے تو سوچا میں بھی اپنی پرانی یادوں کو ذہن سے نکالوں۔

گر فردوس بہ روئے زمین است
ہمیں است ہمیں است و ہمیں است

آج سے 50 سال پہلے 1967ء میں جب ہم کشمیر گئے تھے اس کی خوب صورتی اور بیتا ہوا ایک، ایک لمحہ جیسے کسی کہانی کی طرح میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

اس زمانے میں اتنی سہولتیں نہیں تھیں۔ ہم لوگ چار دن میں دہلی سے پٹھان کوٹ پھر جموں سے سری نگر چار دن میں پہنچے تھے۔ بارہ دن وہاں رہے تھے۔ قدرت کے حسین شاہکار کے لیے بارہ دن بھی بارہ منٹ میں گزر گئے تھے۔ ڈل لیک سے لے کر سون مرگ، گل مرگ، پہلگام۔ خاص طور پر مغل گارڈن جہاں بیچ میں تالاب اور چاروں طرف گلاب کے خوب صورت پودے جو ہوا کے ساتھ چاروں طرف اپنی خوشبو پھیلا رہے تھے اب تک یاد ہے۔

کچھ سالوں بعد جب غلام نبی آزاد کشمیر کے چیف منسٹر بنے تو انہوں نے وہاں 200 ملکوں سے خوب صورت پھول منگوا کر لگائے وہ بھی صرف ایک باغ میں جو کہ TV پر دکھایا گیا تھا۔ اس قدر خوب صورت لگ رہا تھا کہ کاش میں ایک پرندہ ہوتی اور اڑ کر وہاں پہنچ جاتی۔

آج وہاں کے لوگوں کی جو حالت ہے اسے دیکھ کر دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ دل سے ان کے حق میں دعا نکلتی ہے کاش وہاں پھر پہلے جیسا سکون اور خوشحالی واپس لوٹ آئے، آمین۔

پڑھنے والے یقین نہیں کریں گے، صرف 800 روپے میں 20 دن کا سفر کر کے واپس آئے تھے۔

از: فریدہ فضل، ڈیلاس، یو، ایس، اے

''افضال بابا، بھورانی، کہاں ہو سب...... دیکھو آپ کے والد ٹھیک ہو گئے ہیں۔'' رحیم بابا کو ایسے چہکتا دیکھ کر افضال اور رخسانہ دونوں آ گئے۔

''کیوں اتنا شور مچایا ہوا ہے؟'' رخسانہ تپ کر بولیں۔

''بھورانی، آغا جی ٹھیک ہو گئے ہیں، آپ کو یقین نہیں آ رہا تو خود دیکھ لیں، احسان بیٹا کے آنے کی خبر سنتے ہی وہ خوشی سے ہی تندرست ہو گئے ہیں۔''

کمرے میں بوڑھے اور کمزور والد کو بیڈ پر کپکپاتے ہوئے بغیر کسی سہارے کے بیٹھا دیکھا تو افضال اور رخسانہ تو دنگ رہ گئے۔ اور حیرت زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''ابھی تو صرف بیٹے کے آنے کی خبر ملی ہے، اگر بیٹا سچ مچ آ گیا تو یہ بوڑھے میاں تو پھر سے جی اٹھیں گے۔'' رخسانہ من ہی من میں تڑپ رہی تھیں اور افضال کے دل کا حال بھی رخسانہ سے کچھ مختلف نہ تھا۔

☆☆☆

ناشتے کی میز پر سب جمع تھے۔ احسان، سلمٰی ان کی شوخ و چنچل...... سترہ سالہ بیٹی اسما اور دس سالہ بیٹا بلال......

''ماما آج آپ نے اتنی صبح، صبح جگا دیا مجھے، میں تو رات کو بہت دیر سے سوئی تھی۔'' اسما نے سوجی آنکھیں ملتے ہوئے شکایت کی۔

''ہمارے جانے کے بعد جی بھر کے سو لینا، ابھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کرو۔''

''ماما آپ کہیں جا رہی ہیں؟'' بلال نے پوچھا۔

''ہاں بیٹا، تمہارے دادا جی کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے، ان کی عیادت کرنے جا رہے ہیں، ہمارے جانے کے بعد تم دونوں اپنا خیال رکھنا، کریم بی بی آپ کو ہر چیز وقت پر بنا دے گی۔''

نیند کے خمار سے چور اسما کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ دادا جی کی پروا کسے تھی۔ اس کے دل میں تو جنید سے ملنے کے لڈو پھوٹنے لگے۔

''ماما مجھے بھی ساتھ لے چلیں، یہاں اکیلے میں کیا کروں گی۔''

''میں بھی چلوں گا، پچھلے مہینے جو نیا ریموٹ کنٹرولڈ ہیلی کاپٹر لیا تھا وہ بھی ساتھ لے کر جاؤں گا، فہد کو دکھانا ہے۔'' بلال بھی تیار ہو گیا۔

سلمٰی نہیں چاہتی تھی کہ اس کے ایلیٹ کلاس بچے، مڈل کلاس لوگوں کی طرح خاندانی رشتوں میں الجھیں یا بیمار دادا کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے مجبور کیے جائیں۔ لیکن ماڈرن ماں ہونے کے ناتے بچوں کی ضد کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ اسما اچھلتی کودتی تیار ہونے کے لیے کمرے کی طرف بھاگ گئی، کریمن بی بی اسما کا ناشتا کمرے میں ہی لے آئی تھی۔ اسما اپنے بالوں کو بلو ڈرائی کر رہی تھی۔

''اسما بیٹا آپ کسی پارٹی میں جانے کی تیاری کر رہی ہیں؟'' کریمن بی بی نے اسے ناچتے، کودتے تیاری کرتے دیکھا تو پوچھ لیا۔

''ہاں، کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

سب فول پروف پارٹی اسٹائل میں تیار کھڑے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی...... اسٹائلش سا ہیلو رخسانہ کے کانوں سے ٹکرایا۔

''کیسی ہو سلمٰی؟ میں نے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا کہ کب تک نکل رہے ہو تم لوگ، ہم سب...... بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔''

''بس بھابی ہم تو بالکل تیار کھڑے ہیں، اسما کی تیاری ہی مکمل نہیں ہو رہی، بس نکلنے والے ہیں۔''

''اوہ...... بچے ایسے ہی کرتے ہیں، دادا جان سے ملنے کی خوشی ہی ایسے ہوتی ہے، اچھا ٹھیک ہے، میں تم لوگوں کے لیے کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔''

دونوں طرف ہنسی کا تبادلہ ہوا اور فون بند ہو گیا۔

''کم بخت ماری...... اب آئے گی اور اپنے نت نئے برانڈ کی چیزیں دکھا، دکھا کر ڈینگیں مارے گی۔''

رخسانہ فون بند کرتے ہی خوب بڑبڑائیں۔

''دادا جان سے ملنے کی کسے پڑی ہے، ہم تو اس لیے جا رہے ہیں کہ کل کو لوگوں کے طعنوں سے بچ

سکیں۔ پھر بھی رخسانہ باتیں بنائے گی کہ جائداد میں حصہ لینے آگئے، جب ابا جی بیمار تھے، تب تو خبر نہ لی۔'' سلمٰی نے بھی خود کلامی کرتے ہوئے دل کی حقیقت واضح کی۔

''بی بی جی آپ لوگ کسی شادی میں جا رہے ہیں.....؟ کتنے دن لگ جائیں گے؟'' کریمن بی بی نے نہایت ادب واحترام سے پوچھا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے، ہم کسی شادی میں نہیں جا رہے، حانی کے والد قریب المرگ ہیں ان کی عیادت کو جا رہے ہیں، ایک دو دن میں آجائیں گے۔'' سلمٰی نہایت خفگی سے بولیں۔

عیادت کا لفظ سن کر کریم بی بی نے نہایت حیرت زدہ نظروں سے اسما کو دیکھا جو ابھی تک میک اپ ہی کر رہی تھی۔

''بیگم صاحبہ برا نہ مانیں، عیادت تو غیروں کی جاتی ہے، اپنوں سے تو لوگ ملنے جاتے ہیں۔'' رقیہ ہمیشہ کی طرح بیچ میں کود پڑی اور جواباً پھر سلمٰی سے کھری، کھری سنا پڑیں۔

احسان گاڑی میں بیٹھ کر زور، زور سے ہارن بجا رہا تھا۔ ''بیگم صاحبہ اللہ احسان بابا کے والد کو صحت و تندرستی عطا کرے۔'' کریمن بی بی کی اس دعا پر سلمٰی نے گہری نظریں چند ساعتوں کے لیے اس بیچاری کے چہرے پر مرکوز کر دیں اور کریم بی بی نے ڈر کے مارے نظریں جھکا لیں۔ جیسے اس نے دعا کے بجائے کوئی بد دعا دے دی ہو۔ ٹک، ٹک کرتے گھر کی سیڑھیاں اترتے سلمٰی گاڑی کی طرف بڑھی۔

''کیا بات ہے حانی آپ اتنے بجھے ہوئے کیوں ہیں۔'' اپنے لمبے ریشمی کھلے بالوں کو ایک طرف جھٹکتے ہوئے سلمٰی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں......ابھی ابھی افضال بھائی نے ابا جان سے میری ویڈیو کال پر بات کروائی ہے......افضال بھائی بتا رہے تھے، پریشانی کی کوئی بات نہیں، جب سے ہمارے آنے کا ابا جی کو پتا چلا ہے وہ تو بالکل تندرست ہو گئے ہیں۔ ابا جی ٹھیک ہیں، میں نے خود انہیں ویڈیو میں بالکل ٹھیک ٹھاک دیکھا ہے۔''

''کیا.....ابا جی بالکل ٹھیک ہو گئے؟'' سلمٰی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''اچھا کیا آپ نے جو بالکل صحیح وقت پر فون کر دیا۔ اب کم سے کم اتنا اطمینان تو ہو گیا ہے کہ سلمٰی آنے کا پروگرام کینسل کر دے گی، بڑی مطلبی ہے بغیر مطلب کے کچھ نہیں کرتی۔''

رخسانہ اور افضال اپنے گھٹیا دماغ کی داد دے رہے تھے۔

''جب آپ کے والد صاحب ٹھیک ہو ہی گئے ہیں تو پھر عیادت کس کی کرنی ہے۔'' سلمٰی پیر پٹختی اپنی قدموں پر واپس اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔۔اور احسان نے بھی قابلِ اعتراض تاثرات نہ دکھائے۔ کیونکہ یہ سب لوگ عیادت کے نام پر تو اپنوں کی عدم توجہی کے شکار اس ضعیف اور بوڑھی جان کو مردہ سمجھ کر مٹی کے سپرد کرنے جا رہے تھے اور بدلے میں زمین کے چند ٹکڑوں پر اپنی ملکیت کی مہر ثبت کروانے جا رہے تھے جب پتا چلا کہ ان کی زندگی کے چند دن اور بڑھ گئے ہیں تو نہ جانے میں ہی سب کو اپنا فائدہ نظر آیا۔

''بیگم صاحبہ آپ واپس آگئیں.....'' سلمٰی کو واپس گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر ملازمہ نے پوچھا۔

کریم بی بی کو سخت تیز نظروں سے گھورنے کے بعد سلمٰی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں اور اسما الگ سے منہ بسورتی اپنے بیڈ پر جا گری۔

''بابا.....اب ہم نہیں جائیں گے؟'' ہاتھ میں ہیلی کاپٹر پکڑے بلال اپنے بابا سے پوچھنے لگا۔

''نہیں بیٹا چند دن انتظار کرو پھر چلیں گے۔''

دوسری طرف بوڑھی نظریں اپنے لختِ جگر کے انتظار میں دروازے پر ٹکی تھیں۔

❁❁❁

منی ناول

میں انمول

سعدیہ رئیس

دوسرا حصہ



اگلا دن سپاٹ سا گزرا۔ وہ تھکن کا بہانہ بنا کر تکیے میں منہ دیے پڑی رہی۔ حقیقت میں اس کا موڈ خراب تھا۔ وہ ایک ایسے شکنجے میں پھنس چکی تھی جس سے نکلنا بہت مشکل لگ رہا تھا مگر دل کسی طور بھی جنید کو قبول نہیں کر رہا تھا۔

صائمہ آنٹی نے دو تین دفعہ اس کی خیریت پوچھی۔ ایک بار پھوپی رقیہ جان کا فون بھی آیا مگر وہ سوتی بنی رہی، اس کا کسی سے بھی بات کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ کوئی معجزہ ہو جائے وہ آنکھیں بند کر کے لیٹی رہے اور جب آنکھ کھلے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ ایک بار جنید کا فون بھی آیا مگر اس نے نظر انداز کر دیا۔

وہ کسلمندی سے بیڈ پر پڑی تھی۔ جب میسج کی خاص ٹون بجی تو اس نے جھپٹ کر موبائل اٹھایا اور عجلت سے بٹن دبا کر میسج کھولا۔

"آج رات کو لانگ ڈرائیو کا پروگرام

بتاؤ...... ایمل کو راضی کرو...... منگنی کی خوشی میں آئس کریم کا بہانہ ٹھیک رہے گا۔'' یوسف کا میسج تھا۔ انمول کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ہونٹ خود بخود مسکرا اٹھے۔ وہ اوندھی لیٹی تھی اب تکیے پر سر رکھ کر آرام سے لیٹ گئی۔

''اوکے......'' لکھ کر اس نے اس سے ٹائمنگ سیٹ کی اور پھر جیسے ایک آن میں ہی سارا بوجھل پن دور ہو گیا۔ اس نے بکھرے بال سیٹ کر کیچر لگایا اور واش روم میں گھس گئی۔ کپڑے بدل کر تیار ہو کر لاؤنج میں آئی تو حسبِ توقع دوپہر کے کھانے کے لیے میز تیار ہو رہی تھی۔

ایمل نے ایک نظر اسے دیکھا مگر کوئی سوال نہیں کیا...... کل رات آنے کے بعد سے اس نے ایمل سے ایک لفظ بھی بات نہیں کی تھی۔ فیصل کے حوالے سے کوئی مذاق کیا نہ کل کے فنکشن کے بارے میں باتیں کیں۔ وہ ناراض، ناراض سی لگ رہی تھی۔

''کیسی طبیعت ہے انمول......؟ خیریت تو ہے کل رات ہی تمہاری شکل اتر گئی تھی۔'' صائمہ آنٹی نے دیکھتے ہی سوال کیا۔

''کچھ نہیں بس ایسے ہی سر میں درد شروع ہوا اور شاید ٹمپریچر بھی ہو گیا تھا۔ اب بہتر ہوں......'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

دل ہی دل میں وہ صائمہ آنٹی کے صحیح تجزیے پر جز بز سی ہوئی۔ بہت گہری نظر تھی ان کی وہ ان سے محتاط ہو گئی۔

''چاہو تو ڈاکٹر کو دکھا دو...... خواہ مخواہ اگنور نہ کرو...... خوشی کے موقع پر تمہاری طبیعت کو ہر کسی نے نوٹ کیا ہے۔'' اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتے ہوئے صائمہ آنٹی کی اگلی بات نے اس کی طبیعت صاف کر دی۔

''نن...... نہیں...... نہیں ایسی کوئی بڑی بات نہیں...... بس وہ کچھ تھکن سی ہو گئی تھی۔'' اس نے گھبرا کر جواب دیا۔

''ماشاء اللہ فیصل اور ایمل کی جوڑی شاندار رہے گی۔ جیسے جنید اور تمہاری جوڑی لگتی ہے۔ اس معاملے میں وقار صاحب بہت خوش قسمت ہیں۔ دونوں داماد اچھے خوش شکل مل گئے۔'' صائمہ آنٹی نے تبصرے کا آغاز کر دیا۔ جنید کا ذکر اسے اچھا نہ لگا مگر...... فی الحال وہ ہوں ہاں کر کے رہ گئی۔

''جی...... فیصل بالکل ایمل کے ساتھ جچے گا۔'' اس نے تائید کی۔

''بہن کو کل کے فنکشن کی تھوڑی بریفنگ تو دے دیتیں خود بستر کی ہو کر رہ گئیں۔ اس کی تو کوئی سہیلی بھی نہیں ہے۔'' صائمہ آنٹی نے اسے نرم انداز میں تلقین کی۔

''اب فریش ہو گئی ناں...... اب تنگ کروں گی ایمل کو...... کیوں ایمل ٹھیک ہے ناں......'' اس نے مصنوعی خوشگواریت سے ایمل سے سوال کیا۔

''تم سو رہی تھیں تو جنید بھائی کا فون آ رہا تھا۔'' اس کے سوال کا جواب دیے بغیر ایمل نے اپنی بات کہی۔ اس کے جتاتے ہوئے انداز میں تنبیہہ تھی۔

''آں...... آ...... چھا...... اچھا...... ابھی تو فی الحال مجھے بھوک لگی ہے۔ کیا پکایا ہے؟'' اس کی بات سمجھتے ہوئے انجان بن کر اس نے بڑی جلدی موضوع بدل دیا۔

''ہاں لو ناں، پلاؤ ہے اور...... تندوری چکن ہے، نان ہیں، میٹھے میں فروٹ ٹرائفل ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی فیصل کے گھر سے ایمل کا حصہ آیا ہے۔ بروسٹ میں نے ابھی اوون میں رکھوایا ہے۔'' صائمہ آنٹی نے تفصیل بتاؤ۔

سچ تو یہ تھا رات اس سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا تھا۔ صبح کا ناشتا بھی گول ہو گیا اور اب اسے بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے دھیان ہی نہیں دیا کہ ایمل نے تھوڑا سا سالن چکھا اور اٹھ کر چلی گئی۔

صائمہ آنٹی نے اس کا ساتھ دیا اور کھانے کے ساتھ، ساتھ وہ مستقل بولتی بھی رہیں۔ اپنی اسی بولنے کی عادت کی وجہ سے وہ سب کے دل میں جلدی جگہ بنا لیا کرتی تھی۔

وہ کھانا کھا کر کمرے میں آئی تو ایمل جا نماز بچھائے نماز پڑھنے میں مصروف تھی۔ اس نے بغور دیکھا وہ کچھ بجھی، بجھی سی، افسردہ اور حد سے زیادہ

سنجیدہ لگ رہی تھی۔ فرض اور سنتوں کے بعد بھی بہت دیر تک بیٹھی نہ جانے کیا کچھ پڑھتی رہی۔ اس نے سوچا کہ نماز سے فارغ ہوگی تو وہ اس سے چند باتیں کر کے اس کا دل ہلکا کردے گی۔ اپنی بیگانگی کا ازالہ بھی کردے گی مگر نماز پڑھنے کے بعد وہ لیمپ جلا کر کتاب کھول کر بیٹھ گئی۔

"کیا بوریت ہے، اب یہ کتاب کھول کر بیٹھ گئیں، میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" اس نے چڑ کر ایمل سے کہا۔

"سوری انمول، مجھے اپنی اسائمنٹ مکمل کرنی ضروری ہے۔ پہلے ہی تین چار دن کا نقصان ہوگیا۔" وہ قطعی سے انداز میں کہہ کر اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ اس کا انداز سراسر تو لفٹ والا تھا جیسے کچھ سننا چاہتی ہے اور نہ کہنا......

"مشکل ہے کہ یہ رات کو آئس کریم پروگرام کے لیے راضی ہو۔" اس نے خود ہی اندازہ لگایا۔

"ایمل کو راضی کرنا مشکل ہے۔ اگر تم خود کہو تو اچھا ہے۔ وہ میری بات نہیں مانے گی۔" اگلے پل اس نے موبائل پر میسج لکھنا شروع کیا اور یوسف کو بھیج دیا۔

"اسے میں منالوں گا...... میں اپنے پیار کو پانے کے لیے سب کچھ کرسکتا ہوں۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔" فوراً ہی یوسف کا جواب آگیا۔

اس کے بعد دو گھنٹے اس نے ایسے ہی آڑے ترچھے لیٹے مسکراتے ہوئے میسج پڑھتے اور میسج کرتے گزار دیے۔ جب یوسف اس کے پاس ہوتا تو وہ سب کچھ بھول جاتی...... وہ یہ بھول گئی تھی کہ ہر رشتے کا اپنا تقدس ہوتا ہے۔ رشتوں کو توڑنا اور جوڑنا بچوں کا کھیل نہیں......"

شام دھیرے، دھیرے اتر آئی اسے معلوم ہی نہ ہوا...... ایمل کب میز پر سے اٹھ کر باہر گئی اسے پتا ہی نہیں چلا۔ وہ جانے کب تک اسی خواب زدہ سی کیفیت میں پڑی رہی۔ یوسف سے باتوں کے بعد اس کے حواسوں پر سرور سا چھا گیا تھا۔ اس کا آخری میسج تو جیسے اس کے ضبط کو بھی آزما گیا تھا۔

"اب یہ دوری برداشت نہیں ہوتی...... جلد سے جلد اس سے چھٹکارا پالو......" اس کے اندر کی تڑپ میسج پر نمایاں تھی۔

اسے چائے کی طلب ہونے لگی۔ وہ باہر جانے کے لیے اٹھی تو فون بجنے لگا۔ پھوپی رقیہ جان کا فون تھا۔

"اُف......" اس نے کوفت سے بجتے موبائل کو دیکھا ان کے یہ وقت بے وقت کے فون اسے بہت برے لگتے تھے۔

"اونہہ...... زہر لگتے ہیں ایسے لوگ جو ہر پل، ہر لمحہ دوسروں کی زندگیوں میں مداخلت کرتے ہیں اب کیا کسر رہ گئی ہے...... کچھ کرنے کو باقی چھوڑا ہے جو فضول میں میرا دماغ کھاتی رہتی ہیں۔" وہ تنفر سے سوچتی چلی گئی حتیٰ کہ فون بج، بج کر خود ہی بند ہوگیا۔

اس نے موبائل اٹھایا اور اسے سائلنٹ پر کر کے ایک طرف ڈال دیا۔ وہ کمرے سے باہر آئی تو ایمل کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ اسے کچن اور لاؤنج میں جھانکتی واپس پلٹی۔ بالآخر وہ اسے ڈرائنگ روم کے اندھیرے میں صوفے میں دھنسی مل گئی۔ جیسے سب سے چھپ کر بیٹھی ہو۔

اصل بات تو یہ تھی کہ وہ انمول سے بچ کر بیٹھی تھی اور موبائل میں واٹس ایپ پر اتنی مصروف تھی کہ اسے انمول کی آمد کا بھی علم دیر سے ہوا۔

"پورا گھر چھوڑ کر یہی جگہ ملی تھی تم کو...... میں کب سے ڈھونڈ رہی ہوں تمہیں......" وہ دوستانہ انداز میں کہتے، کہتے اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔

ایمل نے اپنے پاؤں سمیٹ لیے...... اس کے بال بے ترتیبی سے چہرے کے گرد جھول رہے تھے۔

"یہاں ٹھنڈک تھی اور سکون بھی......" اس نے مختصراً کہہ کر آنکھیں موند کر سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔

"سکون...... کیا تمہیں سکون کی تلاش ہے؟ کوئی پریشانی ہے کیا؟ کیا فیصل کی طرف سے کوئی......؟" وہ کچھ اور سمجھ کر پوچھنے لگی۔

"ایسی کوئی بات نہیں...... میں تو بس...... کچھ یادوں کو یاد کر رہی تھی۔" ایمل کے افسردہ لہجے میں نمی گھل گئی۔

''اے......ما......ل......کیا ہوا......ادھر دیکھو......''
اس نے قریب ہو کر ایمل کے چہرے پر تھپکی دی۔
اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔
''کچھ نہیں، بس عجیب سا دل ہو رہا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے اور اب میرے دل میں تاب نہیں ہے کچھ اور سہنے کی۔'' وہ ہلکی سی سسکی لے کر بولی۔
''ایمل ......میری جان یونہی الٹا سیدھا سوچ کر پریشان مت ہو......میں فیصل سے ملی ہوں، اچھا لڑکا ہے۔ تھوڑا شوخ بھی ہے......سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
اس نے تسلی دی۔
''تمہیں یاد ہے، ماما یہ ڈرائنگ روم کتنا بند کر کے رکھتی تھیں کیونکہ ہم دونوں گھس کر کشن پھیلا دیتے تھے، کھلونے بکھرا دیتے تھے اور کبھی بسکٹوں یا چپس کا چورا پھیلا دیتے تھے۔'' اس نے انمول کی تسلی آمیز بات جیسے سنی ہی نہیں تھی۔ وہ بھی اس کی طرح یقین و بے یقینی کی کیفیت میں ڈول رہی تھی جب اسے جنید کے ساتھ منسوب کیا گیا تھا تب اس کا بھی یہی حال تھا بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر ہی تھا۔ پرانے رشتوں کو چھوڑ کر نئے رشتوں کو تسلیم کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے یہ سب......
اور پھر اس کے ساتھ تو ظلم ہی ہوا تھا وہ تو....
بے خبری میں ہی ماری گئی تھی۔ اسے اپنی سینت، سینت کے رکھی گئی محبت سے دستبردار کر دیا گیا تھا کچھ اس طرح کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکی تھی۔ اس نے رشتوں کو بھی کھویا تھا اور محبت کو بھی......
ایمل بھی اسے خوش کم اور محتاط زیادہ لگ رہی تھی جیسے ڈرتی ہو کہ جانے اب کیا ہو......حالانکہ حقیقت میں ایمل خود سے زیادہ اس کی باغیانہ سوچ پر فکر مند تھی اور انمول سمجھ رہی تھی کہ وہ اس نئے رشتے پر پریشان ہے۔
''مجھے معلوم ہے کہ تم کیا سوچ رہی ہو...... یہ سب زندگی کا حصہ ہے۔ تبدیلی لازمی امر ہے، ہر انسان کی زندگی میں تبدیلی آتی ہے۔'' اور کچھ اہم رشتے بدلتے ہیں تو ہمیں بہت گہرائی میں احساس ہوتا ہے مگر ہمیں انہیں قبول کرنا پڑتا ہے۔'' وہ روانی میں حقیقت بولتی چلی گئی جبکہ خود اس پر عمل پیرا نہ تھی۔ وہ اب تک جنید کو دل سے قبول نہیں کر سکی تھی۔
''تمہیں یاد ہے، ماما نے ایک بار ہم سے کہا تھا کہ انسان کی زندگی بھی دریا کی طرح ہوتی ہے جس طرح دریا پر بند باندھ کر اسے قابو کیا جاتا ہے اسی طرح انسان کو خود پر ضبط کا بند باندھنا پڑتا ہے تاکہ ہر طغیانی کو سہہ جائے۔'' ایمل نہ جانے کیا کچھ سوچ کر بول رہی تھی۔
ایسا لگ رہا تھا وہ سخت ذہنی بحران میں ہے۔ کبھی کچھ کہتی اور کبھی کچھ......
''ایمل اٹھو، میں چائے بناتی ہوں۔ تم آج میرے ہاتھ کی چائے پیو......'' اس کی کیفیت سے گھبرا کر انمول نے اسے ہلکے سے شانہ پکڑ کر ہلایا۔
''ماما ہماری سالگرہ بھی تو یہیں کرتی تھیں ناں......
اس روز ہم آزادی سے ڈرائنگ روم میں جا سکتے تھے۔ کتنے اچھے کپڑے لاتی تھیں... ماما ہمارے لیے۔''
ایمل دور کہیں پہنچی ہوئی تھی۔
''ہاں......ایمل ہماری بہت سی یادیں اس ڈرائنگ روم سے جڑی ہیں۔ اچھی بھی اور بری بھی......تم جتنا سوچو گی اتنا ہی الجھتی جاؤ گی۔ اٹھو اب یہاں سے۔'' ایسا کہتے ہوئے انمول کے چہرے پر تاریک سائے لہرا گئے۔ اسے بھی بہت کچھ یاد آ گیا تھا مگر وہ سب اچھا نہ تھا۔ اس نے ایمل کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اسے وہاں سے اٹھایا۔
''اپنا حال دیکھو کیا ہو رہا ہے......برسوں کی بیمار لگ رہی ہو......جا کر فریش ہو، بال بناؤ، میں تب تک چائے بناتی ہوں۔'' انمول نے اسے ہدایت دی۔ وہ گم صم سی کھڑی رہی جیسے کچھ نہ سن رہی ہو۔
''اے......مل......اگر ابھی فیصل تمہیں اس حلیے میں دیکھ لے تو بیچارے پر کیا گزرے گی؟'' اس نے شوخی سے اسے ہنسانے کی کوشش کی۔
''وہی جو جنید بھائی پر گزر رہی ہے۔'' اس نے عجیب سے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور تیزی سے ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔

انمول کافی دیر تک ساکت کھڑی اس کے لب و لہجے پر غور کرتی رہی...... وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ خود اس کی وجہ سے ڈسٹرب ہو گئی ہے اتنی زیادہ کہ اپنی خوشی کو بھی ٹھیک سے منا نہ سکی۔ انمول کو افسوس ہوا۔ اسے معلوم ہوتا کہ ایمل اتنی حساس ہے تو ہرگز اس سے ذکر نہ کرتی۔ اس نے تو اپنی رازدار بہن سمجھ کر اس سے دل کی بات شیئر کی تھی۔

چائے کے ساتھ اس نے ابلی ہوئی چکن کے سینڈوچ بھی تیار کر لیے۔ چائے لے کر جب وہ باہر آئی تو ایمل لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ اس نے شکر ادا کیا کہ اس نے اپنا حلیہ ٹھیک کر لیا تھا اور نسبتاً کچھ بہتر لگ رہی تھی۔

''اوہو، اکیلے، اکیلے چائے...... اور میری چائے کہاں ہے؟'' صائمہ آنٹی نے اچانک ہی چھاپا مارا اور بے تکلفی سے ایک سینڈوچ اٹھا کر کھانے لگیں۔

ان کی وقت بے وقت کی مداخلت اسے گراں گزرتی...... اکثر وہ اسی طرح سر پر سوار ہو جاتی تھیں یہ دیکھے بغیر کہ اگلا ان کو پسند بھی کر رہا ہے یا نہیں......

''اور میری چائے......!'' ٹرے میں دو کپ دیکھ کر انہوں نے ایمل کو دیکھا۔

''میں لاتی ہوں۔'' ایمل فوراً کھڑی ہو گئی۔

''چائے میں نے بنائی ہے، میں سمجھی کہ آپ گئی ہوئی ہیں۔'' انمول نے روکھے سے انداز میں کہا۔

''کہاں جاؤں گی، پہلے ہی اتنی تھکن ہو گئی ہے۔ تم اپنی سناؤ...... جنید کب آئے گا؟'' انہوں نے روانی سے اس کے سوختہ جذبات میں مزید چنگاری بھڑکائی۔

''معلوم نہیں، میری بات نہیں ہوئی ابھی......'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''اچھا...... حیرت ہے، مجھ سے تو کہہ رہا تھا کہ......'' وہ زیر لب بڑبڑا کر رہ گئیں کچھ۔ اسی اثنا میں ایمل ان کی چائے لے آئی۔ ایمل کے آتے ہی انمول اٹھ کر کمرے میں چلی گئی اس سے صائمہ آنٹی کی بے سروپا باتیں برداشت نہیں ہوتی تھیں۔

موبائل دیکھ کر اسے یاد آیا کہ اس نے سائلنٹ پر لگا دیا تھا۔ جنید کی آٹھ دس مسڈ کالز تھیں۔ میسج کا ان باکس کھولا تو یوسف کا میسج بھی آیا ہوا تھا۔

''میں نے ایمل کو میسج کر دیا ہے۔ ابھی تک اس کا ریپلائی نہیں آیا۔'' یوسف نے لکھا تھا۔

''ایمل نے مجھے بتایا بھی نہیں...... اوہو، کہیں اس وجہ سے تو وہ ایسی نہیں ہو رہی تھی۔'' اسے خیال آیا۔

وہ تیزی سے باہر آئی۔ صائمہ آنٹی فون پر کسی سے باتوں میں لگی تھیں اور ایمل ٹاک شو لگائے غائب دماغی سے بیٹھی تھی۔

''ایمل...... کیا یوسف نے تمہیں کوئی میسج کیا؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ایمل نے بے تاثر نظروں سے اسے دیکھا۔

''پتا نہیں، میں نے نہیں دیکھا۔ کیوں، کیا ہوا؟'' وہ میسج پڑھ چکی تھی مگر انجان بن گئی۔

''وہ رات کو آئس کریم کا پروگرام بنا رہا ہے۔ چلو گی ناں......'' اس نے ملتجی سے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، میں بہت تھک گئی ہوں...... میری طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں۔'' اس نے صاف منع کر دیا۔ وہ یوسف اور اس کے ڈرامے میں شریک ہو کر گناہ گار نہیں ہونا چاہتی تھی۔

''کیا ہوا ایمل...... کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' صائمہ آنٹی فون رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''دل گھبرا رہا ہے اس کا...... ایسے ہی بس نئے، نئے رشتے سے کچھ ڈسٹرب ہو گئی ہے۔ میں کہہ رہی ہوں رات آئس کریم کھانے چلے چلتے ہیں۔ اچھا ہے کچھ بہتر محسوس کرے گی۔'' ایمل کے بجائے انمول نے جواب دیا۔

''ہوں...... آئیڈیا تو اچھا ہے۔ تو پھر سب چلیں گے...... اوہ مگر وقار صاحب کو تو آج ڈنر پر جانا ہے کہیں......'' صائمہ آنٹی کو اچانک یاد آیا۔

''کوئی بات نہیں ہم شمع جی اور یوسف کو بلا لیں گے۔ یوسف چلا لے گا گاڑی......'' انمول نے جلدی سے پلان بتایا۔ اس پلان میں شمع جی کا اضافہ

اس نے خود کیا تھا تاکہ صرف یوسف کے نام پر صائمہ آنٹی کو اعتراض نہ ہو۔

"یوسف؟" بھویں سکیڑ کر انہوں نے دُہرایا۔

"کتنا کچھ تو کیا ہے اس نے، بہت کام آتا ہے وہ وقار صاحب کے...... اچھا نہیں لگتا کہ ہر وقت اسے پریشان کریں۔" انہوں نے یوسف کو بلانا مناسب نہ سمجھا۔ انمول کا چہرہ اتر گیا۔ اتنی مشکل سے موقع نکالا تھا وہ بھی ضائع جا رہا تھا۔

"دراصل دو چار دن پہلے شمع جی خود کہہ رہی تھیں آئس کریم کھانے کو...... تو میں نے سوچا کہ ان کو بھی بلا لیں۔" اس نے بہانہ بنایا۔

"اچھا...... پھر ٹھیک ہے، میں مہر باجی کو فون کر کے کہہ دیتی ہوں کہ آج رات کا پروگرام سیٹ کر لیں۔" کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے نمبر ملانا شروع کر دیا۔ انمول منع بھی نہ کر سکی۔ اس نے بیچارگی سے ایمل کو دیکھا مگر ایمل نے ٹاک شو پر نظریں جما کر لاتعلقی کا اعلان کر دیا...... قسمت اچھی تھی کہ فون نہ ملا۔

"بچت ہوگئی......" انمول نے شکر کی سانس لی۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے صائمہ آنٹی کو بتا دیا کہ اس کی شمع جی سے بات ہوگئی ہے لہٰذا رات کو وہ سب آئس کریم کھانے جائیں گے۔ اس وقت صائمہ آنٹی کا وجود اسے کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا مگر یوسف کا ساتھ پانے کے لیے وہ ہر تکلیف برداشت کرنے کو تیار تھی۔

اس نے شام کو ہی اپنی نوک پلک سنوار لی۔ خوب صورت تو وہ تھی ہی اور جدید قسم کے ایمبر ائیڈڈ سوٹ نے اس کی دلکشی مزید بڑھا دی۔ اس نے آدھے بالوں میں کیچر لگا کر باقی بالوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ شی کا ڈھیر پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے وہ دھیرے، دھیرے مسکرا بھی رہی تھی۔ ایمل نے دزدیدہ نظروں سے اس کی تیاریوں کو دیکھا۔ اس کی یہ سب حرکتیں اسے بہت بری لگ رہی تھیں۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو، نظر لگاؤ گی کیا؟" ڈھٹائی کی حد عبور کرتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"کیا پتا تم جسے گلستاں سمجھ رہی ہو وہاں صرف خار ہی خار ہوں۔ تمہاری یہ احمقانہ خواہش تمہیں کچھ نہیں دے گی کیونکہ خواہش ایک تپتا ہوا صحرا ہے جو سوائے آبلوں کے کچھ نہیں دیتا۔" ایمل نے کافی سرد مہری سے جواب دیا۔

"تمہاری سوئی ایک ہی جگہ اٹک گئی۔ ارے بھئی ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں جو کروں گی سوچ سمجھ کر کروں گی۔ تم فکر نہ کرو...... اب اٹھو اور تیار ہو۔" وہ بے فکری اور بے پروائی کے ریکارڈ توڑ رہی تھی۔ اس کی سروی گردن ناز سے تنی ہوئی تھی۔ اٹھی ہوئی ستواں ناک میں دمکتا ہیرا لشکارے مار رہا تھا۔

"میں کیا تیار ہوں...... ٹھیک ہوں ایسے ہی اور تم کو بھی زیب نہیں دیتا کہ کسی نامحرم کے لیے......" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

"اسٹاپ اٹ ایمل...... پلیز میری بہن بن کر رہو استانی نہ بنو، لیو دس ٹاپک......" انمول نے تلخی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ یوسف کیوں نہیں آیا ابھی تک......؟" اس کا موڈ خراب ہونے لگا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ دیے گئے وقت سے آدھا گھنٹا اوپر ہو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی یوسف نے اسے میسج کیا تھا کہ وہ بس نکل رہا ہے اور اب تک اس کا پتا نہیں تھا۔ وہ بے تابی سے اس کی منتظر تھی۔ صائمہ آنٹی کا بھی کانٹا نکل گیا تھا۔ انہوں نے از خود جانے سے منع کر دیا تھا۔ اس نے یوسف کو میسج بھیجا کہ جلدی آؤ...... مگر جواب ندارد...... اس نے دو تین بار اور میسج کیے پھر ایک لمبی سی مسڈ کال دی۔ پندرہ بیس منٹ کے انتظار کے بعد بالآخر اس کا میسج آ گیا مگر اس کا میسج پڑھ کر اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔

"سوری، میں نہیں آ سکتا شمع جی کو شدید قسم کا دورہ پڑا ہے، میں ممانی کے ساتھ ان کو ڈاکٹر کے ہاں لے جا رہا ہوں۔"

"اوہ...... نو...... ان کو بھی ابھی پڑنا تھا دورہ......"

چیخ......کیا مذاق ہے یہ۔" اس نے بدمزہ ہو کر موبائل تکیے پر پھینک دیا۔
ایمل اس کی بے چینی سے حظ اٹھاتی رہی، اسے اس آؤٹنگ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے اسے نہ دکھ ہوا اور نہ کوئی خوشی تھی۔ البتہ انمول پیر پٹخ، پٹخ کر غصہ نکالتی رہی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا سجا سنورا سراپا نوچ کھسوٹ کر خراب کرتی کال بیل نے چونکا دیا۔
"آ......یوسف......کتنا بدتمیز ہے......عجب جان لیوا مذاق کیا ہے میرے ساتھ۔ پہلے ایسا میسج کر دیا اور اب خود لینے بھی آ گیا۔ اٹھو ایمل جلدی کرو......"
ایمل سے کہتے ہوئے وہ تیزی سے گیٹ پر پہنچی۔ ایک جوش کے ساتھ اس نے گیٹ کھول دیا مگر سامنے کھڑے جنید کو دیکھ کر منہ کا ذائقہ کڑوا ہو گیا۔
"یہ کہاں سے آ گیا......" وہ دل ہی دل میں کراہی۔
"تم......اس وقت؟" اس کا لہجہ نامناسب سا تھا جیسے کہہ رہی ہوں آ گئے۔
"کیوں، میں نہیں ہو سکتا کیا؟ کہیں جا رہی ہو یا کہیں سے آ رہی ہو؟ فون مسلسل بند مل رہا ہے کیا چکر ہے یہ......" پہلی بار وہ کچھ تیز لہجے میں بولا تھا اس سے۔
ایک لمحے کو تو انمول کو چپ لگ گئی پھر غصہ عود کر آیا۔
"چارجنگ ختم ہو گئی تھی اس کی۔" وہ بھی جھلا کر بولی۔
"ارے جنید......باہر کیوں کھڑے ہو......اندر بلاؤ انمول۔" صائمہ جانے کس وقت چلی آئیں۔
"شکر ہے آپ آ گئیں......ورنہ یہ تو باہر کے باہر ہی ٹرخانے کے چکر میں تھیں۔" اس نے شگفتگی سے شکوہ کیا۔
"کوئی نہیں......وہ تمہیں اچانک دیکھ کر گھبرا سی گئی......تم بھی تو بغیر اطلاع کے آ گئے ناں......" صائمہ آنٹی نے اس کی حمایت کی۔
"کب سے فون کر رہا ہوں......بند جا رہا ہے تو کیا کرتا ایسے ہی چلا آیا۔" اس نے ان کو بھی صورتِ حال بتائی۔
انمول کچھ پریشان ہو کر انگلیاں چٹخانے لگی۔

"اچھا تم بیٹھو......انمول کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی آج......میں آتی ہوں ابھی......" صائمہ آنٹی اسے بٹھا کر خود اندر چلی گئیں۔
"آپ بھی تشریف رکھیے محترمہ......" لاؤنج کی کرسی پر بیٹھ کر اس نے طنزیہ سی ٹون میں کہا۔
وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور انمول کو لگ رہا تھا جیسے وہ اس کے اندر اتر کر سب راز پا لے گا۔ پہلے کبھی وہ اس سے اتنی درشتی سے نہیں بولا تھا۔ اس نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ کرسی پر ٹک تو گئی مگر ایسے بیٹھی تھی جیسے ابھی اٹھ کر بھاگ جائے گی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اس کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے فرار چاہتی تھی...اس کے سوال جواب سے بچنا چاہتی تھی۔
"کیا طبیعت خراب تھی......؟" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا تھا۔ شاید اسے بھی اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہو گیا تھا۔
"کچھ نہیں......بس ایسے ہی تھکن سی ہو گئی تھی۔" اس نے بدقت جواب دیا۔
"اور کلائی ٹھیک ہے تمہاری......کانچ تو نہیں لگا تھا اس میں......دکھاؤ......" اسے کچھ خیال آیا تو پوچھ لیا بلکہ وہ اس کا ہاتھ تھام کر خود دیکھنا چاہ رہا تھا۔
"نہیں......کچھ نہیں ہوا......ٹھیک ہے سب۔" اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھ دوپٹے تلے چھپا لیے۔ اس کی اس حرکت پر وہ خفیف سا مسکرا دیا۔
"میں چائے لاتی ہوں۔" وہ گھبرا کر کھڑی ہوئی۔
"بیٹھو انمول، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" اس کے جانے سے پہلے ہی اس نے اسے روک دیا۔
"جی......ہاں کہو......" وہ گھبراہٹ میں بے ربط سا بول گئی۔
اس وقت اسے لگ رہا تھا کہ جنید اس سے راز اگلوا لے گا یا پھر کوئی ایسی بات ہو جائے گی جس سے پہلے سے ہی سب کچھ افشا ہو جائے گا۔ وہ بڑی خاموشی سے اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتی تھی۔

"پھر کیا سوچا ہے تم نے؟" وہ اسے تولتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

انمول کے ہر مسام سے پسینے پھوٹ پڑے...... اسے لگا کہ وہ سب کچھ جان گیا ہے۔

"کیا مطلب......؟" وہ انجان پن سے بولی۔

"چھٹی تو ختم ہوگئی، اب کیا کرنا ہے؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"اوہ، ہاں......" اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔

"ابھی مجھے اپنے ڈاکومنٹس نکلوانے ہیں۔ کچھ دن مزید لگیں گے۔" اس نے پہلے سے طے شدہ جواز پیش کر دیا۔

"ہم......م......" اس نے ہنکارا ابھرا۔

اس کی گہری نظروں سے اسے کوفت ہو رہی تھی۔ اس کی گرم نظروں میں مخفی پیغام وہ بخوبی سمجھ رہی تھی۔ اس کا التفات ڈھکا چھپا نہیں تھا اس سے۔ وہ جتنا اس سے چڑتی وہ اسی قدر اس پر حاوی ہو رہا تھا۔ اس کی کچھ کہتی نظروں سے وہ خائف رہتی تھی۔ اس نے جنید کو یہی بتا رکھا تھا کہ اسے اپنا گریجویشن سرٹیفکیٹ نکلوانا ہے۔

"ٹھیک ہے چار پانچ دن تک تو میں ہوں ابھی...... اماں نے بھی فون کیا تھا تم کو مگر تم نے ریسیو نہیں کیا۔" اس کے لہجے میں خفگی سی تھی۔

"سچ...... کہا تو ہے چارجنگ ختم ہوگئی تھی۔" وہ زچ ہو کر جھلا کر بولی۔

"خود تو پوری چارج لگ رہی ہو۔ کہیں جا رہی تھیں کیا؟" اس نے شوخی سے مذاق کیا۔

"ارے بیٹا میں تو سمجھی کہ تم لوگوں کی فون پر بات ہوگئی اس لیے انمول تیار ہوئی ہے۔ میرے تو ذہن سے ہی نکل گیا کہ دونوں آئس کریم کھانے جا رہی تھیں شمع کے ساتھ...... ہماری پڑوسن ہے ناں وہ...... اچانک ہی ان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ ابھی بتایا ہے ایمل نے مجھے۔" صائمہ آنٹی اسکواش اور لوازمات لیے چلی آئیں۔ ساتھ ہی ان کا پروگرام بھی بتا دیا۔

"السلام علیکم جنید بھائی۔" ایمل بھی ان کے پیچھے ہی آگئی۔

"وعلیکم السلام...... کیسی ہو ایمل؟ خوش رہو......" اس نے کھل کر اسے جواب دیا۔

"آنٹی یہ اتنا کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔ ایک تو آج چاچی نے اتنا ہیوی ڈنر کرا دیا کہ اب مجھے اسے ہضم بھی کرنا پڑے گا۔" اس نے اسکواش کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔

"میں لے جاتا ہوں آئس کریم کھلانے...... کیوں ایمل......؟" اس نے براہ راست ایمل سے پوچھا۔

"میرا تو ایک ضروری فون آنے والا ہے جنید بھائی...... آپ انمول کو لے جائیں۔" ایمل نے صاف منع کر دیا۔

"فون تو گاڑی میں بھی اٹینڈ کر لوگی۔ اس میں کیا مسئلہ ہے...... یہ کوئی تار والا فون تھوڑی ہے۔" جنید نے فوراً اس کی بات رد کی۔

"اُف...... سمجھا کریں ناں......" ایمل نے ہلکے سے ٹھنک کر ناز بھرا اشارہ دیا۔ اس کے چہرے پر الوہی سی چمک اور شرمیلی مسکان تھی۔ ایمل کا یہ روپ اور یہ انداز اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

"اوہ...... سمجھا...... اوکے، میں کباب میں ہڈی نہیں بنوں گا...... ٹھیک ہے پھر میں اور انمول ہی چلے جاتے ہیں۔" انمول کو کسی بھی قسم کی رضامندی کا حق دیے بغیر اس نے فوری فیصلہ سنایا۔ انمول نے کاٹ کھانے والی نظروں سے ایمل کو گھورا...... سب سمجھ رہی تھی وہ، ایمل نے یہ جال اس کے لیے بچھایا تھا کیونکہ ایمل چاہتی تھی کہ وہ پرکٹی چڑیا بن کر ساری عمر ناپسندیدہ پنجرے میں گزار دے۔

ایمل نے اس کی گھوری کی پروا کیے بغیر مسکرا کر اسے وکٹری کا نشان دکھایا جیسے وہ اس کے خیالات اور ارادوں سے واقف ہی نہیں۔

"اوکے...... وش یو بیسٹ آف لک......" اس نے جنید اور انمول سے کہا۔ انمول کچھ نہ کر سکی...... وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی...... ہر بار ہی پھندا اس کی گردن میں نہ جانے کیوں پھنس جاتا تھا۔ اسے بہت غصہ آ رہا تھا مگر اب انکار کرنا بیوقوفی تھی اور پھر اس کے انکار کا

کوئی جواز بھی تو نہ تھا۔

وہ جلتی کلستی جنید کے ساتھ آئس کریم کھانے کے لیے چلی گئی۔ پہلے ہی یوسف کے عین وقت پر انکار نے اس کو بدمزہ کر دیا تھا پھر جنید کی آمد سونے پر سہاگا ہو گئی اور اب نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جنید کی رفاقت برداشت کرنی پڑی۔ یہ ساری تیاری اس نے یوسف کے لیے کی تھی مگر اب جنید اس کا حق دار بن کر بار، بار اسے محبوبانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے گاڑی چلانے کے کچھ دیر بعد ہی رومینٹک سا گانا لگا دیا۔ وہ غصے سے بیٹھی رہی۔ مسکراہٹ تو دور کی بات تھی اسے رونا آ رہا تھا۔ وہ جنید کی سنگت نہیں چاہتی تھی مگر اس کے ہمراہ تھی۔ اس کی ہم سفر بنی اس منزل کو جا رہی تھی جہاں وہ جا رہا تھا۔

بے بسی و کرب کے اذیت ناک احساسات نے اس کے اندر اتنی شدید توڑ پھوڑ مچائی کہ اس کے سارے باغیانہ ارادے مزید مضبوط اور مضبوط تر ہوتے چلے گئے۔ سارے رستے وہ خاموش بیٹھی رہی۔ دو ایک بار جنید نے کچھ بات کی بھی تو اس نے بے حد اختصار سے جواب دیا۔ سارا وقت وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

جنید نے آئس کریم پارلر کے روشنیاں بکھیرتے سائن بورڈ کے سامنے گاڑی روکی تو وہ چونک پڑی۔

”آیئے میم......“ جنید نے بناوٹی احترام سے اسے مخاطب کیا۔ اس کے طرز تخاطب پر سلگتے ہوئے وہ گاڑی سے اتری۔

”اونہہ...... بڑا آیا... خوشامدی چمچہ...... سب کاموں میں اپنی مرضی اور یہاں دنیا دکھاوا......“ اس نے سوچا۔ وہ بے دلی سے اس کے ساتھ آگے بڑھی...... اپنا پسندیدہ فلیور بھی نہ بتایا۔

”جو مرضی منگوالو......“ اس کے اندر غصہ بھر رہا تھا۔

”جب زندگی کا ساتھی اپنی مرضی کا نہیں چن سکتے تو فلیور گیا بھاڑ میں......“ اس نے دل میں سوچا۔

مگر جب ویٹر اس کے سامنے آئس کریم کپ رکھ کر گیا تو وہ حیران رہ گئی۔ اس کا پسندیدہ اسٹرابیری فلیور اس کے سامنے تھا۔

”ٹھیک ہے ناں......؟“ جنید نے اپنائیت سے پوچھا۔

”ہم......“ اس نے ہلکی آواز میں کہا۔

”بھئی کیا سارے سُر بہن کی منگنی پر نکال لیے جو اب آواز بھی نہیں نکل رہی۔“ اس کی خاموشی پر اس نے دھیرے سے چھیڑا۔

اگرچہ وہ کم بول رہی تھی مگر لگ رہا تھا کہ وہ نظروں ہی نظروں میں اسے پی جائے گا۔ وہ اسے دیکھ، دیکھ کر بلاوجہ مسکرا رہا تھا اور انمول کو اتنی ہی زیادہ کوفت ہو رہی تھی۔

”کچھ نہیں...... بس ایسے ہی بولنے کا دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے ٹکا سا بہانہ بنایا۔

”مجھ سے بھی نہیں......“ اس نے مان سے پوچھا۔ ایک لمحے کو اس کی نظریں ٹکرائی تھیں اور دل ڈول سا گیا وہ اسے پورے حق سے چاہت لٹاتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”بہت دیر ہو گئی...... رات بہت ہو گئی......“ کوئی جواب نہ بن پڑا تو اس نے جلدی مچائی۔

”ہونے دو...... جب دو چاہت کے متوالے ساتھ ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے...... دیکھو...... دیکھو اپنے اردگرد...... کتنے کپلز آئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ ڈیٹ پر آنے والے کپلز ہیں مگر کسی کو کیا پتا کہ ہمارا رشتہ کتنا مضبوط ہے...... سب سمجھ رہے ہوں گے ہم بھی ڈیٹ پر آئے ہوئے ہیں۔“ اس نے شرارت لٹاتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے اردگرد دیکھا فیملیز تو کم نظر آئیں زیادہ تر ایسے ہی کپلز وہاں تھے...... وہ خواہ مخواہ نروس ہو گئی۔ جنید کے ارادے بڑے رومانوی سے لگ رہے تھے اور وہ اب جلدی گھر جانا چاہتی تھی۔

”میں تھک گئی ہوں...... مجھے گھر جانا ہے۔“ اس نے پھر اصرار کیا۔

اس کی اکتاہٹ کو محسوس کرکے یا اس کے پاس سے کسی ردعمل کو نہ پا کر جنید نے پھر کچھ تقاضا نہ کیا البتہ

یہ ہوا کہ وہ کچھ خاموش سا ہو گیا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے...... ہر وقت کی تھکن تم پر طاری رہتی ہے...... سر میں اکثر درد رہتا ہے۔ خود پر توجہ دو اپنی قوتِ ارادی سے اس تھکن کو خود سے دور کرو...... اور پھر میں بھی تو ہوں ناں...... تمہاری ساری تھکن سمیٹنے کے لیے تیار......" اسے سمجھاتے ہوئے وہ یک دم ہی جیسے جامے سے باہر ہوا۔ اس کے کھلے ڈلے سے اظہار پر وہ غیر محسوس طور پر بلش کر گئی۔ لیکن دل میں برہمی بدستور برقرار رہی۔ اپنے برابر میں اس کی موجودگی اسے بری لگ رہی تھی۔

"پلیز دیکھ کر گاڑی چلاؤ......" اس کے التفات کو محسوس کر کے اس نے تنبیہ کی۔

اب وہ اسے کیا بتاتی کہ یہ خود ساختہ تھکن تھی جو اس نے خود پر سوار کر رکھی تھی۔ اس سے بچنے اور دور رہنے کے لیے...... سر درد کچھ نہیں تھا بلکہ وہ اس کے لیے دردِ سری بن گیا تھا۔ واپسی کا سفر کافی لمبا ہو گیا جبکہ واپسی کا سفر اکثر جلدی طے ہوتا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ گاڑی بہت ہلکی رفتار سے چلا رہا تھا۔

"تم اپنے ڈاکومنٹس جلدی نکلوالو...... ویسے بھی کیا کرنا ہے تمہیں، ملازمت تو کرنی نہیں... پھر کیا ضرورت ہے اس سب کی۔" اس نے ایسے کہا جیسے یہ کام بہت غیر اہم ہو اس کے لیے۔

"میرا ارادہ ہے کہ میں جاب کروں گی......" موقع دیکھتے ہوئے اس نے اپنا ارادہ بھی بتا دیا۔ وہ سب کچھ طے کیے بیٹھی تھی۔ اس سے چھٹکارے کے بعد وہ کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی، نہ کسی کے دباؤ میں رہنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے اس کا خود کفیل ہونا بہت ضروری تھا۔

"جاب ...... ہاہا...... تم جاب کرو گی؟ کیا ضرورت پڑ گئی تمہیں جاب کی؟ بے فکر رہو تمہارا مستقبل بہت شاندار ہے...... سب سے پہلے تو میں خود تمہیں منع کروں گا دیگر لوگوں کو چھوڑو کیونکہ اعتراض سب ہی کریں گے۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں بات کی۔

"کسی کو حق نہیں پہنچتا میری ذاتیات میں دخل دینے کا...... میں نے جو سوچا ہے وہ ضرور کروں گی۔" وہ ایک دم چیخ کر تیز لہجے میں بولی۔

"ارے رے...... اتنا غصہ...... ٹھیک ہے بھئی کر لینا جاب مگر پہلے گھر بار سنبھالنا ہوگا۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔" جنید نے اس کی ضد دیکھتے ہوئے ٹالنے والا انداز اختیار کیا۔

"اونہہ، جیسے میں ان کی پابند رہوں گی...... کچھ دن کی بات ہے پھر پتا چلے گا تم کو......" اس نے دل میں سوچا۔

گھر کے پاس گاڑی رکتے ہی ایک اور گاڑی مخالف سمت سے آتے ہوئے مہر آنٹی کے گھر کے آگے رک گئی۔ جنید گاڑی روک کر باہر نکل آیا تھا تاکہ گیٹ کھلنے تک وہیں کھڑا رہے۔ وہ گاڑی سے اتری تو سامنے والی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سے یوسف بھی اتر آیا۔ یوسف نے کچھ حیرانی اور بے یقینی سے اس کے پاس کھڑے جنید کو دیکھا۔ اس کی نظریں یوسف سے ملیں اور یوسف نے اجنبیت سے منہ پھیر لیا۔

"آہ......" صدمے سے اس کا دل بیٹھ سا گیا۔ یوسف جو سمجھ رہا تھا ایسا کچھ بھی نہ تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ یوسف کو جو بظاہر نظر آیا وہ اس کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔

مہر آنٹی، شمع جی کو تھامے گیٹ سے اندر چلی گئیں اور یوسف پورا گیٹ کھول کر پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس نے گاڑی کو بہت زیادہ ریس دی اور کافی تیزی سے گاڑی اندر لے گیا۔ یہ اس کے غصے کا اظہار تھا۔ یہ جو سب کچھ ہوا آناً فاناً ہوا۔ انمول نے تو ایسا سوچا بھی نہیں تھا اور شام سے اب تک ہر بات اس کے خلاف ہی جا رہی تھی۔ جو وہ چاہ رہی تھی ویسا نہیں ہو رہا تھا اور ایسا کیوں ہو رہا تھا یہ وہ نہیں جانتی تھی کیونکہ علم والا، سننے والا، جاننے والا اور دیکھنے والا سب جانتا ہے کہ کس کے ساتھ کیا ہونا ہے مگر نادان بندہ ان مصلحتوں اور حکمتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔

رات دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ اس نے یوسف کو کئی میسجز کیے مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کا دل اور برا

صفائی کرتا نظر آتا تھا۔ کام والی بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ رسی پر کل کے دھلے ہوئے کپڑے لٹکے تھے۔ کیا کرے اور کیا نہ کرے...... وہ سوچ میں پڑ گئی۔ آواز بھی نہیں دے سکتی تھی۔ یوسف کو...... اچھا بھی نہیں لگتا اور پھر وہاں پہلے ہی پریشانی اور اداسی تھی۔ ابھی وہ مایوس ہو کر نیچے جانے ہی والی تھی کہ چھت کے زینے پر کسی کی چاپ محسوس ہوئی۔

"شش...... ای...... اے......" اس نے ہلکی آواز میں پکارا۔ یوسف نے ایک پل کے لیے رک کر اسے دیکھا اور برہم تیوروں سے پلٹ گیا۔ انمول کا دل بیٹھ گیا۔

"اسے کیا ہو گیا...... دماغ خراب ہو گیا اس کا، میں اس کے لیے سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہوں اور یہ...... ابھی ایک میسج کرتی ہوں اسے، دماغ صحیح ہو جائے گا موصوف کا۔"

وہ جلتی بھنتی نیچے اتر آئی۔ مین گیٹ پر زوردار دستک ہوئی۔ پھر کال بیل بھی بجنے لگی۔ اس نے گیٹ کھولا تو کام والی لڑکی دانت نکال رہی تھی۔

"کیا کتا لگا ہے تمہارے پیچھے جو اتنے زور، زور سے دروازہ پیٹ رہی ہو۔" اپنا غصہ اس پر الٹ دیا۔

"باجی جی...... گلی میں سناٹا ہے، ڈر لگتا ہے، آج کل کے لڑکوں میں کوئی لحاظ نہیں...... اپنی عزت سب کو عزیز ہوتی ہے، کچھ ہو ہوا گیا تو میری عزت مذاق بن جائے گی اور یہ مجھے منظور نہیں۔" اس کے غصے کو دیکھتے ہوئے رانی نے تفصیلی وضاحت دی۔

ویسے بھی یہ اس کی پرانی عادت تھی کہ ایک بات کے سو سو جواب دیتی۔

"نام رانی کام ماسیوں کا...... اونہہ عزت کی پڑی ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ غصے میں موبائل اٹھایا تاکہ یوسف کو میسج بھیج سکے مگر وہاں یوسف کا میسج آیا ہوا تھا۔

"دھوکے باز لڑکی...... دعوے مجھ سے اور محبت اس کے ساتھ...... مجھے بیوقوف سمجھ رکھا ہے کیا؟" اس کے میسج نے اسے اور بھی سلگا دیا۔

"سمجھتا کیا ہے خود کو...... ابھی بتاتی ہوں اسے......"

اس نے غصے میں کال ملائی۔ بیل جاتی رہی اور پھر باقاعدہ کاٹ دی گئی۔ انمول کو مزید تپ چڑھ گئی۔

"تم سمجھتے کیا ہو خود کو...... میں تمہاری خاطر کتنا بڑا قدم اٹھا رہی ہوں اور تم نے جنید کو میرے ساتھ دیکھ کر مجھے دھوکے باز لڑکی کہہ دیا...... بہت دل دکھایا ہے تم نے میرا...... تم نے جو دیکھا وہ حقیقت نہیں تھی۔ تمہاری وجہ سے مجھے زبردستی اس کے ساتھ جانا پڑا۔"

اس نے کافی تفصیلی میسج اسے بھیجا۔

یوسف کا کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے مسڈ کال دی اور اس کا بھی کوئی ردِعمل نہیں آیا۔ غصے میں آ کر اس نے موبائل بیڈ پر پٹخ دیا۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ عجیب دوراہے پر آ کھڑی ہوئی تھی وہ...... وہ چاہتی تھی جلد سے جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے مگر ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسے مہر آنٹی کے گھر کا گیٹ کھلنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ وہ پورچ میں آ گئی۔ اس نے اچک کر دیکھا ماموں حامد اور یوسف گاڑی میں کہیں جا رہے تھے۔ اسے اور زیادہ رونا آیا۔ یوسف اس کے ساتھ یہ سلوک کرے گا اسے توقع نہیں تھی وہ بے دلی سے کمرے میں آ گئی۔ موبائل میں یوسف کا میسج آیا ہوا تھا۔

"شام کو گھر آ جانا...... شمع جی کی عیادت کرنے۔"

اس کا مختصر میسج پڑھ کر اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔

"باجی جی...... میں چلتی ہوں کنڈی لگا لو......"

دروازے پر رانی نمودار ہوئی اور حسبِ عادت دانت نکال کر ہنستے ہوئے بولی۔

"تو جاؤ...... وہ آٹومیٹک لاک ہے خود بند ہو جائے گا دروازہ......" وہ جھلا کر بولی۔ "پینڈو...... کچھ نہیں آتا سوائے دانت نکالنے کے۔" زیرِ لب بڑبڑا کر غصے سے اسے دیکھا جو ہنوز دروازے میں کھڑی تھی۔

"وہ باجی جی...... پورے گھر میں اکیلی ہو آپ...... بہتر ہے کہ باہر لاؤنج میں بیٹھو آ کے...... میرے کو معلوم ہے دروازہ خود بند ہو جاتا ہے۔" اس نے ڈرتے، ڈرتے کہا۔

''اُف...... مجھے معلوم ہے میں اکیلی ہوں...... دفع ہو جاؤ اب......'' وہ بد مزاجی سے بولی۔

''توبہ...... توبہ...... غصے والی باجی......'' وہ کان پکڑتی تیزی سے وہاں سے بھاگ گئی۔ اور اس کے جانے کے بعد انمول کافی دیر تک کسی بے جان بت کی طرح بیٹھی رہی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کے مزاج کی چڑچڑاہٹ بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

شام تک وہ ایمل کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کر چکی تھی۔ ایمل بھی حیران، حیران سی اس کا بدلا ہوا موڈ دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ آج کل تو اس کا موڈ کئی، کئی دن خراب رہتا تھا۔

''شمع جی کا پتا نہیں کیا حال ہے...... چلو چل کر خیریت پوچھ لیں۔'' اس نے شام کو سرسری سے انداز میں کہا۔

''ہاں صائمہ آنٹی نے فون تو کیا تھا مہر آنٹی کو......'' اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔

''فون کی بات الگ ہے۔ ہمیں جانا چاہیے شمع جی تمہاری منگنی میں بھی آئی تھیں بڑی بات ہے یہ...... اور پہلے کے مقابلے میں اب تو وہ ہم سے اچھے طریقے سے ملتی ہیں۔'' اس نے اسے راضی کرنے کی کوشش کی۔

''میں تو تھک رہی ہوں بہت...... آج کالج میں بہت دوڑ لگ گئی میری...... سوری میں نہیں جا رہی۔'' ایمل نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

''ایمل مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''اور مجھے بھی......'' ایمل نے معنی خیزی سے جواب دیا۔

انمول غصے میں اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ چھوٹی، چھوٹی باتوں پر اسے جلدی غصہ آ رہا تھا۔ پھر کچھ نہ سوجھا تو لاؤنج میں آ کر اکیلی بیٹھ گئی۔

''منگنی کے بعد کچھ زیادہ ہی اتراہٹ آ گئی ہے اس کے اندر......'' اس نے جل کر سوچا...... ''چند دن میں ہی بہت بدل گئی ہے یہ...... میری ہر بات غلط لگتی ہے اس کو جیسے یہ بڑی اور میں چھوٹی ہوں۔'' وہ مستقل سوچے جا رہی تھی۔ اسی وقت صائمہ آنٹی چلی آئیں۔ شاید وہ کہیں باہر جا رہی تھیں کیونکہ اچھی طرح سے تیار ہو کر آئی تھیں۔

''میں ذرا مہر باجی کی طرف جا رہی ہوں۔'' ایک لمحہ رک کر انہوں نے آگاہ کیا اور انمول کی تو دلی مراد بر آئی۔

''میں بھی چلوں؟ بوریت ہو رہی ہے بہت۔ ایمل اپنا کام کر رہی ہے۔'' اس نے فٹافٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

''تم...... وہاں بھی بور ہی ہو گی...... چلو ٹھیک ہے چلی چلو...... اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں تمہارے پاس پھر تو چلی جاؤ گی پیا دیس......'' کہتے، کہتے صائمہ آنٹی شوخ سی ہو گئیں۔

ان کا مذاق اسے بے حد برا لگا مگر کیا کرتی برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ اس نے مصنوعی مسکراہٹ سے ان کی بات کا جواب دیا۔

''ابھی جب سب کے سر پر بم پھٹے گا تب پتا چلے گا سب کو......'' اس نے جارحانہ انداز میں سوچا۔

مہر آنٹی کے گھر ہمیشہ کی طرح خاموشی کا راج تھا۔ خدا نے ان کو ایک ہی بیٹی دی۔ مزید کوئی اولاد نہ تھی اور بیٹی بھی معذور تھی۔ یہ ان کی بہت بڑی آزمائش تھی، انہیں شمع کی بہت فکر رہتی تھی۔ کہنے کو ان کے پاس لاکھوں، کروڑوں کی جائداد تھی، مال و دولت تھا، عیش و عشرت ...... مگر اولاد صرف ایک اور وہ بھی معذور......

ان دونوں کو دیکھ کر مہر آنٹی خوش ہو گئیں۔

''ابھی میں دل سے تمہیں یاد کر رہی تھی۔'' صائمہ آنٹی کے گلے لگ کر وہ آبدیدہ ہو گئیں۔

''رات سے اب تک اتنی پریشانی اٹھائی ہے کہ اب اس سناٹے سے دل گھبرا رہا تھا۔'' انہوں نے خلوصِ دل سے اپنی پریشانی بتائی کیونکہ ان لوگوں کا آپس میں میل ملاپ بہت پرانا تھا۔ ایک دوسرے کے دکھ، درد اور خوشیوں کے ساتھی تھے وہ...... پرانے پڑوسی اور اچھے پڑوسی تھے۔

''رات مجھے وقار صاحب نے بتایا تو فکر لگ گئی مجھے...... جب سے ہی آنا چاہ رہی تھی مگر آپ کو تو پتا ہی

ہے جب سے مجھے شوگر ہوئی ہے میری ہمت ڈھیر ہو جاتی ہے۔ بس ان بچیوں کا دم غنیمت ہے۔'' صائمہ آنٹی نے محبت بھری نظر سے انمول کو دیکھا۔

''ہاں واقعی......اولاد تو والدین کے دل کی ٹھنڈک ہوتی ہے اور تم نے جس طرح ان بچیوں کو سمیٹا وہ بھی قابلِ تعریف ہے۔ ماشاء اللہ تمہاری عادت بہت اچھی ہے۔ اگر تم نہ ہوتیں تو یہ گھر بکھر جاتا۔'' مہر آنٹی نے دل سے تعریف کی۔

''بس اللہ جسے توفیق دے......وہی ہے جو کائنات چلا رہا ہے، سب کچھ اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔'' صائمہ عاجزی سے بولیں۔

انمول نے بیزاری سے پہلو بدلا۔ اسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شمع وہیں مہر آنٹی کے بیڈ پر سکون آور ادویات کے زیرِ اثر سو رہی تھی۔ ہر دورے کے بعد اس کے چہرے پر نقاہت اور پیلاہٹ سی آجاتی تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے شمع جی کی؟'' اس نے موضوع بدلا۔

''بس بیٹا......اللہ نے کرم کیا......ہر بار اس کی یہ حالت دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے......پتا نہیں کیا ہوگا میری بچی کا۔'' مہر آنٹی کی آواز بھیگ سی گئی۔

''فکر نہ کریں آپ......اللہ بہتر کرے گا۔ ساری دنیا کا نظام وہی چلا رہا ہے، وہی سب کچھ طے کرنے والا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو طے کیا ہوگا اس نے شمع بٹیا کے لیے۔'' صائمہ آنٹی نے ڈھارس دی۔

''ڈاکٹر کہتے ہیں اس کی شادی کردو......کہاں سے لاؤں اس کا بر؟'' مہر آنٹی نے بھرائی ہوئی سرگوشی کی۔

دونوں اپنی خاص باتوں میں لگ گئیں انمول چپ چاپ وہاں سے اٹھ گئی۔

''چھت پر آجاؤ......'' یوسف کا میسج ابھی، ابھی آیا تھا۔

وہ سہج، سہج قدم اٹھاتی چھت کی طرف بڑھی۔ آج تو شمع جی کا بھی ڈر نہ تھا ورنہ ہمیشہ وہ خطرے کی تلوار کی طرح سر پر لٹکتی رہتی تھیں۔ وہ ایک، ایک قدم اٹھاتی چھت کی سیڑھیاں چڑھتی گئی۔ ساری چھت خالی پڑی تھی۔ یوسف کہیں نہ تھا۔ اس نے سب طرف گھوم کر دیکھ لیا۔ شام کا ملگجا اندھیرا چھا رہا تھا۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ وہ تیزی سے مڑی ابھی وہ نیچے جانے والی سیڑھی کی طرف بڑھی ہی تھی کہ ٹیرس کی طرف سے یوسف نے آکر اس کے پیچھے سے ''ہاؤ'' کر دیا۔

''آ......آ آ......'' اس سے پہلے کہ وہ تیز آواز میں چیختی یوسف نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس کی چیخ اندر ہی کہیں گھٹ گئی۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے یوسف کو دیکھا، وہ اس کے بے حد قریب اس کے بازو کے حصار میں تھی۔

''تت......تم......بدتمیز......یہ کیا حرکت ہے؟ میری تو جان ہی نکل گئی۔'' اپنے وجود کو یوسف کے حصار سے نکال کر وہ گہری سانس بھرنے لگی۔

''اور جو تم نے میری جان نکالی......وہ کیا؟ جانتی ہو کیسے شعلوں میں لوٹ پوٹ ہو کر رات گزاری تھی میں نے......بس میں نے کہہ دیا اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا......میں اس کو تمہارے پاس نہیں دیکھ سکتا۔ ہرگز نہیں......'' وہ غصے سے بھرا ہوا تھا۔

''میں کوشش کر تو رہی ہوں، تم اپنا بتاؤ تم نے کیا، کیا اب تک......کرلی اپنی اماں سے بات؟ کب جاؤ گے تم گاؤں بات کرنے؟'' اس نے پوچھا۔

''اماں کو منانا میرا کام ہے......تمہارا مسئلہ مشکل ہے۔ پتا نہیں کیا ہوگا جب یہ معاملہ اٹھے گا تو؟'' یوسف کو فکر تھی۔

''اسی لیے میں سب کچھ پلاننگ سے کرنا چاہتی ہوں یوسف......یہی بات تم کو سمجھا رہی ہوں کہ اس کام میں وقت لگے گا......پہلے مجھے جاب کرنی ہے تاکہ میں ہر قسم کے دباؤ سے آزاد ہو جاؤں اور خود مختاری سے فیصلہ کرسکوں......پھر کوئی مداخلت نہیں کرے گا ہمارے معاملے میں۔ تم اپنی اماں کی رضامندی لے کر رکھو......'' اس نے رسان سے سمجھایا۔

''اتنا آسان نہیں یہ سب......لیکن تمہاری محبت میں سب کچھ کر گزروں گا......میں آخری سانس تک تمہارا انتظار کرسکتا ہوں۔'' یوسف نے بے تابی سے کہا۔

"ہاں لیکن پھر اعتبار بھی کرنا ہوگا کہیں کل کی طرح تم ذرا سی بات پر آؤٹ نہ ہو جاؤ......صرف تمہاری محبت میں اتنا بڑا قدم اٹھاؤں گی میں۔" اس نے جتایا۔

"وہ تو......بس یونہی مزے لے رہا تھا تم سے...... مجھے معلوم ہے کہ تم ہمیشہ سے میری ہو اور میری ہی رہو گی۔" یوسف نے مسکرا کر کہا۔

"کوئی آ نہ جائے یوسف......میں جا رہی ہوں۔" اسے آس پاس کی بھید بھری خاموشی سے خوف آنے لگا۔

"ابھی میرا دل نہیں بھرا...... پہلے ہی تم سے دوری کی سزا بھگت رہا ہوں، مت جاؤ ابھی...... پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم کہیں کھو جاؤ گی۔" وہ خوفزدہ سا بولا۔ اس نے غیر محسوس طور پر اس کے دونوں ہاتھ تھام کر گہری سانس بھری۔

"کوئی آ رہا ہے شاید......" اس نے ہاتھ چھڑائے اور سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ کوئی آواز ہوئی جیسے کوئی چل رہا ہو یا ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی آس پاس ہو۔

"کون آئے گا...... یہاں اوپر میرا اسٹڈی روم کم ٹارچر سیل زیادہ ہے۔ شمع جی تو بیمار پڑی ہیں۔ پہلے ہی وہ خون آشام بلا کی طرح سر پر مسلط رہتی ہیں۔ بات، بات پر غصہ کرتی ہیں اب ٹھیک ہونے کے بعد اور زیادہ بد مزاج ہو جائیں گی۔ کیا چیز ہیں یہ بھی۔ ابھی تو وہ بستر پر پڑی ہیں اور ممانی کی باتیں تو رات تک ختم نہیں ہوں گی۔ بس ابھی تم میری اور اپنی بات کرو صرف۔" اس کی بات کو اہمیت دیے بغیر اس نے...... بے پروائی سے کہا اور بے خودی کی کیفیت میں اس کے قریب ہو کر اسے دونوں شانوں سے تھام لیا۔

ٹیرس کی ٹھنڈی دیوار سے ٹیک لگانے کے باوجود انمول کو پسینے آ گئے۔

"انمول ......انمول......" جانی پہچانی آواز پر انمول نے چوکنا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یوسف تیزی سے کئی قدم دور ہو کر نیچے جھانکنے لگا۔

"یہ تو ایمل کی آواز ہے...... کیا ایمل بھی آئی ہے ساتھ میں؟" یوسف نے پوچھا۔

"نن......نہیں تو......" یہ کہتے ہوئے انمول نے اپنے گھر کی طرف دیکھا جہاں ٹیرس پر ایمل کھڑی عجیب ملامتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"پاگل لڑکی...... پیچھے ہی پڑ گئی میرے۔" وہ بوکھلا کر تیزی سے نیچے اتر گئی لیکن اس ساری مشقت میں بری طرح ہانپ گئی۔

اپنی بپھری سانسوں کو قابو کر کے وہ مہر آنٹی کے کمرے میں گئی تو صائمہ آنٹی بھی اسی وقت جانے کے لیے کھڑی ہوئی تھیں۔

"کہاں تھیں انمول......؟" صائمہ آنٹی نے سرسری سا پوچھا۔

"کہیں نہیں...... شمع جی کے کمرے میں ایک کتاب مل گئی تھی وہی پڑھ رہی تھی بیٹھ کر......" اس نے بات بنائی۔

مگر اندر سے گھبراتے، خوفزدہ دل کو ٹھیک ہونے میں بہت دیر لگ گئی۔ جیسے کوئی چور چوری کرتے پکڑا جائے وہی حال ہو رہا تھا اس کا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ غلط کر رہی ہے مگر دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ وہ بگڑی تقدیر کو اپنی ترکیبوں سے سنوارنا چاہتی تھی۔ وہ روایتوں کی زنجیروں کو توڑنا چاہتی تھی۔ وہ ساری عمر کا روگ نہیں پالنا چاہتی تھی۔

ایمل اس سے ناراض ہو گئی تھی۔ اس بار اس نے اسے کچھ بھی نہیں کہا۔ بس بات چیت بند کر دی......وہ سارا وقت اس سے بولتی رہی وہ ہاں، ہاں کر کے جواب دیتی رہی از خود اس سے کچھ بات نہیں کی۔ دوپہر تک یہی صورتِ حال رہی تو وہ اکتا گئی۔ اس نے بھی ایمل کو مخاطب کرنا چھوڑ دیا۔ بوریت سوا ہو رہی تھی۔ اس نے جویریہ کو فون ملایا سوچا کہ تھوڑی گپ شپ ہی ہو جائے گی مگر وہ نہ جانے کہاں مصروف تھی کہ فون ہی نہ اٹھایا۔ یوسف کو میسج کیا۔

"میں بہت بور ہو رہی ہوں۔" اس کا بھی جواب نہ آیا۔

پھر کچھ سوچ کر وہ اپنی الماری میں گھس گئی۔ اس نے اپنے میٹرک، انٹر کے سرٹیفکیٹ فائل سے نکالے۔ گریجویشن کا سرٹیفکیٹ باہر ہی نکال رکھا تھا جو کچھ روز قبل ہی

وہ جویریہ کے ساتھ نکلوا کر لائی تھی اور جنید سے اب تک یہی کہہ رہی تھی کہ وہ سرٹیفکیٹ ابھی نکلوائے گی۔ اسے وقت چاہیے تھا اور وہ خود اس کو طول دے رہی تھی۔ آئندہ کے لائحہ عمل پر غور و خوض کے بعد اس نے اس بار بھی جویریہ کی مدد لینے کا فیصلہ کیا کہ شاید وہ کچھ بہتر مشورہ دے۔

شام کو تیار ہو کر وہ جویریہ سے ملنے چل دی۔ اسے اچانک سامنے پا کر جویریہ کھل اٹھی۔

''سرپرائز...... کیا حال ہے بھئی، ابھی تم کو ہی یاد کر رہی تھی میں......'' جویریہ بے اختیار اس کے گلے لگ گئی۔

''بس منہ دیکھے کی رہنے دو...... پلٹ کر حال بھی نہیں پوچھ رہیں...... پتا بھی ہے کہ میں کتنی مشکل میں ہوں...... کچھ مدد کرو ناں میری......'' وہ دھپ سے صوفے پر گرتے ہوئے بولی۔

''ارے...... تمہارا افئیر ابھی تک چل رہا ہے۔ کم آن سلی گرل میں سمجھی کہ تم اس نئے رشتے کو قبول کر چکی ہو اور میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ پرانی باتوں پر مٹی ڈالو......'' جویریہ نے بے پروائی سے کہا۔

وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے اس کی بات غیر اہم ہو مگر انمول تڑپ سی گئی۔

''یار...... وہ کوئی معمولی سا فلرٹ نہیں ہے...... وہ میری پرانی محبت ہے جو رگوں میں خون کی طرح گردش کر رہی ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔ کچھ کرو ناں پلیز......'' وہ رونے والی ہو گئی۔

''فولش گرل...... تم تو بہت ہی جذباتی ہو...... ارے کچھ سیکھنا ہی ہے تو وقاص سے سیکھو...... جو ہر سال گرل فرینڈ بدلتا ہے اور ہر ایک سے محبت کا دعوے دار بھی بنتا ہے۔ وہ لڑکیاں بھی سر جھکا کر نئے ساتھی کو اپنا لیتی ہیں۔ اچھی لڑکیوں کی طرح پرانی محبت کو دل میں دبا کر نئی زندگی کی شروعات کرو۔'' اس نے بہترین مشورہ دیا۔

''آہم...... آہم...... مجھ ناچیز کا ذکر بلاوجہ اور میری غیر موجودگی میں کیوں ہو رہا ہے۔'' وہ نہ جانے کب وہاں آیا اور دونوں کی باتیں سن لیں۔

''ہاں...... تمہاری تعریف کر رہی تھی میں......'' جویریہ نے نثار ہوتی نظروں سے بھائی کو دیکھا۔ انمول نے کچھ حیرانی اور خوشی سے اسے دیکھا۔

''ارے وقاص کب آیا؟ کیا اب یہ واپس آ گیا دوبارہ۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں بھئی زبردستی دو چار دن کے لیے آیا ہے۔ ابو کو پتا لگا تو ناراض ہوں گے اس پر انکل سے جھوٹ بول دیا کہ بہن یاد کر رہی ہے۔'' جویریہ نے تفصیلی سے بتایا۔

''اور سنائیں انمول جی کیسی ہیں آپ، بڑے دنوں بعد نظر آئیں۔'' اسے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔

وقاص سے اس کی کافی بے تکلفی تھی۔ یوسف کے ساتھ کی کئی یادگار ملاقاتوں کا وہ بھی راز دار تھا۔ جویریہ کا چھوٹا بھائی تھا مگر ایک دم فلرٹ اور تیز لڑکا تھا حتیٰ کہ اس نے انمول کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔

''اگر یہ یوسف صاحب درمیان میں نہ ہوتے تو میں آپ کو کہیں نہ جانے دیتا۔ میرے جیسا ویل ڈریسڈ، خوش شکل اور ٹپ ٹاپ والا لڑکا آپ کو بھلا کہیں ملے گا۔'' ایک بار اس نے مذاق میں کہا تھا۔ اور وہ بات ہنسی مذاق میں ٹل گئی تھی۔ اس کے بعد سے وہ جویریہ کی طرح اس کا بھی بہترین دوست بن گیا تھا۔

''کیسی نظر آ رہی ہے، پریشان ہے بیچاری اب تم ہی کوئی حل نکالو......'' اس کے بجائے جویریہ نے جواب دیا اور مختصراً اس کی پریشانی بتا دی۔

''ارے مٹی پاؤ...... بھول جاؤ پرانی محبت اور پرانی باتوں کو...... اپنی زندگی بناؤ' یہ سب کتابی باتیں ہیں، حقیقت میں وفا، دوستی اور عشق سب بیوقوفی ہے۔ مجھے دیکھو کتنی لڑکیوں کو پٹاتا ہوں...... سب میرے ساتھ آؤٹنگ پر جاتی ہیں۔ وعدے وعید کرتی ہیں اور پھر جب اپنا لائف پارٹنر ملتا ہے تو پلٹ کر پوچھتی بھی نہیں۔ نئی زندگی میں مگن ہو جاتی ہیں۔'' اس نے ہاتھ جھاڑ کر بے حد سرسری سے انداز میں اس کی بات لی۔

''ہاں، اگر کسی دن مل گئی ناں... کوئی ٹیڑھی کھیر تب پھنسو گے تم...... باز آ جاؤ اپنی حرکتوں سے۔ انکل

سیدھا کر دیں گے تم کو......‘‘ جویریہ نے ڈرانا چاہا۔

’’ارے کچھ نہیں ہوتا یار...... نیا دور ہے...... سب لگے پڑے ہیں واٹس ایپ پر، فیس بک پر...... سب طرف یہی کچھ ہو رہا ہے۔‘‘ اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔

’’مگر میرا معاملہ دوسرا ہے۔ فلرٹ میں اور سچی محبت میں فرق ہوتا ہے۔ میں نے وقت گزاری کے لیے یوسف سے محبت نہیں کی۔‘‘ انمول نے اسے جتایا۔

’’اچھا...... سچی محبت ہے ان سے آپ کو اور ان موصوف کو کتنی محبت ہے آپ سے؟‘‘ اس نے سوال کیا۔

’’وہ بھی میرے لیے سنجیدہ ہے، وہ میرا ساتھ دینے کو تیار ہے۔ اسے بھی مجھ سے اتنی ہی محبت ہے جتنی میں اس سے کرتی ہوں۔‘‘ اس نے یقین کے ساتھ بتایا۔

’’اچھا! آپ نے اپنی اور ان موصوف کی محبت کو کس پیمانے میں ناپا تھا؟‘‘ اسے بغور دیکھ کر اس نے اگلا سوال کیا۔

اس کے فلسفیانہ سوالات سے وہ چڑ سی گئی۔ وہ تو ویسے بھی لفظوں کا کھلاڑی تھا، اپنی اسی خاصیت کی بنا پر وہ لڑکیوں کو گھیر لیا کرتا تھا اور کچھ ہینڈسم بھی تھا۔

’’یہ کیا فضول سوال ہے؟‘‘ وہ چڑ کر بولی۔

’’اچھا...... اتنا یقین ہے ان موصوف پر...... تو پھر وہ اس وقت کہاں تھے جب آپ کسی اور کی ہو رہی تھیں؟‘‘ اس نے استہزائیہ سے انداز میں سوال کیا۔

’’اس وقت کنڈیشن دوسری تھی...... وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا اس وقت...... سمجھو کہ وہ وقت ہی خراب تھا۔ میرے اور اس کے حق میں برا ہی ہوا جب...... نہ وہ کچھ کر پایا اور نہ میں......‘‘ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

’’تو اب کیا کرنا ہے پھر؟‘‘ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔ جویریہ کافی تیار کر کے لے آئی تھی۔ اب ان دونوں کے ساتھ بیٹھی پوری دلچسپی اور توجہ سے باتیں سن رہی تھی۔

’’اب میں کچھ نہ کچھ تو کر سکتی ہوں ناں...... میں اسٹینڈ لینا چاہتی ہوں۔ اور میں کچھ نہ کچھ کر ہی لوں گی۔‘‘ انمول نے جواب دیا۔

ناچ نہ جانے

بور ہو رہی تھی، کچھ کام کرنے کا موڈ نہیں تھا۔ مطالعے میں بھی دل نہ لگا۔ پھولوں، پودوں کی بھی خبر نہ تھی۔ سوچا الماریوں کی صفائی کی جائے مگر دل نہ لگا۔ سو ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی کہ صرف شام کو ذرا خبریں وبریں کوئی ٹاک شو دیکھ سن لیتی ہوں۔ چینل بدلتے، بدلتے ایک چینل پر ہاتھ روک لیا۔ لوگ ناچ رہے تھے، ہوسٹ نچوا رہے تھے۔ کمپیئر کی زبان کے ساتھ وہ خود بھی خوب تھرک رہے تھے، بول رہے تھے۔ لوگوں کو نچوا کر موٹر سائیکل دے رہے تھے۔

جی ہاں، میں نے دیکھا کہ چند شریف حضرات جن میں باریش بزرگ بھی شامل تھے کو بار، بار ایک گانے پر نچوایا جاتا۔ ان کا مذاق اڑایا جاتا ان کا مقابلہ کرایا جاتا۔ اور پھر ایک عدد شامت کا مارا اگر جیت جاتا تو موٹر سائیکل پر بٹھا کر اس کی زوجہ محترمہ کو بھی بلایا جاتا اور وہ مارے خوشی کے بے حال ہوتی ہوئی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر یعنی (جیت کر) یہ جا وہ جا۔

کیا خوب شوہروں کو سر بازار نچوا کر ایک عدد موٹر سائیکل گھر لے جائیں۔ چلیں جن کے پاس سواری نہیں ہے تو کم از کم چھ عدد بچوں کو بٹھا کر اسکول چھوڑ آیا کریں گے۔ مگر اس بے عزتی کو میں ہضم نہیں کر پا رہی ہوں اب تک...... لیجیے اب دوسرا چینل بدلا یہاں تو ہوسٹ کا لباس دیکھ کر ہی طبیعت بدمزہ ہو گئی۔ اچھلتے کودتے ایک جگہ سے دوسری جگہ ’’خیرات‘‘ بانٹتے وہ بالکل بندر لگ رہے تھے۔ اچھی بھلی شخصیت کا مالک تقریباً عریاں لباس میں بازوؤں کے ڈولے کالے رنگ کی ٹائٹ بنا آستین کے بنیان سے جھانک کر پبلک میں موجود جوان بچیوں، ماؤں کا ایمان خراب کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں دادی، نانی ہو کر مارے شرم کے مزید برداشت نہ کر سکی تو ہال میں بیٹھے لوگ...... اف توبہ...... یہ، یہ چینل کہاں لے کر جا رہے ہیں اور ان میں شرکت کرنے والے اچھے بھلے شہری...... یہ مملکت خداداد، اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے جو پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کے نام پر بنا...... ہماری نئی نسل تو گئی کام سے۔ یا اللہ! اس عذاب سے نجات دے کہ قوموں پر عذاب خدا کی نافرمانی سے ہی آتے ہیں۔

اسی لیے ہمارے گھر ٹی وی بند رہتا ہے۔ غور کیجیے کہ دنیا میں مسلم ممالک پر عذاب کس، کس شکل میں آئے اور کیوں کر آئے...... اپنے چینلز یہ دکھا رہے ہیں تو غیر ملکی میڈیا کا کیا رونا روئیں......

شکستہ دل: فریدہ افتخار، اسلام آباد

''مثلاً کیا؟'' اس نے پوچھا۔
''اُف...... یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟ بس مجھے اس سے چھٹکارا پانا ہے اس کے لیے کچھ بتاؤ......'' وہ جھلا کر بولی۔
''ہاہاہا......'' اس نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اس کے ساتھ جویریہ بھی ہنسنے لگی۔ وہ احمقوں کی طرح دونوں کو دیکھنے لگی۔
''زبردست بھئی زبردست...... کیا پلاننگ ہے آپ کی...... عزائم اتنے اونچے اور پلاننگ اتنی بودی...... ہی ہی...... ہاہا......'' اس کی تو ہنسی ہی نہیں رک رہی تھی۔
''وقار...... میں سنجیدہ ہوں، پلیز ہیلپ می...... جویریہ اسے سمجھاؤ ناں......'' اس نے خاموش بیٹھی جویریہ کو بولنے پر اکسایا۔
''میں کیا بولوں...... اس کے سامنے کوئی نہیں بول سکتا بھئی...... یوں چٹکیوں میں باتوں کو اڑا دیتا ہے۔ میری کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا اس پر......'' جویریہ نے بے بسی سے کہا۔
''آپ بھی بہت...... بس کیا کہوں، میرا خیال ہے ساری لڑکیاں ہی بیوقوف ہوتی ہیں۔'' وہ اپنے ہی نظریے سے بات کرنے لگا۔
''وقار...... اگر کچھ کر سکتے ہو کوئی حل نکال سکتے ہو تو نکالو ورنہ اٹھ کر جاؤ یہاں سے۔'' جویریہ نے ذرا سخت لہجے میں کہا اس کے بعد وہ کچھ سنجیدہ سا ہو کر بیٹھ گیا۔
''میرا معاملہ عام معاملہ نہیں ہے...... تم سمجھ کیوں نہیں رہے؟'' اس نے بیچارگی سے کہا۔
''سیدھا سا حل ہے آپ جنید صاحب سے صاف کہہ دو کہ آپ ان کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتیں......'' اس نے تو جیسے بات ہی ختم کر دی۔
''یہ کوئی اتنا آسان نہیں ہے...... میں چاہتی ہوں اس طریقے سے سب کچھ ہو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔'' اس نے کہا۔
''یعنی آپ کو کوئی غلط نہ سمجھے...... اور جنید صاحب بھی منظر سے غائب ہو جائیں۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔
''آئیڈیا...... اس کا بہترین حل یہ ہے کہ کسی پیشہ ور سے کام تمام کرا دیا جائے۔'' اس نے ایک اسٹائل سے چٹکی بجا کر اور ہاتھ لہرا کر کہا۔
''وقاص...... بی سیریس......'' جویریہ نے تنبیہ کی۔
''ایک اور حل ہے میرے پاس...... وہ یہ کہ جنید صاحب پر کوئی الزام لگا دیا جائے...... اور اسی بات کو سامنے رکھ کر ان سے چھٹکارا پالیا جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ کرائے کے غنڈوں سے ہاتھ پاؤں تڑوا دیے جائیں تو خود بخود ہی چھٹکارا مل جائے گا۔'' اس نے جلدی، جلدی ایک کے بعد ایک حل نکالے۔
''وقاص...... تم جاؤ یہاں سے۔'' جویریہ نے کچھ اس طرح کہا کہ ایک دم ہی سوری کہہ کر وہ اٹھ کر چلا گیا۔
''یہ تم کو خاک بتائے گا کچھ، یہ تو خود پرابلم بنا ہوا ہے میرے لیے...... اس کے آئے روز کے افیئرز اس کو بدنام کر رہے ہیں۔ اس کا کردار خراب ہو رہا ہے۔ مگر یہ کچھ سنتا ہی نہیں...... یہ تمہارے معاملے کو سمجھ ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ خود فیئر نہیں ہوتا کسی لڑکی کے ساتھ۔'' جویریہ نے دھیرے سے اسے سمجھایا۔
''میں سوچتی ہوں کچھ...... کرتی ہوں کچھ......'' جویریہ نے اسے ڈھیر تسلی دے کر گھر روانہ کیا تھا۔

☆☆☆

''کہاں تھیں تم...... ایمل سے پوچھا تو اسے بھی معلوم نہیں تھا۔'' وہ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو صائمہ آنٹی کی پکار نے اس کے قدم روک دیے۔
''جویریہ کی طرف گئی تھی۔ ارجنٹ جانا پڑا اسے کام تھا مجھ سے کچھ۔'' اس نے خشک سے بیزار لہجے میں کہا۔
''خیریت ہے...... طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ چہرہ کیسا پھیکا سا پڑ رہا ہے۔ آج میرے ساتھ چیک اپ کے لیے چلی چلو......'' صائمہ آنٹی نے بغور اسے دیکھ کر کہا۔
''افوہ، کچھ نہیں ہوا مجھے، بس یونہی تھکن ہوگئی ہوگی۔'' اس نے رسان سے کہا۔
''تھکن......؟ ہاں یہی کہہ رہا تھا جنید، کیسی تھکن ہو رہی ہے تم کو...... وہ بتا رہا تھا مجھ کو...... کیا مسئلہ ہے کوئی؟''

صائمہ آنٹی کی گہری نظریں اس کے وجود کے پار ہو رہی تھیں۔ ان کے یوں دیکھنے پر اس کا چہرہ مزید زرد پڑ گیا۔

''آنکھوں کے گرد حلقے بھی ہو رہے ہیں تمہارے......'' صائمہ آنٹی نے مزید اس پر نظر ڈالی۔

''کچھ بھی نہیں ہوا، لگ رہا ہے آپ کو...... اور جنید بھی بس بیکار کی باتیں کرتے ہیں۔'' اس نے بات اڑانے کی کوشش کی۔

''اب کب آئے گا جنید......؟'' انہوں نے اگلا سوال کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس سے جنید کے بارے میں بات کرے۔

''پتا نہیں، میری بات نہیں ہوئی ابھی۔'' وہ رکھائی سے جواب دے کر تیز قدموں سے اندر چلی گئی۔

ایمل بیڈ پر نیم دراز فون پر مصروف تھی۔ اس کے چہرے پر گلابیاں چھلک رہی تھیں اور مسکراہٹ رقصاں تھی۔ یقیناً وہ فیصل کا فون تھا۔ وہ اور بھی جل کر خاک ہوگئی۔

''مجھ سے بول نہیں رہی...... اور اس سے لگی پڑی ہے۔ خود کو تو سب کچھ من پسند مل گیا ناں...... سچ ہے برے وقت میں کوئی ساتھ نہیں دیتا۔'' وہ غصے اور کوفت سے شولڈر بیگ وہیں پٹخ کر کمرے سے باہر نکلی اور پچھلے برآمدے میں چلی آئی جہاں سب طرف ملگجی شام بکھری تھی۔ بادام کا پیڑ ساکت کھڑا اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کے دکھ سے باخبر ہو، وہ بھی اس کا بہت پرانا ساتھی اور رازدار تھا۔ اس کے سرخ سبز پتوں میں خاص دلکشی کے ساتھ، ساتھ اس کی زندگی اور محبت کی بھید بھری کہانی بھی چھلکتی تھی۔

وہ اس کے بچپن کا سنگی ساتھی تھا۔ جب کبھی اسے ہوم ورک نہیں کرنا ہوتا تھا وہ ماما سے چھپ کر یہیں آکر بیٹھتی تھی یا پھر کبھی ماما سے روٹھ جاتی تو تب یہیں چھپ کر بیٹھ جاتی حالانکہ اسے پتا تھا کہ ماما اسے ڈھونڈ لیں گی مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ یہیں اسی گوشے میں پناہ لیتی تھی۔ اس گوشے سے اس کی ڈھیر ساری یادیں منسوب تھیں۔ یوسف اس کے بہت اصرار پر اسے پیڑ سے بادام توڑ کر دیتا تھا۔ ان ترش وکسیلے باداموں کو وہ بڑے شوق سے کھاتی تھی۔ ایک بار کانچ کی پلیٹ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی تھی۔ اور اس کی انگلی میں کانچ چبھ گیا تھا تب یوسف نے ہی اپنا رومال اس کے زخم پر باندھا تھا۔ اس وقت ان دونوں کے درمیان خاموش محبت چل رہی تھی...... بن کہے ایک دوسرے کے دکھ سمجھ لینا...... بن کہے ایک دوسرے کے دل کی بات جان لینا...... یہ سب خود بخود ہو رہا تھا۔

یوسف بھی بادام کے پیڑ تلے اس کی تنہائیوں کا ساتھی تھا کبھی سچ میں اور کبھی تصور میں اور زندگی کے بہت سے ناقابلِ یقین دکھ...... روح فرسا حقیقتیں اور سانحے بھی اس نے یہاں تنہا بیٹھ کر کاٹے تھے۔ تب اس کے آنسو پونچھنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ کوئی اسے ڈھونڈنے والا وہاں نہیں تھا...... وہ پہروں وہاں بیٹھی رہتی کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ کیسا عجیب وقت تھا وہ کہ جب سب طرف پرائی ہوائیں چل رہی تھیں۔ کوئی بھی تو اپنا نہ رہا تھا۔ کوئی اس کے دکھ کو سمجھنے یا احساس کرنے والا نہیں رہا تھا۔

تب وہ بے پانی کی مچھلی کی طرح تڑپی تھی مگر اس کی تڑپ کا تماشا دیکھنے والا صرف وہ بادام کا پیڑ تھا جس کے سرخ، سبز پتوں میں زمانوں کے اسرار چھپے تھے۔ اس کا کوئی خیرخواہ تھا نہ ہمدرد......

اس نے ان پرائی ہواؤں کو گھر میں سب طرف دھڑلے سے پھیلتے دیکھا مگر کچھ نہ کر سکی۔ یہاں تک کہ اس کے آنسو کسی خشک سمندر کی طرح سوکھ گئے اور چمکتے رخساروں پر آنسوؤں کے نشانات جم سے گئے۔

اسے اپنے آنسوؤں پر اختیار نہ رہا...... وہ بے اختیار بکھر کر روتی چلی گئی۔ آج بھی وہ اتنی ہی اکیلی تھی جتنی پہلے تھی۔ ماما کے علاوہ اسے کبھی کوئی خود سے مخلص نہیں لگا تھا۔ حتیٰ کہ ایمل بھی...... وہ اس کی ماں جائی...... اس کے دکھ سکھ سے واقف تھی مگر اتنا خراب سلوک کر رہی تھی اس کے ساتھ۔ اس کا ساتھ دینے کے بجائے اسے پسپائی کے مشورے دے رہی تھی۔ اس کا دل ایمل کی طرف سے بھی کھٹا ہو گیا۔ اچانک

ہواؤں میں شدت سی آ گئی جیسے اس کے دکھ پر وہ بھی غصے سے سر پٹخ رہی ہوں۔ آندھی آ رہی تھی...... ہوا کے ساتھ مٹھی بھر مٹی کے تھپیڑے چہرے اور آنکھوں میں چبھنے لگے۔ کسی کمرے کی کھڑکی کے پٹ ہوا کے زور سے زوردار آواز میں بند ہوئے۔ اس کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا۔ اوپر سے وہ کتنی ہی جی دار بن جاتی مگر تھی تو وہ ایک کمزور لڑکی ہی ناں جو حوادث کے تھپیڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے عزائم بے شک بہت بلند تھے مگر اندر سے وہی ایک سہمی ہوئی خوفزدہ لڑکی تھی۔ وہ کچھ ڈر کر اور گھبرا کر اٹھ گئی اور پلٹ کر اندر جانے لگی۔ اس کے دوپٹے کا پلو زمین کو چھوتا ہوا جا رہا تھا مگر اسے خبر نہ تھی۔

اندرونی حصے میں سب طرف خاموشی تھی۔ کسی نے لاؤنج کی لائٹ بھی نہیں جلائی تھی۔ کچن خالی پڑا تھا۔ صائمہ آنٹی کے کمرے سے ہلکی روشنی جھلک رہی تھی۔ ان کے کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ ان کی ہلکی پھلکی سی ہنسی کی آواز باہر تک آ رہی تھی اور ان کا موڈ اتنا خوشگوار جب ہی ہوتا تھا جب ان کی بیٹی ثنا انہیں فون کرتی تھی۔ اس کا دل کچھ اور بھی برا ہو گیا۔

وہ کمرے میں آئی تو ایمل کہیں نہ تھی۔ اس نے اسے ڈھونڈنے یا دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ وہ اس سے ناراض تھی بلکہ شاید وہ ساری دنیا سے ناراض تھی۔

اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایمل اس کا رویا ہوا چہرہ دیکھ کر اس سے زبردستی کی ہمدردی کرے۔ اس کا موڈ بہت خراب ہو چکا تھا۔ وہ پلنگ پر چادر تان کر لیٹ گئی۔

سب طرف نیلگوں سا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ اردگرد کا ماحول صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس راستے پر چلتی جا رہی تھی۔ شاید وہ حالت خواب میں تھی۔ اس نے سرخ کپڑے پہن رکھے تھے اور دلہنوں کی طرح تیار تھی لیکن وہ سر جھکا کر نہیں بلکہ سر اٹھا کر چل رہی تھی۔ اسے چلتے ہوئے بہت سکون مل رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے پاؤں تلے دبیز قالین بچھا ہے۔ اچانک اس کے سر پر کچھ چمگادڑیں منڈلانے لگیں۔ وہ ان سے ڈر کر اور بچ کر چلتی رہی۔ وہ بار، بار ان چمگادڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ ڈر کے مارے اس کا دل تیز، تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ یہ راستہ جلدی طے کرنا چاہتی تھی مگر راستہ اسی قدر طویل اور مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک اسے دور کچھ رنگ نظر آئے۔ وہ نمایاں نہ تھے مگر اپنے وجود کا پتا دے رہے تھے۔ وہ غور سے ان کو دیکھتی کچھ اور تیزی سے آگے بڑھی۔ روشنی کا مدھم سا ہیولہ سب طرف پھیلتا جا رہا تھا اور روشنی نمایاں ہونے کے ساتھ، ساتھ چمگادڑیں بھی کہیں پیچھے رہ گئی تھیں۔ مگر یہ تیز روشنی نہ تھی۔ اس کے ہونٹوں پر دلفریب سی مسکراہٹ ابھری کچھ یوں کہ اس کا ٹیکا اور اس کی نتھ بھی مسکرا اٹھی۔ اس کے پاؤں کی پائل کی چھن، چھن کچھ تیز ہو گئی اور وہ سمجھ گئی کہ اب یہ مشکل راستہ ختم ہونے والا ہے۔ وہ رنگ اب بھی نظر آ رہے تھے مگر بہت مدھم سے۔ وہ ان کے قریب تر ہوتی جا رہی تھی اچانک سارا منظر نمایاں ہو گیا۔ وہ رنگ بہت سے خوشبودار پھول تھے۔ نیلے، پیلے، لال اور گلابی رنگ کے حسین و خوب صورت پھولوں کا جھرمٹ دل لبھا رہا تھا۔ اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا اور وہ تو اتنے خوب صورت پھولوں کو دیکھ کر دیوانی سی ہو گئی۔ وہ خراماں سی چال یک دم ہی تیز ہوئی اور وہ بھاگتی ہوئی ان پھولوں کو سمیٹنے آگے بڑھی۔

اس نے ہاتھ آگے بڑھائے اور یک دم ہی وہ سارے پھول شعلوں میں بدل گئے۔ آگ کا بھڑکتا الاؤ اس سے پہلے کہ اسے جھلساتا وہ زور سے چیخ پڑی۔ کئی چمگادڑوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ آس پاس بلند ہوئی۔ اس نے گھبرا کر سر پر ہاتھ رکھنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی کسی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''خدا خیر کرے...... خدا تمہیں ہر آفت سے بچائے۔''

ماما کی آواز سے اس کے کانپتے دل پر سکون چھا گیا۔

''ماما...... ماما......'' اس نے گھبرا کر آواز دی مگر ماما کہیں نظر نہیں آئیں۔

''ماما......'' وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔

(باقی آئندہ)

ناولٹ

اے کربِ ندامت

ساجدہ گابا

ہال نما کمرے میں خوب صورت اور جدید طرز کی ڈائننگ ٹیبل کے گرد کرسیوں پر کچھ خواتین براجمان تھیں۔ انواع واقسام کے کھانے میز کی زینت بنے ہوئے تھے۔ اس کے اردگرد بیٹھی عورتیں اپنی ڈائیٹ کا خیال رکھتے ہوئے تھوڑا تھوڑا کھا رہی تھیں۔ یہ تمام عورتیں بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھیں مگر جدید طرز کے لباس، جدید ہیئر اسٹائل اور ان کے متناسب وجود نے انہیں اس حد تک بوڑھا نہیں کیا تھا۔ شیریں



بیگم سربراہی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ ہلکے نیلے رنگ کے جدید لباس میں بالوں کو اسٹائلش طریقے سے باندھا گیا تھا۔ شیریں بیگم کے چہرے کی متانت اور سنجیدگی ان کی شخصیت کا حصہ معلوم ہونے لگی تھی۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔ ان سب خواتین کے بیچ ایک جوان، دلکش اور خوب صورت لڑکی ماہم ان سب کی میزبانی کر رہی تھی۔ اس نے ایک جدید و خوب صورت لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔

''آپ اپنے کام سے کام رکھا کریں...... سعید کو میرے خلاف بھڑکانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ارے نہیں بیٹا! وہ تو بس یونہی آ کر بیٹھ گیا تھا۔ میرے پاس۔ میں اسے تمہارے خلاف نہیں بھڑکا سکتی۔''

''بس زیادہ بھولی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس اچانک آنے والے شور سے سب ہی چونکے تھے...... یہ آواز سامنے رہائش پزیر الیاس صاحب کے گھر سے آرہی تھیں۔ دیوار سے دیوار ملے گھر جن کی کھڑکیاں بھی کھلی ہوئی تھیں...... ان ساس، بہو کے درمیان بہت سے مسائل تھے، ہر وقت کا لڑائی جھگڑا اس گھر کا مقدر تھا۔

''اُف یہ لوگ تو ہر وقت ہی لڑتی رہتی ہیں۔'' مسز عذرا جلیل نے تبصرہ کیا۔

''پر یہ لوگ آئے کب ہیں کچھ دن پہلے تک تو یہ گھر خالی تھا۔'' مسز شائستہ نیاز نے پوچھا۔

''ابھی نئے، نئے ہی آئے ہیں۔'' مسز جلیل نے بالوں کو جھٹکا دے کر ایک ادا سے کہا۔

''ان کی بہو تو خاصی بدتمیز ہے آواز تو دیکھو......'' مسز نیاز فوراً بولیں۔ اور شیریں بیگم نے کسمسا کر پہلو بدلا۔

''اس سوسائٹی میں رہنے کے کوئی طریقے ہوتے ہیں اس طرح کا بھونچال یہاں نہیں چلے گا۔'' مسز فاطمہ رضی نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''اُف......! دوسروں کی ذاتیات پر اتنے تبصرے۔'' ماہم نے افسوس سے سوچا۔ عورت چاہے کسی بھی کلاس سے تعلق رکھتی ہو دوسروں کی عادات پر تبصرہ اور ان کی برائیوں کا شمار اس سے بہتر کوئی کر نہیں سکتا۔

''ایکسکیوزمی......!'' ماہم نے ایک نارمل مسکراہٹ ان سب کی طرف اچھالی اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

مسز شیریں اپنے کمرے میں آئیں تو لگتا تھا کہ میلوں کی مسافت طے کر کے آئی ہوں...... ان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

''نازو! نازو۔'' کمرے میں آ کر وہ اپنی ملازمہ کو پکارنے لگیں ملازمہ کسی جن کے مانند جھٹ سے حاضر ہوگئی۔

''دیکھو کمرے کی لائٹ آف کردو، میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' ملازمہ بتی بجھا کر چلی گئی۔ مسز شیریں نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی اور انہیں کچھ دیر پہلے کی باتیں یاد آنے لگیں۔ انہیں شائستہ کی بات یاد آئی۔

''ان کی بہو تو خاصی بدتمیز ہے۔'' وہ پاٹ دار آواز بدتمیزی ہی کی تھی۔ انہوں نے کرب سے آنکھیں موندلیں، وقت کا پہیا پیچھے گھوم گیا تھا۔

☆☆☆

سبز پیراہن...... پہنے خوش رنگ و خوشحال پھولوں سے سجی بوگن ویلیا کی بیل ہوا کے زور پر جھوم رہی تھی اور ایک لڑکی جو تقریباً سترہ، اٹھارہ برس کی معلوم ہوتی تھی، اپنے کام نمٹا رہی تھی۔ گھر کے دیگر ملازمین بھی مستعدی سے کام میں مصروف تھے۔ لاؤنج کے دائیں طرف ایک کمرا تھا جہاں ایک سن رسیدہ خاتون سر پر دوپٹا جمائے بیٹھی تھیں۔ اور وقفے، وقفے سے ایک ہی صدا لگاتی تھیں۔

''ماہم......! اندر آجاؤ...... اب تم تیار ہوجاؤ، وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔''

گیٹ کے باہر ہارن کی آواز سے سب متوجہ ہوئے۔ ملازم نے گیٹ کھولا۔ وہ کچن میں سے اپنی تیاری کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتی باہر نکلی تھی۔ ملازم بیگ اٹھائے اندر داخل ہوا۔ اور ان کے پیچھے، پیچھے شیریں جمال صاحب اور ان دونوں کا ایک عدد بیٹا

تنزیل اندر داخل ہوئے۔ یہ لوگ دبئی سے آئے تھے جبکہ تنزیل کراچی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور وہیں ہاسٹل میں رہائش پزیر تھا۔ یہ گھر اس کا اپنا تھا مگر یہاں اس کی بیوہ خالہ اور ان کی ایک عدد پیاری سی بیٹی رہائش پزیر تھیں۔ اس لیے وہ یہاں کم، کم ہی آتا تھا۔ شیریں بیگم اپنی غیر موجودگی میں اس کا یہاں آنا پسند نہیں کرتی تھیں۔

''ستیاناس کر دیا ہے۔ میرے لان کا...... اتنی خوب صورتی سے سجایا تھا، میں آجاؤں تو جب کھل جاتا ہے ذرا سی توجہ سے...... اور باقی کا تمام عرصہ تم لوگ اسے اجاڑنے کی قسم کھالیتے ہو۔'' جمال صاحب نے ایک حیران نظر اس خوب صورت باغ اور پھر شیریں بیگم پر ڈالی۔

''کیا ہوگیا ہے بیگم آپ کو اتنی اچھی طرح سے تو دھیان رکھا ہے۔''

''آپ کو باغبانی کے بارے میں کوئی علم بھی ہے بلاوجہ ہر جگہ بولنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' تنفر سے منہ موڑتی آگے بڑھ گئیں...... اور پھر اپنی بہن کے کمرے کی طرف دیکھا اور منہ موڑ کر چلی گئیں۔

''آپا......!'' جمال صاحب کمرے کی طرف بڑھے...... تنزیل ان کے پیچھے تھا وہ دونوں بہت ہی شرمندہ تھے۔ تبسم بیگم نے اسے اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا...... ڈھیروں دعاؤں سے نوازا۔

''آپا! وہ شیریں...... پتا نہیں کیا ہوگیا ہے، سفر سے تھک گئی ہے شاید......'' جمال صاحب شرمندگی سے بولے۔

''ہاں، ہاں! میں سمجھ سکتی ہوں کوئی بات نہیں تم دونوں بھی اب آرام کرو بلکہ پہلے کھانا کھالو یہ زیادہ بہتر ہے۔'' مسکرا کر تبسم بیگم نے کہا اور ماہم کی طرف رخ موڑا۔

''جاؤ بیٹا کھانا لگانے کی تیاری کرلو......''

''جی اچھا......!'' کہہ کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

شیریں اور تبسم دو بہنیں تھیں۔ دونوں کی شادی ماں، باپ نے بڑے ارمانوں سے کی۔ شیریں بیگم کو جمال صاحب سے محبت ہوگئی تھی اور یونیورسٹی میں اس محبت کی بہت دھوم تھی۔ جمال صاحب جانتے تھے کہ شیریں زبان کی تلخ ہیں مگر پھر بھی وہ ان پر جان چھڑکتے تھے اور ماں، باپ کو اپنی پسند بتا کر شادی کرنے کی اجازت بھی مل گئی۔ زبان کی تلخ ہونے کی وجہ سے سسرال والوں کے ساتھ ان کی زیادہ نہیں بن سکی۔ اس لیے جمال نے الگ گھر کا بندوبست کرلیا تھا۔ یہاں بھی جمال صاحب کی محبت میں...... کوئی فرق نہیں آیا۔ اللہ رب العزت نے انہیں تنزیل جیسی خوشی سے نوازا تھا۔ جس پر شیریں بیگم کی اتراہٹ کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

تبسم کی شادی ماں، باپ نے اپنی پسند سے کی، عادتاً وہ ذرا شرمیلی تھیں۔ شادی کے بعد بہت خوشحالی دیکھی۔ بدقسمتی سے ماں، باپ جلد ہی اس دنیا سے چلے گئے۔ لیکن شوہر نے اس تکلیف کے وقت میں بہت ساتھ دیا۔ اس غم کو بھلانے میں علیم صاحب نے ہر ممکن کوشش کی اور جب شوہر کی محبت ساتھ ہو تو زخم جلد بھر جایا کرتے ہیں پھر ان کی زندگی میں ماہم نے قدم رکھا اور زندگی کو ایک نئی راہ مل گئی۔

زندگی میں خوب صورت رنگ ماہم کی آمد نے بھر دیے تھے۔ دونوں بہت خوش تھے۔ تبسم بیگم کی زندگی میں شوہر کی محبت اتنی ہی عارضی تھی جتنی کہ بارش کے بعد آسمان پر بکھرنے والے...... قوسِ قزح کے رنگ...... ایک کار حادثے میں علیم صاحب اپنی جان گنوا بیٹھے اور تبسم بیگم کو تنہا کر دیا۔

سسرال والوں نے ماں، بیٹی کو منحوس کہہ کر نکال دیا اور ایسے میں جمال صاحب نے چھوٹے بہنوئی ہونے کے باوجود ایک بھائی ہونے کا حق ادا کیا اور انہیں اپنے گھر میں جگہ دی۔

مگر شیریں بیگم کو اس وقت بھی اعتراض تھا کہ تنزیل لڑکا ہے اور ماہم لڑکی یہ ایک گھر میں قطعاً نہیں رہ سکتے۔

''کیا ہوگیا ہے شیریں! ماہم چھوٹی سی بچی ہے اور تنزیل بھی بچہ ہی ہے۔ ابھی سے تم ایسی باتیں کر رہی ہو۔ وہ آخر کو تمہاری بہن ہیں، اس وقت وہ کہاں جائیں گی۔ مجھے سمجھ نہیں آتا تمہیں اپنی سگی بہن سے خدا واسطے کا بیر کیوں ہے۔'' وہ برہمی سے کہتے کمرے سے نکل گئے۔

یہاں جب اپنا کاروبار ٹھیک سے نہ جما سکے تو وہ ایک دوست کے ساتھ اپنا کاروبار سمیٹ کر دبئی روانہ ہوگئے ساتھ تنزیل اور شیریں بیگم کو لے گئے مگر ہر ماہ باقاعدگی سے تبسم بیگم کو خرچ کے پیسے بھیجتے۔ وہ انہیں دل سے اپنی بہن تسلیم کرتے تھے۔

☆☆☆

جمال اور شیریں بیگم کے آنے سے دو دن پہلے کی بات تھی۔ ماہم لان کی گھاس پر بیٹھی اپنے نوٹس مکمل کررہی تھی۔ اتنے میں گیٹ پر بیل بجی...... ماہم کا کاغذ پر چلتا تیز، تیز ہاتھ رکا۔ ماتھے پر ان گنت بل آئے۔ ناگواری چہرے سے عیاں تھی۔ بیزاری سے اٹھی، قدم، قدم چلتی گیٹ تک آئی۔

''کون......؟''

''میں ہوں تنزیل......'' باہر سے آواز آئی۔

''اوہ...... یہ پھر آگئے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''دروازہ کھول بھی دو۔'' ماہم نے گڑبڑا کر گیٹ کا لاک کھول دیا۔ وہ گھر کے اندر داخل ہوا۔ سامنے گھاس پر بکھری کتابیں دیکھ کر ماہم کو دیکھا۔

''اچھا تو...... تم یہاں بیٹھی تھیں۔'' ماہم نے سر جھکایا۔

''اور پھر بھی تمہیں یہاں آنے اور دروازہ کھولنے میں پورے سات منٹ لگے۔'' تنزیل نے مذاق میں کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیا۔

''جی نہیں سات منٹ نہیں سات سیکنڈ لگے ہوں گے۔ ذرا گھڑی غور سے دیکھا کریں۔'' اب کے ماہم نے تپ کر جواب دیا۔

''میڈم......! میں یونہی کبھی کوئی بات نہیں کہتا۔ میں ثبوت دے سکتا ہوں، ایسے ہی تھوڑی کہہ رہا ہوں...... آپ یہاں کام کررہی تھیں۔ اتنے میں گیٹ پر دستک سے آپ ٹھٹکیں، چین رکھا ماتھے پر بے شمار شکنیں آئی ہوں گی پھر قدم، قدم چلتے، چلتے آپ گیٹ تک آئیں پھر میرے بتانے پر آپ نے یقیناً سوچا کہ یہ پھر آگیا۔'' ماہم ایک دم سے شرمندہ ہوگئی۔

''اب تم یہ سوچو کہ یہ سب مجھے کیسے پتا چلا اور جلدی سے چائے بنا کر لاؤ۔ میں جلدی میں ہوں۔''

ماہم کو شرمندہ ہوتے دیکھ کر اس نے کہا۔

''مجھے کیا...... کیسے پتا چلا بدتمیز انسان......'' ماہم سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

صبح آٹھ بجے سے فون بج رہا تھا اور اب بالآخر سوا آٹھ بجے اس کی آنکھ کھلی موبائل اٹھایا۔ بند آنکھوں اور نیند میں ڈوبی آواز میں بہ مشکل پوچھا۔

''کون بات کررہا ہے؟''

''میں ہوں تنزیل، خالہ کے کمرے میں فوراً آؤ۔'' اور رابطہ منقطع کردیا، ماہم ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ اس کے آنے کا کوئی وقت ہی نہیں ہوتا۔ جلدی، جلدی واش روم میں گھس گئی۔ فریش ہوکر باہر آئی، امی کے کمرے میں داخل ہو کر سلام کیا۔ جس کا جواب تبسم بیگم اور تنزیل نے بیک وقت دیا۔

''کیا کرتی ہو؟ میری خالہ کب سے تمہارے انتظار میں ہیں...... تمہیں ان کا کوئی احساس نہیں۔''

''ارے نہیں بیٹا! یہ تو سارا دن میرے ہی پاس ہوتی ہے بس رات کو ذرا دیر تک پڑھتی ہے تو آنکھ نہیں کھلتی۔'' تبسم بیگم شفیق نظروں سے اپنی بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔

''چلو چائے لے آؤ پھر مل کر ناشتا کرتے ہیں اور پھر ذرا گھر کے کچھ کام کرتے ہیں کیونکہ امی، ابو لوگ یہاں آرہے ہیں۔'' اس کی خوشی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ ماہم اثبات میں سر ہلا کر کچن میں آگئی۔

☆☆☆

تینوں نے لاؤنج میں بیٹھ کر ساتھ ناشتا کیا اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد تنزیل نے اسے مخاطب کیا۔

''ماہم......! امی، ابو آرہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ گھر بالکل صاف ہو۔ سیٹنگ وغیرہ چینج کرلیں اور ایسی سجاوٹ کریں کہ امی خوش ہوجائیں گھر کو دیکھ کر جو بھی ضروری سامان چاہیے ہو مجھے بتادو......''

''نہیں سامان تو کچھ خاص نہیں چاہیے۔ سب موجود ہے اور ہم تو روز ہی صفائی کرتے ہیں۔'' اس نے ذرا جتانے والے انداز میں کہا۔

''ہاں جانتا ہوں مگر امی کو شکایت کا موقع نہ

ملے۔ میں بس یہ چاہتا ہوں۔'' اس نے اپنائیت سے خالہ کی جانب دیکھ کر کہا۔ وہ مسکرا دیں۔

''ہاں ماہم! تنزیل ٹھیک کہہ رہا ہے سب اچھے سے ہو جائے شیریں پریشان نہ ہوں بس......'' ماہم اثبات میں سر ہلانے لگی۔

پھر اس نے الماری سے دھلی دھلائی بیڈ شیٹس، تولیے، کشن کور دیگر چیزیں نکالیں جو اس نے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ آج خاص طور پر کھڑکیاں جھڑوائیں، پنکھے صاف کروائے، جالے وغیرہ اتروائے اگرچہ گھر صاف ہی تھا مگر تنزیل کی تسلی کے لیے لگی رہی۔ سارے کام سے فارغ ہو کر ماہم نے ماں کو چائے دی اور خود تنزیل کے کہنے پر اپنی چائے لان میں لے آئی۔ چائے پیتے، پیتے دونوں ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔ آج لان کو بھی خصوصی توجہ سے دیکھا تھا......

سارا دن آج گھر کی سیٹنگ کر کے اس نے کئی ڈشز بھی بنالی تھیں۔ امی نے بھی مدد کر دی تھی۔ کھانے کی میز پر تنزیل، شیریں بیگم اور جمال صاحب بیٹھے تھے۔ ماہم کھانا سرو کر رہی تھی۔ تبسم بیگم کمرے میں آرام کر رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ شیریں کو اچھا نہیں لگے گا کہ وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ آ بیٹھیں۔ شیریں احساسِ برتری کا شکار تھیں اس لیے تبسم بیگم نہیں چاہتی تھیں کہ ماحول میں کوئی بھی بدمزگی ہو۔ جمال صاحب نے بریانی کھاتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ہاتھ کے بنے کھانوں میں اور تمہاری صورت میں بھی تمہاری مرحوم نانی کا عکس نمایاں ہے۔ تمہاری آنکھیں، تمہارے بات کرنے کا انداز بالکل تمہاری نانی کی طرح ہے۔ ملائمت سے... بھرپور اور نرم لہجہ...... ہے ناں تمہارا کیا خیال ہے شیریں......'' وہ بیگم کے بگڑے زاویوں کو یقیناً دیکھ نہیں سکے تھے تبھی اپنی بات مکمل کرتے رہے۔

''آہم آہم پاپا آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں مجھے تو نانی اماں بہت ہی پسند تھیں۔ بے حد شفیق، مہربان، بے انتہا محبت کرنے والی۔'' بیٹے کی بات پر شیریں بیگم کی حالت غیر ہوگئی۔ غصہ ان کے دل و دماغ پر چھانے لگا۔

ماہم نے تنزیل کو گھورا۔ اسے بھی ابھی بولنا تھا۔

''اُف پانی، پانی۔'' تنزیل نے فوراً اسے بیشتر ماں کو پانی دیا، انہوں نے چند گھونٹ پانی کے لیے تو سانس بحال ہوئی۔

''اُف اللہ......اتنی مرچیں......؟ اور سالن میں نمک تو ہے ہی نہیں......اور بریانی بھی تو یہ...... کچے چاول، اور دیکھو سرخ مرچ کے علاوہ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اُف کھانا بھی بنانا نہیں آتا۔'' وہ پلیٹ پر چمچ پٹخ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تمام لوگ ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھنے لگے اور یوں آج کا پہلا کھانا اختتام کو پہنچا تھا۔

جس وقت یہ بات ہو رہی تھی تبسم اسی وقت ڈائننگ روم میں آئی تھیں مگر یہ سب سن کر واپس پلٹ گئیں۔ تنزیل نے انہیں جاتا دیکھ لیا تھا۔

رات گہری ہوگئی تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے اور جمال صاحب بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے پُرسوچ نگاہوں سے بیگم کو دیکھ رہے تھے جو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بال سنوار رہی تھی۔

''شیریں!'' انہوں نے پکارا۔

شیریں بیگم نے دائیں جانب گردن موڑی اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''یہ کیا طریقہ ہے، تم نے آج ماہم کا دل توڑ دیا۔ کھانے میں کوئی عیب نہیں تھا۔''

''آپ کو وہ بے عیب لگ رہا ہوگا مگر مجھے تو واقعی بہت اسپائسی لگا۔ کہیں مجھے السر ہوگیا تو......''

''بس بھی کرو شیریں کوئی شرمندگی نام کی بھی چیز ہے، تم اپنے رویے پر نادم ہونے کے بجائے کج بحثی کرتی ہو، کیا تم نہیں جانتیں ......اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے یہ فعل......'' وہ سخت جھنجلاتے ہوئے بولے تھے۔

''ارے! عجیب شخص ہیں آپ بھی......'' شوہر کی بات پر وہ تپ ہی گئی تھیں۔ ''وہ میرے ہی گھر میں رہتی ہے۔ ہمارے ٹکڑوں پر پلتی ہے پھر بھی آپ اس کی طرف داری کرتے ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ میں بحث کرتی ہوں۔ واہ بھئی واہ......''

"بکواس بند کرو شیریں...... ! کہاں سے آتی ہیں یہ فضول سوچیں تمہارے دماغ میں...... وہ کوئی غیر نہیں تمہاری اپنی سگی بہن کی بیٹی ہے۔ بھانجی ہے وہ۔۔ تمہاری خالائیں تو بھانجیوں پر جان چھڑکتی ہیں۔"

"ہاں ضرور چھڑکتی ہیں مگر ان بھانجیوں کا کوئی اسٹینس بھی ہوتا ہے، میں ایسی غریب، فقیر، بھانجی پر جان نہیں چھڑک سکتی آخر میری بھی کوئی کلاس ہے۔ اور آپ مجھے ہر وقت مت سمجھایا کریں۔ میرا موڈ ہی آف کر دیا۔" یہ کہہ کر وہ رکی نہیں اور کمرے سے نکل گئیں۔

☆☆☆

تنزیل اپنے کمرے میں کچھ دیر تو ٹہلتا رہا پھر کچھ بے چین سا بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ عجیب الجھن کا شکار تھا۔

"یہ آج کیا ہو گیا تھا ماما کو۔ ماہم کو کتنا برا لگا ہوگا اور خالہ وہ بیچاری تو پہلے ہی ہر وقت خاموش رہتی تھیں۔ اب تو وہ بالکل خاموش ہو جائیں گی۔ آج ان کو کتنا دکھ ہو رہا ہوگا۔ کیا میں ماہم سے سوری کروں۔ نہیں، اس سے بات کرتے ہوئے اگر امی نے لیا دیکھ لیا تو ان کا پارہ اور چڑھ جائے گا۔ کیا مصیبت ہے خالہ بیچاری پھر بھی مسکرا رہی تھیں مگر ان کے اندر کا کرب میں ہی جان سکتا ہوں۔ امی کے رویے نے انہیں بہت دکھ دیا ہے۔" تنزیل اپنے طور پر سخت شرمندہ تھا۔

☆☆☆

صبح کی سپیدی نمودار ہوئی۔ مقفل کمرے اب کھل رہے تھے۔ شیریں اور جمال کے مزاجوں کی برہمی ان کے چہروں پر عیاں تھی۔ شیریں بہن اور بھانجی پر برہم تھیں اور جمال صاحب بیوی پر تنزیل کی پریشانی الگ تھی۔ ماہم کی آنکھیں سرخ تھیں تو کیا ان میں سے کوئی بھی مکمل آرام نہ کر پایا تھا۔ تنزیل کو ماہم کی سرخ آنکھیں دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی تھی۔

ایک چہرے پر اب بھی سدا کا اطمینان تھا وہ ویسے ہی شفیق اور مہربان تھا جیسے کوئی درخت کڑی دوپہر میں اپنے سائے میں بیٹھنے والوں کے لیے ہوتا ہے اور وہ تبسم بیگم کا تھا۔

وہ چپ سادھ کر صبر سے زندگی کے دن۔۔ گزار رہی تھیں۔ زیادہ جینے کی ان میں کوئی خواہش نہیں تھی۔ بس ماہم کا اچھی جگہ گھر بس جائے۔ یہی ان کی خواہش تھی۔۔اور ایک ماں کو اس سے زیادہ کسی چیز کی خواہش ہو ہی نہیں سکتی۔

☆☆☆

صبح ہی سے شیریں بیگم فون سنبھال کر بیٹھ گئی تھیں۔ اپنے تمام دوست احباب کو اپنے آنے کی اطلاع دے رہی تھیں اور ان سے ملنے کے اوقات طے کر رہی تھیں۔

نیلے رنگ کی خوب صورت ساڑی پہنے آئینے میں اپنا سراپا جانچتے ہوئے انہوں نے آخری نگاہ خود پر ڈالی۔ وہ بہت پُر مسرت تھیں۔ تیار ہو کر وہ کمرے سے باہر آئیں تو ان کی نظر سیاہ دل کش فراک پہنے لمبے بالوں کو کھلا چھوڑے، کانوں میں چھوٹے، چھوٹے آویزے سجائے ماہم پر پڑی۔ ان کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ آج دوپہر میں ہی تبسم بیگم کے لاکھ منع کرنے کے باوجود جلیل صاحب نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ ماہم ضرور جائے گی۔ آج ان کے دوست کے بیٹے کی شادی تھی۔

"آپا یہ میری بھی بیٹی ہے آپ اس کے بارے میں مجھے اتنا حق تو دیں کہ میں اس کی زندگی میں کوئی مثبت کردار ادا کر سکوں، میں چاہتا ہوں کہ ماہم باہر کی دنیا سے ضرور آشنا ہو۔" اور تبسم بیگم ہار مان گئی تھیں لیکن خود انہوں نے ان کے ساتھ چلنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

"کم از کم ڈھنگ کے کپڑے تو پہن لیتیں معلوم تو تھا کہ آج شادی میں جانا ہے۔ حد ہے تمہیں تو عقل آ ہی نہیں سکتی۔" شیریں بیگم نے تنقید کا ایک اور موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ نہ تو اس کے لباس میں کوئی کمی تھی نہ ہی وہ بری لگ رہی تھی۔ مگر ان کو تو اس سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔

☆☆☆

رات سیاہ ہو چکی تھی، سب لوگ شادی سے واپس آ کر اپنے، اپنے کمروں میں سونے جا چکے تھے۔ ماہم کپڑے تبدیل کر کے اب کچن میں چائے بنانے آئی تھی۔ یہ اس کی عادت تھی کسی بھی لیٹ نائٹ

تقریب سے واپس آکر وہ چائے ضرور پیتی تھی جبھی پیچھے سے اسے آواز آئی۔

''میرے لیے بھی۔'' اور وہ جو اپنے کام میں مگن تھی یک دم ڈر کر پیچھے مڑی۔

''اف آپ نے تو میری جان ہی نکال دی۔ ایسے اچانک سے بھلا کوئی آتا ہے۔ بغیر کوئی آہٹ کیے......''

''بھئی ہم تو ایسے ہی آتے ہیں ماہم ڈیئر...... میں کوئی بادشاہ تھوڑی ہوں جو با ادب باملاحظہ ہوشیار کے اعلان کے ساتھ داخل ہوں...... عام بندے ایسے ہی آجایا کرتے ہیں تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم سارا دن کچن میں گھس کر چائے بناؤ......'' تنزیل نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ماہم اسے اس طرح بولتا دیکھ کر ہنس پڑی۔

''ویسے تمہیں کبھی کسی نے بتایا نہیں کہ تم ہنستے ہوئے اچھی لگتی ہو پیاری لڑکی......'' ماہم کی ہنسی یک دم تھم گئی اور آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے، اس کی بات پر۔

''ہاں میرے ابو کہتے تھے۔ مجھے زیادہ تو کچھ یاد نہیں ہے لیکن جب میں چھوٹی تھی تو وہ ہمیشہ کہتے تھے تمہاری مسکراہٹ بہت پیاری ہے میری شہزادی! ہمیشہ مسکراتی رہا کرو۔ تمہاری مسکراہٹ میں میری خوشی پوشیدہ ہے۔ اس کے بعد کسی نے نہیں کہا۔ ہاں امی...... بہت اچھی ماں ہیں لیکن ان کے محبت جتانے کا انداز ویسا نہیں...... جیسا ابو کا تھا۔'' ماحول یک دم سوگوار ہو گیا تھا اور ماحول کی سوگواریت کو تنزیل نے ہی ختم کیا۔

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تو کسی گنتی میں ہی نہیں۔''

''آپ؟ آپ کیسے...... میں سمجھی نہیں۔'' ماہم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ارے ابھی تو میں نے کہا کہ تم ہنستے ہوئے اچھی لگتی ہو۔''

''اوہ...... اچھا، اچھا۔'' ماہم نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''ہاں ناں اب تم رونا بند کرو اور مجھے اچھی سی چائے پلاؤ نمکین چائے پینے کا میرا کوئی موڈ نہیں ہے۔'' ماہم ہنس پڑی اور تنزیل کھل کر مسکرا اٹھا۔

☆☆☆

ناشتے کا ٹائم تھا۔ تنزیل آفس جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا اس کی پڑھائی کچھ عرصہ پہلے ہی ختم ہوئی تھی۔ وہ اپنا کیریئر پاکستان میں ہی بنانا چاہتا تھا۔ اسے اپنے وطن سے محبت تھی۔ ماں باپ کے کہنے کے باوجود وہ باہر پڑھنے نہیں گیا۔

''ماہم! تم آج کل یونیورسٹی نہیں جا رہیں، تمہارا تو حرج ہو رہا ہوگا بیٹا۔'' ماہم نے سر اٹھا کر خالو کو دیکھا جن کا بے حد شفقت بھرا انداز تھا۔ وہ انہیں بڑے ابو کہتی تھی۔

''ایکچولی میں نے کچھ دنوں کی چھٹی لے لی تھی۔ آج کل زیادہ پڑھائی نہیں ہو رہی تھی ویسے بھی آپ لوگ آنے والے تھے۔''

''ارے نہیں بیٹا، ہم تو اپنا خیال خود رکھ سکتے ہیں اور پھر گھر میں ملازم بھی ہیں، میں تمہاری پڑھائی کے بارے میں بہت فکر مند ہوں۔ اس کا حرج نہیں ہونا چاہیے۔'' جمال صاحب اسے سمجھا کر خاموش ہوئے تو تنزیل بول اٹھا۔

''بالکل، پاپا کو اپنے اردگرد achievers پسند ہیں اور اگر تمہارے مارکس کم آئے تو پاپا تمہیں گھر میں گھسنے بھی نہیں دیں گے سمجھیں!'' ماہم آخری بات پر سہم سی گئی اور جمال صاحب کو دیکھنے لگی۔

''بکو تم تنزیل، میری بیٹی کو پریشان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیوں پاپا! میری پڑھائی پر تو کوئی کمپرومائز نہیں کرتے تھے آپ، کہتے تھے کہ گھر میں داخلہ منع ہے اگر مارکس کم آئے تو...... اور ماہم کے لیے سب معاف، ایسی ناانصافی پر ہم دھرنا دیں گے۔'' اس نے کہہ کر شرارت سے ماہم کو دیکھا۔

''ارے بھئی یہ سب تو مذاق ہے لیکن کل تم تیار رہنا بیٹا، تنزیل تمہیں یونیورسٹی چھوڑ دے گا۔''

''نہیں...... نہیں میں خود چلی جاؤں گی بڑے ابو پوائنٹ سے جیسے پہلے جاتی تھی۔'' ماہم نے فوراً ہی منع کیا ادھر تنزیل جس کے دل میں ایک عجیب سی خوشی جاگی تھی کہ ماہم اس کے ساتھ جائے گی، اس کے انکار

سے ایک دم بجھ گئی۔

''ہاں ٹھیک ہے بالکل، یہ ویسے ہی جائے گی جیسے یہ پہلے جاتی تھی۔ عادتیں خراب نہیں ہونی چاہئیں۔'' شیریں بیگم نے آگے بڑھ کر فوراً ٹوک دیا۔

''لیکن کیوں بیگم، اتنی گرمی میں بچی پوائنٹ کے دھکے کھائے گی۔ جب تنزیل یہاں ہے تو اس کے ساتھ جانے میں حرج ہی کیا ہے؟''

''پورا سال جب پوائنٹ پر ہی جاتی ہے تو اس ایک مہینے میں کیا ہو جائے گا۔ اسے عادت ہے جانے کی۔ ماہم! تم کل وقت پر تیار ہو کر پوائنٹ سے ہی جانا۔ اچھا اب جاؤ تمہاری امی تمہیں بلا رہی ہیں۔'' شیریں بیگم آخر میں اس سے مخاطب ہوئیں اور ماہم اثبات میں سر ہلا کر چلی گئی اور تنزیل آفس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

شیریں بیگم بیٹے اور شوہر دونوں کے تاثرات جانچ رہی تھیں۔

''ہونہہ....... چالاک لڑکی...... اپنی بھولی صورت کی وجہ سے ہر وقت باپ بیٹے کے دل میں ہمدردی جگاتی ہے لیکن میں بھی سب سمجھتی ہوں جو جمال چاہتے ہیں وہ تو ہرگز نہیں ہوگا، آخر میری بھی کوئی کلاس ہے ایک ہی ایک بیٹے کی شادی وہ بھی ایسی غریب، مسکین کے ساتھ کر دوں۔ کیا سوچیں گے لوگ...... نہیں، نہیں یہ کبھی نہیں ہوگا۔ اس لڑکی کو اس کی اوقات دکھانی ہی پڑے گی۔'' شیریں بیگم نخوت سے کیا کچھ سوچتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

☆☆☆

آج شیریں بیگم نے اپنی اپر کلاس کی دوستوں کو گھر پر مدعو کیا ہوا تھا۔ ماہم کو بھی حکم تھا کہ اچھی طرح سے تیار ہو کر ان کے سامنے آئے۔ گلابی رنگ کے ڈریس میں اس کی رنگت مزید گلابی لگ رہی تھی۔ وہ یونیورسٹی جانے کو تیار تھی۔ میک اپ سے عاری چہرہ اتنا بھی دلکش ہو سکتا ہے یہ آج احساس ہوا تھا مگر کس کو؟ ڈرائیووے کی طرف بڑھتے ہوئے تنزیل کو۔ تنزیل اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔

وہ دفتر میں بیٹھا ماہم کے متعلق ہی سوچے جا رہا تھا کہ موبائل بج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی تنزیل کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹا۔ امی کا نمبر دیکھ کر فون کان سے لگایا۔

''جی مما کیسی ہیں آپ؟ خیریت اس وقت فون کیا ہے؟''

''ہاں، بیٹا!'' شیریں بیگم لہجے میں بے انتہا مٹھاس سموتے ہوئے بولیں۔ ''آج ذرا جلدی گھر آ جانا۔ آج مسز اختر اپنی بیٹی کو لے کر آ رہی ہیں تم جانتے تو ہو انوشے کو، تم لوگوں کی تو آپس میں اچھی کمپنی ہے ناں۔''

''ارے مما! آج تو میں کافی مصروف ہوں۔''

''تنزیل بیٹا کام تو روز ہوتے ہیں، پلیز مائی سن سب ویٹ کریں گے تمہارا اور تم بھی کافی انجوائے کرو گے۔''

''ٹھیک ہے مما میں آ جاؤں گا۔'' تنزیل نے ماں کے اصرار پر فوراً ہامی بھر لی تھی۔

☆☆☆

تنزیل شام ہونے سے پہلے ہی گھر پہنچ گیا تھا۔ شیریں بیگم آرام کر رہی تھیں۔ ماہم یونیورسٹی سے کچھ دیر پہلے ہی آئی تھی اور اب کام میں جتی ہوئی تھی۔

''جی! کام سب ہو گیا۔ کیا، کیا بنایا ہے؟'' تنزیل نے بات کو مزید بڑھایا۔

''کباب، نگٹس، رول، سینڈوچ وغیرہ اور ہاں پڈنگ بھی۔''

''ارے واہ، اتنا کچھ اکیلے بنا لیا ابھی تو یونیورسٹی سے آئی ہو گی۔'' تنزیل نے حیرت سے کہا۔

''جی، کچھ رات کو تیاری کر لی تھی اور کچھ آسیہ (ملازمہ) نے مدد کر دی یوں سب کچھ ہو گیا۔''

''وری گڈ......'' تنزیل نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور ڈرائنگ روم کی سیٹنگ دیکھنے چلا گیا۔

☆☆☆

پیلے رنگ پر میرون چھوٹی، چھوٹی بوٹیاں پڑی تھیں، شرٹ دوپٹا اسے بہت سوٹ کر رہا تھا۔ وہ بہت نکھری، نکھری لگ رہی تھی۔ ہلکے گیلے بالوں کو ہاف کیچر میں باندھا گیا تھا۔ میک اپ سے عاری چہرہ بہت دلنشیں لگ رہا تھا۔ ہاتھوں میں سینڈوچ اور نگٹس کے

platter اٹھائے وہ اور ملازمہ وسیع و عریض ڈرائنگ روم سے متصل ڈائننگ ایریا میں داخل ہوئیں، اندر کا ماحول انتہائی مسحور کُن تھا۔ مختلف پرفیوم کی خوشبوؤں سے ماحول مہک رہا تھا۔ شیریں سامنے سنگل صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے محوِ گفتگو تھیں، جب مسز شہباز نے انہیں ٹھوکا دیا۔

”کیا یہ تمہاری ملازمہ ہے؟“ ان کا صاف اشارہ ماہم کی طرف تھا۔ ”بھئی ماننا پڑے گا اتنی خوب صورت ملازمہ وہ بھی جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے حوصلہ ہے تمہارا۔“

ایسا نہیں تھا کہ مسز شہباز کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ماہم اور شیریں بیگم کے درمیان کیا رشتہ ہے لیکن اپنی پیاری دوست کے دل کو اور اس میں بسے جذبات کو بھی تو مطمئن کرنا تھا۔ ماہم نے کن انکھیوں سے اپنی سگی خالہ کو دیکھا۔ شیریں بیگم نے بادلِ ناخواستہ نفی میں سر ہلایا اور اتنی دھیمی آواز میں گویا ہوئیں کہ مسز شہباز کو بھی بہ مشکل ہی سنائی دیا۔

”نہیں، یہ تو میری بھانجی ہے۔ وہ دوسری عورت ملازمہ تھی۔“ انہوں نے آسیہ کے بارے میں بتایا جو جلدی سے پلیٹ رکھ کر واپس پلٹ گئی تھی اور ماہم ٹیبل سیٹ کر رہی تھی پھر اپنے آپ کو سنبھال کر نارمل آواز میں گویا ہوئیں۔ ”مجھے اس کی بڑی فکر رہتی ہے۔ جانتی ہوں کہ خوش شکل ہے، پڑھی لکھی ہے اسی لیے چاہتی ہوں کہ اپنے گھر بار کی ہو جائے۔“ شیریں بیگم نے بلا کی مبالغہ آرائی سے کام لیا۔

”اصل میں علیم بھائی کے انتقال کے بعد تبسم کو تو سسرال والوں نے منحوس کہہ کر نکال دیا تھا۔ اب اس کے پاس کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا، مجھ سے رہا نہ گیا میں لے آئی اپنے گھر اور پھر جمال کو بھی یتیم، بیوہ، مسکین کی مدد کرنے کا بہت شوق ہے۔“

”تو پھر شیریں اسے جلد از جلد اپنے گھر بار کا کرو کہیں تمہارے بیٹے کو بھی یہی شوق نہ ہو جائے۔“ پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا تھا لیکن شیریں بیگم نے جھرجھری سی لی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل سیٹ کرتے ہوئے

ماہم کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس کا وہاں کھڑے رہنا مشکل ہو گیا تھا، واپس جانے کے لیے مڑی تو دور صوفے پر بیٹھا تنزیل اسی کو دیکھ رہا تھا۔ ماہم سے نظریں ٹکرائیں تو تنزیل نے سر جھکا لیا۔ ساتھ بیٹھی انوشے اس بات سے بے خبر تھی کہ تنزیل کا دھیان کہیں اور ہے وہ بولے جا رہی تھی۔ اس نے آسیہ کو دھیمی آواز میں کچھ کہا اور ہال سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

شام ڈھل کر گہری رات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ تب سے اب تک اس نے ماہم کو کہیں نہیں دیکھا تھا۔ بہانے سے وہ خالہ کے کمرے میں بھی گیا وہاں بھی وہ نہیں تھی۔ ایک آخری کوشش کے طور پر وہ لان میں چلا گیا۔ کہیں سے کسی کے گھٹ، گھٹ کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ اپنے چاروں اطراف اس نے دیکھا کسی کو نہ پایا پھر آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی تو ٹیرس پر ایک سایہ سا نظر آیا۔ وہ اندر لاؤنج میں جا کر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اس کے پاس آ گیا۔

''ماہم!'' اس نے دھیمی آواز میں اسے پکارا۔ ماہم نے آنسوؤں سے بھیگتے چہرے کے ساتھ اسے پلٹ کر دیکھا اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ نہ جانے وہ کب سے رو رہی تھی تنزیل نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ماہم بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

اپنے اور ماں کے مشترکہ کمرے میں آئی تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی، آنکھیں رونے کی وجہ سے لال سرخ ہو رہی تھیں۔ تبسم بیگم نے اسے اس حال میں دیکھا تو پریشان ہو گئیں۔

''کیا ہوا ہے بیٹا، تم رو رہی تھیں۔ مجھے بتاؤ کیا پریشانی ہے؟''

مگر وہ خاموش لب، سوں سوں کرتی ناک، کبھی آنسوؤں سے تر رخسار صاف کرنے لگتی تو کبھی اپنی کتابیں سمیٹنے لگتی۔

''ماہی! میری بات سنو بیٹا یہ تم کیا کر رہی ہو، کہاں جا رہی ہو؟'' تبسم بیگم حیران پریشان تھیں۔

''میں نہیں، ہم دونوں جا رہے ہیں۔ ہم دونوں...... اب یہاں نہیں رہیں گے امی۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو یہاں نہیں رہنا تو کہاں جائیں گے بیٹا کیا ہو گیا ہے تمہیں۔'' وہ شیریں بیگم کے حکم کے مطابق اپنے کمرے ہی میں قید رہتی تھیں۔ اب بھی باہر کیا ہوا وہ اس سے ناواقف تھیں۔ اب ماہم کے رونے سے انتہا درجے پریشان ہو گئی تھیں۔

''امی میں نے کہا ناں ہم یہاں اب نہیں رہیں گے۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ آنسو اب بھی اس کے رخسار مستقل بھگو رہے تھے۔

''بیٹا آرام سے بولو۔ اگر کسی نے سن لیا تو کیا سوچیں گے؟''

''کچھ نہیں سوچیں گے، یہ لوگ سوشل ورک کے شوقین ہیں انہیں بہت سے لاوارث مل جائیں گے اور ہم کسی بھی شیلٹر ہوم میں رہ لیں گے۔''

''یہ سب کیا بولے جا رہی ہو۔ مجھے آرام سے بیٹھ کر بتاؤ کیا ہوا ہے؟'' انہوں نے ماہم کو زبردستی بٹھایا اور ماہم اپنا چہرہ چھپا کر اونچی، اونچی آواز سے رونے لگی اور پھر ماں کو وہ سب کچھ بتا دیا جو مسلسل وہ سہہ رہی تھی۔ تبسم بیگم کا دکھ اور صدمے کے مارے برا حال تھا۔ ماہم نے اپنے آنسو صاف کیے۔

''امی! آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ دادی نے آپ کو دھکے مار کر نکال دیا تھا، آپ کو منحوس کہا...... کیوں امی؟'' ماتھے اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ گویا ہوئی۔ ''اور یہ تو آپ کی سگی بہن تھیں ناں، انہوں نے بھی آپ کی عزت کا مان نہیں رکھا۔'' وہ پھر رونے لگی۔

''بیٹا ماہم! دیکھو شیریں کو میں جانتی ہوں وہ بہت اچھی ہیں اور تمہاری بہت فکر ہے انہیں وہ تمہارا اچھا چاہتی ہیں۔ دیکھو تو سہی بیٹا، جمال بھائی صاحب تمہاری تعلیم کے اخراجات اٹھا رہے ہیں۔ تمہارے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں۔''

''وہ بھی اس لیے امی کہ انہیں اپنے آگے پیچھے achievers دیکھنے کا شوق ہے ہم تو losers ہیں ناں۔'' وہ رو، رو کر نڈھال ہو گئی تھی اور باہر کھڑا تنزیل ہق دق رہ گیا۔ اس نے اس دن یہ بات ماہم

سے مذاق میں کہی تھی اور ماہم واقعی سچ سمجھی۔

''اوہ، اسے کتنا ہرٹ کر دیا میں نے۔ میں تو سمجھا تھا کہ ماہم کو صرف امی نے ہی ہرٹ کیا ہے مگر ماہم کو دکھ میری وجہ سے بھی ہوا ہے۔ اُف میرے خدایا!''

''امی! آپ بہت بھولی ہیں وہ یہ سب باتیں میری ہتک اور توہین کے لیے کہہ رہی تھیں۔''

''بیٹا تم میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔''

''ساری غلطی آپ کی ہے۔ آپ یہاں کیوں آئیں، اس سے اچھا تھا آپ کہیں اور چلی جاتیں، آپ کو احساس نہیں ہے کہ جب یہ بڑے، بڑے ادارے ٹی وی پر اپنی خدمات کا اشتہار لگاتے ہیں تو اتنا دکھ نہیں ہوتا جتنا دکھ اپنوں کے اشتہار لگانے سے ہوتا ہے جب بے عزت اور بے وقعت ہی ہونا ہے تو پھر اپنا ہی کیوں غیر ہی بہتر ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ماں کے گلے لگ کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ تبسم بیگم بالکل خاموش ہو گئیں۔ ماہم نے انہیں کچھ کہنے کے قابل چھوڑا ہی نہیں تھا۔ ان کی چھوٹی گڑیا واقعی بڑی ہو گئی تھی۔ وہ ماہم کو کیا کہتیں...... بات پھر وہی تھی کہ اگر کوئی ٹھکانا ہوتا تو وہ کبھی اپنی اس بہن کے در پر نہ آتیں جو اُن کو بچپن سے پیار کے دو بول بھی نہ دے سکی تھی۔

باہر کھڑا تنزیل اتنا نادم اتنا افسردہ کبھی نہ ہوا تھا ماہم اس کے بارے میں غلط سوچ رہی تھی، وہ آج اپنے آپ سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

بلیک ڈریس پینٹ اور بلیک شرٹ پہنے ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتا وہ تیزی سے سیڑھیاں اترا۔

''تنزیل صاحب ناشتا نہیں کریں گے۔''

''نہیں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' اتنا کہا اور جلدی سے نکل گیا۔ ماہم بھی کچن میں تھی اور وہ ابھی اسے فیس نہیں کرنا چاہتا تھا کل جو کچھ بھی ہوا اس کے بعد وہ خود کو اور ماہم کو سنبھل جانے کا موقع دینا چاہتا تھا کل جو بھی ہوا وہ بہت تکلیف دہ تھا۔

☆☆☆

شام کو جب وہ گھر آیا تو زندگی معمول کے مطابق چل رہی تھی لیکن ایک شناسا سا چہرہ...... اس کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بھی سچ تھا کہ خود کو اس کا سامنا کرنے کے لیے وہ اب تک تیار نہیں کر سکا لیکن اس کی جھلک دیکھ لینے میں کیا حرج تھا۔ فریش ہو کر باہر آیا، کچن میں آسیہ کام کر رہی تھی۔

''آسیہ! مما، پاپا کہاں ہیں؟''

''وہ جی بیگم صاحبہ تو اپنی کسی دوست کے گھر گئی ہیں اور صاحب جی اپنے کمرے میں۔''

''ہم...... م...... ٹھیک ہے مجھے چائے بنا دو۔'' کہہ کر وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ آسیہ چائے لے کر آئی۔ چائے کا کپ تھامتے ہوئے تنزیل نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''وہ ماہم اور خالہ نظر نہیں آ رہے؟''

''وہ جی ماہم بی بی کو تو بخار ہے۔''

''اوہ اچھا، میں دیکھ کر آتا ہوں۔'' چائے کا کپ وہیں چھوڑ کر وہ ان کے کمرے کے جانب بڑھ گیا۔ دروازہ آدھا کھلا تھا۔

''ماہم میری بچی تم جتنا اس بارے میں سوچو گی۔ پریشان ہو گی۔''

تنزیل کو سن کر دکھ ہوا۔ وہ واپس مڑ گیا کچن میں آ کر آسیہ کو تین کپ چائے بنانے کی ہدایت دی اور خود خالہ کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اندر داخل ہوا تو تبسم بیگم بیڈ پر بیٹھی تھیں برابر میں ماہم لیٹی تھی۔

''کیسی ہیں خالہ آپ؟''

''میں تو بالکل ٹھیک ہوں، آؤ تم بیٹھو۔'' تبسم بیگم نہایت شفقت سے بولیں۔

''آپ لوگوں نے کھانا کھا لیا؟'' تنزیل نے بات کا آغاز کیا۔

''بالکل، الحمدللہ میرے بچے تم نے کچھ کھایا؟''

''جی۔'' اتنے میں آسیہ چائے لے کر اندر داخل ہوئی۔

''بیٹا میں نے تو چائے نہیں منگوائی۔'' تبسم بیگم نے کہا وہی شیریں لہجہ، وہ ملازمین سے بھی ایسے ہی بات کرتی تھیں۔

''جی وہ...... میں نے کہا تھا چائے لانے کا، سوچا

تھوڑا ٹائم آپ کے ساتھ بیٹھوں۔'' اس سے پہلے کہ آ یہ جواب دیتی ماہم کو دیکھتے ہوئے تنزیل نے بات مکمل کی۔

''یاد ہے خالہ! جب بچپن میں ایک دفعہ مجھے بخار ہوگیا تھا تب آپ نے میری ایسے ہی خدمت کی تھی۔ مما کے پاس تو کبھی ٹائم ہی نہیں ہوا میرے لیے۔''

''ارے میرے بچے ماؤں کا تو کام ہی اپنے بچے کی دیکھ بھال کرنا ہوتا ہے۔ خالہ بھی تو ماں جیسی ہوتی ہے۔'' تنزیل بہ مشکل مسکرایا۔ ماہم مستقل آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ ٹھنڈی پٹیاں رکھنے سے بخار کچھ کم تھا۔ یہاں آنے کا اصل مقصد تو ماہم کو منانا تھا۔

''خالہ.....'' تنزیل نے اپنا گلا کھنکھارا۔

''خالہ..... ماہم آئی ایم سو سوری...... دراصل میں جانتا ہوں کہ غلطی میری ہی ہے اور امی نے بہت زیادتی کی ہے، میں تم سے بہت شرمندہ ہوں ماہم...... مجھے معاف کردو..... پتا نہیں مما بھی، کبھی ایسے بی ہیو کیوں کرتی ہیں، کیوں وہ سمجھ نہیں پاتیں کہ یہ سب بہت توہین آمیز ہوتا ہے۔ پاپا بہت سمجھاتے ہیں انہیں میں ان کے بدلے میں تم سے معافی مانگ رہا ہوں۔''

ماہم نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور مسکرا کر بولی۔

''اٹس اوکے تنزیل بھائی..... کوئی بات نہیں۔''

اس کا انداز، اس کا لہجہ، چہرہ کچھ بھی تو ایسا نہیں تھا جس سے لگتا کہ یہ کل رات والی ماہم ہے، جسے اس نے روتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس چہرے میں بلا کی طمانیت تھی۔

تنزیل لاجواب ہوگیا تھا۔ وہ خاموش کچھ دیر دیکھتا رہا اور پھر...... ''میں آتا ہوں۔'' کہہ کر اٹھ کر باہر نکل آیا۔ وہ کمرے سے نکل آیا تھا مگر وہ معصوم و سادہ چہرہ اس کی نظر سے نہ ہٹا۔ اس چہرے میں کیا تھا، سمجھ سے باہر تھا۔

☆☆☆

رات کو کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑا اسی کو سوچے جا رہا تھا۔ سادہ چہرہ، وہ لب و لہجہ تنزیل کے دماغ میں بس گیا تھا۔ کہتے ہیں جب انسان کو محبت ہوجاتی ہے تو پھر ہر منظر سے کشش ہٹتی جاتی ہے اور پھر انسان کی نظر میں بس ایک ہی عکس رہ جاتا ہے۔ اور وہ عکس دنیاوی خوب صورتی کا نہیں بلکہ باطنی رعنائی کا عکس ہوتا ہے۔ اور وہ عکس کسی کا اور کا نہیں آپ کے اصل محبوب کا ہوتا ہے۔ تنزیل کی آنکھوں میں بھی اپنے محبوب، ماہم کا چہرہ بس گیا تھا۔

☆☆☆

ماہم عشا کی نماز سے فارغ ہوکر اللہ کے حضور ہاتھ پھیلائے اب دعا مانگ رہی تھی۔ مصلے پر عاجزی سے بیٹھی ماہم کے چہرے پر اطمینان جھلک رہا تھا۔

دعا مانگ کر وہ فارغ ہوئی تو ماں نے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ وہ جائے نماز لپیٹ کر ماں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

''ماہم بیٹا، کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں امی......''

''دیکھو بیٹا اگر کچھ کہنا ہے تو مجھ سے کہہ دو اپنا دل ہلکا کرو، اس طرح اپنے دل میں رکھوگی تو بیمار ہوجاؤ گی۔''

''امی دل میں کچھ ہے ہی نہیں......'' ماہم نے اسی اطمینان سے مسکرا کر کہا۔

''ابھی کل تک تو تم کتنا رو رہی تھیں میری بچی......''

''پر اب نہیں امی......'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''دنیا کے سامنے رونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے امی دنیا والوں کے سامنے رونے سے وہ ہم پر ترس کھاتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی مجھ پر ترحم کی نگاہ ڈالے۔ بس میں نے صبر کیا ہے امی، کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے کی بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ تبسم بیگم بے چین ہوگئیں۔

''ماہم! اتنا صبر مت کرو۔'' اور وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ اور وہ جانتی تھیں کہ ماہم اب تک صبر ہی کرتی آرہی ہے۔ کہیں اس صبر کی پکڑ ہوگئی تو اُن کی بہن نہ جانے کس کرب سے گزرے۔ وہ بے چینی سے تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔

☆☆☆

صبح ناشتے کی میز پر سب موجود تھے۔ ماہم یونیورسٹی کے لیے تیار تھی اور ذرا دیر میں نکلنے ہی والی

تھی۔ تنزیل آفس کے لیے تیار تھا۔

''جمال! میں چاہ رہی تھی کہ اب تنزیل کی شادی کردیں۔'' وہ چائے کا سپ لے کر بولیں۔

''ہم...... ٹھیک ہے سوچ لیتے ہیں۔'' انہوں نے سرسری انداز میں جواب دیا اور ناشتا کرتے تنزیل کا ہاتھ رکا۔

''ارے مما! اتنی جلدی! اتنی بھی کیا جلدی ہے ابھی تو میں تھوڑا سا...... اسٹیبلش ہونا چاہتا ہوں۔'' وہ بری طرح گھبرا گیا تھا۔ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہوئیں جس کی وجہ سے اس کی آواز بھی کپکپانے لگی۔

''کیوں، کیا کمی ہے تنزیل تمہیں...... اتنی اچھی جاب ہے، گھر ہے گاڑی ہے، کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے تم اتنے ہینڈسم ہو کسی بھی اونچے گھر کی لڑکی تم سے شادی کرنا چاہے گی۔ ویسے انوشے مجھے کافی اچھی لگتی ہے اور تمہارے ساتھ کافی سوٹ بھی کرتی ہے۔'' ماہم کا چہرہ دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ جس کا چہرہ...... بے تاثر تھا، وہاں کوئی رنگ نہیں تھا۔ یعنی جس طرح کا... ردِعمل وہ ایسپیکٹ کر رہی تھیں وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ماہم تسلی سے چائے پیتی رہی۔ شیریں بیگم کو تھوڑا برا لگا۔ یہ کڑوی حقیقت ہے کہ انسان دوسرے کو تکلیف پہنچانے کے منصوبے بناتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اس کی توقع کے مطابق ہی ردِعمل دے دیں اور جب ویسا ردِعمل سامنے نہ آئے تو اسے تکلیف ہوتی ہے اور اگر حسبِ منشا ردِعمل آئے تو کمینگی کی حد تک اس شخص کو خوشی ہوتی ہے۔ اور یہ یقیناً انسانیت سے گرے ہوئے لوگوں کی حرکت ہوتی ہے جس میں شیریں بیگم کا بھی شمار ہوتا تھا۔ ان کا سارا دھیان ماہم اور تنزیل پر تھا۔ تنزیل نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

''مما! پلیز آپ مجھ سے پوچھ تو لیتیں...... کم از کم...... میری تو رائے جان لیتیں انوشے کے بارے میں......'' اپنے جذبات پر بہ مشکل قابو پا کر اس نے کہا جب کہ جمال صاحب کے ذہن میں ایک نادیدہ بلبلہ ابھرا جس میں ماہم کی صورت تھی جس کو شیریں بیگم نے انوشے نام کی انگلی سے پھوڑ دیا تھا۔

''تم سے مشورے کی کیا بات ہے، تم سوچ لو مجھے معلوم ہے کہ تمہارا جواب ہاں میں ہی آئے گا۔ لیکن جلدی سوچ لو مسز اکمل کا بیٹا تم سے دو برس چھوٹا ہے۔ اس کی بھی شادی ہوگئی۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ یہ سمجھیں کہ میں تمہاری کمائی کھانا چاہتی ہوں یا پھر میں تنگ نظر ہوں اس لیے تمہیں جلدی بیاہ کر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرنا چاہتی۔ خیر اب اس پر مزید بحث بیکار ہے تم شام تک سوچ لو......'' شیریں دوٹوک انداز میں بولیں۔

''شام تک......؟ میں آفس جا کر کام کروں یا یہ سوچوں؟''

''بس تم دو تین دن میں فائنل کرلو۔'' تنزیل کی پریشان حالت دیکھ کر جمال صاحب نے جھٹ مشورہ دیا۔

''لیکن ابھی تو تم آفس جاؤ۔'' جمال صاحب نے پیار سے اسے پچکارا۔ شیریں شوہر کو گھورتے ہوئے ٹیبل سے اٹھ گئیں۔

☆☆☆

آج کا دن کیسا گزرا، یہ تنزیل کے سوا کوئی نہیں جان سکتا تھا وہ خاصا ڈسٹرب تھا......''یہ مما کو اچانک کیا سوجھی میں ماہم کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ بھی انوشے میری لائف پارٹنر کے طور پر......؟ نہیں تھوڑی بہت بات چیت الگ بات ہے لیکن ہماری عادتیں، مزاج کہاں ملتے ہیں، اُف اس کے بارے میں سوچنا...... ناممکن ہے۔'' وہ سر تھامے بیٹھا تھا...... کیا کرے کیا نہ کرے...... ماہم کو بتائے...... نہیں پاپا کو تو بتا دیتا ہوں وہ یہی سب سوچے جا رہا تھا۔

وہ مسلسل انہی سوچوں میں گم تھا۔ نظریں سامنے ٹیبل پر پڑی فائل پر تھیں پر دل اور دماغ کہیں اور ہی تھے۔

''پاپا! مجھے آپ سے بات کرنی ہے بہت ضروری بات......'' تنزیل آفس سے آتے ہی جمال صاحب کے پاس جا پہنچا جو اس وقت چائے پی رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اخبار بینی بھی کر رہے تھے۔ جمال صاحب نے اخبار نیچے رکھ کر چشمہ اتارا اور اپنے بیٹے کا فکر مند چہرہ دیکھا۔

''ارے برخوردار! کیوں پریشان ہوتے ہو، تمہاری ماں نے ابھی صرف ذکر کیا ہے بات پکی نہیں کی۔'' انہوں نے بھانپ لیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا۔

''پاپا پلیز اس وقت میری زندگی کا سوال ہے آپ کو مذاق کی پڑی ہے۔''

''اچھا بتاؤ، کیا ہوا؟'' اب کے وہ سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئے۔

''پاپا میں کسی اور سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو بیٹا جی کر لو...... اپنی ماں سے جا کر کہو۔ کل اس لڑکی کے حقوق کیسے لو گے اگر آج یوں اتنی سی بات پر پریشان ہو رہے ہو ویسے وہ ہے کون......؟''

''پاپا وہ...... وہ اصل میں...... پاپا میں ماہم کو پسند کرتا ہوں۔'' بالآخر اس نے اپنی بات مکمل کر لی تھی۔ جمال صاحب مسکرائے۔

''ٹھیک ہے، تم پریشان نہ ہو، مل کر بات کر لیں گے۔''

☆☆☆

اس کمرے میں تو گویا عدالت لگی تھی۔ شیریں بیگم نے سرخ رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا مگر غصے سے ان کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا تھا۔ وہ ایک استانی کی طرح بیڈ کے پاس کھڑی تھیں اور تنزیل مجرم بنا بیٹھا تھا۔ سر نیچے جھکا تھا اسے اندازہ تھا کہ ماں کا ردِعمل اس سے مختلف نہیں ہوگا...... لیکن کبھی، کبھی انسان کے تمام خیالات کو زنگ لگ جاتا ہے۔ اس کے بھی تمام دلائل دم توڑ گئے تھے۔

''میری تو خیر ہے مگر یہ کہیں ماہم کو کچھ نہ کہہ دیں۔ میں تو ان کا بیٹا ہوں مگر ماہم یہ بات کبھی نہیں بھول پائے گی۔ وہ تو بیچاری اس سب میں بالکل...... بے قصور ہے۔ وہ تو جانتی بھی نہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔'' تنزیل دل ہی دل میں سوچے جا رہا تھا۔

''کب سے چل رہا ہے یہ سب......؟'' وہ چیخی تھیں۔

''تنزیل میں کچھ پوچھ رہی ہوں تم سے۔''

تنزیل جو اپنے ہی خدشات میں مبتلا تھا ہوش و حواس میں واپس آیا۔

''بس ایک ہفتہ......''

''اس ایک ہفتے میں کیا جادو کیا ہے اس نے تم پر......'' وہ پھر سے چلّائی تھیں۔

''شیریں، بچے کی بات تو سن لو...... ایسا کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔ ایک ہفتہ تو زیادہ ہوتا ہے میں بھی تو تم سے پہلی نظر میں ہی محبت کر بیٹھا تھا۔ کیا ہم دونوں نے محبت کی شادی نہیں کی تھی؟ شیریں ایسا بھی کیا گناہ ہو گیا ہے۔'' شیریں بیگم کو تو گویا شوہر کی بات پر پتنگے لگ گئے۔

''ہماری بات اور تھی اور یہ تو بچہ ہے اور وہ ڈائن میرے بچے کو اپنے جال میں پھانس رہی ہے۔'' وہ نہایت بے دردی سے بولیں۔

''کیوں ہماری بات اور کیوں ہے، کیا میں اور تم کل کے بچے، بچی نہیں تھے۔ شیریں اگر کل کو میرے گھر والے مجھے معصوم اور تمہیں ڈائن کا لقب دے دیتے تو؟''

''خاموش ہو جائیں آپ، یہ ماں، بیٹی محبت کے جال میں پھانس رہی ہیں آپ دونوں کو۔ مت کیا کریں ان کی بے جا طرف داریاں......'' وہ پھر سے چلّائی تھیں۔ دونوں میاں، بیوی بیڈ پر بیٹھے۔ بچے کے لیے لڑ رہے تھے...... اور بیڈ پر بیٹھا یہ ''بچہ......'' یعنی ان کی اولاد ماہم کے لیے دعا گو تھا کہ بات اسی کمرے میں رہ جائے۔ بس ماہم کو کچھ نہ کہیں...... اس کی روتی صورت تنزیل کے تصور میں تھی۔

''او کے...... ایک ڈیل کرتے ہیں۔'' تنزیل نے جمال صاحب کی طرف مدد طلب نظر سے دیکھا۔ شیریں بیگم صوفے پر بیٹھی تھیں جو تنزیل کے مدِمقابل تھا۔

''میری پسند...... نہ تمہاری...... یعنی کے انوشے نہ ماہم کوئی اور لڑکی...... کسی بھی لڑکی پر ہاتھ رکھو۔ میں اس سے تمہاری شادی کے لیے تیار ہوں۔'' پھر وہ چاہے...... دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو۔ میں، میں شیریں جمال، خود تمہارا ہاتھ مانگنے جاؤں گی...... او کے......؟'' انہوں نے پُر اعتماد انداز سے بیٹے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اس نے ماں کو دیکھا پہلے حیرت...... بے یقینی پھر صدمہ......

''مما......!'' جب وہ بولا تو اس کی آواز خاصی پر اعتماد تھی۔

''آپ کوئی ساڑھی خریدنے نہیں جا رہی ہیں کہ نہ میری...... نہ تمہاری...... یہ میری زندگی ہے اور اسلام نے مجھے پورا حق دیا ہے کہ میں اپنی لائف پارٹنر اپنی

مرضی سے منتخب کروں......اس میں آپ کی مداخلت مجھے گوارا نہیں ہے۔''

یہ باتیں ان کا بیٹا تنزیل کہہ رہا تھا ان کا چہرہ دھواں ہونے لگا۔ ان کو شدید اشتعال نے آن گھیرا۔

''تم...... تم...... کیوں نہیں سمجھ رہے۔'' وہ کانپنے لگی تھیں۔

''کیا ہے ایسا ماہم میں...... معمولی شکل صورت، کوئی بیک گراؤنڈ، نہ کوئی اسٹیٹس، نہ بیٹھنے، اٹھنے کا سلیقہ، ان فیکٹ اس دن مسز شہباز اس کو اس گھر کی میڈ سمجھیں تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ ہماری کتنی سبکی ہوگی...... وہ اس کلاس میں کبھی ایڈجسٹ نہیں کر سکتی۔''

''مما پلیز......''

''اس وقت تم محبت میں پاگل ہوتے رہو...... بعد میں تمہیں پتا چلے گا کہ کس قدر بیوقوفانہ فیصلہ تھا۔'' تنزیل کچھ لمحے خاموش رہا۔

''مما......! ایک ڈیل کرتے ہیں۔'' شیریں بیگم کو کچھ اطمینان ہوا۔

''آپ کی کلاس...... آپ کا اسٹیٹس آپ کو مبارک، میں یہاں سے ماہم کو لے کر چلا جاؤں گا۔ آفس کی طرف سے مجھے گھر بھی مل جائے گا۔ بس آپ میری شادی کر دیں ماہم سے۔'' شیریں بیگم کو شدید غصہ آگیا۔

''ماہم کو کیا لگتا ہے کہ وہ تمہیں مجھ سے چھین لے گی۔ کیا جادو کیا ہے اس نے تم پر...... میں ابھی جا کر پوچھتی ہوں۔'' شیریں بیگم نے کھینچ کر دروازہ کھولا اور پھر دھاڑ کی آواز سے اسے بند کیا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔ جمال صاحب اور تنزیل کی نظر ایک دوسرے سے ٹکرائی اور دونوں فوراً پیچھے بھاگے۔

''مما!''

''شیریں بات سنو......'' تیزی سے دروازہ کھلا...... اندر تبسم بیگم نے پانی کے ساتھ ابھی دوا لی تھی اور ماہم گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔ اور اب وہ ان کو چادر اوڑھا رہی تھی۔ آج ان کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ شیریں بیگم نے اندر داخل ہو کر تنفر سے ماہم کو دیکھا۔

''بہت معصوم بنی پھرتی ہو۔ تم نے میرے بیٹے کو پھانس لینے کی جرأت کیسے کی۔ تم اپنی اوقات تو دیکھو۔'' ماہم ہکا بکا دیکھنے لگی۔ تنزیل کو اسی بات کا ڈر تھا۔

''مما! خاموش ہو جائیں۔'' شیریں بیگم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

تم چپ رہو۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

''تم تو معصوم ہو اور یہ چالاک...... میں جانتی ہوں کہ یہ بدلہ لے رہی ہے مجھ سے۔'' پھر تبسم بیگم کی طرف دیکھا۔

''کون سا بدلہ......؟'' وہ حیران ہو کر بولیں۔

''اتنی بھولی نہ بنو...... تمہیں آج تک کوئی خوشی نصیب نہیں ہوئی۔ امی اور ابا کی محبت مجھے ملی۔ اور تمہارے شوہر علیم کے مقابلے میں جمال کہیں بہتر تھے' ویل آف تھے۔ میں ہر لحاظ سے تم سے بہتر زندگی گزارتی آئی ہوں۔''

''یہ سب کیا ہے' تبسم بیگم نے بہن کو افسوس سے دیکھا۔

''ہر وقت پیسہ، دولت، تمہارے آگے کسی انسان کی کوئی وقعت نہیں...... تم اس طرح کی باتیں کر رہی ہو جو میرے ذہن میں کبھی نہیں آئیں۔''

''ہاں، ہاں تمہارے ذہن میں نہیں لیکن تم اپنی اولاد کو تو یہی سبق دے رہی ہو کہ ناں پھانس لو کسی امیر زادے کو اور تنزیل سے بڑھ کر کون ہوگا۔ میرے گھر کا کھاتے ہو تم لوگ میرے گھر میں تو نمک حرامی نہ کرو......'' تنزیل کو اس کے آگے کچھ نظر نہیں آرہا۔ میرے ٹکڑوں پر پلتی ہے۔ تمہاری بیٹی اور تم اور میرے گھر کی رانی بننے کے خواب...... کوئی شرم، کوئی حیا ہوتی ہے' اچھا تھا وہ وقت جب تمہیں سسرال والوں نے دھکے دے کر نکال دیا تھا۔ میری ہی عقل پر پردے پڑے تھے کہ سوشل ورک کی خاطر تم لوگوں کو گھر لے آئی۔ ارے کچھ تو احسان مانو میرا......'' شیریں بیگم پگھلتا ہوا سیسہ، انڈیل رہی تھیں اور تبسم بیگم کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

''سارے یتیم اور مسکین میرے بیٹے کے لیے رہ گئے ہیں۔'' اور بھی جانے وہ کیا، کیا بولتیں رہیں۔

''ایک بات کان کھول کر سن لو تبسم...... اس گھر کی رانی تمہاری بیٹی کبھی نہیں بن سکتی، آئی سمجھ۔'' تبسم بیگم کی آنکھ سے آنسو نکلا ماہم کی طرف دیکھا جو بے یقینی سے نفی میں سر ہلا رہی تھیں۔ پھر دھیرے، دھیرے وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہونے لگیں۔ اور بیڈ پر ڈھے گئیں۔

''مما! تبسم خالہ کو دیکھیں۔'' تنزیل چلایا۔

''امی!'' ماہم اپنی ماں کی طرف بڑھی۔

''تنزیل بیٹا جلدی سے انہیں اسپتال لے چلو۔'' جمال صاحب پریشانی کے عالم میں بولے۔

''ہوں......! ڈرامے بازیاں شروع......'' شیریں بیگم پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

ایمرجنسی میں ڈاکٹرز اپنی سی کوشش کر رہے تھے کہ مریض کی جان بچائی جاسکے مگر مریض اپنا دل ہار چکا تھا۔ اتنی ذلت و رسوائی دل سہہ نہ سکا۔

☆☆☆

باہر کاریڈور میں کھڑی ماہم دیوار سے ٹیک لگائے بے آواز رو رہی تھی۔ آنسو مستقل اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب باہر آئے۔ تنزیل فوری ان کی جانب بڑھا۔

''آپ پلیز ویٹ کریں ابھی کچھ بھی کہنا ممکن نہیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے اتنا کہا اور باہر نکل گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد کچھ ڈسکس کرتے دوسرے ڈاکٹر کو لے کر اندر چلے گئے۔ اس سے زیادہ مشکل لمحہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ تنزیل شرمندہ تھا جو بھی ہوا اس کی وجہ وہ تھا۔ ماہم کو روتا دیکھ کر وہ بہت پریشان تھا اور شرمندہ بھی، وہ دو بول دلاسے کے دینے کی بھی سکت میں نہیں تھا۔

☆☆☆

شیریں بیگم بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھیں۔

''ایک علاج تک کے تو پیسے ہوتے نہیں ان کے پاس اور آئے میرے بیٹے کی دلہن بننے کے خواب دیکھنے والے... میں خود بات کرتی ہوں کہ کہیں بھی دیکھ بھال کر اسے فارغ کرو...... آج تک شیریں بیگم کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوا اور نہ ہی ہوگا۔'' وہ اپنے تئیں منصوبے بنانے لگیں۔

☆☆☆

آپریشن تھیٹر کی بتی بجھ گئی۔ اور انتظار ختم ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی جانب سب بڑھے۔ ڈاکٹر صاحب نے تینوں نفوس کو دیکھا۔ ایک گہری سانس خارج کی۔

''شی از نو مور......'' (وہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں) الفاظ تھے یا ہتھوڑے جو سب کے حواسوں پر برسے تھے۔ جمال صاحب اور تنزیل خاموش ہو گئے اور ماہم زار و قطار رونے لگی۔

☆☆☆

شیریں بیگم کو اپنا آپ مفلوج ہوتا محسوس ہوا۔ جب تنزیل نے خبر دی کہ تبسم خالہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ ایک ایک آخری حد تھی جو انہوں نے کبھی سوچی نہیں تھی۔

غصہ حرام ہے کیونکہ وہ انسان کو ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ انہیں ہر بات یاد آنے لگی اور پھر افسوس ہوا کہ کاش اس وقت وہ ان کے کمرے میں گئی نہ ہوتیں۔ ہم انسانوں کے ساتھ یہی مسئلہ ہے کہ جب ہم پر کوئی جنون سوار ہوتا ہے تو کچھ سمجھ نہیں آتا اور بعد میں نقصان ہو جانے کی صورت میں سارا الزام کاش پر آجاتا ہے مگر اب پچھتانے سے کیا حاصل تھا۔

☆☆☆

تدفین کے بعد شیریں بیگم کو جمال صاحب سے بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ کچھ کہتیں کچھ سنتیں......

''جمال......'' انہوں نے پکارا۔

''ہاں بولو۔'' وہ بیڈ پر آنکھیں موندے لیٹے تھے۔ لاتعلق سے انداز میں گویا ہوئے۔

''ماہم کیسی ہے؟'' بیڈ کی چادر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''تمہاری بھانجی ہے وہ شیریں، یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ شرم کرو بن باپ کی بچی کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے تم نے...... تم تو اتنی بدنصیب ہو کہ لوگ تمہارے شر کی وجہ سے تمہاری عزت کرتے ہیں۔ تمہارے خواص ایسے نہیں کہ دل سے عزت کریں۔

تمہاری زبان دوسروں کے دلوں میں خنجر گھونپتی ہے۔ شیریں، شکر ہے کہ آج تمہارے ماں، باپ حیات نہیں وہ کس کرب سے گزرتے۔ جب انہیں یہ پتا چلتا کہ یہ بہن کی محبت ہے دوسری بہن سے مگر دیکھ تو وہ رہے ہوں گے۔ اور ہاں اگر تنزیل شادی کرنا چاہتا ہے اپنی پسند سے تو اسے پورا حق ہے۔ میں نے تمہاری خواہشات کا بہت خیال رکھا ہے۔" جمال صاحب بس بولے جا رہے تھے۔

"انسان کو لگتا ہے کہ بم اور گولہ بارود انسانوں کی تباہی کا سبب بنتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت کوئی نہیں جانتا کہ انسانی زبان کے تیر کا ایک وار دل کے آر پار ہو جاتا ہے اور اس کے زخموں کا مقابلہ یہ نئے دور کے ہتھیار نہیں کر سکتے۔" افسوس سے وہ سر جھٹکتے اٹھ کر باہر نکل گئے تھے۔

☆☆☆

گھر کی فضا اب بھی سوگوار تھی۔ ماہم لان کی سیڑھیوں میں بیٹھی روئی، روئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اب بھی کسی سے کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ کچھ کہنے کی حالت میں تھی ہی کب...... جن کے دستِ نگر آپ ہوں ان کو کچھ کہنے کی ہمت آپ میں کبھی آ ہی نہیں سکتی۔ لیکن وہ جو اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے وہ اپنے پیارے بندے کو آزماتا ہے اور پھر وہی زخموں پر مرہم بھی رکھتا ہے بشرطیکہ بندہ اللہ توکل ہو اور ماہم کی ماں تبسم بیگم نے خود بھی ساری زندگی اللہ توکل پر ہی گزاری اور اب اسی کا صلہ ماہم کو انعام کی صورت ملنے کا وقت آ گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی جمال صاحب، تنزیل اور اس کے نکاح کے بارے میں بتا کر گئے تھے۔ وہ نادان خاموش اس لیے ہوئی کہ اسے لگا کہ یہ بھی ایک آزمائش ہے۔

☆☆☆

شیریں بیگم افسوس اور صدمے سے بے حال تھیں۔ جو آئینہ ابھی جمال صاحب دکھا کر گئے تھے وہ ہی اصلیت تھی۔ وہ خود بھی جانتی تھی اس کرب سے بڑا کوئی کرب ہی نہیں کہ انسان اپنی ہی نظر میں ذلیل اور رسوا ہو جائے۔ دوسروں کو چپ کرانا آسان ہے مگر اپنے ہی ضمیر کو کیسے چپ کروایا جائے۔ اپنے آپ سے کیسے چھپا جائے۔

☆☆☆

تبسم بیگم کے چالیسویں کے بعد ماہم اور تنزیل کا نکاح سادگی سے ہو گیا تھا۔ البتہ شادی میں تھوڑی بہت رونق ضرور ہو گئی تھی۔ جیسی کہ تنزیل کی خواہش تھی۔

ماہم خود کو احسان مندی کے بوجھ تلے دبا محسوس کر رہی تھی۔ بار، بار اسے اس احساس سے تکلیف ہو رہی تھی کہ یہ سب احسانات برداشت نہ کرنے پڑتے اگر آج اس کے پاس اس کی ماں تبسم بیگم ہوتیں۔ تنزیل کے پیار، محبت اور عزت نے اسے یہ اعتماد بخش دیا تھا کہ یہ کوئی احسان نہیں بلکہ وہ واقعی ماہم کو پسند کرتا ہے۔ ان کی زندگیوں سے دکھ کے بادل چھٹ گئے تھے۔

☆☆☆

شیریں بیگم کافی عرصے تک اپ سیٹ رہیں۔ انہیں یہ کرب چین نہیں لینے دیتا تھا اب وہ بالکل خاموش ہو چکی تھیں۔ پر ان کا ضمیر انہیں کچوکے لگاتا رہتا۔ انہیں ہر لمحے ستاتا رہتا۔ وہ بے حد ذہنی خلفشار کا شکار رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ انہیں سائیکاٹرسٹ کو دکھانا پڑا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ یہ صرف گلٹ میں مبتلا ہیں تھوڑے عرصے بعد خود ہی زندگی کی طرف لوٹ آئیں گی۔

تنزیل اور جمال صاحب نے ان کو دوبارہ ان کے سوشل سرکل میں انوالو کرنے کی لاکھ کوشش کی اور ان کی کوششوں کے بعد وہ کسی حد تک لوگوں سے ملنے بھی لگی تھیں مگر بہن کی موت کا سبب کوئی اتنا چھوٹا نہیں تھا وہ اب شدید احساسِ ندامت میں تھیں۔ وہ جب اکیلے میں ہوتیں تو اپنے آپ کو شیریں، ماہم اور تبسم کے کرداروں میں ڈھال لیتیں اور پھر اپنی کڑوی باتوں کے جواب خود ہی دینے لگیں۔ ایسا کرنے سے ان کو لگتا کہ وہ اپنا بوجھ ہلکا کر لیں گی۔ اپنی بے چینی پر قابو پا لیں گی مگر وہ ایسا نہ کر سکیں اور ایک نہ ختم ہونے والے کرب میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ کربِ ندامت سے بڑا کوئی کرب نہیں جب ضمیر پل، پل دھتکارتا اور ملامت کرتا تو وہ شدید اذیت میں مبتلا ہو جاتیں۔



فون کی بیل کی آواز سن کر کچن میں پلیٹیں دھوتی سدرہ کے ہاتھ رک گئے۔ تاول سے ہاتھوں کو خشک کرتے ہی اس نے موبائل آن کر لیا۔ دوسری طرف کی گفتگو سنتے ہی خوشی کے مارے موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹتے، چھوٹتے بچا۔ کال ایک معروف چینل کی جانب سے آئی تھی۔ جس میں اسے مبارک باد دیتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ کل شام کو وہ معروف اداکاروں کے ساتھ ان کی نئی آنے والی ڈراما سیریل کی شوٹنگ دیکھنے کے بعد رات میں ان

شوقِ جنوں

عذرا فردوس



کے ساتھ ڈنر پر مدعو ہے۔ یہ سنتے ہی خوشی کے مارے سدرہ کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔

"میڈم! آپ کو میری آواز تو آ رہی ہے۔" اس کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے پوچھا گیا۔

"جی بالکل......" سدرہ کے منہ سے بہ مشکل نکلا۔

"اب آپ کہیں گی کہ آپ اپنے ساتھ اپنے شوہر کو لے کر آنا چاہتی ہیں؟ اس کا جواب میں آپ کو سوال کیے بغیر دے دیتا ہوں کہ آپ اپنے ساتھ بالکل انہیں لاسکتی ہیں، چینل کی وین چار بجے آپ کے گھر پہنچ جائے گی آپ اپنا ایڈریس مجھے بھیج دیں۔" دوسری جانب سے کال کے منقطع ہوتے ہی سدرہ نے اپنا ایڈریس سینڈ کر دیا تھا۔ چینل میں جانا اور وہاں اپنے پسندیدہ آرٹسٹ مہروز کو شوٹنگ کرتے ہوئے دیکھنا یہ تصور سدرہ کے لیے اتنا باعثِ مسرت تھا کہ وہ چولھے پر رکھے سالن کو بھول گئی۔ سالن جلنے کی بُو جیسے ہی کچن سے باہر پھیلی سدرہ کو ایک دم ہوش آیا۔ جب تک وہ کچن میں پہنچی سالن جل کر کوئلہ ہو چکا تھا۔ کڑھتے ہوئے سدرہ نے پتیلی کو سنک میں رکھا اور دوبارہ بیڈروم میں جا کر الماری میں موجود اپنے کپڑوں کا جائزہ لینے لگی کہ ان میں سے کون سا لباس وہ کل کے لیے منتخب کر سکتی ہے۔

تمام کپڑوں پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد بالآخر ایک سوٹ اس نے منتخب کر ہی لیا۔ وہ وہیں بیڈروم میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر کے ایک مہینہ قبل ڈرامے سے متعلق پوچھے جانے والے سوال کے بارے میں سوچنے لگی جس کا درست جواب دینے والے لوگوں میں سے پانچ خوش نصیبوں کو فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈرامے کے مرکزی کرداروں کے ساتھ ڈنر کرنا تھا۔ سوال کا جواب دیتے ہوئے سدرہ کو امید بھی نہیں تھی کہ کروڑوں لوگوں میں اس کا نام منتخب ہوگا۔

ڈرامے کا مرکزی کردار مہروز دیگر خواتین کی طرح سدرہ کا بھی پسندیدہ فنکار تھا۔ جس کے مقابل سدرہ کو کوئی ہیروئن جچتی ہی نہیں تھی۔ مہروز مختلف چینل پر چلنے والے ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھا رہا تھا، اس کے فینز میں عورتوں اور لڑکیوں کی بڑی تعداد تھی۔ مہروز مخصوص قسم کے کردار کرتا تھا اس کے ڈراموں کی کہانی ایک جیسی ہوتی تھی ابتدا میں ہیرو ہیروئن سے بیزار نظر آتا اور بعد میں اس کی محبت میں گرفتار...... سدرہ کے برخلاف اس کے شوہر ارحم کو اداکار مہروز ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ کرسی پر جھولتے ہوئے آنے والے خوش کُن لمحات کے بارے میں سوچتی سدرہ کی نظر وال کلاک پر پڑی۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ یہ وقت ارحم کی آفس سے واپسی کا ہوتا تھا۔ آتے ہی ارحم کو کھانے کی طلب ہوتی تھی اور کھانا تیار نہ دیکھ کر وہ غصہ کرنے لگتا تھا۔ اب تو سدرہ کا کھانا پکانے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔ چاروناچار وہ کچن میں جا گھسی اتنے کم وقت میں کھانے کی کوئی اور ڈش نہیں بن سکتی تھی سو اس نے آملیٹ کے لیے پیاز کاٹنی شروع کی، وہ انڈے پھینٹ رہی تھی تب ہی ارحم فلیٹ کے اندر داخل ہوا۔ ایک چابی حسبِ معمول اس کے پاس ہوتی تھی۔ سدرہ کے سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ طنزیہ انداز میں گویا ہوا۔

"انڈے کیا مفت میں ملنے لگے ہیں جو تم ناشتے کے علاوہ ہر دوسرے دن رات کے کھانے میں بھی بنا لیتی ہو۔ پرسوں میں نے تم سے سوئٹ ڈش بنانے کا کہا تم نے میٹھا انڈا بنا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ خدا بخشے ابا مرحوم کو جاتے، جاتے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر گئے جانے کون سی منحوس گھڑی تھی جب ان کی تمہارے پاپا سے دوستی ہوئی تھی۔ اس دوستی کی سزا میں بھگت رہا ہوں، روٹی بنا چکی ہو یا وہ بھی مجھے گھر میں گھستا دیکھ کر بنے گی۔"

"روٹی تیار ہے تم فریش ہو جاؤ میں کھانا ٹیبل پر لگاتی ہوں۔" سدرہ نے تحمل سے جواب دیا کوئی اور دن ہوتا تو وہ ارحم سے الجھ بیٹھتی مگر آج اس کا موڈ اچھا تھا، وہ اس سے الجھ کر اپنے موڈ کی خوشگواریت کو ختم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آملیٹ تیار ہوتے ہی سدرہ نے ٹیبل پر پلیٹیں سجانا شروع کیں۔ جیسے ہی ارحم ٹیبل پر آ کر بیٹھا وہ

تذبذب کے عالم میں سوچنے لگی کہ وہ چینل سے آنے والی کال کے بارے میں ارحم کو بتائے یا نہیں ارحم تو ہمیشہ کی طرح مہروز کا مذاق اڑانا شروع کردے گا اور اپنے مخصوص انداز میں یہی کہے گا کہ ''آج کل کے اداکار۔ ہونہہ اداکاری تو آتی نہیں شکل کے بل بوتے پر کام حاصل کرلیتے ہیں۔'' جھجکتے ہوئے وہ ارحم سے مخاطب ہو ہی گئی۔

''ارحم تمہیں اس چینل کی سیریل ''مانی'' تو یاد ہوگی جس میں ''زینا'' کے ساتھ مہروز ہیرو تھا۔''

''میں کیوں اس سیریل کو یاد رکھنے لگا اس سیریل میں کوئی غیر معمولی بات تھی میں نے تو چلتے پھرتے سرسری سا ہی دیکھا تھا ویسے بھی مہروز کے ڈراما سیریل کو تم عورتوں اور لڑکیوں کی بدولت شہرت ملتی ہے جس کی وجہ سے اسے آئندہ بھی چانس مل جاتا ہے۔''

''خیر اب ایسا بھی نہیں ہے، میں نے ڈراما سیریل ''مانی'' کی آخری قسط کے بارے میں پوچھے گئے سوال کا جواب دیا تھا، درست جواب دینے پر میرا نام بذریعہ قرعہ اندازی ان پانچ خوش نصیبوں میں شامل ہے جنہیں ڈرامے کے مرکزی کرداروں کے ساتھ ڈنر کرنے کی دعوت دی گئی ہے، ساتھ ہی مہروز کی نئی آنے والی ڈراما سیریل کی شوٹنگ دیکھنے کی بھی اور پتا ہے تمہیں بھی مدعو کیا گیا ہے۔ تم فیکٹری سے جلدی آجانا اسکرین پر نظر آنے والے اداکاروں کو نزدیک سے دیکھنے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ بھئی میری تو ہمیشہ سے یہی آرزو ہے کہ میں اپنی اداکاری کے جوہر اسکرین پر دکھاؤں۔''

''اس عمر میں تمہیں کسی ڈرامے میں مرکزی کردار کا چانس تو ملنے سے رہا...... رہے چھوٹے موٹے کردار تو وہ کرکے تم وقت ہی ضائع کروگی...... ویسے بھی تم اب عمر سے بڑی دکھائی دینے لگی ہو۔''

''اچھا ویسے مجھ سے جیلس ہوکر تم فضول بات کررہے ہو، میں تو اپنی عمر سے چھوٹی دکھائی دیتی ہوں۔ ہاں یہ بات میں مانتی ہوں کہ پہلے کے مقابلے میں میرا وزن ضرور بڑھا ہے جسے کم کرنے کے لیے اب میں جم جوائن کرلوں گی، آخر کو اداکارائیں بھی تو خوب صورت رہنے کے لیے سو جتن کرتی ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہیں ۔۔ میرا اداکاری کرنا برا تو نہیں لگے گا وہ بھی مہروز کے مقابل...... '' سدرہ کے منہ سے ان الفاظ کے نکلتے ہی پانی پیتے ارحم کے گلے میں پھندا سا لگ گیا۔ وہ بے تحاشا ہنسنے لگا۔

''تمہیں بڑی خوش فہمی ہے کہ تمہیں مہروز کے

اِک تحریر گمنام سی

جب زمین کو تہ در تہ کھودا جاتا ہے تو اس میں سے کچھ نیا نکلتا ہے ورنہ ہموار زمین بنجر ہی رہتی ہے سو اپنی ذات کے بنجر پن کو مٹانے کے لیے اپنی ہی ذات پر کھدائی ضروری ہوتی ہے کیونکہ انسان کی ذات بھی نت نئی چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے جسے ہماری غفلت اور۔۔۔ بے پروائی کی تہوں نے ڈھانپ رکھا ہوتا ہے۔ جب اس کی کھدائی کا کام ہم انجام نہیں دے سکتے تو پھر اللہ پاک ہمارے لیے بہتر سوچتا ہے۔ یہ جو اکثر ہماری پُرسکون زندگی میں پریشانیاں اور فکریں آتی ہیں یہ ہمیں جھنجھوڑنے کے لیے آتی ہیں۔ جیسے یہ ہماری ذات کی کھدائی کرنے آئی ہوں۔ جیسے ہماری ذات کے اندر سے کچھ نیا جنم دینے آتی ہوں۔ یہ بظاہر نقصان دہ چیزیں ہمیں ہی فائدہ دینے آتی ہیں۔ المختصر...... جو پُرسکون زندگی چاہتے ہیں ان کی ذات میں چھپا خزانہ ہمیشہ دبا رہ جاتا ہے، وہ صلاحیتیں جو انہیں اپنا نام بنانے کے لیے زندگی کے سفر میں سامان کے طور پر دی جاتی ہیں وہ جوں کی توں رہ جاتی ہیں اور جو اپنی ذات کی کھدائی کے لیے فکروں اور پریشانیوں کو مزدور بنا دیتے ہیں ان کی بے سکون زندگی انہیں اِک نام دے دیتی ہے جو ہمیشہ باقی رہ جاتا ہے۔ وہ نام جو آخرت میں ان کے کام آتا ہے کہ وہ مشکلوں پر قابو پاکر اپنی ذات کی کھوج لگا کر اللہ کو پالیتے ہیں۔

از: ایف کے نیازی، میانوالی

مقابل اداکاری کا موقع ملے گا تم کن چکروں میں پڑنے کی سوچنے لگیں۔''

''یہ بتاؤ کہ کل میرے ساتھ چل رہے ہو یا نہیں؟'' سدرہ نے ارحم کی بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پوچھا۔

''کل تو آؤٹ ہے، مجھے فیکٹری سے جلدی چھٹی نہیں مل سکتی ویسے بھی مجھے شوٹنگ دیکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں، ہاں ڈنر کرنے میں ضرور ہوٹل پہنچ جاؤں گا۔ شکر ہے کوئی ایک دن تو ایسا مل رہا ہے جس دن انڈے نہیں کھانے پڑیں گے۔'' بے ہنگم سا قہقہہ لگاتے ہوئے وہ آملیٹ پلیٹ میں ڈالنے لگا۔

☆☆☆

اگلے دن سدرہ کو جانے کیوں یہ گمان ہو رہا تھا کہ وہ جس ڈرامے کی شوٹنگ دیکھنے جا رہی ہے اس کے ڈائریکٹر پہلی نظر میں ہی اس کے اندر چھپے ٹیلنٹ کو پہچانتے ہوئے اسے ضرور کسی آنے والے ڈرامے میں مرکزی کردار کی آفر کریں گے، بلاشبہ سدرہ میں اداکاری کے جوہر تھے۔ اسکول، کالج کے ہر ڈرامے میں وہ ضرور شامل ہوتی تھی اس کی ٹیچر اس کے ٹیلنٹ کو سراہتی تھیں ان کی تعریف سدرہ کا سیروں خون بڑھا دیتی تھی۔ تعلیمی دور میں سدرہ کی شدت سے خواہش تھی کہ وہ اداکاری کے میدان میں نام پیدا کرے مگر گھر والوں کی حوصلہ افزائی نہ ہونے کے سبب اس کا شوق آگے پروان نہیں چڑھ سکا تھا۔ کالج کا دور ختم ہونے کے بعد سدرہ نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہا تو امی نے صاف منع کر دیا۔

''تم نے رو پیٹ کر چار سال میں بی اے کیا ہے، اب ایم اے میں ایڈمیشن لیا تو وہاں دو کے بجائے پانچ سال لگا دو گی۔''

امی کی بات سدرہ کے دل کو لگی۔ ویسے بھی پڑھائی کا اسے کوئی شوق نہیں تھا وہ تو دل بہلاوے کے لیے یونیورسٹی میں جانے کی خواہش مند تھی۔ ورنہ تو اسے صبح سویرے اٹھنا ہی دنیا کا مشکل ترین کام لگتا تھا۔

امی کی خوب سے خوب تر داماد کی تلاش میں وہ پانچ سال تک گھر بیٹھی رہی تھی اس دوران اس کے تمام شوق ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ سارا دن وہ ٹی وی دیکھتی رہتی جس کے سبب اس کا بیشتر وقت امی کی ڈانٹ سنتے ہوئے گزرتا تھا۔ اس دوران اس کے بابا کے دوست اپنے بیٹے ارحم کا رشتہ لے کر آئے تو چٹ منگنی، پٹ بیاہ کا معاملہ ہوا۔

ارحم، سدرہ کی توقع سے بڑھ کر تھا۔ سدرہ کی ساری سہیلیاں کہا کرتی تھیں تم بہت خوش قسمت ہو جو ساس، نندوں کے جھنجٹ سے آزاد ہو۔ شوہر بھی ایسا ملا ہے جو تمہاری خوشی میں خوش رہتا ہے مگر سدرہ کی امی کی رائے اس کی سہیلیوں سے مختلف تھی۔ انہیں ارحم ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ وہ پستہ قد اور موٹا تھا۔ بقول ان کے اس کا سدرہ کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں بنتا تھا کیونکہ ان کی بیٹی لاکھوں میں ایک تھی۔ سدرہ کے پاپا نے ارحم کا رشتہ آنے پر بیوی کے اعتراض کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے یہ کہہ کر ان کا منہ بند کر دیا تھا کہ پہلے ہی ہر رشتے میں نقص نکالنے کے سبب سدرہ کی عمر اچھی خاصی ہو گئی ہے۔ اب میں اسے مزید بٹھا کر نہیں رکھوں گا، یوں ارحم، امی کی ناپسندیدگی کے باوجود سدرہ کا ہم سفر بن گیا تھا۔

شادی کے اوائل دنوں کا خمار ختم ہوا تو اسے امی کی بات سے اتفاق کرنا پڑا۔ ارحم شادی کے بعد مزید بھدا ہو گیا تھا سدرہ کی سحر انگیز شخصیت کے آگے وہ دبا، دبا سا نظر آتا تھا۔ ارحم کی حسِ مزاح بہت اچھی تھی اپنی فیکٹری میں وہ چٹکلے باز مشہور تھا۔ وہ جس تقریب میں جاتا وہاں اپنی پُرمزاح گفتگو سے لوگوں کو ہنسنے پر مجبور کر دیتا۔ سدرہ کی کزنز اپنے بہنوئی کی گفتگو سے محظوظ ہونے کے بعد قصیدہ گوئی کرتے ہوئے کہتیں۔

''تمہارا شوہر دل کا اچھا ہے تم تو بہت خوش ہو گی۔'' وہ سر ہلا کر رہ جاتی۔

اگلے دن جانے کے لیے تیار ہونے کے بعد سدرہ نے تنقیدی نظروں سے اپنا جائزہ لیا۔ وہ پوری طرح سے مطمئن تھی کہ وہ بے حد پُرکشش اور حسین لگ

رہی ہے۔ اس لمحے اس کی نظر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی اپنی تصویر پر پڑی جو کالج کے دور کے کسی فنکشن کی تھی۔ وہ ان گنت بار اس تصویر کو دیکھ چکی تھی اور ہر بار وہ تصویر کو دیکھتے ہوئے خود کو سراہتی تھی۔ اب میک اپ کی تہ میں چھپا سدرہ کا چہرہ اس کی اصل عمر کی چغلی کھا رہا تھا لیکن دل جھوٹی تسلی دے رہا تھا کہ تصویر میں اور اس کی موجودہ شکل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ آج بھی ویسی ہی نظر آرہی ہے جیسی اسٹوڈنٹ لائف میں تھی۔ چار بجے جونہی وہ اپنی بلڈنگ کے داخلی دروازے پر پہنچی تو باہر چینل کی جانب سے بھیجی گئی وین موجود تھی۔ سدرہ نے ڈرائیور سے اپنا تعارف کرایا۔ اگلے لمحے اس نے ادب سے جھکتے ہوئے وین کا دروازہ کھولا۔ سدرہ کی نظر فلیٹ کی بالکنی سے جھانکتی ان عورتوں پر پڑی جن کا کام پڑوسیوں کی جاسوسی کرنا ہوتا ہے۔ وہ عورتیں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں جسے لینے معروف چینل کی گاڑی آئی تھی۔ سدرہ کی گردن فخر سے اکڑ گئی۔

گاڑی میں اور بھی کچھ لوگ تھے۔ ایک لمبے راستے کے بعد جب وہ اسٹوڈیو پہنچی تو انہیں مخصوص گوشے میں بٹھا دیا گیا۔ سدرہ کے لیے وہ ماحول بالکل اجنبی تھا وہ آنکھیں گھما کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ گفتگو کا ہلکا سا شور تھا۔ ڈائریکٹر کے سین کو اسٹارٹ کرتے ہی وہاں خاموشی چھا گئی۔ مہروز بالکل ویسا ہی دکھائی دے رہا تھا جیسا وہ اسے ڈراموں میں دیکھتی رہی تھی۔ سین کی ریکارڈنگ ہوتے ہی جب ڈائریکٹر بلال خان ایک جگہ فرصت سے سدرہ کو کھڑا نظر آیا تو اس نے اس کے پاس جا کر اپنے ایکٹنگ کے شوق کے بارے میں اسے بتایا۔

''سر! آپ میرا اسکرین ٹیسٹ لے لیں، آپ کو پتا چل جائے گا کہ مجھ میں اداکاری کی کتنی صلاحیت ہے۔''

''فی الحال تو ہم لوگ آج خاصے مصروف ہیں، اس لیے آپ کا اسکرین ٹیسٹ لینا ابھی ممکن نہیں۔ آپ اپنا فون نمبر دے دیجیے میں آپ سے جلد رابطہ کروں گا۔''

''سر! میری شدت سے خواہش ہے کہ میں مہروز کے مقابل اداکاری کروں، میں نے ان کا ڈراما ''جھلا رانجھا'' کی ایک، ایک قسط پانچ بار دیکھی ہے، اس سیریل کا ایک، ایک منظر میری آنکھوں میں محفوظ ہے۔'' سدرہ نے اپنا نمبر انہیں دیتے ہوئے بتایا۔ بلال خان نے سرسری نگاہ اس پر دوڑاتے ہوئے اسے تسلی دی کہ وہ جلد ہی اس کو اسکرین ٹیسٹ کے لیے بلائے گا۔

☆☆☆

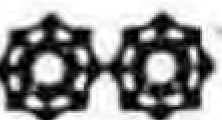
سدرہ نے چینل کی جانب سے ایک مہینے تک کال آنے کا انتظار کیا پھر مایوس ہوگئی۔ اسی مایوسی کے عالم میں وہ ایک دن بلال خان کو کال ملا بیٹھی۔ اس کی خوش نصیبی تھی کہ بلال خان نے اس کی کال ریسیو کر لی۔ بڑی مشکل سے وہ سدرہ کو پہچاننے میں کامیاب ہوا۔ پہچانتے ہی اس نے سدرہ کو خوش خبری سنائی کہ وہ اپنی نئی ڈراما سیریل میں سدرہ کو اہم کردار دے رہا ہے، اس سیریل کا ہیرو مہروز ہے۔ یہ سنتے ہی سدرہ ہواؤں میں اڑنے لگی۔

''سر! آپ کا بے حد شکریہ جو آپ نے مجھے اہم کردار دینے کا سوچا۔ آپ یہ بتائیں کہ میں کب آؤں شوٹ کے لیے؟''

''فی الحال آپ کو آنے کی ضرورت نہیں، آپ ہمیں اپنی اچھی سی تصویر بھیج دیں۔''

''صرف تصویر؟ سر آپ کو میرا آڈیشن بھی تو لینا ہوگا، وہ میں کب دوں گی؟''

''اس کی فی الحال ضرورت نہیں کیونکہ ڈرامے میں آپ مہروز کی مرحومہ والدہ کے کردار میں ہیں جو اس کے بچپن میں مر چکی ہے۔ سیریل کے کئی سین میں وہ آپ کی تصویر سے ہم کلام نظر آئے گا۔ اوکے مس سدرہ اب تو آپ خوش ہیں ناں؟'' بلال خان اس کی خوشی کا اندازہ لگائے بغیر فون آف کر چکا تھا۔ جبکہ سدرہ گم صم سی اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ اداکاری کا وہ شوقِ جنوں جس نے دوبارہ جنم لیا تھا وہ اس کال کو سنتے ہی ایک دم ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔



سلسلے وار ناول

قسط 6

میں عشق ہوں

نایاب جیلانی

عشق، محبت، الفت، چاہت، انسیت، لگاؤ، پیار، اپنائیت... اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حسین جذبے... کہیں یہ پھول برساتے ہیں، زندگی مہکاتے ہیں، سانسوں کو معطر کرتے ہیں، لبوں کو ترنم بخشتے ہیں، تاریک راہوں کو منور کرتے ہیں اور کبھی، کبھی یہ مردہ ہوتے وجود میں زندگی کی نئی لہر بھی دوڑاتے ہیں... غرضیکہ انسانی حیات انہی جذبوں کی مرہونِ منت ہے... لیکن یہی جذبے کبھی عمر بھر کی تلاش کا حاصل ہوتے ہیں اور کبھی ریت کے ذروں کی طرح ہاتھ سے پھسلتے چلے جاتے ہیں اور انسان تہی داماں رہ جاتا ہے... اسی حاصل اور لاحاصل کے گرد گھومتی حساس جذبوں کی آئینہ دار ایک دلکش و دل پزیر تحریر

ابھی تو عشق میں ایسا بھی حال ہونا ہے
کہ اشک روکنا تم سے محال ہونا ہے

ملیں گی ہم کو بھی اپنے نصیب کی خوشیاں
بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے

ہر ایک شخص چلے گا ہماری راہوں پر
محبتوں میں ہمیں وہ مثال ہونا ہے

وصی یقین ہے مجھ کو وہ لوٹ آئے گا
اسے بھی اپنے کیے کا ملال ہونا ہے



کچھ دیر بعد حریم اسے کپڑے دینے کے بہانے آ گئی تھی۔ اس نے بڑی خوب صورت پیروں کو چھوتی پر پل کلر کی ستاروں سے بھری فراک اٹھا رکھی تھی جس کی سنہری فرل فرش پر گرتی تھی۔ یقیناً تائی امی نے عمائم کے لیے بھیجی تھی۔

''پہن کے فٹنگ چیک کر لو...... ابھی ٹیلر سے تیار ہو کر آئی ہے۔'' حریم نے فراک احتیاط سے بیڈ پر یوں بچھائی کہ اس کی ساری خوب صورتی واضح ہو گئی۔ حریم کی آنکھوں میں ستائش ابھر آئی تھی۔

''کتنی خوب صورت فراک ہے، تم پر جچے گی۔'' وہ تعریف کیے بنا نہیں رہ سکی تھی۔ عمائم کچھ دیر کے لیے اس کا چہرہ دیکھتی رہی تھی پھر دھیرے سے بولی اور اسے چونکا گئی۔

''تم پہن لو...... اگر زیادہ پسند ہے تو......'' اس نے صاف نیت سے آفر کی تھی۔ حریم کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''پھر تم کیا پہنو گی؟ آج عائشہ کی بارات ہے۔'' حریم نے خفگی سے جتایا تھا۔ جیسے عمائم تو بھول ہی گئی تھی۔

''میں بارات اٹینڈ نہیں کروں گی۔ گھر پر رہوں گی۔'' اس نے اپنا ارادہ ظاہر کر دیا تھا۔ حریم کی آنکھیں پھر سے کھل گئی تھیں۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ جیسے کچھ سمجھنا چاہتی ہو۔ اس کی آنکھوں میں دبی، دبی سی چمک تھی۔

''تم کیوں نہیں جاؤ گی؟'' اس نے بڑے ہی تجسس کا مظاہرہ کیا تھا۔ کٹے ہوئے بالوں کو کانوں میں اڑس کر دبے، دبے جوش سے پوچھا تھا۔ عمائم کو اس کا جوش و خروش سمجھ نہیں آیا تھا۔ وہ بہت چیزوں میں ذہین ہونے کے باوجود کچھ معاملوں میں سخت کوری تھی۔

''اچھا...... اچھا سمجھ گئی......'' حریم نے تالی بجا کر خود کو داد دی۔ جیسے اپنی ''سمجھ'' پر اسے بڑا پیار آیا ہو۔

''تم عالی اور احتشام بھائی کی وجہ سے نہیں جا رہی ناں......؟'' حریم کے اگلے سوال نے اس کا منہ کھلا دیا تھا۔ کیا اس کا چہرہ ایسی کھلی کتاب تھا۔ جسے کل کے بچے بھی پڑھنے لگیں...... یا پھر اسے اپنے تاثرات چھپانے میں کوئی کمال حاصل نہیں تھا...... وہ تو بس منجمد سی ہو گئی تھی۔ کچھ بول سکنے کی ہمت بھی نہیں کر سکی۔

''عالی کا رویہ بھی تو عجیب تھا۔ مجھے تو لسوڑی لگی، شام بھائی سے چپک گئی تھی۔'' حریم کو عالی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ اب وہ اپنی ناگواریت کا بھرپور اظہار کر رہی تھی۔

''تمہارے شام بھائی نے اسے چپکایا تو چپکی ناں...... گھر کی کوئی لڑکی تو ایسی ''ہمت'' اور ''جی داری'' کا مظاہرہ نہیں کر سکی۔ حتیٰ کہ ماہم بھی نہیں۔'' عمائم کے منہ سے بے ساختہ پھسلا تھا۔ حریم نے بھی اس انداز میں سر ہلایا تھا جیسے اس کی بات سے سو فیصد متفق ہو۔

''میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ شام بھائی کا کام دیکھو...... اپنا اتنا مہنگا ٹیبلیٹ اٹھا کر عالی کو پکڑا دیا۔ آج تک ہمیں اس پر گیم کھیلنے کی اجازت بھی نہیں مل سکی۔'' حریم کو اپنے دکھ یاد آ گئے تھے۔ عالی پر اور بھی تاؤ چڑھا تھا۔

''اور جانتی ہو، شام بھائی نے عالی سے کہا۔ تم صبح ضرور آنا۔'' حریم نے مزید ''تڑکا'' لگایا۔ ''میں تو شدید جیلس ہو گئی تھی۔'' اس کا منہ ہی اتر گیا تھا۔ پھر وہ حرم کے آواز دینے پر چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد تائی امی چلی آئیں۔ ان کے آتے سے ہی عمائم سمجھ گئی تھی، حریم نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔

''تم کیوں نہیں جاؤ گی؟ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ...... ساری لڑکیاں تیاری کر رہی ہیں......'' انہوں نے خفگی سے کہا۔ عمائم کا دل چاہا حریم کی گردن ہی مروڑ آئے۔ مجال ہے جو فضول لڑکی ہلکے پیٹ میں کچھ محفوظ رکھ لیتی۔ عمائم کو ہامی بھرتے ہی بنی تھی۔ وہ تائی امی کو کبھی انکار کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ سو تیار ہونے چل پڑی۔ تائی امی کل کی طرح آج بھی چاندی کے جھمکے، چوڑیاں وغیرہ بیڈ پر سجا گئی تھیں۔ جس کا مطلب تھا۔ ''تم نے یہ سارا سنگار مکمل کر کے آنا ہے۔'' وہ ان کا مفہوم سمجھتی تھی۔ پھر چپ چاپ چوڑیاں پہننے لگی۔ چاندی کے جھمکے کانوں میں اٹکائے، اس کا سنگار مکمل ہو گیا تھا۔ آئینے میں خود کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ بڑا مکمل حسن رکھتی تھی۔ پھر ایسی بے خبر

کیوں تھی؟ پر پل ستاروں بھری فراک نے اس کا دودھیا سراپا واضح کر دیا تھا۔ پر بل ہی مقیش لگا دوپٹا اچھی طرح لپیٹ کر وہ باہر نکل آئی تھی۔ حالانکہ اس نے تیاری میں ذرا بھی وقت نہیں لگایا تھا۔ پھر بھی جب باہر آئی تو سارا گھر بھاں، بھاں کر رہا تھا۔ صرف شموں پھولوں کی ٹوکریاں اٹھا کر پک اپ میں رکھتی دکھائی دی تھی، عمائم ہراساں سی رہ گئی۔

''اب وہ میرج ہال کس طرح سے پہنچے گی؟'' اس نے پورچ کو دیکھا...... وہ خالی پڑا تھا۔ عام دنوں میں یہاں گاڑیوں کی لائنیں لگی ہوا کرتی تھیں۔ عمائم کچھ مایوس ہو کر پلٹ آئی۔ پھر سینڈل اتار کر صوفے پر آرام سے بیٹھ گئی۔

''عائشہ! تمہاری بارات کا کھانا میرے نصیب میں نہیں تھا۔'' اس نے بہ آواز بلند سوچا تھا۔ معاً گیٹ کے پار سے ہارن کی آواز آئی۔ یکے بعد دیگرے ہارن بجتا رہا تھا۔ پھر جیسے کسی نے ہارن کے بٹن پر ہاتھ ہی رکھ لیا۔ عمائم نے کان لپیٹ لیے۔

''جانے کون اسٹوپڈ ہے۔'' وہ بھنا رہی تھی۔ پھر اٹھ کر ٹی وی لگا لیا۔ آواز قدرے اونچی کر لی تھی تا کہ ہارن کی ''بھاں، بھاں'' سنائی نہ دے...... کچھ ہی دیر میں آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ پھر کوئی جارحانہ تیور لیے اندر آیا تھا۔ عمائم جو بڑے اطمینان سے دوپٹا ایک طرف رکھے، سارے بال دائیں کندھے پر گرائے آرام سے لیٹی ٹی وی پر ٹاک شو ملاحظہ کر رہی تھی۔ ایک دم گڑبڑا کر دوپٹا اٹھانے لگی۔ پھر بھی اسے آنے والے کی چبھتی نگاہیں جسم کے آر پار محسوس ہوئی تھیں۔ وہ کٹ سی گئی۔

''تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں میں......'' اس نے ایک جھٹکے سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کیا۔ اسکرین پر سیاہی چھا گئی تھی۔

''بیس منٹ سے ہارن کی آواز سنائی نہیں دی۔ کانوں میں روئی ٹھونسی ہے کیا؟'' وہ اب غرایا تھا۔ عمائم شرمندہ سی ہو گئی۔ اس شخص کے سامنے عمائم کے لیے شرمندگی ہی لکھی تھی۔

''تو وہ ہارن کیا میرے لیے بج رہا تھا؟'' عمائم نے ہونق پن کی انتہا کر دی تھی۔ اس نے شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھورا۔

''نہیں، تمہارے بھوت کے لیے، اب چلو بھی...... بارات پہنچ بھی گئی......'' وہ خاصا بگڑا ہوا لگ رہا تھا۔ جیسے کسی نے زبردستی بھیجا ہو...... صاحب بہادر کے مزاج بہت برہم تھے۔

''پکڑ کے ڈرائیور بنا دیا۔ تائی امی بھی ناں......'' وہ بھناتا ہوا گاڑی تک آیا تھا۔ عمائم بھی بھاگتے ہوئے اس کے پیچھے لپکی۔

''کیا ضرورت تھی تائی امی کو اسے بھیجنے کی۔'' اس نے عادتاً اونچی آواز میں سوچا تھا۔ پھر بیک ڈور کھول کر بیٹھ گئی۔ آج اس کے نصیب جاگ گئے تھے۔ احتشام کی سپر لگژری کار میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ اگر اس کی جگہ حریم ہوتی تو دونوں ہاتھوں سے زوردار آواز میں تالی پیٹ کر خوشی کا اظہار کرتی...... وہ اچھے چہروں، اچھے کپڑوں، اچھی گاڑیوں اور موبائلز سے خوب متاثر ہو جاتی تھی۔

معاً عمائم کا موبائل بجا...... اس نے چپکے سے نگاہ ڈالی تھی۔ عالی کا میسج تھا۔ ''ابھی آئی نہیں تم......؟'' وہ یقیناً بے چین ہو گئی۔ ظاہر ہے، احتشام جو وہاں نہیں...... وہ بگڑ کر سوچتی رہی تھی۔

''لوگوں کو بھی کیسے، کیسے کمال حاصل ہیں...... لمحوں میں پتھروں کو پگھلا دیتے ہیں۔'' اس کا دل خوب بھر گیا تھا۔ وہ عالی کے لیے سخت بدگمان ہو رہی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ کوئی اور بھی اس کے تاثرات نوٹ کر رہا ہے۔

''اچھے دوست سرمائے کی طرح ہوتے ہیں، ان کی حفاظت کرنی چاہیے۔'' وہ سابقہ اکھڑ لہجے میں بولا تھا۔ عمائم گنگ سی رہ گئی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا۔ کیا وہ عمائم سے مخاطب تھا؟ اس کی احمقانہ بدگمانی ٹائپ حرکتوں کو نوٹس کر رہا تھا۔ یا اس کی ''حماقتوں'' سے لطف اٹھا رہا تھا؟ پھر عمائم کو ایک دفعہ مزید اس کی آواز سنائی دی تھی۔

''ایک ڈراپ سین سنو......فرانسیسی ہوا باز اپنا جہاز رن وے پر اتارتے ہوئے بہت خوش تھا۔ نیچے عملے نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک ائرمین اس کی وردی اور ہیلمٹ اتارنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ ہوا باز نے بڑے فخر سے کہا۔

''آج میں نے جرمنوں کا بڑا نقصان کیا ہے......دو جہاز گرائے، ایک آبدوز تباہ کی اور ایک بحری جہاز اڑا دیا۔''

''لیکن سر! آپ سے بہت بڑی بھول بھی ہوگئی۔'' ائرمین نے کہا۔

''وہ کیا بھئی؟''

''دراصل سر! آپ غلطی سے جرمنوں کے ہوائی اڈے پر ہی لینڈ کر گئے ہیں......'' ائرمین مسکرا کر بولا۔

اس ڈراپ سین کا کیا مطلب تھا؟ عمائم کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ اس کی خوشی کا فیضان تھا کہ وہ عمائم سے از خود مخاطب تھا۔ اب اس کی باتوں کے مفہوم کیا نکلتے تھے؟ عمائم کی بلا سے......اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ گویا اس نے واضح کر دیا تھا کہ اس نے لطیفہ انجوائے کیا ہے۔

''یہ ہوتی ہے احمقانہ چال......نادانی اور غائب دماغی جب ایک چیز تمہیں ''شکوک'' میں مبتلا کر رہی ہے تو اسے چھوڑا کیوں نہیں جاتا۔'' اس نے اِک گرم نگاہ بیک مرر پر ڈالی تھی۔ عمائم کچھ ہونق سی ہوگئی تھی۔ آخر وہ کیا سنا رہا تھا۔ اس نے چپکے سے موبائل پر نگاہ ڈالی۔ وہاں اجنبی نمبر سے میسج آ رہے تھے۔ وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ پھر غور کیا تو نورس کے میسج تھے۔ اِک نئے اور اجنبی نمبر سے۔ نورس کے ساتھ اسے گزشتہ واقعات بھی یاد آگئے تھے۔ دل جیسے اتھاہ میں گر رہا تھا۔ نورس نے اسے شاید آخری دھمکی بھرا میسج سینڈ کیا تھا۔ عمائم کی پیشانی پر پسینہ اتر آیا۔ ابھی تو وہ زبانی کلامی دھمکا رہی تھی۔ آگے نہ جانے کیا ارادے تھے؟

''ایک اور کہانی سنو......برما فرنٹ پر دلدل سے لبریز ایک علاقے میں رائل انجینئرز کور کے آفیسر انچارج نے اپنے ایک لفٹیننٹ کو سڑک تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ لفٹیننٹ نے جگہ کا معائنہ کرنے کے بعد کرنل کی خدمت میں رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔

''جناب! دلدل قدآدم گہری ہے۔ اور اس پر سڑک تعمیر نہیں کی جاسکتی۔''

''بکومت......'' کرنل گرجا۔ ''جس چیز کی ضرورت ہو، لکھ کر دو، یہ کوئی طریقہ نہیں ہے، تمہاری تحریری رپورٹ آنے پر میں ضرورت کی چیزیں مہیا کر کے دوں گا۔''

لفٹیننٹ سیلوٹ کر کے اپنے خیمے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد کرنل کو اِک چٹ ملی......جس پر لکھا تھا۔

''دلدل والے علاقے میں سڑک تعمیر کرنے کے لیے سولہ، سولہ فٹ کے دس سپاہی مہیا کر دیجیے۔ تاکہ تعمیرات کا کام شروع کیا جاسکے......'' وہ خاموش ہوا اور گاڑی کی اسپیڈ بھی بڑھ گئی۔ عمائم پھر بھی ہونق رہی تھی۔ اس کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ کچھ دیر بعد احتشام کی آواز پھر سے سنائی دی۔

''کوئی اتنا ناسمجھ بھی نہ ہوا کرے۔'' وہ دھیمی آواز میں غرایا تھا۔ عمائم ساکت سی ہوگئی۔ اس کا غصہ عمائم کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''آبدوز گرا کر دشمن کے ہوائی اڈے پر لینڈ کرنے کا کیا مطلب ہے؟'' اس کی آنکھوں سے آگ سی نکل رہی تھی۔ عمائم بغیر دیکھے بھی جلنے لگی تھی۔ چہرہ پسینے سے تربتر تھا۔ صد شکر کہ وہ میک اپ سے مبّرا تھی۔ ورنہ اس پسینے سے سارے پرنٹ بگڑ سکتے تھے۔ چہرہ پر عنڈ سا ہو جاتا، چتکبرا سا......اس کا سر ٹھوڑی سے جا لگا۔

''گرفتاری......یعنی قید، مشکلات، عذاب؟'' وہ بگڑ رہا تھا۔ ساتھ، ساتھ قریب رکھے حساس سسٹم والے موبائل کو بھی دیکھ رہا تھا۔ موبائل کی اسکرین بلنک ہو رہی تھی۔

''تم تو رائل انجینئرز کور کے آفیسر انچارج سے بھی زیادہ کوڑھ مغز ہو...... دلدل پر پل تعمیر ہوتے ہیں نہ سڑکیں...... دلدل ہمیشہ گہری ہوتی ہے...... اس میں دھنسا ہوا شخص کبھی نکل نہیں سکتا۔ آفیسر انچارج سولہ فٹ کا سپاہی مہیا نہیں کرسکتا۔ سو پہلے ہی سمجھ لیتا۔ تحریری رپورٹ کی کیا ضرورت تھی؟'' احتشام کے ماتھے پر دو بل نمودار ہوئے تھے۔ اس نے گاڑی کی اسپیڈ اور بڑھادی تھی۔ عمائم ہونق سی رہ گئی۔ پھر اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ اس کے کان میں ائرفون لگا تھا تو گویا وہ کسی اور سے فون پر مخاطب تھا؟ شرمندگی کے مارے اس کا سر جھک گیا تھا۔ ساری خوش فہمیوں کے رنگ اتر گئے۔ احتشام نے بیک مرر سے عمائم کا جھکا سر دیکھا اور گاڑی کے ٹائر شدت سے... چرچرائے تھے۔ سامنے ہوٹل کی شاندار عمارت کھڑی تھی۔ عمائم نے گاڑی سے نکلنے میں لحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ وہ پیچھے دیکھے بغیر اندر بھاگ گئی تھی۔ پیچھے دیکھ لیتی تو شاید پتھر ہوجاتی اور پتھروں میں جان نہیں ہوتی۔

☆☆☆

تقریب اپنے عروج پر تھی۔ شادی کی روایتی رسمیں جاری تھیں۔ تاہم آج ماہم کی چونچالی غائب تھی۔ اس کی نگاہیں بھٹک بھٹک کر احتشام اور عالی کا طواف کررہی تھیں۔ وہ کل کی طرح آج بھی مگن تھے۔ احتشام سیاہ شرٹ، سیاہ پینٹ میں عام دنوں سے ہٹ کر تر و تازہ لگ رہا تھا۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں گھسا رکھے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ سر کو ہلکا سا خم دیتا تھا گویا مقابل کی بات سمجھنے کی طرف اشارہ تھا۔ ماہم کا جی اوب گیا تو وہ بہن کے پاس اسٹیج پر چلی گئی تھی۔ حریم جان بوجھ کر عالی اور احتشام کے اردگرد منڈلا رہی تھی۔ مگر آج اس کے ہاتھ ان کی کوئی کمزوری لگنے والی نہیں تھی۔

عمائم ایک الگ تھلگ میز پر کہنیاں ٹکائے ہر ایک چہرے کو اجنبی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی حتی المقدور کوشش تھی کہ وہ عالی اور احتشام کو نہ دیکھے۔ لیکن یہ کوشش ہر چار منٹ بعد بیکار ہوجاتی تھی۔ وہ خود سے الجھتے، الجھتے تھک گئی تھی۔ ''ہونہہ...... میری بلا سے......'' اس نے عادتاً اونچی آواز میں سوچا تھا۔ پھر تائی امی کا اشارہ پا کر اٹھ گئی۔ انہوں نے بسمہ کو بلانے کا کہا تھا۔ اور بسمہ جہاں بیٹھی تھی وہ راستہ پل صراط تھا۔ اسے عالی اور احتشام کے قریب سے گزر کے جانا تھا۔ متبادل کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ عمائم نے خود کو بے پروا بنا کر کڑا دل کیے قریب سے گزرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اپنے تئیں اس نے ثابت کیا تھا کہ وہ ان دونوں کو دیکھے بنا جارہی ہے...... جب وہ ان دونوں کے پاس سے گزری تھی آواز آئی۔ بڑی سنجیدہ قسم کی آواز تھی۔

''ڈفر ہے......'' احتشام نے سرد سے لہجے میں کہا تھا۔ جواباً عالی کی ہنسی بے ساختہ تھی۔ عمائم کو لگا جیسے اسے ہی سنایا گیا ہو۔ اسے شدید غصہ آیا مگر پھر بھی ضبط کرتے، کرتے بسمہ تک پہنچ گئی۔ تائی امی کا پیغام دے کر واپس بھی وہیں سے آنا تھا۔ جب وہ دوبارہ ان کے قریب سے گزری تو عالی کی آواز آئی تھی۔

''عمائم رکو......'' اس نے بازو سے پکڑ کر عمائم کو روک بھی لیا تھا۔ وہ بادلِ ناخواستہ رک گئی تھی۔ تاہم اس نے یوں ثابت کیا گویا بڑی ناگواری سے کھڑی ہے۔

''احتشام کو بڑی اچھی کہانیاں آتی ہیں مگر ان کو سمجھنے کے لیے دماغ چاہیے......'' عالی نے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ تب اسے احتشام کی ہلکی آواز سنائی دی تھی۔

''جو ان کے پاس ہے نہیں......'' اس کا لہجہ سرد اور برفیلا تھا۔ عمائم کو شدید غصہ آیا۔

''تو میری بلا سے......'' وہ تن فن کرتی وہاں سے چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد عالی بھی آگئی۔ اس کا انداز خفگی سے بھرپور تھا۔

''تم اتنی بدتمیز تو نہیں تھیں۔'' عالی کا لہجہ جتلاتا ہوا تھا۔

''اب ہوچکی ہوں......'' عمائم چڑ کر بولی۔ وہ خفگی سے دور بہت دور کھڑے احتشام کو دیکھ رہی تھی جو ہمیشہ اسے ڈی گریڈ کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ جسے اس نے بہ مشکل اندر اتارا تھا۔

''تم ڈپریسڈ ہو...... معاملہ بھی تو گمبھیر ہے...... اگر احتشام تمہیں فیور دیتا تو اس مشکل سے نکل سکتی تھیں تم......'' عالی نے لگے ہاتھوں اس کی کلاس لی تھی۔ عمائم نے غصے سے اسے دیکھا۔

''مجھے احتشام کی فیور نہیں چاہیے...... تمہیں ایک بات سمجھ کیوں نہیں آتی......'' وہ چڑی تھی۔

''وہ کون سا تیار بیٹھا ہے۔'' عالی منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ ''اسے تو میں نے فورس کیا تھا۔''

''تو نہ کرتی۔'' عمائم نے بھنا کر کہا۔ ''صد شکر، احسان کی گانٹھ اٹھانے سے بچ گئی۔'' اب وہ آنکھ کا کونا بھی پونچھ رہی تھی۔ پھر اس نے عربی کی ایک حکایت سنائی۔ اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔

''حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے مدین گئے تو انہیں بخار نے آلیا اور اس کے بعد بھوک ستانے لگی تو انہوں نے دعا کی۔

''اے میرے رب......! میں مسافر بھی ہوں، مریض بھی ہوں اور میرے پاس کچھ بھی نہیں۔''

اللہ نے فرمایا...... ''اے موسیٰ! کیا تو جانتا ہے کہ غریب کون ہے؟ مریض کون ہے؟ اور بغیر مال والا کون ہے؟'' حضرت موسیٰ نے کہا۔ ''اے میرے پروردگار مجھے کچھ علم نہیں۔'' اللہ نے فرمایا۔

''غریب وہ ہے جس کا مجھ سا پروردگار نہ ہو، مریض وہ ہے جس کا مجھ سا طبیب نہ ہو اور بغیر مال والا وہ ہے جس کا مجھ سا کارساز نہ ہو۔'' عمائم کی آواز بھیگ گئی تو وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔ عالی بھی کچھ سحر زدہ کھڑی تھی۔ پھر اس فسوں کو عالی نے ہی توڑا۔

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' اس کا لہجہ سنجیدہ اور کچھ سوچتا ہوا تھا۔

''وہ ہے ناں میرا کارساز......'' عمائم کا لہجہ اٹل تھا۔ بہت مضبوط اور پختہ، عالی اسے دیکھتی رہی تھی۔ پھر سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

''اللہ نے انسانوں کو وسیلہ بنایا ہے۔ ایک دوسرے کی تکلیف کا بوجھ اٹھائیں۔'' وہ دور کھڑے احتشام کو دیکھ رہی تھی۔

''اور اللہ نے ہر کمزور کے لیے ایک طاقت ور بنایا ہے۔ جو اسے سپورٹ کرے، اس پر مسلط نہ ہو، بس سمجھ کے نکتوں کا ہیر پھیر ہے۔ عنقریب تم بھی سمجھ جاؤ گی۔'' وہ فکر کا پہلو اجاگر کرتی دھیمے سے مسکرائی تھی۔ عمائم لمحے بھر کے لیے ساکت رہ گئی تھی۔ گویا اس میں سانس بھی نہ ہو جیسے کوئی چینی کی بے جان مورت بہت دیر بعد اسے معمولی سی بات سمجھ میں آئی تھی۔ ''تو اللہ نے اس گینگسٹر کو میرے لیے ''وسیلہ'' بنایا؟'' وہ سانس روکے بے جان کھڑی تھی۔

☆☆☆

شادی کی رونقیں سمٹ کر ایک ''سکوت'' کے لبادے میں لپٹ گئی تھیں۔ گھر کے سب افراد اپنی، اپنی مصروفیات میں گم ہو چکے تھے، کوئی کالج جا رہا تھا، کوئی یونیورسٹی کوئی دفتر، عمائم کے پاس بھی ہر بہانہ ختم تھا۔ اب گھر بیٹھنا بھی محال تھا۔ کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑا۔ پھر وہ ایک فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی تھی۔

اگلے ہی دن وہ تیار تھی۔ فیروزی خوب صورت سا ڈریس، فیروزی چپل پیروں میں پھنسائے اس نے اوپر گاؤن پہنا اور باہر نکل آئی۔ گیلری کے آخری سرے پر حریم کھڑی تھی۔ چہرے پر نقاہت بھرے تاثرات لیے عمائم نے اشارہ کیا تو بھاگتی ہوئی آ گئی۔

''تم کالج نہیں گئیں؟'' اس نے کتابوں کو ایک بیلٹ میں باندھ کر بیگ میں رکھا تھا۔ اس کا انداز مصروف سا تھا۔ حریم نے اپنے چہرے پر شدید بیماری بھرے تاثرات پرنٹ کر لیے۔

''پیٹ میں شدید درد تھا۔'' اس نے کراہ کے کہا۔ ایسے ''بہانے'' وہ عموماً چھٹی کے لیے اپلائی کرتی تھی کہ جب خاص طور پر اس کا ٹیسٹ ہوتا، عمائم نے سمجھ کر سر ہلایا۔ پھر ذرا تجسس بھرے لہجے میں بولی۔

''کوئی نئی خبر ہے؟'' اس کا انداز بھرپور رازدارانہ تھا۔ حریم فوراً چوکنا ہو گئی۔

''ہے تو......'' اس کی آنکھوں میں بھی تجسس بھر گیا تھا۔ آنکھوں میں بے چینی بھی تھی۔ چہرے پر بھرپور جوش تھا۔

''کیا رپورٹ ہے؟'' عمائم نے دلچسپی سے کہا۔ حریم اس کے کان پر جھک گئی تھی۔

''شام بھائی کے کان سے موبائل کبھی نہیں اترا۔ آج کل بڑی ترنگ میں ہیں، جب سے تمہاری دوست اسے ملی ہے۔'' آخر میں اس کا لہجہ کڑوا سا ہو گیا تھا۔ عمائم کی آنکھوں میں بھی تفکر کے سائے پھیلے۔

''ہوں...... '' اس نے ہنکارا سا بھرا تھا۔ ''تو گویا بات یہاں تک پہنچ گئی۔'' عمائم نے عادتاً اونچی آواز میں سوچا تھا۔ حریم کا تجسس کچھ اور بڑھ گیا۔

''اور اس مکار کتنی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟'' حریم کا اشارہ عالی کی طرف تھا۔ عمائم نے اسے ٹوکا نہیں۔ پھر وہ کچھ سوچ کر آگے بڑھ گئی۔

''نگاہ رکھوں گی...... منٹ، منٹ کی رپورٹ دوں گی۔'' حریم نے پیچھے سے یقین دہانی کروائی تھی۔ وہ سر ہلا کر آگے بڑھتی رہی۔ پھر قدرے گردن موڑ کر بولی۔

''لیکن وفاداری شرط ہے۔'' اس نے حریم کو کچھ یاد کروایا تھا۔ حریم کا سر ٹھوڑی سے جا لگا۔ اس نے نچلا ہونٹ لٹکا لیا تھا۔ پھر عمائم کو جاتا دیکھتی رہی۔

عمائم نے پورچ سے کار نکالی اور جامعہ کی طرف رواں دواں ہو گی۔ ایک گھنٹے بعد وہ پارکنگ میں کھڑی تھی۔ گارڈ کو کارڈ دکھایا تو اس نے عمائم کو اندر جانے سے روک دیا۔ وہ جیسے ششدر رہ گئی تھی۔

''اوپر سے آرڈر ہے۔'' گارڈ نے اپنی مجبوری بتائی تھی۔ عمائم کو شدید اہانت کا احساس ہوا تو گویا نورس نے اس عمارت کو عمائم کے لیے شجرِ ممنوعہ قرار دے دیا تھا۔ وہ اس عظیم درس گاہ کے اندر جانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتی تھی۔ عمائم کے گال تپنے لگے۔ اس نے وہیں کھڑے، کھڑے نورس کو کال کی۔ پھر دو تین میسج بھی لکھ کر سینڈ کیے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ پارکنگ کے قریب انتظار گاہ میں بیٹھ گئی تھی۔ قریب اڑھائی گھنٹے بعد گارڈ نے اسے اندر جانے کا کہا تھا۔ عمائم بہ مشکل اپنے پیروں کو گھسیٹتی ہوئی اندر آئی تھی۔ ماربل کے ٹھنڈے فرش پر چلتے ہوئے اس کا رواں، رواں سلگ رہا تھا۔

نورس آخر اس کے ساتھ کون سا گیم کھیل رہی تھی، انسان سے بھول چوک تو ہو جاتی ہے، اس پر ایسا جارحانہ ردِّعمل......؟ وہ سلگتی سوچوں کے ساتھ نورس کے انتہائی عالیشان دفتر میں پہنچ گئی تھی۔ وہ دفتر میں موجود نہیں تھی۔ یقیناً مزید انتظار کی کوفت میں جتلا کر رہی تھی۔ عمائم پورے دفتر کی ایک، ایک چیز کو ازبر کر چکی تھی۔ بس وہاں ایک چیز انوکھی اور منفرد تھی۔ بظاہر مٹی کا خوب صورت گملا...... جو آفس میں کھلنے والی بالکونی میں رکھا تھا۔ جس میں ڈھیروں مصنوعی پھولوں کو سجایا گیا تھا۔ دیکھنے میں یہ پھول اصلی معلوم ہوتے تھے، عمائم کی آنکھوں کو بہت اچھے لگے...... قریب ایک گھنٹے بعد نورس دفتر میں آئی تھی۔ اس نے بلیو لینس لگا رکھے تھے۔ آنکھوں پر بلیک چشمہ بھی تھا۔ جسے اس نے اتار کر گلاس ٹیبل پر رکھ دیا۔ اب وہ اسکارف کھول رہی تھی۔ اپنے دفتر میں وہ اسکارف کھول دیتی تھی۔ عمائم اس کے بالوں کا رنگ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس کے ریشمی سنہری بال سرمئی رنگ میں بہت رف اور عجیب لگ رہے تھے، بالوں میں کہیں، کہیں سفیدی نمایاں تھی۔ نورس نے نظر کا چشمہ نکال کر پہن لیا۔ اس کا میک اپ بھی عجیب تھا۔ عمائم کو پہلی نگاہ میں وہ ادھیڑ عمر سی لگی۔ حالانکہ وہ ایسی تھی نہیں...... نہ جانے لوگ بھی کیسے، کیسے فیشن اپنا لیتے ہیں؟

کچھ دیر عمائم کو نظر انداز کرنے کے بعد بالآخر نورس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''تم خود چل کر آ گئیں...... یہ بڑا کمال ہے۔ ورنہ میرے لوگ تمہیں اٹھا ہی لاتے۔'' اس کا لہجہ بہت ملائم تھا بس الفاظ عجیب تھے۔ عمائم ناسمجھی سے اسے دیکھے چلی گئی تھی۔ وہ عام روٹین میں بہت حلیم تھی۔ یہ تو اس منحوس پیکٹ کی وجہ سے......

''نورس! میں معذرت کرتی ہوں، میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی، پلیز مجھے اسٹرک آف مت کریں، میرا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔'' وہ رونا نہیں چاہتی تھی، پھر بھی آنسو پگھلنے لگے تھے، وہ ہراساں ہو رہی تھی۔

''میری جان! میں کب تک تمہیں نکالنا چاہتی ہوں، اپنی غلطی کو تسلیم کیا ہے تو پیکٹ بھی ڈھونڈ لاؤ...... بات ختم......'' نورس کی حلاوت قابلِ دید تھی۔ عمائم نے اسے پوری بات پھر سے سنائی۔ نورس نفی میں سر ہلانے لگی تھی۔ جیسے اسے کسی بودے بہانے پر یقین نہیں آیا ہو۔

''عمائم جان! تمہارے گھر سے میرا سامان چوری ہوا؟ آخر کیوں؟ کوئی تو وہاں ہے ناں......؟ مشکوک انسان، کیا پہلے بھی کچھ چوری ہوا؟ نہیں ناں تو پھر؟'' نورس میٹھی آواز میں بولتی رہی، عمائم کو وہ انتہا کی سنجیدہ لگی تھی۔

''ثریم نے......'' عمائم نے کچھ کہنا چاہا تو نورس نے بے ساختہ اسے ٹوک دیا۔

''ثریم نے اپنا فرض نبھایا۔ غلطی تم سے سرزد ہوئی۔ سزا بھی تمہی کو ملے گی۔'' وہ بڑے عام سے لہجے میں ملائمت سے بولی تھی۔ عمائم اور بھی ہراساں ہوئی۔

''میرے گھر والے مجھے معتوب ٹھہرا دیں گے۔ وہ میرے نکالے جانے پر مجھے مصلوب کر دیں گے۔ وہ بہت انا پرست ہیں۔ میری معمولی سی غلطی مجھے سب کی نگاہ سے گرا دے گی۔'' اس نے ٹوٹی آواز میں بہ مشکل کہا۔ نورس حلیمی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر سر نفی میں ہلا کر بولی۔

''تمہاری غلطی معمولی نہیں...... سزا بھی معمولی نہیں ہوگی۔'' اب وہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک فائل کھول لی۔ اب وہ اس فائل کو ملاحظہ کر رہی تھی۔

''دو دن ہیں تمہارے پاس، اس فائل کا پرنٹ تمہارے ہاتھ میں ہوگا۔ اس پر لکھے الفاظ کا مفہوم تمہارے گھر والے سمجھ جائیں گے، اِک نظر دیکھنا چاہو تو دیکھ لو......'' نورس نے بہت محبت سے لیپ ٹاپ کا رخ عمائم کی طرف کر دیا تھا۔ عمائم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ اس کے حلق پر جیسے تیز دھار چاقو چل رہا تھا۔ وہ جیسے قطرہ، قطرہ مر رہی تھی۔

وہ الفاظ نہیں...... اس کی موت کا پروانہ تھے۔ عمائم کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچنے لگے۔ وہ بے یقینی سے سامنے کھلے پیج کو پڑھنے لگی تھی۔ اس پر غشی طاری ہونے لگی۔

''کسی انسٹی ٹیوٹ میں کوئی لڑکی ''بدفعلی'' کرتی پکڑی جائے تو ادارہ اسے بے دخل تو کرتا ہی ہے اس کی ڈگریز بھی ضبط کر لی جاتی ہیں اور ایک سرٹیفکیٹ تیار کر کے دیا جاتا ہے جو آئندہ زندگی میں کسی قابل نہیں چھوڑتا۔ امید ہے تم سمجھ گئی ہو...... دو دن کا وقت ہے، آرام سے سوچو، اسی دفتر میں رہو، اچھے برے پر غور کرو اور پیکٹ چرانے والے کا نام بتا دو...... پیکٹ کا حصول پھر ہمارا کام ہے......'' وہ نرمی سے اس کا گال چھو کر اٹھی اور پھر کسی ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گئی۔ عمائم کا سُن ہوتا دماغ اچانک بیدار ہوا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے نورس کے پیچھے لپکی تھی۔ مگر دروازہ لاک ہو چکا تھا۔ یہ ایڈمن آفس تھا۔ اکیڈمک بلاک سے الگ تھلگ، دیواریں ساؤنڈ پروف تھیں، وہ عمر بھر بھی چیختی تو باہر آواز نہ جاتی...... پھر بھی وہ آدھا گھنٹا مسلسل روتی، تڑپتی اور چلاتی رہی تھی۔ آخر نورس اس کے ساتھ کیا کر چکی تھی؟ اگلے دو گھنٹوں میں اس نے بہتر مرتبہ سوچا تھا۔ ہر دفعہ ایک چلچلاتا سچ حلق پر پنجہ مارتا اس کی سانس تک کھینچ لیتا۔

وہ چلا، چلا کر تھک گئی۔ رو، رو کر نڈھال ہو گئی۔ اس کا سُن ہوتا دماغ تھک، تھک کر کھلنے لگا...... پھر اسے خیال سا گزرا تھا۔ ''تو کیا نورس نے اسے قید کر لیا؟'' وہ آنکھیں دباتی ابھی تک سسک رہی تھی۔ پھر اسے یقین ہو ہی گیا۔ وہ ایک پری کی قید میں تھی۔ وہ گرفتار ہو چکی تھی۔ معاً اس کی آنکھوں سے پردہ سا ہٹ گیا۔ وہ جیسے خود ہی منجمد ہو گئی تھی۔

''آبدوز گرا کر دشمن کے ہوائی اڈے پر لینڈ کرنے کا مطلب کیا ہے؟'' کوئی عمائم کے کان میں چلایا تھا۔ وہ جیسے پتھر کی مورت میں ڈھل گئی تھی۔ پھر اس کے اندر سے چیختی چلاتی آواز آئی۔

''گرفتاری......'' کس نے عمائم کو تمسخر سے دیکھا تھا۔ جیسے اس کی بیوقوفی پر لعنت بھیج رہا تھا۔ عمائم سُن سی رہ گئی۔ وہ پیکٹ چوری کروا کے دشمن کی راجدھانی میں بے دھڑک چل کے آئی تھی۔ انجام اس سے الگ کیسے ہوتا؟

''میں رائل انجینئرز کور کے آفیسر انچارج سے بھی زیادہ کوڑھ مغز ہوں، کچھ بھی ہی نہیں...... دلدل کی گہرائی کا علم تب ہوتا ہے جب دلدل میں قدم پڑتا ہے۔ اور میں ''دلدل'' میں اتر چکی ہوں۔ یہاں سے نکلنا محال ہے...... اے کاش! تم دلدل سے نکلنے کی کوئی کہانی بھی سنا دیتے۔'' اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بھیگی آواز میں سوچا۔ وہ بھربھری ریت کی طرح بکھر رہی تھی۔

☆☆☆

صوفی صالح کی ''راج گدی'' پر بڑا اداس سورج طلوع ہوا تھا۔ دن بھی بے جان تھے راتیں بھی ویران تھیں۔ کہیں دور سرحد کے اس پار کسی رادھیکا کرشن جی مہاراج کی پیاری گوپی گھٹنوں میں سر رکھے سسکتی جا رہی تھی۔ جانے کس روگ تلے نڈھال تھی۔

رات کو غوک جوہڑوں میں ٹرٹراتے، کہیں گیدڑوں کی آواز مہیب سناٹوں کو توڑ ڈالتی۔ ایسی ہی ویران اور اداس شام تھی۔ عمامہ کی جرأت پر کپکپاتی، لرزتی، خوفزدہ ہوتی۔ اس نے باہر لپکتی کپکپاتی شام کو دیکھ کر ریسیو رکھا اور دنگ رہ گئی۔ اس کے پیچھے طاہرہ کھڑی تھیں۔ زعفرانی دوپٹے میں زعفران جیسی...... ان کے گال آگ کی طرح تپ رہے تھے۔ آنکھوں سے شعلوں کی پھنکار گر رہی تھی۔ عمامہ کھڑے، کھڑے جھلس گئی۔ ماں کا خوف اسے پھڑپھڑانے پر مجبور کر گیا تھا۔ اس کے ہاتھ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح پہلو میں گر پڑے۔ طاہرہ شعلہ فشاں نگاہوں سے اسے گھورتی قریب آئی تھیں۔ پھر ان کا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا۔ عین ممکن تھا وہ زندگی میں پہلی مرتبہ عمامہ پر ہاتھ اٹھا لیتیں مگر ضبط اور صبر کے شکنجوں نے انہیں جکڑ لیا۔

کل اس نے وداع ہو جانا تھا۔ ماں کا دل تھا سو پسیج گیا۔ مگر وہ فون کال بہت بڑا سوالیہ نشان تھی۔ انہوں نے سخت کھردرے لہجے میں سوال کیا۔

''کسے فون کیا عمامہ......؟'' ان کا سوال بڑا نوکیلا تھا۔ عمامہ خوف سے کپکپانے لگی۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

''مرنے کا بہت شوق ہے تمہیں......؟'' وہ دھیمی آواز میں چیخ رہی تھیں۔ ''موت کے مفہوم کو جانتی ہو کیا؟ موت کی اذیت اور سختی کا اندازہ ہے تمہیں...... موت تو جوانوں کو نچوڑ لیتی ہے بوڑھے جسموں کو توڑ دیتی ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں لفظوں کے بھالے اتار رہی تھیں۔ عمامہ کا سر جھک رہا تھا۔

''موت کی بات کرتی ہو...... اپنے ماں، باپ کا امتحان لیتی ہو؟'' انہوں نے غیظ بھرے لہجے میں کہا۔ ان کے لفظ، لفظ سے درد کا غبار پھوٹ رہا تھا۔

''اماں......'' وہ سسک اٹھی۔ پھر سسکتی رہی...... بہت شدت سے تڑپتی رہی...... طاہرہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

''میں مرنا نہیں چاہتی۔'' وہ ماں کے سینے سے جا لگی۔ ''پر میرا دل مر رہا ہے اماں...... مجھے بچا لیں اماں......'' عمامہ بے آواز رو رہی تھی اور اس کے آنسو طاہرہ کا آنچل بھگو رہے تھے۔ نیچے ڈھولک کی تھاپ تھی۔ گیتوں کی دھنیں بکھر رہی تھیں۔ تالیوں کا شور تھا...... اور ادھر عمامہ رو رہی تھی۔ اور اس کے آنسو طاہرہ کا زعفرانی آنچل بھگوتے رہے۔

''عمامہ......'' ماں جیسے تڑپ اٹھی تھی۔ ''پاگل نہ بن...... جھلی نہ ہو، ورنہ میں ''حواس'' کھو دوں گی۔'' طاہرہ کی بڑی، بڑی آنکھوں سے سیال بہنے لگا۔ عمامہ کے رونے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ بے آواز مچل، مچل کر تڑپتی رہی تھی۔

''اماں! یہ شادی کچھ آگے نہیں ہو سکتی؟ تھوڑا سنبھلنے تک، کم از کم ذبیحہ کو ''قتل گاہ'' لے جانے تک کچھ مہلت تو دی جاتی ہے۔''

عمامہ نے بڑا نڈھال کر دینے والا سوال اٹھایا تھا۔ طاہرہ کا سر جھک گیا۔ وہ بیٹی کی حالتِ زار سے واقف تھیں لیکن مقامِ بے بسی کے شکنجے میں تھیں۔ زنجیروں نے انہیں جکڑ رکھا تھا۔ وہ بااختیار ہوتے ہوئے بھی بے اختیار تھیں۔ کاش ان میں اتنی طاقت ہوتی کہ وہ عمامہ کی زندگی کا رخ بدل دیتیں۔

"عمامہ۔" انہوں نے تڑپ کر اس کے گلاب ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بدشگونی کی بات مت کرو۔"

"ذرا سی "مہلت" کا سوال ہے اماں! جان حلق میں اٹک رہی ہے۔" عمامہ ان کے پیروں میں جھک آئی تھی۔ طاہرہ کا دل پگھل، پگھل کر بہہ گیا۔

"کیسے سوال اٹھاتی ہو؟" ان کی آنکھیں بہتی رہیں۔ "تیری "تقدیر" سے لڑنے کی میری اوقات نہیں...... اللہ کے دربار میں حاضر ہو...... دعائیں آسمان کے پردے ہلا دیتی ہیں۔" انہوں نے نگاہ چرا کر آہستگی سے کہا تھا۔ عمامہ کو امید کا روشن پہلو دکھائی دیا۔ وہ جان گئی تھی تقدیر ٹلتی نہیں تھی۔ نصیب بدلتے نہیں تھے۔ لوحِ محفوظ کا لکھا کبھی مٹ نہیں سکتا، نہ تبدیل ہو سکتا ہے۔ اللہ نے فرمادیا۔ "صحیفے لپیٹ دیے گئے ہیں، قلم خشک ہو چکے ہیں۔" پھر وہ اپنی تقدیر بدلنے کی دعا کس طرح سے کرتی۔ یہ شادی رک نہیں سکتی تھی، ٹل ضرور سکتی تھی۔

عمامہ کی آنکھوں میں ستاروں کی کوٹ بھر گئی تھی۔ اس نے گلابی دوپٹا اتار کر پھینک دیا۔ پھر وہ غسل خانے میں وضو کرنے بھاگ گئی تھی۔ طاہرہ نے فرش پر پڑا گلابی کرن لگا دوپٹا اٹھا کر ہاتھ میں لیا...... اب وہ دھیمے قدموں سے چلتی غسل خانے کے قریب آ گئی تھیں۔ دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ عمامہ وضو میں مصروف تھی۔ طاہرہ لحہ بہ لحہ دیکھتی رہیں۔ وضو مکمل ہونے کے قریب تھا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آئی۔ دوپٹا سر پر لپیٹا۔ چہرے پر پانی کی بوندیں تھیں جو کبھی کبھار زمین پر گر پڑتیں۔ اس نے منہ پونچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں پاکیزہ سا دھلا دھلایا چہرہ...... سحر انگیز نقوش، ملائم سی مکھن ملائی جیسی جلد...... خوب صورت جھیل سی آنکھیں، جن میں ڈوبنے والا کبھی عمر بھر نکل نہ پاتا۔ وہ گلاب اور دودھ سے تراشا کوئی پیکر تھی۔ طاہرہ کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ عمامہ کو دیکھ نہ سکیں۔

عمامہ اب جانماز بچھا کر نماز کی نیت کر رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ بیرونی دنیا سے لاتعلق ہو گئی۔ اس نے اپنا مقدمہ اللہ کے دربار میں پیش کر دیا تھا۔

"شادی رک نہیں سکتی۔ ٹل تو سکتی ہے ناں تو پھر اس شادی کو ٹال دو اللہ جی...... عمامہ کو مہلت چاہیے ایسی مہلت جو زمین والوں نے اپنے اختیار کی "حدوں" میں چھپا رکھی ہے۔" وہ سجدے میں گری گڑگڑا رہی تھی۔ طاہرہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہیں...... عمامہ کو روکنا محال تھا، عمامہ کو ٹوکنا محال تھا۔

☆☆☆

طاہرہ بجھے دل سے سیڑھیاں اتر کے نیچے آگئیں ایک، ایک پیر ایک، ایک قدم بھاری تھا۔ وہ لاؤنج کی رونق سے نگاہ چرا کر اپنے کمرے میں آگئیں۔ دل میں اداسیوں کا بسیرا تھا۔ جیسے جو کچھ ہو رہا تھا۔ سب غلط تھا۔ جلد بازی میں تھا۔ انہوں نے کمرے میں اندھیرا کر لیا اور پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ عمامہ کے آنسو دل کو "ستاری" سے چھید رہے تھے۔ اِک، اِک سوراخ کا گھاؤ بڑا گہرا تھا۔ وہ کنپٹیاں دبانے لگیں۔ معاً صوفی صالح گلا کھنکھار کے اندر آئے تھے۔ وہ انتظامات کی تفصیل پوچھنا چاہتے تھے۔ طاہرہ کو ہاتھ پاؤں چھوڑے دیکھ کر گھبرا گئے۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے طاہرہ......؟" انہوں نے تفکر سے پوچھا۔

"نہیں...... بخار سا لگتا ہے۔" طاہرہ نے بھیگی آواز میں کہا۔ صوفی صالح لمحے بھر کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔

"عمامہ کی رخصتی کے خیال سے افسردہ ہو؟" ان کی اپنی آواز بھی بھرا گئی تھی۔ "میرا دل بھی بڑا اداس ہے۔"

انہوں نے اپنی کیفیات بھی شیئر کیں۔ دل صبح سے بڑا پریشان کر رہا تھا۔

''ہم نے عمامہ کے لیے بڑی جلد بازی کا مظاہرہ کیا...... ہماری بچی کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔'' بہت دیر بعد طاہرہ دھیمی آواز میں بولیں۔ ''وہ نئے ماحول میں جانے سے گھبرا رہی ہے۔ اسے کچھ مہلت درکار تھی۔'' طاہرہ نے بالآخر کہہ ہی دیا۔

''اب یہ باتیں بلاوجہ ہیں...... آپ پہلے بتاتیں۔'' انہوں نے پیشانی مسل کر کہا۔

''انجان لوگوں میں رشتہ طے کر دیا...... کم از کم سال دو سال تک پرکھتے تو سہی......'' طاہرہ کے خدشے.... بے بنیاد نہیں تھے۔ صوفی صالح چونک سے گئے تھے۔ انہیں طاہرہ کے لہجے میں عجیب سا دکھ اٹھتا محسوس ہوا تھا۔

''اماں نے ایک نہیں چلنے دی۔ پکڑ کر ہاں کر دی۔ مجھے تو عمامہ کی ساس ذرا پسند نہیں...... عجیب پُراسرار عورت ہے۔'' طاہرہ کے اندر اٹھتا ابال باہر آ رہا تھا۔ ساس کی خودغرضی سے پہلے ہی دل میں بال آ چکا تھا۔

''اماں بزرگ ہیں ہماری...... عمامہ کی دادی ہیں، کوئی غلط فیصلہ تو نہیں کر سکتیں۔'' صوفی صالح نے کھوکھلے سے لہجے میں جیسے خود کو تسلی دی تھی۔ طاہرہ نے نم آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ وہ انہی کو دیکھ رہے تھے۔

''ٹھیک تو بہترین فیصلہ شام اور فیقہ کا رشتہ جوڑ کے کیا ہے۔'' طاہرہ کے دل کی کڑھن باہر آ ہی گئی۔ صوفی صالح تاسف سے بیوی کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

''تم فیقہ کی خوشی سے جل رہی ہو؟'' انہوں نے بے یقینی سے کہا۔

''میں کیوں جلوں گی؟ مجھے شام کی رنجیدگی مار رہی ہے بچے کے چہرے سے خوشی کا ہر احساس مٹ گیا ہے۔'' طاہرہ نے ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا تھا۔ شام کا چہرہ تصور میں لہرایا تھا تو دل مٹھی میں آ گیا۔

''شام نے انکار بھی تو نہیں کیا۔'' صوفی صالح جز بز ہو کر بولے۔

''کیسے انکار کرتا...... آپ کی والدہ اس انکار کی کیسی کڑی سزا دیتیں۔ معلوم نہیں کیا۔'' طاہرہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''پھر بھی اپنا حق تو استعمال کرتا ناں......'' انہوں نے پیشانی کو مسل کر کھڑکی سے باہر دیکھا تھا۔ باہر کا منظر عجیب تھا۔ پورب سے گرد کا ایک بگولا اڑ رہا تھا۔ ریت ہی ریت، غبار ہی غبار، مٹی ہی مٹی...... انہوں نے اٹھ کر کھڑکیاں دروازے بند کیے تھے۔

''یہ طوفان کہاں سے آ گیا؟'' وہ متفکر تھے...... باہر گراؤنڈ میں دیگیں پک رہی تھیں۔ مٹی اور ریت کا طوفان دیگوں میں گھس رہا تھا۔ ہوائیں شور مچانے لگی تھیں۔ باہر چیخ و پکار سی اٹھی۔

''طوفان نے تو آنا ہی تھا......'' طاہرہ گم صم سی بولیں۔ ''وہ عمامہ جانے سے نہیں ہلی......'' ان کی دھڑکنوں میں تلاطم اٹھا...... کہیں سے بوجھل خبر کی اطلاع کا اندیشہ تھا۔

''طاہرہ! شامیانے بھی اڑنے لگے۔'' انہوں نے متفکر انداز میں کھڑکی کھولی اور فوراً بند کر دی۔ طاہرہ.... بے خیالی میں انہیں دیکھنے لگیں۔

''یہ بے جوڑ رشتے ہواؤں کو بھی پسند نہیں آئے۔ کیسا شور مچا رہی ہیں۔'' طاہرہ دہل کر بولیں۔

''آپ باہر نکل کر دیکھیں۔ مہمان جا تو نہیں رہے۔'' صوفی صالح نے تفکر سے کہا تھا۔ پروگرام چوپٹ سا ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت بھری تھی۔

''چلے ہی جائیں گے...... جانے والے رکتے کہاں ہیں۔'' وہ گھڑی کی طرف دیکھ کر اٹھ گئی تھیں۔ باہر نکل کر دیکھا تو بہوئیں اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں۔ کوئی بچوں کے پیچھے لپک رہی تھی طوفان نے سارا لاؤنج مٹی مٹی کر دیا تھا۔ فرنیچر تک غبار سے اٹا تھا۔ دادی متوحش سی بھاگ رہی تھیں۔ فیقہ تک حیران کھڑی طوفان کے جلال کو دیکھ رہی تھی۔

طاہرہ نے گم صم کھڑی طابہ کا بازو ہلایا۔ وہ بچے کو تھپکتے ہوئے چونکی۔

"چیزیں سمیٹ لو۔" انہوں نے آنکھ سے سمجھایا تھا۔ طابہ کچھ حیران ہوئی۔

"کیا رسم کا ارادہ نہیں..... ؟" وہ حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ شامیانے سمیٹے جا رہے تھے۔ طوفان کا غیظ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ کیٹرنگ والے اپنا سامان بچانے کی دوڑ میں لگ رہے تھے۔ کرسیاں، قالین سنبھالے جا رہے تھے، ہر ایک کو اپنی پڑی تھی۔

"مہمان تو جا چکے......" کسی نے اونچی آواز میں کہا۔ طاہرہ نے گردن موڑ کر سیڑھیوں سے اوپر دیکھا۔ کارنر پر عمامہ کا کمرا تھا۔ دروازہ بھی کھلا تھا۔ وہ ابھی تک مصلیٰ سنبھال کر بیٹھی تھی۔ طاہرہ کے دل کو کچھ ہوا۔ اللہ کے دربار میں کھڑی، ذرا سی مہلت، مانگ رہی تھی۔ اور وہ جو عرشِ عظیم پر اپنی شان کے عین مطابق جلوہ افروز تھا۔ کیسے مایوس لوٹا دیتا؟ عمامہ کی دعا قبولیت کا شرف پا گئی تھی۔ طاہرہ کا دھڑکتا دل لمحہ بھر میں پُرسکون ہو گیا۔ وہ اس سکون کی وجہ نہیں سمجھ سکی تھیں۔ کچھ دیر بعد ایک فون کال نے ٹھٹکا دیا۔ کال تقی نے ریسیو کی تھی۔ طاہرہ، فیقہ، دادی اور طابہ کا رواں، رواں کان بن گیا۔ تقی فون سن رہا تھا۔ پھر وہ یک لخت گھبرا اٹھا۔

"کیسے؟ کس طرح......؟" تقی کی آنکھوں میں پریشانی کی لہریں اٹھیں۔ وہ ریت بھری آنکھوں کو مسل کر ماں سے مخاطب ہوا تھا۔

"فرخ اور اس کے بہنوئی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ فرخ شدید زخمی ہے جبکہ اس کا بہنوئی جاں بحق ہو گیا۔" تقی نے سب کے سروں پر بم بلاسٹ کیا تھا۔ طاہرہ سمیت گھر کی سب خواتین دنگ رہ گئی تھیں۔ فیقہ نے غیر ارادی طور پر اپنی کلائیوں میں سجے گجروں کو دیکھا تھا۔

"آپ لوگ نکلنے کی تیاری کریں۔ جنازے پر پہنچنا ہے۔" تقی ہدایت دے کر باہر مردانے میں نکل گیا تھا۔ اڑتا ہوا طوفان ہر چیز اڑا کر لے گیا۔ پھول، خوشبو، رونق، مہندی، فیقہ متوحش سی گجروں کو دیکھتی رہی۔ اسے گجرے کسی سانپ سے مشابہ لگ رہے تھے۔ اس نے خوف کے عالم میں پتی، پتی نوچ ڈالی۔ معاً دادی کی فیقہ پر نگاہ پڑی تھی۔ وہ چیل کی تیزی سے فیقہ تک چلی آئیں۔

"بدشگونی نہ کرو......" انہوں نے ڈپٹ کر کہا...... فیقہ وحشت بھری نظروں سے ماں کو دیکھتی رہی۔

"تو اور کیا کروں......؟ بدشگونی تو ہو گئی......" فیقہ نے ہونٹ کاٹ کر اوپری منزل کی طرف نگاہ ڈالی تھی۔ وہاں عمامہ کھڑی تھی۔ بہت پُرسکون اور مطمئن...... جیسے جو ہو رہا تھا اس کی توقع کے برخلاف نہیں تھا۔ گھر کی بہوؤں نے ہار سنگار کا سامان سمیٹ ڈالا تھا۔ منہ رگڑ، رگڑ کر دھو لیے۔ چہروں سے غازہ اتر گیا۔ آنکھوں سے کاجل نکل گیا۔ زرق برق کپڑے الماریوں میں قید ہو گئے۔ سب خواتین عبائے پہن کر صوفی صالح کے ہمراہ جنازے پر پہنچ گئیں۔ آخر عمامہ کی سسرال کا معاملہ تھا۔ دادی اور فیقہ کی جلد بازی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ دونوں شادیاں اِک نامعلوم مدت تک کے لیے کینسل ہو گئیں۔

عمامہ کے سر سے پہاڑ ٹل گیا تھا۔ پہاڑ ٹلتا کیوں نہ......؟ اس کی دعا میں شدت پہاڑ کی بلندی سے زیادہ تھی۔ پورا گھر لمحوں میں خالی ہو گیا۔ بھابیاں بچے، اماں، بابا، دادی اور بھائی سب نکل گئے تھے۔ بس فیقہ اور عمامہ گھر پر تھیں۔ مردوں میں طاہر اور شام تھے جو باہر کا پھیلاوا سمیٹتے رہے۔ طوفان تو رک گیا تھا۔ اسے بارش پر ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا۔ پھر اس نے پلٹ کر جانماز سمیٹی اور لمحہ بھر کے لیے ٹھہری گئیں...... وہ دروازے کے قدمچے پر کھڑا تھا۔ شام گلاب کا کوئی روپ سروپ لیے عمامہ کی پیاسی آنکھ سیراب ہوتی چلی گئیں۔ وہ دم بخود دیکھتی رہ گئی۔

"کچھ اور مانگ لیتیں تو کیا نہ ملتا......؟" اس کی آواز میں عجیب سا درد بول رہا تھا۔ عمامہ ٹھٹک سی گئی تھی پھر

اس کا چہرہ کھوجتی رہی...... وہ سراپا سادگی تھا۔ وہاں سادگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ عمامہ ساکت سے دیکھتی رہی۔ آنکھ دیدار سے بھرتی ہی نہیں تھی۔ وہ جیسے بے بس ہوگی۔

''تم کبھی طلب کے سمندر میں اترے ہو؟'' عمامہ نے بھیگی آنکھ سے سوال کیا۔ وہ سامنے موجود تھا۔ مگر صدیوں کے فاصلوں پر کھڑا تھا۔ بیچ میں طویل خلیج تھی۔

''کیا تم نے کبھی ''دعا'' مانگی......؟'' وہ پھر سراپا سوال تھی۔ محبت کا بھجن گاتی، محبت کو اوڑھتی......

''ہر دعا قبول نہیں ہوتی۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔ ''پر تمہاری دعا پر بھروسا بہت ہے۔'' وہ یقین کے اونچے مینارے پر کھڑا تھا۔

''شادی ٹلنے کی نہیں، رکنے کی دعا کر لیتی۔ ہمیشہ کے لیے......'' شام نے بے آواز کہا...... وہ سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔ سوچوں کے الجھاوے میں کھو رہا تھا۔ عمامہ نے تسلی سے اسے دیکھا پھر دیکھتی رہی، دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ چونک گیا۔ نگاہوں کی تپش سے پگھل گیا۔

''شادی رک بھی سکتی ہے، ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے......'' وہ آنکھوں میں چمک لیے مخاطب تھی۔ ''تم اگر جرأت کا مظاہرہ کر لو......'' اس نے بڑے ٹھوس سے انداز میں وضاحت کی تھی۔ وہ عمامہ کو دیکھتا رہ گیا۔ سفید دوپٹے کے نیچے گھونگر والے بالوں کے لچھے تھے جیسے پیچ در پیچ مڑے ہوئے بال، انتہائی خوب صورت، دل کو کھینچ لینے والے شام کا دل گویا الجھ گیا۔

''یہ ممکن کہاں ہے......'' اس نے بھیگی آواز میں کہا۔ ''اپنے قد سے اونچی خواہشات میں نہیں پالتا۔'' وہ گہری، گہری سانسیں کھینچنے لگا۔ عمامہ اسے دیکھتی رہی۔

''بزدل......'' عمامہ دہاڑی تھی...... ''خود کو دلدل میں گرا کر بھی بزدل ہی رہنا...... تمہیں عمامہ کی بہادری کبھی یاد آئے گی...... جب وقت ہاتھوں سے ریشم کی طرح پھسل گیا۔'' اس نے تلخی سے کہا تھا۔ شام کی آنکھیں اس الزام پر اٹھ ہی نہیں سکیں۔

''تم پر جرأت بھی بجتی ہے۔ غرور بھی...... تم بلندی کی اونچائی پر ہو، میں زمین کی گہرائی میں۔'' شام نے اداسی سے کہا۔ عمامہ کی تلخی بڑھتی رہی تھی اور بڑھتی ہی گئی۔

''یہ تمہارا احساسِ کمتری ہے۔'' وہ بگڑ کر بولی۔

''تم جو بھی کہو...... جیسا بھی سمجھ لو...... میں کسی مضبوط زمین پر کھڑا نہیں...... میری بنیاد بہت کمزور ہے۔ اور کمزور بنیاد پر کوئی بھی عمارت کھڑی نہیں رہ سکتی۔ تمہیں کس طرح سمجھاؤں عمامہ......'' وہ بے بسی سے بالوں میں ہاتھ پھنسا کر بولا۔ اس کی نگاہیں گیر ڈین کے پردے پر تھیں۔ سوتی اور ریشمی کپڑے کا پردہ...... جس میں اون ملی ہوئی تھی۔ کپڑے کے پیچھے کوئی خاموش سایہ تھا۔ شام کو وہم سا ہوا۔ کہیں فیقہ تو نہیں تھی؟ وہ گیر ڈین کے پردے کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

''فیقہ پھپھو اور تم دونوں متبائن لوگ ہو یعنی بالکل الگ اور مختلف...... پھر عمروں کا تضاد ایک حقیقت ہے۔ میں حیران ہوں دادی کو تم پر رحم نہیں آتا۔'' عمامہ پھٹ گئی تھی۔ اسے بری طرح رونا آ گیا۔

''ان کے دل سے خدا نے ''رحم'' اٹھا لیا ہے۔ وہ میری کفالت کا بدلہ چاہ رہی ہیں۔ میں احسان فراموش نہیں...... جان دے کر بھی بدلہ چکا دوں گا۔'' اس نے پہلی مرتبہ اندر کا ابال باہر نکالا تھا۔ آواز بہت مدھم تھی۔ جیسے خود کلامی کر رہا تھا۔ جیسے خود سے مخاطب تھا۔

''عمریں گنوا کر احسان نہیں چکایا کرتے......'' عمامہ کی آواز مدھم ہوگئی تھی۔ گیر ڈین کا پردہ ہلتا رہا۔ عمامہ پگھلتی

رہی اور شام بکھرتا رہا تھا۔
"تم ایک دفعہ بابا کے سامنے زبان تو کھولو پھر دیکھنا عمامہ کیا کرتی ہے"۔ اس نے پھر کر التجا کی تھی۔ وہ عمامہ کی ماہر (زہر) میں بھیگتی آنکھوں کو دیکھ کر تھم سا گیا۔ ان آنکھوں میں آج بھی خودی تھی، خودسری تھی۔ سرکشی تھی۔ شام کا دل لرز اٹھا۔ وہ عمامہ کو کبھی اس حد پر نہیں لانا چاہتا تھا۔ جہاں سے آگے کوئی رستہ ہو نہ پیچھے کوئی جائے پناہ...... وہ لحہ، لحہ مڑتا گیا۔ پلٹتا گیا۔ عمامہ دروازے کے چوکھٹے میں کھڑی دیکھتی رہی۔ وہ لحہ بہ لحہ سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اس کے قدموں میں مجبوری کی زنجیریں تھیں، اداسی کے نوحے تھے، شکستگی کے بین تھے۔ وہ ایک، ایک سیڑھی اتر رہا تھا۔ وہ عروج سے زوال کی طرف آ رہا تھا۔ وہ اپنے پیروں سے چل کر پاتال کی طرف آ رہا تھا۔
پھر وہ لحہ بھر کے لیے مڑا...... عمامہ اب بھی دریچے میں کھڑی تھی۔ کسی خوب صورت کتاب کی طرح، کسی روشن خیال کی طرح۔
"میرے بغیر جی کے دکھانا۔" عمامہ نے جیسے چیلنج کیا تھا۔ اس کی آنکھوں کا تاثر بڑا بھیانک تھا۔ جیسے اسے یقین تھا۔ عمامہ کے بغیر وہ دوسری سانس بھی نہیں لے سکے گا۔
شام نے مڑ کر دیکھا اور دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر اک ترانہ رواں ہوا تھا۔ اس کا لفظ، لفظ عمامہ کی سماعتوں کو بھگونے لگا۔

"اس ادا سے بھی ہوں میں آشنا، تجھے اتنا جس پر غرور ہے
میں جیوں گا تیرے بغیر بھی، مجھے زندگی کا شعور ہے"

عمامہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ باغی آنسوؤں کو شام کے سامنے بے مول نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ شام کے سامنے خود کو کمزور کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔
"مجھے کھو کر تمہیں احساس ہوگا۔" عمامہ کی آواز میں پہلی سی ہی روانی تھی۔ آنسوؤں کی آمیزش نے اسے کمزور نہیں کیا تھا۔ شام کے پیر زنجیر پا ہو گئے تھے۔ وہ اسی مقام پر ٹھہر گیا۔

"نہ ہوس مجھے مئے ناب کی، نہ طلب صبا و سحاب کی
تری چشم ناز کی خیر ہو، مجھے بے پیئے ہی سرور ہے"

شام کی آواز نے عمامہ کو بادلوں کے رتھ پر سوار کر دیا تھا۔ وہ ہوا کی لہروں پر تیر رہی تھی...... اور شام اسے سمجھا رہا تھا۔ وہ ملے یا نہ ملے اس کی محبت کا سرور اس کی زندگی کا ماحاصل ہے۔
"میری محبت کا حصار توڑ کر جاؤ گے تو جاؤ گے کہاں؟" اس نے نرم بالوں کو ہتھیلی سے چھوا۔ وہ دھنک کے پار دیکھ رہی تھی۔ یہاں قوسِ قزح کے رنگ بکھر رہے تھے۔ یہاں جگنوؤں کی برسات ہو رہی تھی۔ یہاں گلاب کی پتیوں پر شبنمی بوندیں گر رہی تھیں۔
"اور جب حصار توڑ کر نکل جاؤ گے تو تمہیں احساس ہوگا۔ تم کس مقام پر کھڑے تھے۔ تمہیں کس مقام پر آنا پڑا......" عمامہ کے ہونٹوں سے خواب آگیں الفاظ موتیوں کی طرح بکھرتے رہے۔ وہ بھی اس کی سماعتوں کو اپنی آواز کے اسم سے لبریز کرتا رہا۔

"میں نکل کے بھی تیرے دام سے، نہ گروں گا اپنے مقام سے
میں قتیل جور و ستم سہی، مجھے تجھ سے عشق ضرور ہے"

شام کی آواز مدھم ہوتے ہوتے ایک خاموش نکتے پر ٹھہر گئی تھی۔ اس نے آخری مرتبہ دریچے میں کھڑے اس حسین خیال کو دیکھا...... پھر وہ نگاہیں موڑ کر ایک، ایک زینے سے نیچے چلا آیا۔ اس کا دل قطرہ، قطرہ پگھل رہا تھا۔

لمحہ لمحہ تڑپ رہا تھا۔ بوند، بوند سسک رہا تھا...... اور ذرا، ذرا مر رہا تھا۔
وہ دریچے میں بے خودسی کھڑی تھی۔ شام کو گزرتا دیکھ رہی تھی۔

وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تو نے منزلوں کا
تیری گلی سے نہ جانے کیوں آج سر جھکا کر گزر گیا وہ

عمامہ نے پلکوں کو زور سے میچ لیا تھا۔ پھر بھی دو آنسو بغاوت کر کے پھسل پڑے تھے۔ وہ شام کو جاتا دیکھتی رہی۔ خود سے دور ہوتا دیکھتی رہی۔

کبھی لوٹ آئیں تو پوچھنا، نہیں دیکھنا انہیں غور سے
جنہیں راستے میں خبر ہوئی کہ یہ راستہ کوئی اور ہے

☆☆☆

دادی نے واپس آ کر اعلان کر دیا تھا۔
''یہ ساری عمامہ کی نحوست ہے جس دن سے تاریخ طے ہوئی۔ اس کا سوگ ختم نہ ہوا۔ میری بچی کی خوشیوں کو بھی نگل گئی۔'' دادی، طاہرہ بھابی سے دل کا حال بیان کر لیتی تھیں...... طاہرہ خوب ہمدردی جتاتی تھی۔ اکلوتی نند کے خلاف اس کے دل میں جو عناد تھا وہ کبھی کم نہ ہوا۔ وہ دونوں طرف آرام سے گیم کھیل رہی تھی۔ کبھی دادی کے پہلو سے چپک جاتی، کبھی عمامہ کے کان میں گھسی رہتی اور کبھی فیقہ کو نئے، نئے سپنے دکھاتی...... چونکہ شادی نامعلوم مدت کے لیے کینسل ہو گئی تھی۔ فرخ تین مہینے تک اٹھنے کے قابل نہ رہا تھا۔ ابھی تو اس کا اسپتال میں علاج چل رہا تھا۔ شادی ممکن نہیں تھی۔ سو شام اور فیقہ کا معاملہ بھی التوا میں پڑ گیا تھا۔ جس کا دادی کو شدید قلق تھا۔ وہ اپنی بہو کو بھی کچوکے لگانے سے باز نہیں آتی تھیں۔ طاہرہ خاموشی سے سن لیتیں۔ پلٹ کر جواب نہ دیتیں۔

''کوئی مژدہ بادنہیں......صالح بھی کٹھور ہوگیا......کم ازکم چالیسویں کے بعد فیقہ کو نپٹا دیتا......'' دادی نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا تھا۔ ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ وہ اس وقت برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ لان میں منال گھوم رہے تھے۔ لاجوردی کنٹھے والے جنہیں دیکھ کر دادی کو شدید غصہ آتا تھا۔ دراصل انہیں عمامہ سے منسوب ہر چیز سے بیزاری ہوگئی تھی۔

''آپ بابا سے بات تو کریں۔'' طابہ نے انہیں تحریک دلائی پھر منال کو دیکھنے لگی.... وہ منگلا (سفید اور نیلے پھولوں والی گھاس) پرچہلیں کر رہے تھے اور ان کی ناز برداریاں کرنے والی نہ جانے کہاں تھی؟

''کرچکی ہوں......'' دادی نے ہاتھ جھاڑے تھے'' اس نے کہا......تین مہینے تک ملتوی سمجھیں۔ عمامہ کی ساس کو برا لگے گا۔ ان کا خاندان صدمے سے گزر رہا ہے۔ یہاں شادیانے بجنے لگیں۔'' دادی ناگواری سے بولتی رہیں......طابہ نے سمجھ کر سر ہلا دیا تھا۔ پھر وہ منہ بنا کر اٹھ گئی۔ دادی کے پاس کوئی چٹ پٹی اطلاع نہیں تھی......اس کا جی اوب گیا تھا۔ اب وہ طویل گیلری سے ہوتی ہوئی لکڑی کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ سامنے کارنر پر عمامہ کا کمرا تھا......حسب معمول دروازہ کھلا تھا۔ طابہ کچھ سوچ کر اندر آ گئی۔ عمامہ پلنگ پر چت لیٹی تھی۔ پہلے کی طرح مضطرب یا بے چین نہیں تھی۔ طابہ کو کھدبدی ہوئی......عمامہ کی خاموشی اور سکون اسے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

''عمامہ! کمرے میں اتنا اندھیرا کیوں بھر رکھا ہے؟'' اس نے ہمدردی سے گرڈین کے پردے کو لپیٹ کر ڈوری میں کسا تھا۔ دونوں دریچے کھول دیے۔ کمرے میں قدرتی روشنی کا گزر ہوا۔ عمامہ نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

''جن کی قسمت میں اندھیرے ہوں......انہیں روشنیوں سے کیا غرض......'' عمامہ نے سادگی سے کہا تھا۔ پھر وہ بال سمیٹ کر بیٹھ گئی......طابہ نے اسے تاسف سے دیکھا تھا۔

''تم تو مایوس ہوگئیں عمامہ......!'' طابہ کو گہرا دکھ ہوا......''ہمت توڑ بیٹھی ہو تو شام کو کون جرأت دلائے گا۔'' اس کا انداز سرگوشیانہ ہوگیا۔ وہ اس کے اندر بجھتی چنگاری کو عموماً ہوا دیتی تھی۔ اس نے خالی نظروں سے طابہ کی طرف دیکھا تھا۔ پھر صاف گوئی سے بولی۔

''بھابی......! شام سے مجھے کوئی امید نہیں رہی۔'' وہ انگلیاں مسلتی مضطرب سی ہوگئی تھی۔ طابہ کو اسی اضطراب کو ملاحظہ کرنے کی بے چینی تھی۔ اس کے سینے میں ٹھنڈی سی پڑ گئی۔

''تم اسے تحریک دلایا کرو......انسان ہے ناں کوئی پتھر تو نہیں......ایک دن پگھل ہی جائے گا۔'' طابہ نے اس کی ٹوٹتی ہمت کو بحال کرنا چاہا تھا۔ وہ اس کے اعصاب کا اکثر امتحان لیتی تھی......عمامہ کچھ بھولنا بھی چاہتی تو اسے بھولنے نہ دیتی تھی۔ ہر روز اس کے زیاں کو ابھارتی......تازہ دم کرتی......تحریک دلاتی، ہمت بڑھاتی وہ اپنا کام بڑی دلجمعی سے کر رہی تھی۔

''بھابی! میں تھکنے لگی ہوں، ٹوٹنے لگی ہوں، مجھے مصروف رہنے کے لیے کوئی مشورہ تو دیں۔'' اس نے بھیگی آنکھوں کے کونے پونچھ کر جیسے التجا کی تھی۔ وہ شام کے خیال سے بھاگنا چاہتی تھی۔ وہ راہ فرار کی متلاشی تھی اور طابہ اسے کبھی ''مفرور'' نہ ہونے دیتی۔

''شام کی محبت نے اتنی جلدی تمہیں نڈھال کر دیا؟'' طابہ نے ہمدردی سے آنکھیں گھما کر کہا جیسے شدید دھچکا پہنچا ہو۔

''محبت کہاں تھکاتی ہے بھابی......! محبوب کا رویہ تھکا ڈالتا ہے۔'' اس نے سر جھکا کر اپنے تاثرات چھپانے چاہے تھے مگر وہ ناکام رہی......اسے تاثرات چھپانے میں کمال حاصل نہیں تھا۔ طابہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا۔ پھر بغور اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

''شام تم سے محبت کرتا ہے......وہ بھی مجبور ہے کیا کرے، کوئی بدنامی افورڈ نہیں کرسکتا۔'' طابہ نے اس کا

ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''اپنی خالہ کے ڈر سے بھاگ رہا ہے تم سے۔ کم فہم ہے سمجھتا نہیں...... محبت سے فرار کبھی کامیاب نہیں کرتا۔'' وہ ملائمت سے بولتی رہی۔ عمامہ کے اندر لگے جالے ہٹاتی رہی۔ ایک دفعہ پھر اکساتی رہی۔

''بھابی! میں کیا کروں......؟'' عمامہ اس سے مشورہ مانگ رہی تھی۔ کم عمر تھی، تجربہ تھا نہیں...... ایک گھاگ بیاہتا عورت سے مدد چاہتی تھی۔ عورت بھی وہ جو اسے عموماً ڈی گریڈ کرتی رہی تھی۔ عمامہ ہمدردی کی آڑ میں اس کے عزائم کو سمجھ نہیں پائی۔ وہ خود کو مصروف رکھنے کے لیے کوئی ٹھوس حل چاہتی تھی۔ طابہ نے کچھ دیر سوچنے کی اداکاری کی۔ پھر اسے نئی راہ دکھا کر بولی۔

''تم کالج میں ایڈمیشن کیوں نہیں لیتی عمامہ......'' طابہ نے ایک بڑا خوب صورت حل پیش کیا۔ ''تمہارے بھائی اور بابا کو بھی اعتراض نہیں ہوگا۔ کالج کی دنیا بھی بڑی دلفریب ہوتی ہے۔ پھر تمہیں شام سے ملنے کے مواقع بھی میسر ہوں گے۔ یہاں تو وہ اپنی خالہ کے خوف سے تمہاری طرف دیکھتا بھی نہیں......'' طابہ نے مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ قائل ہو رہی تھی۔ وہ قائل ہو چکی تھی۔ اسے بھابی کا مشورہ پسند آیا تھا۔

''میں طاہر بھائی سے فارم منگوا لیتی ہوں۔ تھینک یو بھابی...... آپ نے مجھے کمال کا مشورہ دیا۔'' عمامہ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ بڑی قیامت سی مسکراہٹ تھی۔ طابہ عورت ہو کر مسحور ہو گئی۔ پھر مردوں کا بھلا کیا حال ہوگا؟ مرد بھی شام جیسا...... طابہ کو عجیب سا حسد ہوا۔

''دیکھ لو اماں اعتراض نہ کریں...... تین چار ماہ تک تو تمہیں رخصت ہونا ہی ہے......'' طابہ نے غیر محسوس انداز میں اس کی مسکراہٹ کو فنا کر دیا...... وہ اپنی رخصتی کے خیال سے زرد پڑ گئی تھی۔

''کمال ہے بھابی...... ! امید بھی دلاتی ہیں۔ پاتال میں بھی گراتی ہیں۔'' اس نے سر جھکا کر پھیکی آواز میں کہا۔

طابہ کو فوراً اپنے لفظوں کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے عمامہ کو ڈھارس پہنچائی۔

''امید ہے تین ماہ کے اندر شام اسٹینڈ لے گا۔ تمہاری کشتی کو سہارا مل جائے گا۔ تمہاری محبت کو کنارہ مل جائے گا۔'' طابہ نے ملائمت سے اس کا ریشمی ہاتھ سہلایا...... عمامہ ممنونیت سے اسے دیکھنے لگی۔

''بھابی آپ کی باتیں امیدیں روشن کرتی ہیں۔ میں قطرہ، قطرہ مرنے لگتی ہوں۔ آپ کے الفاظ میرے اندر روح پھونکتے ہیں۔'' وہ عقیدت سے طابہ کو دیکھتی رہی۔ طابہ خواہ مخواہ نگاہ چراتی رہی۔

''کیا شام واقعی اسٹینڈ لے گا؟'' عمامہ نے آس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کیوں نہیں لے گا اسے لینا ہی پڑے گا۔'' طابہ نے یقین بھرے لہجے میں کہا تھا۔ عمامہ جیسے مطمئن ہو گئی۔

''تاہم تمہیں ہار نہیں ماننی...... اس ''جنگ'' کو جیت کر دکھاؤ...... شام کو محبت سے زیر کر دو...... اسے اسٹینڈ لینے پر مجبور کر دو۔ تمہارے پاس ''حسن'' کا ہتھیار ہے۔'' وہ اسے نئے باب پڑھا رہی تھی۔ اسے نئے سبق دکھا رہی تھی۔ عمامہ یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ جیسے لفظ، لفظ کو ذہن میں بٹھا رہی تھی۔

''اور اماں کالج کے لیے مان جائیں گی؟'' اس نے کسی خدشے کے تحت بے ساختہ پوچھا۔

''کیوں نہیں مانیں گی۔ میں منوا کر دم لوں گی۔'' طابہ نے پیار سے اس کے بال سہلائے اور مسکراتے ہوئے باہر نکل گئی تھی جبکہ عمامہ کالج کے تصور میں خود کو الجھانے لگی۔ اندر کی تپش اور اضطراب سے بچنے کے لیے کالج سے بہتر کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

☆☆☆

چھاجوں چھاج سنہری کرنیں دھرتی کے سینے پر بکھر رہی تھیں۔ بڑی مہکتی سی سویر تھی۔ ادھ کھلی سی، عمامہ نے ... گبرڈین کے پردے کو ڈوریوں سے سمیٹ کر کھڑکی سے جھانکا۔ نیچے خوب رونق لگی تھی۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ گھر کے

سارے مرد صحن میں دکھائی دے رہے تھے۔ عمامہ نے آنکھیں مسل کر دیکھا۔ وہیں برآمدے کے قدمچے پر شام بھی بیٹھا تھا۔ منال سے لاڈ کرتا ہوا۔ اس کے لاجوردی کنٹھے کو چھیڑتا ہوا۔ منال اس کی شرارتوں پر اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔

باورچی خانے کی بڑی سی کھڑکی اسی صحن میں کھلتی تھی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ وا تھے۔ سوجی کی بھینی، بھینی خوشبو چہار سو پھیلی تھی۔ شمسہ بھابی پوریاں بھی تل رہی تھیں۔ پورے گھر میں سوجی کے حلوے کی خوشبو چکرا رہی تھی۔ باداموں والا سنہرا سنہرا حلوا لذیذ خستہ پوریاں، عمامہ کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ اس نے جلدی سے منہ دھویا اور سلیپر پہن کر دھپ دھپ سیڑھیاں اترنے لگی۔ گیلری سے گزر کر اس نے باورچی خانے میں جھانکا اور جالی دار دروازہ کھول کر باہر آ گئی تھی۔ عمامہ کو دیکھ کر اس کے سارے بھائیوں کے چہرے روشن ہو گئے۔ کوئی اِدھر سے حال پوچھ رہا تھا۔ کوئی اُدھر سے لاڈ کر رہا تھا۔ تقی اور طاہر بھائی بہت جوشیلے اور غصیلے تھے بس عمامہ کے لیے بہت ملائم ہو جاتے۔ شرارتیں بھی کرتے، تنگ بھی کرتے، چھیڑتے بھی۔

''عمامہ...... تمہارا منال تو شام کا مرید ہو گیا......'' طاہر نے خستہ، خستہ پوریوں سے انصاف کرتے ہوئے برآمدے کے قدمچے پر بیٹھے شام کو دیکھ کر ٹکڑا لگایا تھا۔ شام جھکی آنکھوں سے مسکراتا رہا...... اس کی نگاہیں منال کے لاجوردی کنٹھے پر تھیں تاہم وہ طاہر کی گفتگو سے محظوظ ہو رہا تھا۔ عمامہ، طاہر کی پلیٹ سے پوری اٹھا کر تقی کی رکابی سے حلوا ٹونگتی مسکرائی۔

''دیکھ لو، منال نے تمہیں دیکھا بھی ہے پھر بھی تمہارے قریب نہیں آیا۔'' طاہر، عمامہ کو مسلسل چھیڑ رہا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے منال کے لیے خاصا حساس تھی۔

''منال بڑا چالاک پرندہ ہے...... یہ خوشامد اور چاپلوسی کا مظاہرہ کرتا ہے۔'' تقی نے بڑے غور و خوض کے بعد نکتہ اٹھایا تھا۔

''اسے چاپلوسی کی کیا خبر...... تقی! تم بھی حد کیا کرتے ہو......'' بڑے بھیا نے بیچ میں مداخلت کی۔ ''یہ ایک پرندہ ہے انسان تھوڑی ہے جو خوشامد کرتا پھرے۔''

''منال ''محبت'' کے پیاسے ہوا کرتے ہیں۔'' طاہر نے فلسفہ بگھارا۔ ''اور دیکھیں ذرا شام کے پیروں میں لوٹنیاں لگا کر محبت مانگ رہا ہے۔'' طاہر نے سب کو منال کی طرف متوجہ کیا تھا...... جو واقعی شام کے پیروں میں لوٹیں لگا رہا تھا...... سب منال اور شام کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''شام محبت کے معاملے میں بڑا کنجوس ہے۔ کوئی منال بیچارے کو سمجھائے تو سہی......'' تقی نے شرارتاً کہا اور لاچی والی خوشبودار چائے کی چسکیاں بھرتا رہا۔ عمامہ اب بھی تقی کی پلیٹ سے حلوا ٹونگ رہی تھی۔ پھر تقی نے باقی کی چائے عمامہ کی طرف بڑھا دی۔ تقی اور طاہر کا بچا کھچا تبرک...... کھانا عمامہ کو بہت پسند تھا۔

''کنجوسِ اعظم ہم آپ سے مخاطب ہیں۔'' طاہر نے حلوے سے بادام اٹھا کر شام کی گردن پر مارا تھا۔ جسے اٹھا کر شام نے منال کو کھلا دیا پھر پلکیں اٹھا کر تقی اور طاہر کو دیکھنے لگا تھا۔

''محبت خیرات تھوڑی ہے جو ہر بندے اور پرندے پر لٹائی جائے۔'' شام کے جواب نے طاہر کو کھانسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بری طرح کھانستا رہا حتیٰ کہ تقی کو اس کی کمر سہلانی پڑی تھی۔

''ویسے محبت کے بارے میں تمہارا خیال کیا ہے؟'' طاہر نے کچھ دیر بعد سنجیدگی سے دریافت کیا تھا۔ شام کچھ چونک گیا۔

''محبت کی تشریح کر سکتے ہو؟'' طاہر نے پھر سے سوال کیا تھا۔ اب کہ حاذق بھیا نے طاہر کو چپت لگائی۔

''بچے کو کس مصیبت میں ڈال رہے ہو، شام کو کیا خبر محبت کس چڑیا نہیں کبوتر کا نام ہے......'' حاذق کا مسکراتا

ہوا لہجہ مذاق اڑاتا نہیں تھا...... وہ شام کو اکثر گھیر لیتے تھے اور باتوں ہی باتوں میں خوب زچ کرتے تنگ کرتے، چھیڑتے، جواباً وہ دھیما، دھیما سر جھکا کر مسکراتا اور سیدھا دل میں اتر جاتا۔ دادی کا یہ اکلوتا بھانجا ان سب کی آنکھوں کا تارہ تھا۔

''جواب تو دو شام!'' بڑے بھیا بھی مسکرا کر گفتگو میں شریک ہوئے...... وہ اپنا ناشتا کر چکے تھے اب اٹھنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ بس شام کا جواب سننے کے لیے رک گئے تھے۔ شام کچھ دیر سوچتا رہا تھا۔ پھر اسی طرح سر جھکا کر بولا۔

''محبت احساسات کی تفسیر کا نام ہے۔'' اس کے جواب نے کئی لوگوں کو لاجواب کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ تقی اور طاہر محظوظ ہوئے تھے۔

''شام! بتاؤ ناں تمہیں ہوئی محبت......؟'' طاہر کے اس سوال کی نہ عمامہ کو توقع تھی نہ شام کو...... وہ لمحہ بھر کے لیے گڑبڑا گیا تھا۔ عمامہ بھی سر اٹھا کر شام کی طرف دیکھنے لگی اور لاشعوری طور پر وہ شام کے جواب کی منتظر تھی۔ اسی پل ٹرے اٹھا کر طابہ بھی آ گئی تھی۔ پھر اس نے ٹرے شام کی طرف بڑھا دی۔ گفتگو کلائمکس پر تھی سو طابہ بھی لطف اندوز ہونے کے لیے بیٹھ گئی۔

''محبت کے بغیر دل کا مکان خالی ہوتا ہے اور میرا دل خالی مکان نہیں......'' شام کے جواب نے عمامہ کے حلق میں اٹکی سانس کو بحال کر دیا تھا۔ وہ ہلکے، ہلکے مسکراتی چائے کی چسکیاں بھرنے لگی تھی۔ طابہ گلا کھنکھار کر رہ گئی۔

''یعنی تمہارے دل میں کسی کی محبت موجود ہے۔'' طاہر پُرجوش سا اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اب وہ تفصیلات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ حاذق بھی کھوجتی نظروں سے شام کو دیکھتا رہا۔ وہ ذرا جھینپ رہا تھا۔ حاذق کو ترس آ گیا۔

''بچے کو پریشان نہ کر، وڈا محبت کا فلاسفر لگتا ہے اپنی ڈور کہیں پھنسا آیا ہے۔'' حاذق نے طاہر کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ وہ لمحے بھر میں گڑبڑا گیا تھا گویا چوری پکڑی گئی تھی۔ تو یوں کا رخ اس کی طرف مڑ جائے گا۔ یہ طاہر کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ عمامہ بھی دلچسپی سے بھائی کو دیکھنے لگی۔ کیا طاہر کی زندگی میں کوئی آ چکا تھا۔

''یہاں شام کی بات چل رہی ہے۔ میں بیچ میں کہاں سے آ گیا۔'' طاہر نے بات بنانی چاہی تھی۔ مگر تقی اور حاذق اسے بخشنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے اس کا ریکارڈ لگا دیا تھا۔ شام اپنی جان بچ جانے پر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ عمامہ کی پلیٹ خالی ہو گئی تھی۔ آدھی پوری اور تھوڑا سا حلوا ٹونگا تھا۔ ابھی بھوک خاصی چمک رہی تھی۔ اس کی نظریں بہت کچھ سمجھا رہی تھیں۔

''محبت پر مذاکرات تم نے شروع کیے ہیں۔ دراصل تمہاری اپنی دال میں کالا ہے۔ شام کی آڑ میں اپنے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہو۔'' تقی نے طاہر کا کالر پکڑ کر کھینچ لیا تھا۔ وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔

''مطلب کیا ہے تمہارا؟'' طاہر مصنوعی خفگی سے بولا۔ سب کی نگاہیں اس پر تھیں تبھی جھنجلا رہا تھا۔

''کہاں دل پھنسا کے آئے ہیں؟'' حاذق نے دوسری طرف سے اسے گھیر لیا تھا۔ اب طاہر کی درگت بن رہی تھی۔

''دراصل میرے بھائی! تم لوگوں کے ساتھ مسئلہ کیا ہے وہ میں جان چکا ہوں۔'' کچھ دیر بعد طاہر بڑے اعتماد سے بولا تھا۔ تقی اور حاذق پوری طرح متوجہ ہوئے۔

''ہیں...... ہیں......؟ ہمارے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔'' ان کے کان کھڑے ہوئے تھے۔ طاہر سے کسی اچھی بات کی امید تو نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر ڈرامائی انداز میں سوچتا رہا۔

''ایگزیکٹلی! بابا نے تم لوگوں کی بلی ماردی ہے۔ وقت سے پہلے کھونٹوں پر باندھ دیا۔ تم لوگ محبت کی اصل لطافت سے واقف نہیں۔ شادی سے پہلے کسی سے محبت کرنا، ہجر اور وصل کی اذیتوں کو محسوس کرنا، تارے گننا......''

طاہر آنکھیں موندے کسی اور ہی خیال میں تھا جب تقی نے جوتا اتار کر لہرایا۔ طاہر ساری طراری لمحوں میں بھول گیا تھا۔

''شادی سے پہلے کسی سے محبت کرنا، اس کے بھائیوں سے چھترول کروانا، اس کی ہیل سے سر تڑوانا۔ میرے بھائی! ہم ایسی محبت سے ''شادی شدہ'' بھلے...... '' حاذق نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ تاہم طاہر ہنستا کراٹھ گیا تھا۔ اب وہ بیرونی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی بالکونی میں جا کھڑا ہوا تھا۔ چہرہ خوب پھیلا۔ رکھا تھا۔ حاذق، تقی اور بھیا وغیرہ اٹھ کر چلے گئے تھے۔ شام وہیں قدمچے پر بیٹھا تھا۔

''عمامہ! برتن اٹھالاؤ...... '' بڑی بھابی کی آواز آئی تو وہ گڑبڑا کر اٹھ گئی تھی۔ پھر اس نے برتن سمیٹ کر اندر رکھے تھے۔ عمامہ جب واپس آئی تو شام وہاں نہیں تھا۔ اس کا دل بھر سا آیا۔ گردن اونچی کر کے دیکھا تو شام اور طاہر بالکونی میں کھڑے نظر آئے تھے۔ جانے کب طاہر نے شام کو اوپر بلا لیا تھا۔ اب باتوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ عمامہ کے اندر کھد بد سی ہوئی۔

کچھ سوچ کر دوسری طرف سے گھومتی وہ اوپر والی منزل کے گلیارے میں آ گئی۔ کچھ ہی فاصلے پر شام اور طاہر کھڑے تھے۔ عمامہ انہیں دیکھ سکتی تھی۔ اور وہ دونوں اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس نے باتوں کی بھنبھناہٹ پر کان لگا دیے۔

''آنا فاناً شادی کا طے ہونا پھر رک جانا...... یہ تمہارے حق میں مبارک ثابت نہیں ہوا؟'' طاہر کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ شام کی شادی کے موضوع پر بات کر رہا تھا۔ عمامہ کا رواں رواں کان بن گیا۔

''مبارک بادی کا مجھ پر فیضان ہونے والا نہیں...... یہ رکاوٹ تو عارضی ہے۔ ذبیحہ کو تیار کرنے تک کی مہلت، ذہنی اور قلبی طور پر تیار ہو جانے کا اشارہ...... '' کچھ دیر بعد شام کی بوجھل آواز سنائی دی تھی۔ یوں کہ فضا کا مہکیلا پن بھی اس بوجھ تلے دب گیا تھا۔ عمامہ کے روم، روم میں تھکن اتر آئی تھی۔

''تم نے انکار کیوں نہیں کیا؟ خاموش رہ کر فرمانبرداری کا کوئی ایوارڈ نہیں ملے گا۔'' طاہر نے اسے اکسایا تھا۔ حقیقت میں شام اور فیقہ کی شادی اس کے لیے قطعاً ناقابلِ قبول تھی۔ شادی میں کچھ بھی نارمل نہیں تھا۔ ایک ایب نارمل شادی تھی، جس کا رک جانا ہی مناسب تھا۔

''انکار کی 'وجہ' کیا بتاؤں......؟'' اس کا سوال خاصا نوکیلا تھا۔ عمامہ نے دیوار کا سہارا لے لیا۔

''فیقہ پھپھو عمر میں تم سے دُگنی ہیں۔ یہ کیا کم وجہ ہے۔'' طاہر نے خفگی سے کہا۔

''ہمارے ہاں اس وجہ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔'' وہ آزردگی سے بولا۔ ''اور اگر فرض کرو، میں انکار کرتا بھی ہوں تو اس خاندان سے بے دخل کر دیا جاؤں گا۔ کسی اور حوالے کے ساتھ جینا بہت محال ہے۔ صالح بھیا کے نام سے مجھے پہچانا جاتا ہے۔ میں اس نام کے علاوہ منصور دلال کا بیٹا کہلوا کر مر جاؤں گا۔'' شام کی بوجھل آواز میں کانچ چٹخ رہے تھے۔ طاہر دکھ سے اسے دیکھتا رہا۔

''تم میں جرأت کی کمی ہے۔ میں بابا سے بات کروں؟'' طاہر کا ازلی جوش امڈ کر باہر آیا تھا۔ شام اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ طاہر کو بتا نہیں سکا تھا۔ اس جرأت کے پیچھے ایک طوفان کھڑا ہے۔ وہ اپنے انکار کی طاقت کا استعمال کر کے صوفی صالح کے گھر کی بنیادیں نہیں ''ہلا'' سکتا تھا۔ کیونکہ اس انکار کے پیچھے عمامہ مجسم تھی۔ فیقہ کو ٹھکرا کر عمامہ تک آنا ممکن کہاں تھا؟ وہ سارے ابتدا سوچتے تھے۔ شام انتہا کو سوچتا تھا۔

''اس کی ضرورت نہیں...... '' شام نے اذیت سے کہا تھا۔ عمامہ کی آنکھوں میں ریت بھرنے لگی تھی۔ اسے یقین تھا کہ کبھی شام، بابا کے مقابل کھڑا نہیں ہوگا۔ وہ کبھی جرأت کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔

''عمامہ بھی کچھ پریشان ہے، پہلی سی نہیں رہی۔ کمرے میں بند رہتی ہے۔ فرخ کے ایکسیڈنٹ سے غمگین ہے شاید...... '' طاہر نے متفکر انداز میں خود کلامی کی تھی۔ شام چونک کر نگاہ چرا گیا تھا۔ عمامہ بھی ساکت ہوئی تھی۔



نامور ایڈووکیٹ، پاکیزہ کی جانی پہچانی، ادیبہ، شاعرہ اور مستقل قاری و تبصرہ نگار سعدیہ ہما شیخ کے لیے یہ بات یقیناً قابل فخر ہے کہ انہیں اسی کالج میں بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا جہاں سے وہ زیور تعلیم سے آراستہ ہوئیں......

معروف شاعرہ سعدیہ ہما شیخ کو قائد اعظم لاء کالج کی طرف سے شیلڈ دی جا رہی ہے



معروف شاعرہ سعدیہ ہما شیخ قائدِ اعظم لاء کالج کی سالانہ تقریب سے خطاب کر رہی ہیں

پھر آئل پینٹ کی ہموار دیوار پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''اور تم......؟'' طاہر، شام کے کچھ قریب ہوا تھا...... پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''تم اتنے نڈھال کیوں ہو؟ جیسے عمر بھر کی پونجی لٹائی ہو۔'' اس کی کھوجتی نگاہ نے شام کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل نہ پایا۔

''خواہ کچھ بھی ہو مصیبت کے دن گزر جاتے ہیں اگر یہ نہیں گزرتے تو انسان خود ہی گزر جاتا ہے۔'' شام کے الفاظ نے طاہر کو ''ٹھرا'' کر رکھ دیا تھا۔ وہ متوحش سا اسے دیکھتا رہا۔ جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سخت بے یقینی تھی۔

''تم کس مصیبت سے گزر رہے ہو؟'' طاہر نے بہت دیر بعد بے ربط انداز میں کہا۔ شام نے خالی، خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

''اپنے دل پر اتنا ستم مت کرو کہ یہ سہہ نہ پائے۔'' طاہر نے اس کا شانہ ہلایا تھا۔ وہ اب بھی خالی، خالی نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے ایک لفظ بھی نہیں تھا۔ وہ اندر تک خالی ہو چکا تھا۔

''تم اتنے اداس کیوں ہو؟'' طاہر کے سوال اسے زخم، زخم کر رہے تھے۔ اس نے گہری سانس کھینچی اور بہ مشکل بولا۔

''پتا ہے عورت کا دل ایک گھنے جنگل کے مانند ہوتا ہے جس کے اردگرد کانٹوں کی باڑھ لگی ہوتی ہے جہاں اجنبیوں کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے لیکن اگر چھپتے چھپاتے، بچتے بچاتے کوئی اندر گھس بھی جائے تو وہ ساری زندگی کے لیے وہاں قید ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ وہاں مر بھی جائے تو اس کی قبر اسی جنگل میں بنتی ہے اور اس پر ہر روز آنسوؤں کے پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ جب سے اس فلسفے کو سمجھا ہے تب سے میرے اندر زندگی قطرہ، قطرہ پگھلنے لگی ہے۔'' وہ ایک عجیب جواب دیتا طاہر کو دم بخود کر گیا تھا۔

☆☆☆

اور دم بخود تو عمامہ بھی رہ گئی تھی جب اس کے کندھے پر پیچھے سے کسی کا ہاتھ پڑا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ شمسہ بھابی کھڑی تھیں پھر اس کا بازو پکڑ کر وہ برابر والے کمرے میں لے گئیں۔

''طاہر اگر دیکھ لیتا عمامہ! تم اتنی غیر محتاط تو نہیں تھیں۔'' بھابی کی آنکھوں میں تنبیہہ تھی۔ عمامہ کٹ کر رہ گئی تھی۔ اس کی خام خیالی تھی کہ طابہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ حالانکہ معاملہ کچھ الگ تھا۔ بہت سارے لوگ بہت کچھ سمجھ رہے تھے پھر بھی خاموش تھے۔ اور وہ خاموش کیوں تھے؟

''خود کو سنبھالو عمامہ! مضبوط کرو، یہ عشق کی راہیں آسان نہیں...... کیوں بن دیکھے چل پڑی ہو۔'' شمسہ بھابی اسے آنکھوں سے سمجھا رہی تھیں۔ عمامہ کا سر جھک گیا۔ وہ بھابی کو کیسے بتاتی۔ وہ اتنی بے بس ہے کہ خود پر کوئی اختیار نہیں رکھتی۔ وہ کمزور ہے، کم فہم ہے، وہ الجھی ہوئی ہے اس کی الجھنیں سلجھانے والا کوئی نہیں۔

''وہ تمہارے اختیار کی حدوں سے بہت دور ہے۔ اپنے قدموں کو روک لو۔'' نرم دل بھابی نے سسکتی عمامہ کو خود میں سمیٹ لیا تھا۔

''جب میں اس گھر میں آئی تو تم بہت چھوٹی تھیں۔ چینی کی گڑیا سی...... سرخ، گلابی، ملائم سی...... میں نے گھر بھر کو تم پر ہمیشہ مہربان دیکھا ہے۔ تمہارے بھائی تم پر جان وارتے ہیں۔ تم ان کی جان ہی رہو...... جان کا وبال نہ بنو......'' بھابی نے اس کے بھیگے گال ہاتھوں سے پونچھے۔

''عمامہ......'' وہ بے خودی اسے دیکھنے لگیں۔ ''عمامہ تم! بہت خاص ہو، خود کو بے مول نہ کرو......'' انہوں نے پھر سے اس کو خود میں سمیٹ لیا تھا۔

''اور طابہ سے دور رہو...... وہ ہمدردی کی آڑ میں نقصان پہنچائے گی۔ سمجھ رہی ہو ناں......'' شمسہ بھابی نے بڑی گہری بات سمجھائی تھی۔ عمامہ بھیگی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

''فیقہ اور دادی کا مقابلہ آسان نہیں......'' انہوں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ''اور تم نے انہیں بدلا ہوا نہیں دیکھا؟ تمہیں دیکھ، دیکھ کر جیتی تھیں۔ اور اب؟ آخر کیا وجہ ہے؟ کوئی تو ہے انہیں بدگمان کرنے والا؟ میں پھر کہوں گی، طابہ سے بچتی رہو۔ اپنے اندر کے راز کو کسی سے مت کہو......'' شمسہ بھابی نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ اب عمامہ کا فرض تھا کہ وہ ہر نکتے کو گہرائی میں جا کر سمجھتی۔ اور اس نے اپنی فہم کے مطابق ہر بات کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

''مجھے دادی اور پھپو کی پروا نہیں۔ انہوں نے کب میری پروا کی۔'' وہ سوں، سوں کرتی رہی۔ ''اچھا ہے...... انہیں طابہ بھابی نے سب کچھ بتا دیا۔ بھلا چندن کے درخت کی مہک بھی کبھی چھپتی ہے؟'' وہ اسی طرح روتی رہی۔ بھابی اسے دیکھتی رہیں، کچھ سوچتی رہیں۔

''جب آپ کو بھی کچھ پتا ہے تو یہ بھی معلوم ہوگا۔ شام سا بزدل کوئی نہیں، عمامہ نے کس سے سر ٹکرایا۔'' وہ سسکتی رہی۔

''عمامہ! تمہیں خود کو مصروف رکھنا ہوگا۔'' شمسہ اسے نرمی سے دیکھ کر بولیں۔ وہ کسی روٹھی شہزادی کی طرح تھی۔ جس کو خلاف طبع چھینک بھی آتی تو خفا ہو جاتی۔ اور یہاں تو معاملہ ہی اور تھا۔ زندگی کی ناؤ طغیانیوں میں بہہ رہی تھی۔ شمسہ دیر تلک سوچتی رہیں پھر سنبھل کر اٹھتے ہوئے بولیں۔

''وہ محبت یقیناً عظیم ہوتی ہے جو ایک دوسرے کی، عزت پر مبنی ہو...... اور شام تمہاری عزت کا محافظ ہے عمامہ! اتنا سا نکتہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔ اسے امتحان میں مت ڈالا کرو......'' شمسہ بھابی شام کی وکالت کرنے نہیں آئی تھیں۔ پھر بھی عمامہ کو وکالت ہی لگی۔ وہ خود سے الجھ، الجھ کر تھک گئی تھی۔ شمسہ سے بات کی تو دل کو کچھ سکون ملا تھا۔ پھر شمسہ کو خیال آیا۔

''اماں کا پیغام پہنچانے آئی تھی۔ ان کی بات سن لو۔'' وہ اٹھتے ہوئے اسے منہ دھونے کا اشارہ کر کے نیچے چلی گئی تھیں۔ عمامہ مرے، مرے قدم اٹھاتی سنکنی کی طرف بڑھ گئی۔ منہ دھویا پھر بغیر خشک کیے سیڑھیاں اتر کر اماں کے کمرے میں آ گئی۔ وہ کروشیے کا جال بُن رہی تھیں۔ عمامہ کے لیے بلاؤز اور بازو بن رہے تھے۔

کوئی اور وقت ہوتا تو عمامہ اتنا پیارا بلاؤز دیکھ کر چہک اٹھتی۔ جس کے نیچے اماں نے لمبی سی جرسی بھی بنا رکھی تھی مگر اس وقت اسے کچھ بھی نہیں بھا رہا تھا۔ اماں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر اون، گولے سمیٹتی ہوئی بولیں۔

''دیکھو تو...... پسند آیا ہے؟'' انہوں نے بلاؤز کی ڈوریاں لگا کر عمامہ کو دکھایا۔ اس نے اماں کا دل رکھنے کو سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

''کیا بات ہے عمامہ......؟'' اس کی آزردگی پر اماں فوراً چونکی تھیں۔ عمامہ نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ کچھ سوچ کر بولی تھیں۔

''کسی روز قدسیہ کو فون کر لینا گلہ کر رہی تھیں، عمامہ نے تعزیت کی نہ فرخ کا احوال پوچھا'' طاہرہ اون، گولے اٹھا کر الماری میں سنبھال آئیں۔ عمامہ کا بلاؤز اور بازو تیار تھے۔ اب ان کو سوئی دھاگے کی مدد سے جوڑنا تھا۔

''کرلوں گی......'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''پھپو کے لیے بھی بنایا ہے؟'' اس نے کچھ خیال آنے پر پوچھا۔ طاہرہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''بنایا تو نہیں...... تمہارا دیکھ کر فیقہ کا دل بھی آ گیا۔ کہہ رہی تھی، بنا دوں اسے بھی......'' وہ سادگی سے بولی تھیں۔

عمامہ کے تیور بگڑ گئے تھے، چہرے پر ناگواریت پھیلتی چلی گئی تھی۔

''فیقہ کا دل ہمیشہ میری چیزوں پر آتا ہے؟'' وہ درشتگی سے بولی۔ طاہرہ کی آنکھوں میں ناگواری سی چمکی تھی۔ انہوں نے فوراً عمامہ کو ٹوکا۔

''بری بات عمامہ! پھوپی ہے تمہاری۔'' انہوں نے خفگی سے جتایا تھا۔

''پھوپی نہیں، چڑیل کہیں......'' وہ منہ ہی منہ میں بدبدائی تھی۔ طاہرہ سن ہی نہیں سکی تھیں ورنہ ضرور ٹوکتیں۔

''اچھا سنو......'' انہوں نے عمامہ کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ ''تم نے طابہ سے کچھ کہا؟'' وہ کھیس تہہ کرتی مصروف انداز میں پوچھ رہی تھیں۔ عمامہ ڈرسی گئی۔ چاہے جتنی بہادر بنتی تھی۔ ماں کے سامنے خوفزدہ ہو جاتی۔ نہ جانے طابہ نے اماں سے کیا کہا تھا؟ اس پہلو پر وہ غور ہی نہیں کر سکی۔

''کک کیا......؟'' عمامہ متوحش سی بولی۔

''پڑھائی کے متعلق......'' طاہرہ کے اگلے الفاظ اسے پُرسکون کر چکے تھے۔ اس کی اٹکی ہوئی سانس بحال ہوئی تھی۔

''جی...... کی تو تھی......'' عمامہ نے آہستگی سے کہا۔

''تو پھر تیار ہو جاؤ...... طاہر فارم لے آئے گا۔ یونیفارم کا کپڑا وغیرہ خریدتی ہوں۔ درزن گھر بیٹھ کر سلائی کر جائے گی۔'' اماں نے اسے مژدۂ جاں فزا سنایا تھا۔ جیسے وہ خود بھی چاہتی تھیں کہ عمامہ مصروف ہو جائے۔

''کتابیں بھی آ جائیں گی۔ شرط یہ ہے دھیان سے پڑھنا۔'' وہ کچھ کہتے، کہتے رک سی گئی تھی۔ لحاظ آڑے آ گیا تھا۔ ورنہ کہہ ہی دیتیں۔ ''شام کا خیال نہ کرنا، دھیان سے پڑھنا''

''کیا سچ اماں......؟'' عمامہ خوشی سے بے چین ہو کر چیخی...... اتنے دنوں کے حبس کا بڑا دلفریب توڑ ہوا تھا۔ عمامہ کی سرخ آنکھیں چمکنے لگیں۔

''میں نے تمہارے بابا سے بات کر لی ہے...... انہیں بھی اعتراض نہیں...... ویسے بھی فرخ کا علاج لمبا چلے گا۔ چار، پانچ ماہ تو لگیں گے۔ اللہ اسے صحت عطا کرے...... تب تک تم بھی مصروف رہو گی۔ چاہو تو شادی کے بعد بھی پڑھتی رہنا۔'' وہ نگاہ چرا کر بولتی رہی تھیں۔ عمامہ سر ہلا، ہلا کر ان کی بات سمجھتی رہی۔ پھر بے ساختہ ماں کے گال چومنے لگی۔ اس کا انداز بڑا پُرجوش قسم کا تھا۔

''اماں! بہت، بہت شکریہ......'' اس کی آنکھیں چمکتی رہیں...... پھر وہ اٹھ کر باہر جانے لگی تھی کہ اماں کی آواز آئی۔

''عمامہ! شکایت کا موقع نہ ملے۔'' ان کے لہجے میں واضح تنبیہہ تھی۔ ایک روک، ایک ٹوک، کچھ واضح ہوتا،

کچھ پوشیدہ سمجھانے والا انداز...... ایک پابند کرتا حکم نامہ...... ''تمہاری یہ حدود ہیں، ان سے آگے مت بڑھنا۔ تمہاری ساری خواہشیں پوری ہوتی رہیں گی۔'' اس نے ماں کا حکم نامہ سمجھا تھا یا نہیں...... آج وہ خوش بہت تھی۔ اسی طرح قلانچیں بھرتی باہر کی طرف بھاگی۔ طابہ کے روم کا دروازہ ناک کیا سر اندر گھمایا اور کورنش بجالائی تھی۔

''تھینک یو طابہ بھابی! آپ نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ آپ نے اماں کو منالیا۔'' وہ طابہ کی احسان مند ہوئی تھی۔ اس کے خیال میں تھا طابہ نے اماں کو جان جوکھوں میں ڈال کر منایا ہوگا۔ اس کا خیال غلط تھا۔ اماں تو خود کب سے خواہش رکھتی تھیں کہ کم از کم عمامہ بی اے تک تعلیم حاصل کرلے...... اور وہ یہ بھی چاہتی تھیں کہ عمامہ کو ایسی مصروفیت ملے کہ اس کا دھیان شام سے ہٹ جائے۔

''تمہاری خاطر میں کچھ بھی کر سکتی ہوں...... کبھی آزما کر دیکھ لینا۔'' طابہ نے بیٹے کو سلا کر کپڑوں کا ایک ڈھیر عمامہ کو پکڑا دیا۔

''اپنے بھتیجوں کے یونیفارم پریس کردو...... آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں......'' طابہ نے بڑی لجاجت سے کہا تھا کوئی اور وقت ہوتو عمامہ کو کپڑوں کے اس ڈھیر کو طابہ کے منہ پر مار دیتی۔ مگر اب حالات مختلف تھے۔ طابہ نے اس پر تازہ، تازہ احسان کیا تھا، وہ انکار نہیں کر سکتی تھی کپڑے اٹھا کر لے آئی پھر ڈیڑھ گھنٹے میں جما، جما کر استری کیے...... ہینگروں میں لٹکائے پھر تھک ہار کر باغیچے میں چلی آئی۔ اسے دیکھ کر منال بھاگتا ہوا آ گیا تھا۔ عمامہ نے جھک کر اسے اٹھایا۔ لاجوردی کنٹھے کو پیار سے کھینچا...... پھر گود سے اتار کر وہیں گھاس پر بیٹھ گئی تھی۔ تنکوں کو ہاتھوں سے نوچ، نوچ کر وہ کالج کے متعلق سوچتی رہی۔ کالج کا خیال شام کے خیال سے بھاری نہیں تھا۔ پھر وہ کچھ دیر کے لیے خود کو ہر فکر سے آزاد... کرنا چاہتی تھی۔

وہ سوچوں میں گم تھی جب طاہر کا وہاں سے گزر ہوا...... اسے لان میں بیٹھا دیکھ کر وہ اندر جانے کے بجائے عمامہ کی طرف آ گیا تھا۔ وہ بھائی کو دیکھ کر چونک گئی۔

''کیا سوچتی ہے عمامہ!'' طاہر نے اس کے گھنگرالے بالوں کو چھیڑا۔ عمامہ بھائی کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''کچھ خاص نہیں......'' وہ اداسی سے مسکرادی۔

''یہ پڑھائی کا خیال کیسے آ گیا؟'' طاہر نے حیرانی سے پوچھا۔

''بس ایسے ہی۔'' وہ سر جھکا کر بولی اس کا جواب بڑا مسکین تھا۔ طاہر کو ہنسی آ گئی۔

''بس ایسے ہی...... کرتے، کرتے فیل نہ ہو جانا...... دیکھو، مجھ سے بے عزتی برداشت نہیں ہوگی۔ آخر تم ایک بینکر کی بہن ہو......'' طاہر نے اسے جتا کر کہا تھا...... اب کہ عمامہ کو ہنسی آ گئی۔

''ریٹائرڈ بینکر......'' اس نے تصحیح کی تھی۔

''نہیں جی سابق بینکر۔'' طاہر نے ٹکڑا لگایا۔ ''ویسے تمہیں کچھ خبر ہے؟'' اس نے عمامہ کو تجسس بھرے لہجے میں بتایا۔ وہ کچھ چونک کر بھائی کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ جیسے بات سمجھنا چاہتی ہو۔

''یہ اپنا شام اودھ ہے ناں...... ملٹی نیشنل کمپنی میں ایگزیکٹو پوسٹ پر جا لگا...... اور ہمیں بتانا گوارا تک نہیں کیا۔'' طاہر کے انداز میں مصنوعی خفگی تھی۔ گویا وہ خود تو جانتا تھا تاہم عمامہ کو غصہ دلا رہا تھا کہ شام سے اس کی لڑائی پکی ہو۔

''کیا سچ؟'' عمامہ کا منہ حیرت سے کھلا۔

''سچ...... کبھی صبح سویرے دیکھنا...... بلیک ٹو پیس میں بن ٹھن کر خوشبوئیں لگا کر آفٹر شیو لوشن میں نہا کر کہاں جاتا ہے۔'' طاہر نے اس کی کھلی آنکھوں میں دیکھ کر مزید ٹکڑا لگایا تھا۔ اب وہ عمامہ کو اٹھ کر شام کے پورشن کی طرف جاتا دیکھ رہا تھا۔

(جاری ہے)

اگر تم ہوتیں

ہما بیگ



آج نہ جانے برسوں بعد کیسے اس نے وہ برسوں پرانا رائٹنگ پیڈ اور دراز سے چن کر سرخ قلم تھاما تھا۔

"عزیز از جان بیٹی......! ویسے تو دن میں کئی دفعہ تم سے باتیں کرتی ہوں، کبھی روتی ہوں، کبھی ہنستی ہوں۔ سوچا آج خط بھی لکھ ہی ڈالوں...... تم مجھ سے یقیناً ناراض ہو جبھی میری کسی بات کا جواب نہیں دیتیں۔ وضاحتیں جتنی بھی دی جائیں کم ہیں۔ پھر بھی میں جہاں تمہارے نہ ہونے سے نامکمل ہوں وہاں تمہیں دنیا میں لا کر شرمندہ ہوتی۔

یہ اس مظلوم ماں کا خط ہے جو نکاح کی زنجیروں میں جکڑ کر ایسے گھر میں لائی گئی جہاں اس کی حیثیت بیٹے پیدا کرنے والی مشین سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک ایسی ہستی جسے دو وقت کی روٹی اور کپڑے دے کر نسل آگے بڑھائی جا سکے۔ وہ شخص جو تمہارا باپ کہلایا جاتا اس نے کم عمر بزدل لڑکی کو قید با مشقت نہ صرف سنائی بلکہ مقدر کر دی، جو اپنے والدین کی عزت کی خاطر چپ رہی۔ اسے کچھ

زیادہ نہیں چاہیے تھا، صرف محبت کی نظر، چاہت کے دو میٹھے بول، عزت بھری زندگی اس کے بدلے وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔

اس کو وہ ہم سفر ملا جو صرف غرض مند تھا، غرض پوری ہونے سے پہلے بھی اور غرض پوری ہونے کے بعد بھی حاکمِ اعلیٰ اور بیوی کو اُف کہنے کی بھی اجازت نہ دینے والا۔

جس شخص کو بیٹی کے نام سے نفرت تھی جو صرف اپنی طاقت اور رتبہ بڑھانے کے لیے بیٹوں کی فوج بنانا چاہتا تھا۔ وہ بیٹی جیسی کمزوری کو اپنی زندگی میں، اپنے گھر میں کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ بیٹی کو وراثت میں حصہ دینا اس کے پرکھوں کے شایانِ شان نہیں تھا۔

زیور کیا ہوتا ہے، ہار سنگار کیا ہوتا ہے، بھرپور پُرسکون نیند کیسے ملتی ہے، زندگی میں ایسی کوئی عیاشی نہیں...... اگر کچھ تھا تو شوہر، ساس، سسر کی قہر آلود، مزید خدمت کا تقاضا کرتی آنکھیں...... ایسے ماحول میں اگر میں اپنی مرضی کی ایک بغاوت کر بھی لیتی اور تمہیں دنیا میں لے بھی آتی تو سوچو تمہیں کیا ملتا؟ صرف نفرتیں، جھڑکیاں، قیدِ تنہائی، باپ اور بھائیوں کی برچھیوں کی طرح چبھتی نگاہیں، جوان ہوتے ہی تمہارا نکاح کلام پاک سے کروا کے اپنی زمین و جائداد کو محفوظ کرلیا جاتا۔ ابھی تو میں حالات سے سمجھوتا کرنے کی کوششیں کررہی ہوں...... تمہارا غم کیسے برداشت کرپاتی۔ میری بچی......

چلو مانا اگر ہم حالات سے بغاوت کرنے میں کامیاب بھی ہوجاتے اور میں تمہیں اعلیٰ تعلیم دلاتی پھر بھی تم آزادی سے جی نہیں پاتیں۔ وہ تمہارے اوپر ایک اور ظلم ہوتا تعلیم سے تمہیں اپنے حقوق کا پتا چلتا۔ اپنی ماں پر اور خود پر ہونے والے ظلم کا پتا چلتا۔ باہر کی دنیا بہت دلکش ہے، اس کی رنگینیاں تمہیں اپنی طرف مائل کرتیں۔ تم اپنی جیسی لڑکیوں کو ہنستے، مسکراتے اپنے بھائیوں اور باپ کی شفقت تلے دیکھتیں تو ضرور شکوہ کرتیں کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہورہا ہے؟ میرے ناز نخرے کیوں نہیں اٹھائے جاتے؟ کمزور و ناتواں ماں جس نے اپنے حقوق کے لیے آواز نہیں اٹھائی وہ تمہارے لیے بھلا کیا کرسکتی تھی؟ مجھے پتا ہے اب تم کہوگی۔

''تم کیسی ماں ہو! اگر میں ہوتی تو ہم سہیلیوں کی طرح رہتے۔ ایک دوسرے کا دکھ، سکھ بانٹتے۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے۔'' مگر میری جان ایسا نہیں ہوتا، تم بھی اوروں کی طرح مجھ سے نفرت کرتیں۔ تم اگر پیدا ہوتیں تو اس معاشرے میں ماضی اور حال میں فرق، کہنے اور کرنے کا تضاد دیکھ کر مجھ پر ناراض ہوتیں...... یہی کہتیں کہ ''اس دورخے معاشرے میں مجھے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جہاں سانس لینے پر بھی پابندی ہے، جہاں رشتے صرف غرض اور دولت کی ڈور سے بندھے ہیں۔''

اگر تم دنیا میں آتی تو یقیناً بہت ذہین ہوتیں مگر محبت اور حکومت کرنے کے لیے مرد کو عقلمند عورت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اسے ہمیشہ خود سے کم تر، بیوقوف ثابت کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس طرح کے نام نہاد پڑھے لکھے لوگ بظاہر روشن فکر نظر آنے والے اگر ذہین لڑکی سے شادی کر بھی لیتے ہیں تو اس لڑکی کو اپنی ازدواجی زندگی کی بقا کی خاطر نکاح کے ساتھ ہی اپنی زبان اور عقل کو کسی صندوق میں بند کرکے سات تالے لگا کر سمندر کی گہرائیوں میں پھینکنا پڑجاتا ہے۔ دنیا والوں کے سامنے وہ جتنی عالم و فاضل ہو، گھر میں اس کی حیثیت جوتی کی نوک سے زیادہ نہیں ہوتی۔

پیاری بیٹی اگر تم آج ہوتیں تو دیکھتیں کہ کتنے وحشی درندے اس معاشرے میں پل رہے ہیں اور اپنی جھوٹی انا اور روایات کو لے کر اپنی ہی عورتوں کا استحصال کررہے ہیں۔ کیسی کیسی قبیح رسمیں آج بھی رائج ہیں۔

نابھی کی عمر میں اگر تمہارا کسی پر دل آجاتا تو......؟ جبکہ یہ تو آفاقی جذبہ ہے، ہونی کو کون ٹال سکتا ہے، تمہاری پسند میری بھی پسند ہوتی۔ مگر ساتھ، ساتھ یہ خوف بھی دامن گیر ہوتا کہ کہیں شادی کے بعد یہ بدل تو نہیں جائے گا؟ تمہارے ساتھ روایتی شوہروں والا رویہ تو نہیں روا رکھے گا۔ شاید اس کی وجہ وہ محرومیاں ہیں جن کا میں زندگی بھر سامنا کرتی رہی۔ میں نہیں چاہتی تھی وہ میری بیٹی کا بھی مقدر بنیں...... میں بھی کن خیالوں کی دنیا میں رہ رہی ہوں۔ بھلا تمہارے باپ اور بھائی تمہاری پسند کو برداشت کرتے، وہ تو تم دونوں کو ہی کاروکاری کے جرم

میں قتل کر دیتے۔

تم پیدا ہوتی تو مجھے کہتیں۔

''امی آپ تو جھوٹی اور منافق ہیں۔ آپ کی زندگی کتنی مصنوعی ہے، دن بھر چڑچڑاتی ہیں، چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہیں۔ اندر ہی اندر گھٹتی ہیں۔ مگر جیسے ہی ابا گھر میں آتے ہیں، آپ کے چہرے کے تاثرات بدل جاتے ہیں۔ لگتا ہے جیسے دنیا میں آپ جیسا خوش کوئی ہے ہی نہیں...... وہ آپ کو جھڑکتے ہیں، سیدھے منہ بات نہیں کرتے پھر بھی آپ ان کے سامنے بچھی، بچھی جاتی ہیں۔''

ہاں بیٹی تم یہی سوال کرتیں۔

میری بچی یہ سب تو کرنا ہی پڑتا ہے، اپنا گھر بسا رکھنے کے لیے۔ اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے، آخر کو مشرقی عورت کے لیے شوہر ہی تو سب کچھ ہوتا ہے، میں آج بھی اتنے سارے لوگوں کے درمیان تنہا ہوں۔ محبتوں اور چاہتوں میں تلخیاں بھی تو تنہائیوں کو جنم دیتی ہیں...... زمینی بے گھری کے علاوہ دل کی رومانوی ...... بے گھری بھی تو ہوتی ہے۔ اس تنگ نظر معاشرے میں تو اگر مسکرا کر کسی سے بات ہی کر لی تو بس...... یہیں سے فتنہ سازی کی دکان کھلنے کا سامان ہو گیا۔ اس امر کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں...... میں اور تمہارے باپ، بھائی تمہارے پیدا ہوتے ہی تمہارے مسکرانے پر پہرے بٹھا دیتے۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے دنیا معصومیت اور شیطانیت میں فرق نہیں جانتی۔

میں تمہاری کیسے اور کتنی چوکیداری کرتی میری بچی......؟ جہاں سگے اور خونی رشتے ہی ڈاکا ڈال دیتے ہوں، کوئی بھروسے کے لائق نہیں۔ اس سب کے باوجود تمہاری ماں تمہارے باپ سے شدید محبت کرتی ہے۔ وہ باپ جس نے کبھی تمہاری ماں کے ساتھ بیٹھ کر یہ ڈسکس نہیں کیا۔

''اگر بیٹی ہوئی تو ہم اس کا یہ نام رکھیں گے، اسے اعلیٰ تعلیم دلوائیں گے اس کے دل میں نہ تو بیٹی کا ارمان تھا اور نہ ہی مجھ کو کسی بھی معاملے میں فیصلے کا اختیار...... جبھی تو میرے اندر بھی ٹوٹ پھوٹ ہوئی اور پھر اپنی زندگی کا سب سے بڑا، پہلا اور آخری فیصلہ کیا وہ بھی اتنا سنگین کہ تمہیں اس دنیا میں نہیں آنے دیا۔ جب لیڈی ڈاکٹر نے بتایا۔ ''چار بیٹوں کے بعد اس دفعہ آپ بیٹی کی ماں بننے جا رہی ہیں۔'' تو میں چیخ پڑی۔

''نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ میں اپنے آپ کو اس آزمائش میں نہیں ڈال سکتی۔ اپنی بیٹی کو اس دنیا میں لانے کا ظلم نہیں کر سکتی۔''

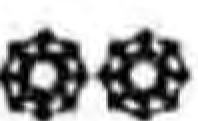
بالفرض اگر تم ہوتیں بھی تو میں تم سے کچھ بننے کی توقع کرتی تو یقیناً غلطی پر ہوتی، میں نے...کون سے تیر مار لیے پڑھ لکھ کر تم بھی وہیں کرتیں جو معاشرہ چاہتا ہے۔ جو تمہارا باپ چاہتا ہے۔ میں تمہیں زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی نہیں ڈراتی، کہیں تمہارے قدم بہک نہ جائیں اور ڈر ایسی چیز ہے جو ایک دفعہ دل میں بیٹھ جائے تو پھر بھی باہر نہیں نکلتا۔

ڈر ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے پھر ہر ایک سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ تم پیدا ہو کر دیکھتیں کس، کس طرح عورت کی تذلیل ہوتی ہے، کبھی مذہب کی آڑ لے کر تو... کبھی معاشرتی اقدار کی آڑ لے کر...... کبھی نفسیات کا سہارا لے کر عورت کا دماغ مرد کے مقابلے میں چھوٹا ہے، کمزور ہے۔

پھر میں تمہیں پیدا کرنے کی غلطی کیونکر کرتی۔ ایسے جہاں میں جہاں کوئی بھی حتیٰ کہ تمہارا باپ اور تمہارے بھائی بھی تمہیں خوش آمدید کہنے کو تیار نہیں تھے۔ پیدا ہو کر تم کون سا تیر مار لیتیں۔ حد تو یہ کہ میں تو تمہارے مرنے کے بعد بھی تمہاری حفاظت نہیں کر سکتی تھی۔ لاشوں کی بے حرمتی بھی عام ہو گئی ہے۔ جیتے جی کیسے درندوں سے بچا پاتی۔

ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا...... میں بہت مجبور تھی، میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرنا۔ میری بچی فقط تمہاری... بدنصیب ماں......''

لیٹر پیڈ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ دھڑام کی آواز پر اس کا شوہر اور بیٹے کمرے میں آئے تھے اور سرخ قلم سے لکھی گئی رائٹنگ پیڈ پر شکستہ تحریر اس کی موت کی روداد سنانے کو کافی تھی۔





مکمل ناول

بِساط

ناہید سلطانہ اختر

دوسرا اور آخری حصہ

ایک معروف پرائیویٹ چینل نے امریکا میں مقیم پاکستانی تارکین وطن کے حوالے سے ایک سیریل لکھوانے کے لیے ایمہ سے رابطہ کیا۔ سیریل کی بیشتر ریکارڈنگ امریکا ہی میں ہونا تھی۔ ان دیکھے دیس کی ثقافت، ماحول اور لوکیشنز دیکھنے کے لیے ایمہ کا امریکا جانا ضروری تھا۔ بلکہ پروڈیوسر کا خیال تھا کہ سیریل کی تیاری کے دوران ایمہ کو کئی مرتبہ امریکا جانے اور تھوڑے، تھوڑے عرصے کو وہیں قیام کی ضرورت بھی ہوسکتی تھی۔

اینہ کافی دنوں بعد دو دن کے لیے اماں کے ہاں رہنے آئی ہوئی تھی۔ ابا کو پتا چلا کہ اینہ سے بیرون ملک ڈراما لکھوانے کے لیے رابطہ کیا گیا تھا تو وہ جھوم اٹھے۔

''واہ، واہ...... اینہ بیٹی ایسے مواقع قسمت سے ملتے ہیں، گنوانا مت...... فوراً ہاں کر دو......''

''ضیغم سے بات کیے بغیر میں کیسے ہاں کر سکتی ہوں ابا۔'' اینہ نے کہا۔

''وہ کوئی منع کرے گا کیا......؟'' ابا نے یقین سے کہا۔

''منع کرے یا نہ کرے اینہ کو اس کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔'' اماں بولیں۔

''تم دیکھنا وہ کتنی خوشی، خوشی اجازت دے گا۔ ارے بھئی یہ تو اس کے بلکہ اس کی پوری فیملی کے لیے فخر کی بات ہے۔'' ابا نہایت مسرور ہو رہے تھے۔

ضیغم اسے گھر واپس لے جانے کے لیے آ ہی رہا تھا۔ وہ آیا تو خود اینہ سے پہلے ابا نے یہ خوشخبری اسے سنائی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا ہوا......؟ تم خوش نہیں ہوئے؟'' ابا نے کہا۔

''انکل......! ہے تو خوشی کی بات مگر...... ممی سے اجازت لینا ہوگی اینہ کو۔''

''ہاں، ہاں اُن کی اجازت کے بغیر تھوڑی جائے گی اینہ...... اور بھئی وہ کوئی منع کریں گی کیا...... ایسے سنہری مواقع تو قسمت سے ملتے ہیں۔''

ضیغم نے ماں سے بات کی، وہ خوش ہوئیں...... شوہر کو بتایا۔ ذرا سی دیر میں تمام اہلِ خانہ کو خبر ہو گئی۔ جیٹھانیاں اینہ کو دل جلے رشک سے دیکھنے لگیں۔

''ضرور جانا چاہیے تمہیں......'' عفت جمیل نے اینہ سے کہا۔ ''مگر میری ایک شرط ہوگی۔''

اینہ انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''ضیغم بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔''

''مجھے کوئی شوق نہیں۔''

''بیگم کو اکیلے غیر لوگوں کے ساتھ بھیجنا اچھا لگے گا تمہیں......'' عفت جمیل نے ابرو چڑھا کر بیٹے کو دیکھا۔

''ہاں ناں، آپ ساتھ ہوں گے تو میں بھی کمفرٹیبل رہوں گی۔'' اینہ بولی۔

''میری جاب ہے بھئی......'' ضیغم اپنی اہمیت جتا رہا تھا۔

''چھٹی لے لینا...... آخر لوگ نوکری سے چھٹی لے کر باہر جاتے ہیں کہ نہیں، آج کل تو پاکستانی پاسپورٹ پر امریکا کا ویزا لگ جانا کوئی آسان بات نہیں لیکن میڈیا کی اپنی کریڈیبلٹی ہے۔ اینہ کی وجہ سے شاید تمہیں بھی مل جائے ویزا۔''

''اور اگر نہ ملا تو؟''

''تو...... اینہ بھی چینل سے معذرت کر لیں گی...... اکیلے تو میں اجازت نہیں دوں گی جانے کی۔''

''میں بات کرلیتی ہوں ان لوگوں سے......'' اینہ نے کہا۔

''امریکا کا ویزا آج کل بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ پہلے والی بات نہیں رہی۔ ایک مرتبہ جا کر واپس آ جاؤ تو دوبارہ بھی ویزا ملنے کا چانس رہتا ہے۔ چینل ذمے دار ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کے لوگ باہر آتے جاتے رہتے ہیں، ویزا ملنے میں عام لوگوں کی طرح دشواری نہیں ہوتی۔'' علیحدگی میں عفت جمیل نے بیٹے سے کہا۔

''لیکن ممی...... اینہ تو وہاں اپنے کام سے جا رہی ہے، کیا میں اس کا باڈی گارڈ بنا رہوں گا۔''

''خدا نہ کرے...... باڈی گارڈ کیوں بنے رہو گے۔ گھومنا پھرنا، اپنے لیے ملازمت کے مواقع دیکھنا...... وہاں سیٹ ہونے کے لیے راستے تلاش کرنا...... یہاں کیا رکھا ہے۔''

''آپ سرکار کی ملازم ہو کر ایسا کہہ رہی ہیں۔'' ضیغم نے ماں کو معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھا۔

''غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں...... جسے دیکھتی ہوں بچوں کو باہر سیٹ کرنے کی کوشش میں ہے...... سرکاری ملازموں کا کیا ہے، بچے باہر سیٹ کرتے ہیں ریٹائرمنٹ ...... کے بعد خود بھی انہی کے پاس چلے جاتے ہیں۔''

''آپ مجھے قربانی کا بکرا بنانا چاہ رہی ہیں۔''

''زیادہ باتیں نہ بناؤ ضیغم...... میں تمہارا اور تمہارے بچوں کا مستقبل محفوظ دیکھنا چاہتی ہوں...... قدرت موقع فراہم کر رہی ہے تو اسے گنواؤ مت۔'' عفت جمیل نے پہلا جملہ قدرے درشتی سے ادا کیا تھا۔

''امیری جاب ٹھیک ہے می...... میں یہاں خوش ہوں...... اور ایسہ کے لیے بھی آگے جانے کے مواقع یہیں ہیں۔'' ضیغم طبعاً تساہل پسند تھا۔

''فضول بحث سے کوئی فائدہ نہیں...... ایسہ کے رائٹنگ کیریئر کو تو ابھی جمعہ، جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے ہیں شروع ہوئے...... بہت سے نامی گرامی فنکاروں سے واقف ہوں میں جن کا کبھی پاکستان میں طوطی بولتا تھا۔ اپنے عروج کے دور میں یورپ، امریکا، کینیڈا جا کر سیٹل ہو گئے۔ خوش ہیں، پاکستان میں ان کی شہرت نے انہیں کچھ نہیں دیا۔ یہاں بے شمار مشہور لوگ کسمپرسی میں مر گئے۔ باہر جانے والے کو عزت کی زندگی اور پُرسکون موت تو نصیب ہو جاتی ہے۔'' عفت جمیل مسلسل بولتی چلی گئیں۔

''آپ چاہتی ہیں ایسہ کے کندھوں پر سوار ہو کر میں بھی باہر چلا جاؤں۔'' ضیغم بولا۔

''تم کچھ زیادہ ہی نہیں بولنے لگے ہو ضیغم......'' عفت جمیل نے اسے تادیبی نظروں سے دیکھتے ہوئے تنبیہی لہجے میں کہا۔

''سوری می......'' ضیغم کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

☆☆☆

ایسہ نے چینل سے بات کی اور اپنا باہر جانا شوہر کے ہمراہ ہونے سے مشروط رکھا۔

''ان کے سفری اور دیگر اخراجات ہمارے اپنے ذمے ہوں گے۔ بس ویزا کے سلسلے میں آپ کا تعاون درکار ہو گا۔'' ایسہ نے چینل کی انتظامیہ سے کہا۔

انتظامیہ پس و پیش میں پڑ گئی۔

ابا، ایسہ کے ساس، سسر اور دیگر اہلِ خانہ ایسہ سے روزانہ پوچھتے۔

''ہاں بھئی تمہارے باہر جانے کا کیا ہوا؟''

''ابھی کچھ پتا نہیں۔'' ایسہ جھینپ کر کہتی۔

ایسہ کی جیٹھانیاں زیرِ لب مسکراتیں اور ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھتیں۔

''ایسہ کو گر، پڑ کر پوچھنا اچھا نہ لگتا مگر ساس کے اطمینان کو اسے مصلحتاً کہنا پڑتا۔ ''جی می آج پوچھوں گی۔'' آج سے کل اور کل سے پرسوں پر بات ٹلتی چلی گئی۔

''ایسہ پوچھا تم نے؟''

''ممی آج وقت نہیں ملا...... کل ان شاء اللہ ضرور پوچھوں گی۔'' ایسہ بات بناتی خوامخواہ جھوٹ بولنا ناروا لگتا اور چینل سے بات کرنے میں خجالت محسوس ہوتی۔ انہیں ضرورت تھی تو وہ خود رابطہ کرتے۔ وہ کیوں پوچھ کر اپنی قدر گراتی۔ بالآخر اخبار کی ایک خبر سے پتا چلا کہ مذکورہ چینل نے اپنی بیرون ملک فلمائی جانے والی سیریل کے لیے ایک مرد ڈراما نگار کا انتخاب کر لیا تھا۔

''ایسہ تم آج کل کرتی رہیں اور انہوں نے تمہاری عدم دلچسپی دیکھ کر کسی اور کے ساتھ کانٹریکٹ سائن کر لیا۔'' عفت جمیل بولیں بعد میں ایسہ کو شوبز ہی کی ایک شخصیت کی زبانی معلوم ہوا کہ چینل والوں نے تو شوبز حلقوں میں اس کے بارے میں یہ مشہور کر دیا تھا کہ ایسہ احتشام سیریل کے بہانے امریکا میں سیٹ ہونے کے لیے اپنے شوہر کو بھی اپنے ساتھ امریکا لے جانا چاہتی تھیں اس لیے ان کی جگہ دوسرے رائٹر کو لینا پڑا۔ ایسہ کو سخت دکھ اور شوبز کی دنیا بڑی خود غرض اور مطلب پرست محسوس ہوئی۔ ایسا بھلا کب تھا کہ وہ امریکا میں سیٹ ہونے کے لیے ضیغم کو ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ ظاہر تو ضیغم جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ماں نے اسے مجبور کیا تھا۔ خیر ابا کے بقول ''سنہری موقع'' ہاتھ سے نکل گیا تھا مگر وہ اس ''سنہری موقع'' کے ہاتھ سے نکل جانے پر کون سا کوئی مری جا رہی تھی۔ لکھنا اس کے لیے خود کو پُرسکون رکھنے کا سبب تھا اور اپنی ذات کو یہ سب یہاں بھی فراہم کیا جا سکتا تھا وہاں بھی۔ ہاں البتہ اس ''سنہری موقع'' کے گنوائے جانے پر اپنی دونوں جیٹھانیوں کی نظروں میں ڈولتی استہزائیہ کیفیت نے اسے یہ فیصلہ

کرنے میں مدد دی کہ آئندہ اگر اس طرح کا کوئی موقع آیا تو وہ اس کی غیر ضروری تشہیر سے گریز کرے گی۔

☆☆☆

دوبارہ بہتری موقع ملنے میں دیر نہیں لگی۔ پرائیویٹ چینلز کی بہتات نے مسابقت کی فضا پیدا کر دی تھی۔ ناظرین کو اپنی طرف متوجہ رکھنے کے لیے چینلز اپنی ڈراما سیریلز کو نت نئی سرزمینوں کے دلکش نظاروں میں فلمانے پر لگے تھے۔ انیسہ کو جلد ہی ایک دوسرے چینل کی جانب سے ماریشس کی لوکیشنز میں ایک سیریل لکھنے کی پیشکش ہوئی اور سیریل لکھنے سے قبل حسبِ سابق اس کا ماریشس جانا اور وہاں کے ماحول اور مقامات سے واقف ہونا لازم ٹھہرا۔ اس مقصد کے لیے فنانسر، پروڈیوسر، اسسٹنٹ اور رائٹر کو اکٹھے ماریشس جانا تھا۔

انیسہ نے سب سے پہلے ابا کو بتایا۔

''تم اس بار صرف ضیغم سے بات کرو۔'' ابا نے صلاح دی۔

''وہ اپنی والدہ کو بتائے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتے۔''

''نہ کرے لیکن تمہارا اس کو بتانا لازم ہے۔''

''اور اگر اس بار پھر وہی صورتِ حال پیدا ہوئی؟''

''تو میں خود بات کروں گا ضیغم سے۔''

انیسہ کا خدشہ درست ثابت ہوا۔

''بیوی کو غیر مردوں کے ساتھ اکیلے بھیج دو گے تم۔'' عفت جمیل، بیٹے کے بات کرنے پر معترض ہوئیں۔

''آپ بھی تو جاتی رہی ہیں سرکاری میٹنگز میں۔'' ضیغم نے دبی زبان سے کہا۔

''بیوی کی خاطر اب تم مجھ پر اعتراض کھڑے کرو گے۔'' عفت جمیل نے تیوری چڑھائی۔

''سوری ممی...... یہ بات نہیں ہے۔''

''تو پھر......؟''

''انیسہ کوئی بچی نہیں ہے...... اچھا برا سب سمجھتی ہے...... اور اتنے دنوں میں ہم سب نے دیکھ ہی لیا ہے کہ وہ کتنی ریزرو رہتی ہے۔ کسی سے بلا ضرورت بات کرتی ہے نہ بے تکلف ہوتی ہے۔'' ضیغم نے انیسہ کی وکالت کرنے کی کوشش کی۔

''وہ جس گھر سے آئی ہے وہاں عورتوں اور لڑکیوں کو دبا کر رکھا جاتا ہے اس لیے ریزرو لگتی ہے تمہیں...... میں سمجھتی ہوں عورتوں کی نفسیات...... ذرا ڈھیل ملے تو اونچی اڑنے لگتی ہیں۔ میں اجازت نہیں دے سکتی اپنے گھر کی کسی عورت کو بغیر محرم غیر مردوں کے ساتھ باہر جانے کی...... اور میں سمجھتی ہوں بحیثیت شوہر تمہیں بھی اجازت نہیں دینی چاہیے۔''

''میں ساتھ چلا جاؤں۔'' ضیغم نے کہا۔

''ماریشس جا کر کیا کرو گے تم۔''

''امریکا جا کر کیا کرتا...... وہاں تو پوری ٹیم جا رہی تھی انیسہ کو وہیں بیٹھ کر اسکرپٹ بھی لکھنا تھا...... یہاں تو اب صرف لوکیشنز دیکھنے جا رہے ہیں یہ لوگ۔''

''احمق ہو تم...... ماریشس کا ویزا میں تمہیں کھڑے، کھڑے دلوا سکتی ہوں۔'' عفت جمیل نے ضیغم کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔

''تو پھر چلا جاتا ہوں میں انیسہ کے ساتھ۔'' ضیغم زیرِ لب مسکرایا۔

''نہ تم جاؤ گے اور نہ تمہارے بغیر انیسہ......''

☆☆☆

مگر ابا نے انیسہ کو شہ دی۔

''یہ ان کی بہت زیادتی ہے بیٹا...... تمہارے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر کے وہ ظلم کر رہے ہیں تم پر...... ارجنٹ پاسپورٹ بنواؤ اپنا اور جاؤ...... میں دیکھتا ہوں کس طرح روکتی ہیں تمہاری ساس تمہیں...... حد ہو گئی...... اس طرح تو وہ ایک روز تم پر ہر دروازہ بند کر دیں گی...... تم کوئی گھر کی نوکرانی بننے کے لیے تھوڑی ہو۔''

''کیا غضب کرتے ہیں۔'' اماں نے ٹوکا۔ ''انیسہ کو اب اسی گھر میں انہی لوگوں کے ساتھ رہنا ہے۔''

''ہمارے گھر میں جگہ کم نہیں ہے ہماری بچی کے لیے...... زیادہ تڑپڑ کریں گی تو انیسہ کو اپنے گھر بٹھا لوں گا۔''

''توبہ کریں...... کیسی باتیں کرتے ہیں......

بیٹیاں کوئی گھر بٹھائی جاتی ہیں...... انیسہ کو اب وہی کرنا چاہیے جو وہ لوگ چاہتے ہیں۔"
"وہ اس کا مستقبل تباہ کر دینے کے درپے ہیں۔"
"اس کا مستقبل اب وہی گھر اور اس کا شوہر ہے۔"
ماں اور ابا کے اختلاف نظر نے انیسہ کو پریشان کر دیا۔
"میں ضیغم سے خود بات کروں گا۔" ابا بولے۔
انیسہ کی پریشانی کچھ کم ہو گئی۔
"ہاں ابا! آپ ضیغم سے بات کر لیں...... اگر وہ اجازت دیں تو میں رسک لے لیتی ہوں۔"
"رسک کی کیا بات ...... یہ تمہارا حق ہے۔" ابا نے کہا۔
"ضیغم کی مرضی کے بغیر نہیں ابا۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "آپ انہیں اعتماد میں لے لیں۔"
ابا نے ضیغم کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔
"انکل......!" وہ ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا۔ "ہم بھائی، بہن کبھی بھی ممی اور پاپا کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔"
"یہ انیسہ کے رائٹنگ کیریئر کا معاملہ ہے بیٹے...... اس نے اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت جدوجہد کی ہے۔"
"درست......! مگر ممی کی مرضی میرے لیے مقدم ہے۔"
"اور میرے لیے انیسہ کا کیریئر......"
"اسے خود فیصلہ کرنے دیں۔"
"جیسے تم اپنے والدین کے فیصلوں کے پابند رہے ہو ویسے ہی انیسہ بھی میرے فیصلوں کی پابند رہی ہے۔"
"معاف کیجیے گا انکل...... اب وہ میری بیوی ہے۔"
"ٹھیک ہے...... مگر میرا بھی کچھ حق ہے اس پر......"
ضیغم اور ابا کی گفتگو ہمیشہ کی طرح خوشگوار ماحول میں ختم ہونے کے بجائے قدرے تناؤ میں ختم ہوئی۔
"مجھے تمہارے ابا کی بات اچھی نہیں لگی، تم پاریشس جانا چاہتی ہو جاؤ لیکن...... پھر میرا تم سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔" بعد میں ضیغم نے انیسہ سے کہا۔
انیسہ دم بخود رہ گئی۔

"کیا ہمارا تعلق اتنا کمزور ہے ضیغم......!" اس نے صدمے کی کیفیت میں ضیغم کو دیکھتے ہوئے پھنسی، پھنسی آواز میں کہا۔
"ممی سے اپنے تعلق کے مقابلے میں مجھے ہر تعلق کمزور دکھائی دیتا ہے۔" وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔
گویا ضیغم کی زندگی میں اس کی حیثیت ثانوی تھی۔
"تمہارے والد صاحب ہمارے تعلق کو اور کمزور کر رہے ہیں۔" ضیغم نے ناگواری سے کہا۔
"ایسا نہیں ہے ضیغم......" وہ دھیرے سے بولی۔
"ایسا ہی ہے......" وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔
"وہ آخر چاہتے کیا ہیں۔" ضیغم اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے دونوں ہاتھ بغلوں میں دے کر اسے کڑے تیوروں سے دیکھنے لگا۔
انیسہ اس کے روبرو جا کھڑی ہوئی اور اس کا بازو دھیرے سے اپنی گرفت میں لے کر نہایت ٹھنڈے لہجہ میں بولی۔ "آپ کو ابا کی باتیں بری لگیں تو میں آپ سے سوری کرتی ہوں ضیغم۔"
ضیغم نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
"سوری ضیغم......! ابا نے جو بھی کہا میں تو آپ کے ساتھ ہوں ناں...... وہی کروں گی جو آپ چاہیں گے مگر...... ایسا آخر کب تک......!"
"کیا مطلب......؟" وہ تیوری چڑھا کر اسے دیکھنے لگا۔
"ممی آخر کب تک ہماری زندگی کے فیصلے کریں گی۔"
"جب تک وہ ہیں۔"
"خدا انہیں لمبی عمر دے۔"
"اور جب تک ہم اس گھر میں ہیں۔" ضیغم نے مزید کہا۔
"اس کا مطلب ہے...... ہمیں خود اپنے فیصلے کرنے کے لیے علیحدہ گھر بنانے کی ضرورت ہے......"
انیسہ نے یہ بات بظاہر ہلکے پھلکے لہجے میں لیکن درحقیقت ضیغم کا ردِعمل دیکھنے کو کہی۔

"اوور مائی ڈیڈ باڈی ...... جب تک ممی، پاپا ہیں کم از کم میں علیحدہ گھر بنانے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔"

"ممی کو یہ تو سمجھا سکتے ہیں کہ مجھے اپنی صلاحیت سے فائدہ اٹھانے دیں۔ کل جن لڑکیوں کو دو جملے بھی اچھے لکھنے نہیں آتے تھے دھڑا دھڑ سیریلز چھاپ رہی ہیں...... میری ایک کولیگ کی کزن نے صرف ایک ڈراما سیریل لکھی اور اسی کی بنیاد پر ایسے ایسے فائدے حاصل کر رہی ہے کہ میں اپنی کولیگ کی زبانی سن کر حیران ہوتی ہوں۔ لوگ اپنی صلاحیت ہی نہیں شہرت کو بھی کیش کراتے ہیں...... سو طرح کے فائدے اٹھاتے ہیں۔ مجھے تو کالج کی مصروفیت اور رات گئے تک کچن کے کاموں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔"

"جاؤ...... تم بھی کیش کرا لو خود کو...... لگا دو اپنی قیمت......" ضیغم بھبکا۔

"پلیز ضیغم......!" وہ اتنا ہی کہہ پائی۔ ایسے یوں لگا جیسے اس کا شوہر ایم بی اے ڈگری ہولڈر اور ایک معزز گھرانے کا فرد نہیں ایک ان پڑھ، اجڈ اور گنوار مرد تھا۔ اسے الفاظ کا استعمال بھی نہیں آتا تھا۔

کچھ دیر وہ دم بخود کھڑی رہی پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "لکھنا میرا جنون ہے ضیغم...... میرا عشق ہے...... لکھنا مجھے زندگی لگتا ہے...... میں لکھے بغیر نہیں رہ سکتی......"

"مجھے تمہارے لکھنے سے کیا ملتا ہے...... کیا فائدہ ہے مجھے......" انیسہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "فائدہ......" وہ تنویمی سی کیفیت میں بڑبڑائی۔ "کیا فائدہ چاہتے ہیں آپ......؟"

"کمانے والی ایک عورت سے کیا فائدہ ہونا چاہیے اس کے شوہر کو۔" ضیغم نے کہا۔

انیسہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔

کتنی جلدی اس نے اپنی اصلیت دکھا دی تھی۔ ابھی تو شادی کی پہلی سالگرہ بھی نہیں گزری تھی۔ بجا کہ تینوں بھائیوں میں معاشی لحاظ سے وہی سب سے کمتر تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ اسے اتنی جلدی بیوی کی کمائی سے لو لگانے کی ضرورت پڑ جاتی۔ ایم بی اے تھا۔ سیلولر فون کے ایک ادارے میں ملازمت کر رہا تھا۔ اچھی بھلی ماہانہ تنخواہ اور مراعات تھیں...... پھر بھی...... پھر بھی ایسی ندیدگی۔

"جو کماتی ہو اماں، ابا کو بھر آتی ہو...... مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تمہاری تنخواہ کتنی ہے...... لکھنے سے کیا ملتا ہے۔"

انیسہ کو لگا جیسے اس کے جسم سے جان جا رہی تھی۔

"نہیں......" اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "قسم لے لیں جو اماں، ابا کو بھرتی ہوں بلکہ وہ تو الٹا مجھی کو دیتے دلاتے رہتے ہیں۔"

"جانتا ہوں......" وہ پھنکارا۔ "بہت دیکھی ہیں میں نے تم جیسی جو اپنی کمائی کی ہوا نہیں لگنے دیتیں...... شوہر پر بوجھ بنی رہتی ہیں۔"

انیسہ کو وہ اجنبی لگا۔ اتنی جلدی بدل لیتا ہے مرد اپنا روپ...... کس قسم کی باتیں کر رہا تھا وہ......! کہیں سے پڑھا لکھا اور کسی عزت دار گھرانے کا فرد لگ رہا تھا وہ۔

"ممی نے اس لیے نہیں کی تھی تم سے میری شادی...... وہ چاہتیں تو ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی لا سکتی تھیں میرے لیے...... لیکن ان کا خیال تھا معمولی گھر کی لڑکی ہمارے جیسے گھر میں آ کر دب کر رہے گی اچانک ملنے والی شہرت پر اترائے گی نہیں مگر تمہیں تو کبھی گھر کے کام کے لیے ایک نوکر کی ضرورت پڑ جاتی ہے کبھی تم گلچھرے اڑانے کے لیے اکیلی باہر جانا چاہتی ہو اور اب علیحدہ گھر کا خواب......"

"پلیز ضیغم...... بس کریں......" وہ روہانسی ہو گئی۔

ضیغم کے تیور تو وہ دیکھتی تھی...... بے پروا اور اپنی ذات کو فوقیت دینے والا مگر اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جب کینچلی اترے گی تو وہ ایسے لالچی اور نیچ شخص کو اپنے سامنے پائے گی۔

رات بہت بے چینی میں مسلسل کروٹیں بدلتے گزری...... ضیغم کے الفاظ ہتھوڑے کی ضربوں کی طرح انیسہ کے ذہن پر تابڑ توڑ برستے رہے۔ اس کی نگاہوں سے برستی بے رحمی اس کی روح کھلساتی رہی۔

"اس گھر میں...... اور ضیغم کی زندگی میں میری

حیثیت کیا ہے؟'' وہ رہ، رہ کے سوچتی رہی۔ ایک معمولی گھرانے کی لڑکی جسے سسرال میں دب کر رہنا تھا...... جسے اپنی شہرت پر اترانا نہیں تھا...... توہینِ ذات کا احساس اس کی آنکھیں بار، بار نم کر رہا تھا۔ دل بری طرح گھائل ہوا تھا اس کا۔

اور ضیغم اسے آزار پہنچانے کے بعد نہایت ٹھاٹھ سے لمبی تانے سوتا رہا۔

صبح دل شکن تھی۔ وہ انتہائی ماندے دل سے کالج جانے کو تیار ہوئی۔ ناشتا حسبِ معمول جلدی، جلدی زہر مار کیا۔ اس کے جانے تک ناشتا بنا ہی نہیں ہوتا تھا۔ کالج وین ساڑھے چھ بجے گیٹ کے باہر آ کھڑی ہوتی۔ تب تک وہ خود ہی ایک پیالی چائے بنا کر ہلکا پھلکا ناشتا کر چکی ہوتی تھی۔ کبھی توس کبھی ایک سلائس پر مکھن، جام یا مایونیز کبھی ایک دو بسکٹ...... راستہ بھر اور کالج پہنچنے کے بعد بھی طبیع مضمحل رہی اس کی قریبی دوستوں نے پوچھا بھی۔ ''کیا بات ہے انیسہ آج اداس لگ رہی ہو۔''

''نہیں......کوئی بات نہیں......'' اس نے دکھاوے کی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

مگر دل واقعی بہت اداس تھا۔

فری پیریڈ میں وہ لان میں جا بیٹھی۔ سوچا اماں کو فون کر کے بتائے پھر اس خیال سے ارادہ ترک کر دیا کہ انہیں بتانے سے اس کے سوا کیا ہوگا کہ اماں بھی پریشان اور اداس ہو جائیں گی...... ابا کو بتائیں گی تو وہ بھی کیا کر لیں گے۔ اونچی اڑان کی کوشش میں اپنے سے بڑے گھر میں بیٹی بیاہنے کا تاوان تو ادا کرنا تھا ناں انہیں بلکہ انہیں کیا ان کے معمولی گھرانے کے سبھی افراد کو اور سب سے بڑھ کر انیسہ کو۔

کالج سے گھر واپس لوٹی تو دل اسی طرح بوجھل تھا۔ گھر میں کسی نے اس کے چہرے پر بکھری اداسی کو قابلِ توجہ نہیں گردانا...... شام کو ضیغم دفتر سے گھر واپس آیا تو اس کی آنکھوں میں اداسی کے ڈورے اور لبوں پر سناٹا پا کر بھی اس نے التفات نہیں کیا۔ بھرے گھر میں وہ خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اماں کے گھر جانے کو جی چاہ رہا تھا مگر وہ ضیغم سے کہہ نہ سکی تھی۔ کچن اسے صدائیں دے رہا تھا۔ کچن میں جائے بنا چارہ نہ تھا۔ زندگی کتنی بدل گئی تھی ایک وہ وقت تھا کہ وہ کالج سے گھر واپس آتی تو اماں گھر کے برآمدے میں پڑی میز پر اس کے لیے کھانا گرم کر کے رکھ دیا کرتی تھیں۔ بیٹھی لکھ رہی ہوتی تو ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد کبھی چائے کے ساتھ بسکٹ کبھی نمک پارے، کبھی گھر میں تلے گرما گرم پکوڑے، کبھی پاپڑ، کبھی نمکو تو کبھی حسبِ موسم اس کی پسندیدہ فنگر فش پر چاٹ مسالا چھڑک کر اس کی میز کے ایک کنارے پر رکھ کر کبھی، کبھی خود بھی خاموشی سے دوسری کرسی پر بیٹھ جایا کرتی تھیں اور اسے کام کرتے دیکھنے لگتی تھیں۔ ''اتنا دماغی کام مت کیا کرو......'' کبھی آہستہ سے دلسوز لہجہ میں کہتیں۔ کوئی بہت اچھا جملہ مکمل لکھنا ضروری نہ ہوتا تو وہ لکھنا روک کر اماں کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ بھنی ہوئی سونف میں کترا ہوا کھوپرا، ثابت بادام، مصری اور ثابت سبز الائچی ملا کر اماں اس کی دماغی تقویت کا یہ سامان پلاسٹک کے ایک مرتبان میں اس کی لکھنے کی میز پر یوں موجود رکھتیں جیسے اسے دماغی اور ذہنی تقویت فراہم کرنے کا سامان مہیا کر رہی ہوں...... مائے نی مائے...... ماں کا نعم البدل کون ہو سکتا تھا بھلا......!

یہاں تو یہ عالم تھا کہ لکھنے بیٹھتی تو کوئی جھوٹوں بھی ایک پیالی چائے کو نہ پوچھتا بلکہ آدھی رات کو جب ضیغم کی کبھی ایک تو کبھی دوسری اور کبھی دونوں بہنیں اٹھی ممی، پاپا سے ملنے آ دھمکتیں تو ضیغم کی والدہ اسی کے کمرے پر دستک دے کر اسے بے وقت دھمکے مہمانوں کی آمد سے مطلع کرتیں اور اسے چار و ناچار گھر آئے مہمانوں کی خاطر مدارات کو اٹھنا پڑتا۔

☆☆☆

دو چار دن نہایت بے سکونی میں گزرے۔ انیسہ اندر ہی اندر کڑھتی رہی۔ ضیغم سے بات چیت بھی بس واجبی سی رہی۔ وہ بھی گھر والوں کے سامنے...... اپنے کمرے میں تو اسے چپ لگ جاتی۔ ضیغم کوئی بات کرتا

بھی تو ہوں، ہاں کر کے رہ جاتی۔ ضیغم کو اس کی ناراضی اور اپنی غلطی کا احساس تھا لیکن انکھیوں سے اس کی حرکات و سکنات دیکھے جاتا۔ تین چار دن گزرے تو وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"سنو......"

وہ بدستور اپنا کام کرتی رہی۔

"میں نے کچھ کہا ہے......" وہ بولا۔

انیسہ نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"منہ کیوں پھلا رکھا ہے؟"

وہ چپ رہی۔

اس نے انیسہ کے عقب سے اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔ "آئی ایم سوری......" اس نے کہا۔

انیسہ نے اس کے بازوؤں کے حصار سے نکلنے کی کوشش کی۔

"سوری یار......!"

انیسہ نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

"رئیلی سوری!"

انیسہ کا دل بھر آیا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔

"کیا ہوا؟"

"کیا نہیں ہوا۔" سسکیاں تھمیں تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"غصہ آ گیا تھا یار...... معاف کر دو......"

"مجھے اپنی اوقات تو پتا چل گئی۔" اس کی آواز میں رقت تھی۔

"کیا مطلب......!"

"معمولی گھر کی لڑکی جسے قسمت سے اچانک شہرت مل گئی...... اسے بڑے گھر کے لوگوں سے دب کر رہنا تھا...... شوہر اور سسرال والوں کے پاؤں کی جوتی بن کر۔"

"شٹ......!" ضیغم نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "منہ سے نکل گیا تھا...... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"کیا مطلب تھا کیا نہیں تھا...... میرا دل تو زخمی ہوا۔ ساری زندگی یہ احساس میرے ساتھ رہے گا کہ مجھ جیسی معمولی گھر کی لڑکی کو اس گھر میں بہو بنا کر کیوں لایا گیا۔"

"معاف کر دو مجھے......" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کر دیے۔

"مجھے کام کرنا ہے۔"

"تمہیں کب نہیں کرنا ہوتا۔" اس نے انیسہ کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ "آج نہیں کرنے دوں گا کام۔"

وہ اسے دیکھنے لگی۔

"کم آن...... اٹھو...... تمہارے گھر چلتے ہیں۔"

"میرا گھر اب نہ چاہتے ہوئے بھی یہی ہے۔"

"یار کیا سوچتے ہوں گے تمہارے اماں، ابا کہ کیسا داماد ہے ہماری بیٹی کو اتنے دن سے ہم سے ملوانے نہیں لایا...... اٹھو شاباش......"

"جب جانا ہوگا چلی جاؤں گی۔"

"ابھی چلو گی۔"

"زبردستی ہے۔"

"ہاں تم آسانی سے نہیں چلو گی تو زبردستی لے جاؤں گا تمہیں۔"

"پھر طعنہ بھی دیں گے کہ جو کماتی ہو اماں، ابا کو بھر آتی ہو۔"

"سوری کہہ تو دیا...... اب اٹھ جاؤ فوراً۔"

دل تو اس کا بھی چاہ رہا تھا جانے کو۔ اماں دو دن سے فون کر رہی تھیں کہ آ کیوں نہیں رہیں۔ دوپہر کو ابا نے بھی فون کیا تھا کہ تمہاری ماں یاد کر رہی ہیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

"طبیعت تو ٹھیک رہی ناں تمہاری......؟" اماں نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے قدرے تشویش سے پوچھا۔

"الحمد للہ......!" اس نے اماں کو مطمئن کرنے کے لیے مسکرانے کی کوشش کی۔

"لگتی تو نہیں......" اماں کی تشویش رفع نہ ہوئی۔

"کیوں؟" وہ دھیرے سے ہنسی۔

"چہرہ اترا، اترا ہے۔"

"آپ کا وہم ہے...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اللہ ٹھیک ہی رکھے...... کام زیادہ کر رہی ہو گی...... تھکن سے بھی آدمی کا چہرہ جھٹک جاتا ہے۔"

"ہاں، اماں کام تو ہے...... کالج پھر لکھنا۔"

"اب کا ہے کو جان کھپاتی ہو...... لکھنے کا شوق تھا تمہیں...... تم نے اپنا شوق پورا کر لیا بس......"

اماں جسے شوق کہہ رہی تھیں وہ تو عشق بن گیا تھا۔ شاید وہ ملازمت کو خیر باد کہہ کر بیٹھ سکتی تھی مگر لکھے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ ضیغم کی دل دکھانے والی باتوں کے بعد قلم ہی تو تھا جس نے سچے دوست کی طرح اس کی دلداری کی تھی کو وقت کم کرنے کے لیے وہ لکھتی رہی تھی۔ قلم اس کا دافع، اس کی طاقت بن گیا تھا۔ عفت جمیل بھی جو عام حالات میں ساس بنی رہتی تھیں اپنے حلقۂ احباب میں اسے بڑے فخر سے متعارف کراتیں۔

"یہ ہماری چھوٹی بہو...... ٹیلی پلے رائٹر انیسہ احتشام۔" عفت جمیل کے احباب اس سے نہایت اشتیاق سے ملتے۔

"بھئی آپ بہت کمال کا لکھتی ہیں۔" اس کی تحریروں کا ذکر چھڑ جاتا۔ کہانی، کرداروں اور مکالمات کی تعریف ہونے لگتی۔ عفت جمیل پھولے نہ سماتیں اور انیسہ نہایت عجز کا مظاہرہ کرتی۔

امینہ خوش تھی۔ اس کی سسرال کوئی ہائی فائی گھرانا نہیں تھا مگر شوہر، ساس، سسر، نندیں سب نہایت خیال رکھنے والے لوگ تھے۔ لڑکی اپنے گھر میں خوش ہو تو میکا اسے کم ہی یاد آتا ہے سو امینہ کم ہی میکے آتی سسرال میں مگن رہتی۔ انیسہ سے بھی کم ملاقات ہوتی۔ موبائل فون آدھی ملاقات کا ذریعہ بنا رہتا بلکہ ویڈیو کال کے ذریعے کبھی، کبھی پوری ملاقات کا بھی۔ شادی کے چوتھے برس اس کے ہاں فیملی میں اضافے کی امید بندھی تھی۔ اماں بہت خوش تھیں۔ ابا جن کی ریٹائرمنٹ کا زمانہ اب قریب ہی تھا دفتر چلے جاتے۔ اماں آنے والے مہمان کی ضرورت کے چھوٹے، چھوٹے کپڑے سینے میں لگی رہتیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد رہائش کے لیے ابا نے شہر کے ایک دور افتادہ رہائشی علاقے میں دو کمروں کا ایک فلیٹ بک کرا رکھا تھا جس کی قسطیں باقاعدگی سے ادا کر رہے تھے۔ امید تھی کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے سے قبل فلیٹ کا قبضہ مل جائے گا۔

امینہ کے بعد اب اماں کو انیسہ کی فکر لگی تھی۔ ہر ماں اپنی اولاد کو بھی صاحب اولاد دیکھنے کی متمنی ہوتی ہے۔

"اللہ مجھے انیسہ کے ہاں بھی خوشی دکھائے۔" اماں کہتیں۔

"ان شاء اللہ دیکھو گی......" ابا تسلی دیتے۔

"انیسہ کے سسرال والے اچھے لوگ ہیں۔" اماں انیسہ سے ملی معلومات کی بنیاد پر کہتیں۔ اس کی سسرال تو ان کا کم ہی جانا ہوتا تھا

"اچھے نہیں...... بہت اچھے...... قسمت سے مل گیا ایسا گھرانہ ورنہ ہماری کیا حیثیت تھی...... آدمی کو اپنی سوچ اونچی رکھنی چاہیے۔ اللہ بھی بندے کی لگن دیکھتا اور اس کی دعا سنتا ہے...... اس مولوی کے بیٹے سے جو اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا انیسہ کی شادی کر دیتے تو کیا اتنی مطمئن زندگی گزار سکتی تھی وہ وہاں...... الحمدللہ ڈیفنس میں رہتی ہے۔ افسروں کو بتاتا ہوں کہ بیٹی کی ساس اتنی بڑی سرکاری افسر ہیں تو وہ یوں میرا منہ دیکھنے لگتے ہیں جیسے میں مذاق کر رہا ہوں یا پھر جھوٹ بول رہا ہوں۔"

"اللہ میری بچیوں کو سکھی رکھے...... شاد آباد رہیں...... کوئی دکھ کبھی ان کے قریب بھی نہ پھٹکے۔" اماں تہ دل سے دعا مانگتیں۔

امینہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔

انیسہ کو زندگی میں پہلی بار نئے رشتوں کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اس سے پہلے اس کی زندگی میں تین رشتے ہی اہم تھے۔ اماں، ابا اور بہن...... اور یہ رشتے دنیائے رنگ و بو میں اس کی آنکھ کھلنے سے پہلے ہی اس کی زندگی میں موجود تھے۔ اب جو نیا شگوفہ پھوٹا تو اس کی روح

سرشار ہوگئی..... خالہ بننا اس کے لیے حیات کا ایک نیا تجربہ تھا..... امینہ کے بیڈ کے نزدیک پنگوڑے میں لیٹے ننھے منے وجود کو وہ کتنی ہی دیر اشتیاق سے دیکھتی رہی۔ گلابی جلد، چھوٹے، چھوٹے ہاتھ، ننھی منی انگلیاں اور منی منی آنکھوں کے متورم پپوٹے۔ اس کے سینے میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اس نے ضیغم کو دیکھا۔ ضیغم کی آنکھوں میں معنی خیزی تھی۔ سفید بستر پر لیٹی امینہ نہایت مسرور، مغرور اور مکمل نظر آتی تھی۔

''انیسہ نام آپ تجویز کریں گی۔'' امینہ کے شوہر نے کہا۔

''ضرور..... لیکن..... اگر دادا، دادی کریں تو زیادہ بہتر ہوگا فرحان بھائی۔'' انیسہ بولی۔

''چلیے ایک نام آپ تجویز کریں ایک دادا، دادی سے پوچھ لیتے ہیں۔ دونوں کو ملا کر ایک نام رکھ لیں گے۔'' امینہ کا شوہر بھی بیٹے کی پیدائش سے بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔

''اور ان دو ناموں کے ساتھ آپ کا نام بھی ضرور لگے گا۔'' ضیغم مسکرایا۔

''ظاہر ہے۔''

دادا نے پوتے کا نام مصطفیٰ تجویز کیا۔ انیسہ کو لڑکوں کے لیے علی پسندیدہ تھا۔ یوں امینہ کے نومولود بیٹے کا نام مصطفیٰ علی فرحان رکھ دیا گیا۔

''اپنے بیٹے کا نام تم کیا رکھو گی.....؟'' ضیغم نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آیان.....!'' اس نے جواب دینے میں دیر نہیں کی۔

''مجھ سے مشورہ کیے بغیر۔'' ضیغم جو بستر پہ نیم دراز تھا۔ سیدھا ہو بیٹھا اور اسے معترض نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ایک نام آپ بھی بتا دیں دونوں ملا کر رکھ لیں گے۔''

''دادا، دادی کو حق نہیں دو گی؟''

''میں اپنے حق سے دستبردار ہو جاتی ہوں ورنہ آخر میں آپ کا نام بھی شامل کر کے چار ناموں کا ایک نام بنانا پڑے گا۔''

''کیا یاد کرو گی، میں دستبردار ہو جاتا ہوں اپنے حق سے۔''

انیسہ محسوس کر رہی تھی اس ناگواری کے بعد ضیغم اس کے ساتھ خاصا بامروت ہو گیا تھا۔ تعلقات معمول پر آنے بلکہ پہلے سے بھی بہتر ہو جانے پر ایک روز انیسہ نے اماں کو اعتماد میں لے کر بتا دیا۔ کسی کو تو ہمراز بنانا ہی تھا۔ اماں سے بہتر ہمراز کون ہو سکتا تھا۔ اماں پہلے تو رنجیدہ ہوئیں پھر فکر مند ہو گئیں۔ پھر دلسوزی سے بولیں

''بیٹا! رہنا تو تمہیں اب اسی گھر میں ہے اور زندگی بھی اسی شخص کے ساتھ گزارنی ہے۔ جیسے وہ چاہتا ہے ویسے ہی کر دو تا کہ اسے آئندہ شکایت کا موقع نہ ملے۔''

''یعنی جو کماؤں اس کے ہاتھ میں دے دوں یا پھر حساب کتاب دوں اسے۔''

''اگر وہ ایسا ہی چاہتا ہے۔ اسی میں خوشی ہے تو کیا حرج ہے۔'' اماں نے دلسوزی سے اسے دیکھا۔

''اور کہاں لے جانا ہے میں نے یا کس کو دینا ہے جو میرا ہے اسی کا ہوگا اماں لیکن مجھے اس کی بات اچھی نہیں لگی۔''

''اچھی لگے یا نہ لگے..... اب وہی کر جو وہ چاہے۔''

''اس کا مطلب ہے میری تو کوئی حیثیت، کوئی اہمیت، کچھ اختیار ہی نہیں ہوا۔''

''عورت کے اختیار میں کیا ہوتا ہے بیٹا..... اسے تو مرد کے اشاروں پر چلنا اور اسی کے رحم و کرم پر جینا ہوتا ہے..... میں بھی تمہارے ابا کی مرضی کے خلاف چل سکی۔''

''آپ کا زمانہ اور تھا اماں..... عورت کو اپنے حقوق کا شعور نہیں تھا۔'' وہ جارحانہ لہجے میں بولی۔

''ارے بیٹا کتنا ہی شعور آ جائے دنیا مرد ہی کی ہے..... بلکہ سچ پوچھو تو زندگی بھی مرد ہی کی ہے۔ ہم عورتیں تو مرد کی زندگی جیتی ہیں..... عورت کو صبر سے کام لینا پڑتا ہے تب کہیں جا کے وہ سکون سے رہ پاتی

ہے۔ ذرا بے صبری دکھائی اور زندگی برباد......"
"عجیب ماں ہیں آپ......"
"کیوں......؟ عجیب کی کیا بات ......" اماں دھیرے سے بولیں۔
"آج کل کی مائیں تو بیٹوں کو ترغیب دیتی ہیں کہ میاں ایک کہے تو تم دو سناؤ...... سسرال والوں کو جوتے کی نوک پر رکھو۔"
"ایسی تربیت کا انجام کیا ہوتا ہے۔"
"شوہر کے سر پر چڑھ کر رہتی ہیں اور سسرال والوں کو پیروں تلے دبا کر رکھتی ہیں۔"
"اور جو شوہر سر کو جھٹکا دے تو اوندھے منہ گر بھی پڑتی ہیں۔ سسرال والے ٹھوکر پر لے آتے ہیں۔"
"ایک بات کہوں؟" اس نے اماں کو نہایت محبت اور احترام سے دیکھا۔
"کہو......"
"ہیں تو آپ سادہ سی گھریلو عورت مگر آپ کی بصیرت اور فراست کے سامنے میرا سارا علم، ساری عقل اور وہ جملے بازی جس پر میرے ڈراما دیکھنے والے تعریفوں کے پل باندھ دیتے ہیں گٹوں میں منہ چھپا کر بیٹھ جاتے ہیں۔"
"ارے نہیں بیٹا، آج کل کی لڑکیاں ہم پرانی عورتوں سے زیادہ سمجھدار اور عقل مند ہیں۔"
"بس نام کی سمجھدار اور عقل مند...... جو بات آپ جیسی پرانی عورتوں میں ہے، وہ ہم میں کہاں اماں...... ہم تو بس بڑھ، بڑھ کر بولنا جانتی ہیں یا شور مچاتی ہیں...... اچھا سنیں...... ابا کو مت بتایئے گا۔"
"کیا......؟ کیا نہ بتاؤں......؟"
"یہی سب کچھ جو میں نے آپ کو بتایا ہے...... ضیغم کی باتیں......"
"ضرور بتاؤں گی۔"
انیسہ نے چونک کر اماں کو دیکھا۔
"مرد سے بات چھپا کر عورت فائدے میں کب رہتی ہے...... میں نے اپنی زندگی میں کوئی بات تمہارے ابا سے راز نہیں رکھی...... مرد کو بتانا ضروری ہوتا ہے۔ راستہ اسی نے نکالنا ہوتا ہے بیٹا۔"
"آپ کی باتوں سے مجھے لکھنے کے لیے بڑے اچھے، اچھے آئیڈیاز ملتے ہیں اماں......" انیسہ فرطِ محبت سے اماں سے لپٹ گئی...... اماں اسے پیار کرنے لگیں۔

☆☆☆

اماں کے برعکس ابا نے انیسہ کو شہ دی۔
"کوئی ضرورت نہیں تمہیں اس سے یا اس کے گھر والوں سے دبنے کی...... پڑھی لکھی ہو...... اپنے

پیروں پر کھڑی ہو..... اپنا کماتی ہو، کسی کی محتاج نہیں..... کہو تو میں بات کروں ضیغم سے۔"

"نہیں، نہیں ابا....." وہ گھبرا کر بولی۔ "اب تو سب کچھ ٹھیک ہے۔"

"تعلیم یافتہ بیٹی دی ہے ہم نے انہیں..... جس کے نام سے ساری دنیا واقف ہے..... ساس تمہاری سرکاری افسر سہی مگر بڑی بی کو کون جانتا ہے۔ کتنی دنیا ان کے نام سے واقف ہے..... تمہاری شہرت تو یہاں سے دبئی، انگلینڈ، امریکا، کینیڈا تک ہے..... جہاں، جہاں تمہارے ڈرامے دیکھے جاتے ہیں لوگ تم سے..... تمہارے نام سے واقف ہیں۔"

"کیا الٹا سبق پڑھا رہے ہیں اسے....." اماں نے مداخلت کی۔ "شہرت میں کچھ نہیں رکھا..... لڑکی کی پہچان اس کا گھر، اس کا شوہر ہوتا ہے۔"

"ضیغم کی مجال کیسے ہوئی کہ وہ ہماری بیٹی کو معمولی گھر کی لڑکی ہونے کا طعنہ دے۔" ابا غصے میں دے۔

"ہاں تو کیا ہوا..... غلط تو نہیں..... ہمارا گھرانا معمولی ہی تو ہے۔"

"اس کی یہ مجال کہ وہ اس سے اس کی آمدنی کا حساب کتاب پوچھے۔"

"کوئی، کوئی شریف النفس ہوتا ہے جو نہیں پوچھتا۔ زیادہ تر ایسے ہی ہوتے ہیں..... آپ نہیں لیتے کیا مجھ سے گھر کے سودا سلف کا حساب کتاب۔"

"دیتا بھی تو ہوں....."

"وہ بھی دیتا ہوگا۔"

"کیوں انیسہ دیتا ہے تمہیں وہ کچھ؟" ابا کا روئے سخن انیسہ کی طرف تھا۔

اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"سن لو....."

"ائے ہئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔"

"سال تو ہونے کو آ گیا۔"

"ابا پلیز، آپ ضیغم سے کچھ نہ کہیے گا..... وہ سمجھیں گے میں نے شکایت کی ہے۔"

"سمجھنے دو..... تم کوئی گری پڑی نہیں ہو۔"

"عورت کو شوہر سے دب کر ہی رہنا پڑتا ہے....." اماں بولیں۔

"اپنی اماں کی باتوں پر کان مت دھرو..... تم کوئی جاہل لڑکی نہیں ہو..... ڈٹ کر رہو....."

"جی ابا..... ٹھیک ہے..... مگر پلیز آپ ضیغم سے کچھ مت کہیے گا۔"

"اس دفعہ تو تمہارے کہنے سے معاف کرتا ہوں لیکن اگر آئندہ اس نے ایسی کوئی بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" ابا لال پیلے ہو رہے تھے۔ انیسہ نے سوچ لیا آئندہ سسرال کی کوئی ایسی ویسی بات ابا کے کانوں تک نہیں پہنچنے دے گی۔

"تمہارے ابا یہ نہیں سوچتے کہ کبھی، کبھی ذرا سی بات پر بیٹیوں کے گھر بگڑ جاتے ہیں۔ بیٹی اور اس کے گھر والوں کو بہت سوچ سمجھ کر چلنا پڑتا ہے۔" ابا سے علیحدگی میں اماں اس سے بولیں۔

"اماں کوشش تو یہی ہے کہ مجھ سے کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔"

"میں تمہاری بات نہیں کر رہی بیٹا..... تمہارے صبر اور برداشت کا تو مجھ سے بہتر اندازہ کسے ہوگا بھلا..... بچپن میں جب تم بیمار ہوتی تھیں تو مجال تھی کہ ذرا ہائے وائے کرتیں۔ آنکھیں بند کیے چپ پڑی رہتی تھیں۔ ہاں امینہ اپنی ذرا سی تکلیف پر میرے ہاتھ پاؤں پھلا دیتی تھی..... ہائے اماں میں مر رہی ہوں..... اماں میرا سر بہت دکھ رہا ہے..... اماں میں مر گئی میری کمر دبا دیں..... مجھے پانی پلا دیں..... چادر اوڑھا دیں..... توبہ، توبہ بہت ہی چھوٹے دل کی ہے امینہ..... میری صبر والی بچی تو بس ایک تم ہی ہو۔"

"صبر کا بڑا فائدہ ہوتا ہے اماں....."

"ہاں..... بس ایک ہی آدمی جھیلتا ہے باقی مزے میں رہتے ہیں۔" اماں دلسوزی سے بولیں۔

☆☆☆

انیسہ امید سے ہو گئی۔

کام بدستور تھے۔ کالج، گھر داری اور اس کا عشق...... لکھنا......!

ساس اور جیٹھانیوں کے رویئے سے تو لگتا تھا وہ خود اس مرحلے سے کبھی گزری ہی نہیں تھیں۔ رات کو کھانا بدستور اسی کے ذمے لگا ہوا تھا۔ ضیغم بھی عجیب آدمی تھا کچھ نہ بولتا بلکہ ہوائیوں کہ اس بار جب اس نے نئی سیریل لکھنے کا معاہدہ سائن کیا تو وہ سامنے آ کھڑا ہوا۔

''کتنے میں سائن کی ہے تم نے یہ سیریل؟''

وہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو...... پیسے بتاؤ...... شوہر ہوں تمہارا...... مجھے تمہاری ہر بات معلوم ہونی چاہیے یار......'' اس کا لہجہ دوستانہ تھا۔

''آپ کو پیسوں کی ضرورت ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''پیسوں کی ضرورت کسے نہیں ہوتی۔'' وہ مسکرایا۔

''آپ کی ضرورت کتنی ہے؟''

''گاڑی بدلنا چاہ رہا ہوں...... نو، دس تک یہ والی چلی جائے گی...... زیرو میٹر کے لیے کم سے کم اتنے ہی اور...... قسطوں پر ممی لینے نہیں دیتیں کہ قرضہ بھی چڑھتا ہے اور سود کی لعنت الگ......''

''ٹھیک تو کہتی ہیں وہ...... مل جائیں گے آپ کو پیسے۔''

''تھینک یو...... آئی فیل سو لکی ایمہ کہ مجھے تم جیسی بیوی ملی ہے۔'' ایمہ کو اپنے جبڑے بھنچے محسوس ہوئے۔

بے اختیار اسامہ یاد آ گیا۔

یونیورسٹی کیفے ٹیریا میں وہ جب بھی اکٹھے جائے پیتے بل کی ادائیگی کے لیے اسامہ اس کے بیگ کھولنے سے قبل ہی اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اسے آنکھوں کے اشارے سے سمجھا دیا کرتا تھا کہ ادائیگی وہ خود کرے گا۔ کئی مرتبہ اس نے کہا بھی کہ اسے ہمیشہ اس کے پیسوں سے کھانا پینا اچھا نہیں لگتا۔ جواب میں کبھی وہ کہتا۔

''کوئی بات نہیں...... تم پیسے دو یا میں ایک ہی بات ہے......'' کبھی وہ کچھ اور کہتا۔ ایک روز بولا۔ ''جو مرد، عورتوں کے پرس پر نظر رکھتے ہیں کمزور ہوتے ہیں ایمہ......''

کسی اور کو بتائے بغیر ایمہ نے ضیغم کی مطلوبہ رقم اپنے بینک اکاؤنٹ سے اس کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی۔ پرانی گاڑی کی جگہ نئی گاڑی آ گئی۔ اس نے ابا کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی کہ نئی گاڑی خریدنے کے لیے ضیغم کو رقم اس نے فراہم کی تھی۔ اماں کو البتہ بتا دیا مگر راز داری کے وعدے پر...... اماں اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''بیچاری عورت اپنی جمع پونجی اور کہاں لے جاتی ہے اپنے گھر پر ہی لگا دیتی ہے...... تمہارے ابا مجھے جو پیسے دیتے تھے جو جمع پونجی گھر ہی میں لگا دیتی کبھی گرائنڈر لے آئی کبھی جوسر، کبھی واشنگ مشین منگوالی، کبھی پرانے صوفے، کباڑیے کو دے کر نئے صوفے ڈلوا لیے، آج تک یہی حال ہے...... گھر میں اب جو ضرورت کی ہر چیز موجود ہے تنکا، تنکا جوڑ کر آشیانہ بنایا ہے...... وہ مرد بیوقوف ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ عورت اپنے گھر کے بجائے کسی دوسرے کا گھر سنوارنے کا سوچے گی۔''

''ویسے اماں ہوتی تو ضرور ہوں گی ایسی عورتیں بھی جو اپنا گھر سنوارنے کے بجائے دوسروں کی فکر رکھتی ہوں گی۔''

''دیکھو بیٹا اگر وسائل اجازت دیں تو شادی شدہ لڑکی کا بھی اپنے ماں، باپ بہن، بھائیوں اور عزیز و اقارب کو بشرط ان کی ضرورت یا مجبوری دینا کوئی عیب یا گناہ کی بات نہیں مگر بلا سبب اپنے گھر کے بجائے دوسروں کو بھرنا تو بے عقلی ہے...... پہلے خویش پھر درویش......''

☆☆☆

ماں بننا ایمہ کے لیے بے بہا تجربہ حیات ثابت ہوا۔ اپنے وجود سے جنم لینے والی نئی زندگی کی پہلی صدا کان میں پڑتے ہی وہ ناقابلِ بیان مسرت کے احساس میں ڈوب گئی۔ اسے پہلی بار دیکھا تو لگا اس سے زیادہ قوی، مستحکم اور بے ریا رشتہ دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں اماں تھیں مگر یچی اور راز کی بات یہ تھی کہ وہ بھی اسے کبھی، کبھی اپنے اور امینہ کے درمیان بٹی

ہوئی دکھنے لگتی تھیں۔ مگر یہ ننھا وجود تو اسے پورے کا پورا اپنا ہی لگتا تھا۔ اسے اپنی بانہوں میں لے کر وہ جتنی دیر چاہے اپنے سینے سے لگائے رکھ سکتی تھی۔ اس سے سرگوشی میں باتیں کر سکتی تھی۔ اس سے اپنے دل کا حال کہہ سکتی تھی۔ اسے اپنے سینے سے لگا کر اس کے ننھے سے دل کی دھڑکن میں اپنے دل کی دھڑکن مدغم کر سکتی تھی۔ عجیب تھا یہ رشتہ......!

زچگی کی رخصت ختم ہوئی تو ننھے آیان کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جانا دل شکن محسوس ہوا مگر کوئی اور چارہ ہی نہیں تھا۔ ''بڑی بھابی پلیز! آیان کا خیال رکھیے گا۔'' وہ جیٹھانیوں کی خوشامد کر کے جاتی۔

''چھوٹی بھابی نیپی چینج کر دیجیے گا اس کی...... بہت مہربانی ہوگی۔'' کالج سے بار، بار فون کرتی، کبھی ایک جیٹھانی کو کبھی دوسری کو کبھی گھریلو ملازم کو۔

''آیان رو تو نہیں رہا؟''

آیان کی فکر اس کے دل کو دبوچے رکھتی۔ جی چاہتا ملازمت چھوڑ چھاڑ آیان کی پرورش کو گھر بیٹھ جائے۔

''انیسہ تو کالج سے تمام وقت آیان کے لیے فون کھڑکائے رکھتی ہیں۔'' جیٹھانیاں چپکے، چپکے ساس کے کان بھرتیں۔

''ہم نے ملازمت کے ساتھ بچے نہیں پالے ہیں کیا...... صبح کے گئے شام ہی کو بچوں کو دیکھ پاتے تھے۔'' عفت جمیل معترض ہوتیں۔

''یہ تو تین سوا تین بجے آ جاتی ہیں پھر بھی کبھی ہم دونوں میں سے کسی کو فون کبھی نوکروں کو فون......''

''لوئر مڈل کلاس کی پرابلم یہی ہے...... ذرا اوقات سے بڑھ کر ملے تو بہت پھیل جاتی ہے۔'' ساس کی بات پر جیٹھانیاں زیرِ لب مسکراتیں۔

اماں کی زندگی کے تجربات سے اخذ شدہ بہت سے نتائج کی طرح یہ نتیجہ بھی کتنا درست تھا کہ اکثر اوقات دیورانیاں، جیٹھانیاں تو ساس، نندوں سے بھی بڑھ کر بدخواہ ثابت ہوتی ہیں۔

شام سے رات تک امورِ خانہ داری انجام دیتے ہوئے بھی انیسہ کا دھیان آیان کی طرف بھٹکتا رہتا۔ بار، بار وہ اپنے کمرے کا چکر لگاتی اور آیان کو دیکھتی۔ آیان میں تو جیسے اس کی جان اٹک گئی تھی البتہ شام کو گھر میں ضیغم کی موجودگی سے اسے آیان کی طرف سے دن کی نسبت بہرحال کچھ تسلی رہتی۔ رات کو لکھنے بیٹھتی تو بار، بار اٹھ کر آیان کو دیکھتی رہتی۔ آیان روتا تو وہ بے چین ہو جاتی۔ بیمار پڑتا تو اس کی جان پر بن جاتی۔ اسے اپنی آغوش کی گرمی دینے کو وہ رات، رات بھر بیٹھی رہتی۔ بازار جاتی تو اس کے لیے نت نئے کپڑے اور رنگ برنگ کھلونے خرید لاتی۔ آیان اس کی زندگی کی سب سے قیمتی متاع بن گیا تھا۔

''آیان کو میرا رقیب بنائے دے رہی ہو تم۔'' ضیغم ایک روز بولا۔

''کیا مطلب......!'' وہ چونکی۔

''اس کے سامنے تو میں تمہیں جیسے دکھائی ہی نہیں دیتا۔'' وہ مسکرا دی۔

بات تو سچ تھی۔ آیان کے مقابلے میں اسے واقعی ہر شے ہیچ دکھائی دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کی ایک سیریل ایک بڑے ایوارڈ کے لیے منتخب تین بہترین تحریروں میں سے ایک ٹھہری اور اسے ایوارڈ شو میں شرکت کے لیے دبئی جانے کی دعوت ملی تو اس نے معذرت کر لی اور حسنِ اتفاق ایوارڈ اسی کے نام ہوا۔ ایوارڈ کا لائیو شو وہ سب کے ساتھ بیٹھی دیکھ رہی تھی۔

''چلی جاتیں تو اس وقت پروڈیوسر کے بجائے تم خود اپنا ایوارڈ وصول کر رہی ہوتیں۔'' ضیغم نے کہا۔

''کوئی بات نہیں......'' انیسہ جو آیان کو اپنی آغوش میں دبکائے بیٹھی تھی بغیر کسی پچھتاوے کے بولی۔

''غالب مرحوم تمہاری بیگم ہی کے لیے تو یہ شعر کہہ گئے ہیں ضیغم۔'' عفت جمیل کا لہجہ گہرے طنز میں بجھا تھا۔

''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی''

عفت جمیل کا کہنا تا سمجھ بچوں کے تو سر سے گزر گیا البتہ جو عفت جمیل کے طنز کو پا گئے وہ ہنس کر انیسہ کو

دیکھنے لگے۔ ساس کا طنزیہ لہجہ انیسہ کو پہلے ہی پہلو بدلنے پر مجبور کر چکا تھا۔

''کچھ لوگ شہرت پر مرتے ہیں کچھ پیسے پر جان دیتے ہیں مگر ضیغم تمہاری بیگم تو ایک معما ہیں نہ شہرت سے سروکار ہے انہیں نہ ہی ہم نے انہیں پیسہ انجوائے کرتے دیکھا آج تک۔'' عفت جمیل گویا بھری بیٹھی تھیں۔ استہزائیہ لہجہ میں مزید کہا۔ انیسہ دم بخود تھی۔

''کیوں انیسہ پھر کس لیے لکھتی ہو؟'' عفت جمیل کا روئے سخن اب براہ راست انیسہ کی طرف تھا۔

تمام سسرال کی موجودگی میں عفت جمیل کے تابڑ توڑ لفظی حملوں سے انیسہ کا رواں، رواں سنگ اٹھا تھا۔

''اپنی تسکین کے لیے ممی......'' اس نے کہا۔

''اوہ...... آج پہلی بار پتا چلا کہ اپنی تسکین کے لیے بھی لکھا جاتا ہے۔'' عفت جمیل کو غالباً انیسہ سے جواب کی توقع نہ تھی۔ سو اُن کی نگاہوں اور لہجے دونوں میں ناگواری جھلکی۔

''ممی! تخلیقی کام کوئی بھی ہو...... تخلیق کار کے لیے اپنی تسکین اولین ترجیح ہوتی ہے...... میں بھی اس سے ماورا نہیں۔'' انیسہ نے دھیمے لہجے میں بات کی۔

عفت جمیل نے گردن گھما کر انیسہ کو تیکھی نظروں سے دیکھا پھر اپنی بڑی اور منجھلی بہوؤں کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے انیسہ سے زہر بھرے لہجے میں بولیں۔

''یہ دونوں تم سے بڑی ہیں، آج تک مجال نہیں ہوئی، ان کی کہ مجھے کسی بات پر جواب دیں۔ یا بحث میں الجھیں۔''

''سوری ممی! میری بھی یہ مجال نہیں کہ میں آپ کو خدانخواستہ جواب دوں یا بحث میں الجھوں......'' انیسہ شرمندہ ہوگئی۔

''اور جواب دینا کسے کہتے ہیں......'' عفت جمیل کی ابروئیں تن گئیں۔ ٹیلیویژن کے سامنے بیٹھے تمام اہلِ خانہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

''بھئی بیگم، انیسہ نے تو ایک بات کہی تھی تم نے خواہ مخواہ اپنے دل پر لے لیا۔'' انیسہ کے سسر نے جو بیگم کی تنک مزاجی کے خوگر تھے معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔

''آپ چپ رہیں۔'' عفت جمیل نے انہیں ڈانٹا۔ وہ کان دبا کر رہ گئے۔

''ممی سے سوری کرو انیسہ......'' ضیغم بولا۔

''کہہ تو دیا ہے سوری......'' انیسہ جو ضیغم کے دونوں بھائیوں، بھاوجوں اور ان کے بچوں کی موجودگی میں اپنی توہین و تضحیک سے زمین میں گڑی جا رہی تھی بہ مشکل اپنی رقت پر قابو پاتے ہوئے گھٹی، گھٹی آواز میں بولی پھر اس نے عفت جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ کہا۔ ''سوری......''

عفت جمیل تنتاتی ہوئی اٹھیں اور لاؤنج سے چلی گئیں۔ جمیل صاحب نے نظریں جھکا لیں اور باقی سب انیسہ کو یوں دیکھنے لگے جیسے اس سے کوئی ناقابل معافی جرم سرزد ہو گیا ہو۔ اپنے آنسو پیتی، آیان کو اپنی گود میں لیے وہ بھی اٹھی اور اپنے کمرے میں آگئی۔

ضیغم کافی دیر بعد اس وقت کمرے میں آیا جب وہ اس شدید ذہنی بھونچال پر قابو پا کر صدمے سے رنج کی کیفیت میں آچکی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے ضیغم کو دیکھا۔ اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ چند ثانیے وہ بیڈ کے کنارے پر خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے بستر کے سرہانے سے دونوں تکیے اٹھا کر پوری قوت سے فرش پر بچھے قالین پر پھینک دیے۔ بستر کی چادر کھینچی اور اسے بھی قالین پر پٹخ دیا۔ بیڈ روم چیئر کو زور سے لات مار کر الٹ دیا۔ بیڈ سائڈ بورڈ پر رکھے تصویری فریم بیڈ پر بچھے گدے پر اچھالے اور کمرے میں موجود فرنیچر کو خواہ مخواہ ٹھوکریں مارنے لگا۔ انیسہ چپ چاپ دیکھتی رہی۔

''شٹ......'' وہ زور سے پھنکارا۔

''کسے کہہ رہے ہیں؟'' انیسہ کو مزید برداشت کرنا بزدلی لگی۔

''تمہیں اور کسے......'' وہ غرایا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ تم اسی لائق ہو۔''

"کیا، کیا ہے میں نے؟"
"تم اپنی اوقات بھول گئی ہو۔" وہ اس کے روبرو آ کھڑا ہوا اور اس کے دونوں شانوں کو اتنی قوت سے دبوچ کر کہ انیسہ سسکی بھرنے پر مجبور ہو گئی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔
"معمولی گھر کی لڑکی......!" انیسہ نے گھائل لہجے میں کہا۔
"ہاں......اس میں کیا شک ہے......دو کمروں کے معمولی مکان سے اٹھ کر ڈیفنس کی اس عالیشان کوٹھی میں آ کر تمہارے دماغ ہی زیادہ خراب ہو گئے ہیں۔ عزت تم سے ہضم نہیں ہو پا رہی...... میری ماں نے غلطی کی جو میرے بھائیوں کی طرح میرے لیے بھی کسی اچھے گھرانے کی لڑکی لانے کے بجائے تمہارا انتخاب کیا...... تمہیں تو اپنے باپ کی طرح کوئی کلرک، اسسٹنٹ یا مکینک ملنا چاہیے تھا...... چلی جاؤ...... دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"
انیسہ شدید صدمے اور رنج سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ چھوٹی سی بات کا ماں اور بیٹے نے کتنا لمبا فسانہ بنا دیا تھا۔
"چھوٹی سی بات کا......آپ لوگ کتنا بڑا بتنگڑ بنا رہے ہیں۔" انیسہ کی آواز بھرا رہی تھی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔
"لوگ......!" وہ بھڑکا۔ "کسے کہہ رہی ہو لوگ؟"
"آپ کو اور......"
"اور......؟"
"آپ کی والدہ کو......"
ضیغم کا ہاتھ اوپر اٹھا اور آنِ واحد میں پوری قوت سے انیسہ کے رخسار پر آ پڑا۔
اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامتی وہ بے دم سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کتنی ہی دیر وہ رنج و ملال میں ڈوبی بیٹھی رہی۔ رات نہ ہوتی، دن ہوتا اور اس کا میکا، سسرال کے گھر سے بہت دور شہر کے دور افتادہ علاقے میں واقع ہونے کے بجائے آس پاس ہی کہیں ہوتا تو وہ آیان کو اپنی گود میں اٹھا کر اسی وقت اس گھر سے نکل گئی ہوتی۔ اس کی اتنی توہین اور ذلت کے بعد ضیغم اور اس کے گھر والوں سے کچھ تو بات ہونی چاہیے تھی۔ ابھی تو آغازِ سفر تھا۔ اماں، ابا اس کی پشت پناہی کو موجود تھے آگے نہ جانے کیا حالات ہونے تھے۔
کاش! ابا کو کوئی پہلے ہی سمجھا سکتا کہ بڑے گھروں میں کبھی کبھی بونے بھی رہتے ہوتے ہیں۔

☆☆☆

صبح، پہلے تو اس کا جی چاہا کسی کو بتائے بغیر آیان کو لے کر خاموشی سے اس گھر سے نکل جائے لیکن پھر اس نے "بونوں" کو اپنے معمولی پن کا اندازہ کرا کے جانے کا فیصلہ کیا۔ کالج وین ڈرائیور کو اس نے فون کر کے کہہ دیا کہ وہ دو دن چھٹی پر رہے گی۔ اسے لینے کے لیے نہ آئے۔ اہلِ خانہ ناشتے کی میز پر تھے۔ وہ آیان کو سینہ سے لگائے ان کے سامنے پہنچی اور اس نے کہا۔
"میں جا رہی ہوں۔" سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ سوائے عفت جمیل کے جنہوں نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔
"کہاں......؟" سسر نے پوچھا۔
"اس معمولی گھر جہاں سے مجھے اس عالی شان مکان میں اس لیے لایا گیا تھا کہ اپنے والدین کی معمولی حیثیت مجھے کھاتی پیتی سسرال میں سر اٹھا.... کر جینے کی اجازت نہیں دے گی۔" انیسہ نے تلخی سے کہا۔
اب عفت جمیل نے ابرو تیکھی کر کے اسے دیکھا۔
"مگر میں سر اٹھا کر جینا چاہتی ہوں اس لیے جا رہی ہوں۔"
"بچہ ہمارا ہے یہیں رہے گا۔" عفت جمیل ابھرے ہوئے لہجے میں بولیں۔
"آیان کے لیے میں آخری حد تک جا سکتی ہوں۔"
"کون سی آخری حد......" عفت جمیل نے اسے استہزائیہ نظروں سے دیکھا اور ضیغم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے نزدیک آ کھڑا ہوا۔
"کیا بکواس ہے۔" وہ دانت بھینچ کر بولا اور

اس کا بازو قوت سے دبوچ کر غرایا۔ ''تم آیان کو لے کر کہیں نہیں جاؤ گی۔''

''آیان کے بغیر میں کہیں نہیں جا سکتی۔''

''تو شرافت سے بیٹھو گھر میں۔''

''گھر...... کس گھر کی بات کرتے ہیں آپ...... جہاں مجھے دوسرے درجے کا شہری بھی نہیں سمجھا جاتا۔ جہاں میری کوئی عزت، کوئی مرضی، کوئی اختیار نہیں...... ہاں لوگوں کے سامنے ایک شوپیس کے طور پر ضرور پیش کر دی جاتی ہوں۔''

''اسی کا زعم ہے تمہیں......'' عفت جمیل نے بپھر کر کہا۔

''جی نہیں...... زعم نہیں غم ہے...... کل میں نے اتنا ہی تو کہہ دیا تھا کہ میں اپنی تسکین کے لیے لکھتی ہوں، اتنی سی بات پر میرے خلاف پہاڑ کھڑا کر لیا گیا...... شوہر صاحب نے کمرا تتر بتر کر ڈالا...... مجھے مارنے سے بھی دریغ نہیں کیا...... میں مار کھانے کے لیے نہیں آئی تھی اس گھر میں...... میں نے اگر اس گھر اور گھر کے لوگوں کو احترام دیا تو مجھے بھی عزت ملنی چاہیے تھی۔''

''ارے بھئی! صبح، صبح یہ کیا ہنگامہ ہو رہا ہے گھر میں۔'' جمیل صاحب نے برا منہ بنایا۔

''پہلے بھی ہوا......'' عفت جمیل نے شوہر کو دیکھا۔

''تو آج کیوں......؟'' وہ ناگواری سے بولے۔

''بعض لوگوں کو عزت راس نہیں آتی۔''

''ٹھیک کہتی ہیں آپ......'' انیسہ کا لہجہ ذو معنی تھا۔

''تم حد سے بڑھ رہی ہو انیسہ......'' بڑے جیٹھ نے غصے سے کہا۔

''یہ کلاس ڈیفرنس کا اثر ہے......'' منجھلے جیٹھ نے ناگواری ظاہر کی۔

''کسی نے...... ٹیکسی...... منگوائی ہے......'' ملازم لاؤنج میں آ کر بولا۔

''ہاں میں نے......'' انیسہ بولی۔

''اسے مجھے دو......'' ضیغم نے آیان کو اس سے چھیننے کی کوشش کی۔ انیسہ نے اسے سختی سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

''ضیغم! تماشا مت بناؤ...... لے جانے دو اسے......'' عفت جمیل کا طنطنہ دیکھنے کے لائق تھا...... ضیغم روبوٹ کی طرح حکم بجا لایا اور پیچھے ہٹ گیا۔

انیسہ اپنی متاعِ حیات کو آغوش میں سمیٹے وہاں سے نکل گئی۔

☆☆☆

اماں، ابا دونوں ہی پریشان ہو گئے۔ مگر دونوں کا ردِعمل مختلف تھا۔

''گزارہ کرتیں بیٹا...... اب تم اکیلی نہیں ہو...... ایک معصوم جان اور بھی تمہارے ساتھ لگی ہے۔'' اماں نے کہا۔

''کوشش کی اماں لیکن...... میں گوروں کے دیس میں کالوں کی طرح تھی...... آج بتا رہی ہوں آپ کو...... پہلے اس لیے نہیں بتایا کہ آپ کا دل برا ہوتا۔ باقی دو بہوؤں کے گھر والے آتے تو ساس صاحبہ ان کے سامنے بچھ، بچھ جاتی تھیں اس لیے ناں کہ وہ ان کی ٹکر کے لوگ تھے۔ لیکن جب آپ اور ابا یا امینہ کبھی کبھار مجھ سے ملنے آتے تو میں دیکھتی تھی کہ وہ آپ لوگوں کو اپنے باقی دو سمدھیانوں جیسی تعظیم نہیں دیتی تھیں۔''

''یہ ایسی کوئی بات نہیں تھی جس پر تم گھر چھوڑ کر چلی آئیں۔''

''صرف یہی بات نہیں تھی اماں اور بھی باتیں تھیں...... ضیغم میں لالچ تھی، بدگمان تھا...... اس کا خیال تھا کہ میں اپنی کمائی اپنے میکے میں دے دیتی ہوں۔'' انیسہ کو اماں کا صدمہ رفع کرنے کو نہ چاہتے ہوئے بھی بتانا پڑا۔

''لاحول ولاقوۃ......! خدا کسی ماں، باپ کو بیٹی کا محتاج نہ کرے۔''

''رات کو گیارہ، بارہ بجے تک مجھے کچن ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ رات گئے ان کی بیٹیاں اور داماد ملنے آتے تو ان کی خاطر مدارات کے لیے ہمارے ہی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا...... آخر دو بہویں اور بھی تو تھیں گھر

میں اور میرے اس گھر میں جانے سے پہلے بھی تو مہمانداری کا نظام کسی نہ کسی طرح چلتا ہی رہا ہوگا۔"

"یہ تو خیر ایسی کوئی بات نہیں..... لڑکی کو اپنی سسرال میں قدم جمانے کے لیے بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔" اماں نے کہا۔

"اتنے دن سے سہہ ہی رہی تھی۔ ضیغم نے نئی گاڑی خریدنے کے لیے پیسے مانگے، میں نے منع نہیں کیا..... لکھنے کے پیسے بھی تنخواہ کے اکاؤنٹ ہی میں جاتے تھے میں نے پیسے بے چوں وچرا انہیں نکال کر دے دیے، ویسے بھی میں چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لیے شیئر کرتی ہی رہتی تھی۔ کبھی میں اور ضیغم اکٹھے باہر جاتے تو گاڑی میں پٹرول ڈلوانے اور شاپنگ کی ادائیگی کے لیے میرا ڈیبیٹ کارڈ ہی استعمال ہوتا تھا۔ آپ کو میں یہ سب اس لیے نہیں بتاتی تھی کہ مجھے گزارہ کرنا تھا، میں اپنی ذات پر ہر سختی سہنے کو تیار تھی مگر اب بات میری ذات کی توہین پر آ گئی تھی۔ بچوں، بڑوں سب کے سامنے ضیغم کی ممی نے میری انسلٹ کی اور..... ضیغم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ نہیں اماں..... میں مار کھا کر ذلیل ہونے والی عورت نہیں بننا چاہتی..... مجھے نفرت ہے ان مردوں سے جو اپنی بیویوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں..... ابا کوئی رئیس آدمی نہیں تھے..... ہم دونوں بہنوں کو اور آپ کو ابا سے بنی تلی ضروریات زندگی ہی پوری ہوئیں۔ ابا کی بہت سی باتوں سے ہمیں اتفاق بھی نہیں رہا مگر ان کی سب سے اعلیٰ صفت یہ تھی کہ ہم نے ابا کو کبھی آپ کی تذلیل کرتے یا آپ پر ہاتھ اٹھاتے نہیں دیکھا۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔" اماں نے تائید کی۔

"ضیغم کوئی جاہل مرد نہیں..... پڑھا لکھا ہے..... ماں کا احترام اپنی جگہ لیکن اسے ڈگڈگی نہیں بننا چاہیے..... اسے معلوم ہونا چاہیے کہ بیوی کو بھی عزت دی جاتی ہے۔"

"تم نے ٹھیک کیا بیٹی ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" ابا کو سارے حالات کا علم ہوا تو انہوں نے کہا۔

ایسہ کو حوصلہ ہوا۔

"ابا..... آیان کو نہیں لانے دے رہے تھے وہ لوگ مجھے....."

"کیسے نہیں لانے دے رہے تھے، آیان کو تم اپنے پاس رکھنے کا قانونی حق رکھتی ہو..... ضرورت پڑی تو کورٹ بھی جا سکتے ہیں ہم۔"

ایسہ کو تسلی ہوئی۔

"اللہ نہ کرے جو کورٹ کچہری کی نوبت آئے۔" اماں دہل کر بولیں۔

"دیکھو بھئی..... جب اوکھلی میں سر دے لیا تو موصلوں کا کیا ڈر....." ابا نے جرأت کا مظاہرہ کیا۔

"وہ بڑے لوگ ہیں ایسہ کے ابا....." اماں نے کہا۔

"بڑے لوگوں کی چھوٹی باتیں تو تم نے سن لیں بیٹی سے۔"

"ارے میاں! لڑکی اور اس کے گھر والوں کو تو بڑی، بڑی سننی پڑتی ہیں یہ تو بہت چھوٹی، چھوٹی باتیں ہیں..... اتنی چھوٹی باتوں پر گھر نہیں بگاڑے جاتے۔" اماں کا لب ولہجہ صلح جویانہ تھا۔

"اماں..... ! میں اب وہاں واپس نہیں جاؤں گی۔" ایسہ کا انداز فیصلہ کن تھا۔

"نہیں بیٹا..... پھٹے کو سیے اور روٹھے کو منائے بغیر زندگی نہیں گزرتی..... تمہیں ضیغم کو منانا پڑے گا۔"

"میری غلطی ہوتی تو مجھے عار نہ ہوتا مگر غلطی ان لوگوں کی ہے۔"

"عورت تو تم ہو ناں بیٹا۔"

"کیا مطلب.....؟"

"جھکنا عورت ہی کو ہوتا ہے۔"

"مجھے جتنا جھکنا چاہیے تھا میں جھک گئی..... اب اور نہیں اماں....."

"اور اگر ان لوگوں نے کوئی غلط قدم اٹھالیا۔" اماں تشویش سے بولیں۔

"اٹھالیں..... میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوں..... آیان میرے پاس ہے..... اب اگر مصالحت کی کوئی بات ہوگی تو صرف ایک نکتے پر..... اور وہ یہ کہ

میں اس گھر میں نہیں رہوں گی...... ضیغم اور میں علیٰحدہ گھر میں رہیں گے...... اماں وہاں کوئی میری مصروفیت، مشقت اور مشکل کا احساس نہیں کرتا...... میں نے چاہا کہ میں اپنا ہاتھ بٹانے کے لیے اپنے خرچ پر کوئی ملازم رکھ لوں مجھے اس کی اجازت نہیں دی گئی...... میں انسان ہوں...... میری بھی کچھ مرضی ہو سکتی ہے...... جس گھر میں بہو کا جائز حق بھی تسلیم نہ کیا جائے وہاں گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنے سے فائدہ...... ایسے بڑے گھرانے میں میری شادی کرنے سے تو بہتر تھا کہ آپ کسی ایسے گھر میں میری شادی کر دیتیں جہاں مال و دولت، کوٹھی، گاڑیاں، چمک دمک نہ ہوتی مگر مجھے عزت دی جاتی۔ اپنی مرضی کی زندگی جینے کا حق تو ملتا۔'' وہ مسلسل بولتی چلی گئی۔ ''آپا کو دیکھیں...... بہت امیر نہیں ہیں ان کے سسرال والے مگر انسان ہیں۔''

''تمہارے ابا ہی کو لگن تھی تمہیں بڑے گھر میں بیاہنے کی...... اپنے جیسوں میں رشتہ جوڑتے تو نہ تمہیں مشکل ہوتی نہ ہم دکھ میں پڑتے۔''

''آپ کو اب بھی دکھی ہونے کی ضرورت نہیں اماں......'' انیسہ نے اپنا بازو اماں کے شانوں پر دراز کر دیا اور اماں کو کسی چھوٹے بچے کی طرح پیار کرتے ہوئے بولی۔

''میں خوش ہوں اماں کیونکہ آیان میرے پاس ہے...... کالج جاؤں گی تو اس کی دیکھ بھال تو آپ کر لیں گی ناں......''

''جی جان سے میرے بچے......'' اماں نے انیسہ کو دلسوز نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ ''دعا ہے کہ تم اپنے گھر میں شاد آباد رہو...... عورت کی پہچان اس کا شوہر اور گھر ہوتا ہے۔''

ماں کتنی بے لوث اور اولاد کی کتنی خیر خواہ ہوتی ہے۔

☆☆☆

عفت جمیل بھی تو ماں ہی تھیں۔ لیکن اماں کی طرح سادہ، منکسر المزاج اور عفو درگزر کی عادی نہیں۔ انا پرست، متکبر اور منتقم المزاج...... سالہا سال کی افسری نے انہیں ڈکٹیشن دینے کا عادی بنا دیا تھا۔ وہ دفتر میں اپنے ماتحتوں ہی نہیں گھر میں اپنے اہلِ خانہ کو بھی ان کی نہیں اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا عادی دیکھنا چاہتی تھیں۔ بڑی اور منجھلی بہو اونچے گھرانوں سے آئی تھیں کچھ ان کے میکوں کی معاشرتی حیثیت، کچھ دونوں بہوؤں کو ان کے شوہروں کی مکمل پشت پناہی، عفت جمیل بھی ان کے ساتھ سنبھل کر رہتی تھیں اور وہ دونوں بھی ان سے حد میں رہتیں۔ ہر طرح کی آسائش انہیں حاصل تھی۔

ضیغم عفت جمیل کی اولادوں میں سب سے چھوٹا، بچپن کے لاڈ میں بگڑا اور تلون مزاج تھا۔ دوسروں تو توقعات رکھنا اور دوسروں کی توقعات کا احترام نہ کرنا اس کی عادت تھی۔ ماں سے زیادہ اولاد کا مزاج آشنا کون ہوتا ہے۔ عفت جمیل جانتی تھیں کہ ضیغم دو بڑے بھائیوں کی طرح لائق اور اپنی ذمے داریوں سے آگاہ نہیں تھا۔ بڑی بہوؤں کی طرح اس کے لیے بھی کسی بڑے گھر کی لڑکی بیاہ کر لانے کے بجائے انہوں نے انیسہ کا انتخاب اپنی دانست میں نہایت دانشمندی سے کیا تھا۔ ان کا خیال تھا جس لڑکی کی تحریر میں اتنی پختگی ہو وہ ان کے چھوٹے، لاڈلے اور لاابالی بیٹے کو بہت اچھی طرح سنبھالے گی۔ اس کی کمزوریوں سے نباہ کرے گی اور معمولی گھرانے سے تعلق ہونے کے باعث ان کے گھر میں دب کر رہے گی۔ شاید انہیں اس حقیقت کا ادراک نہیں تھا کہ پختہ تحریروں کی اس نوجوان مصنفہ کو شعورِ ذات کا احساس بھی ہوگا۔ وہ برداشت کی حد جانتی ہوگی اور یہ بھی کہ حد سے بڑھنے والے کو کب انگلی کھڑی کر کے حد پار نہ کرنے کی تنبیہہ کرنی ضروری ہوتی ہے۔

انیسہ کا یوں چلے جانا، عفت جمیل کے پندار پر ایسی ضرب تھی کہ جس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بڑی دو بہوؤں کی موجودگی میں چھوٹی بہو کے ہاتھوں اپنی اس ہتک کا گہرا اثر لیا انہوں نے۔

''وہ اب کبھی اس گھر میں واپس نہیں آئے گی۔'' عفت جمیل نے فیصلہ سنایا۔ ''سن رہے ہو ناں ضیغم،''

انہوں نے بیٹے کو جتایا۔

''مگر میرا بیٹا ممی......'' ضیغم بولا۔ ''وہ تو اسی کے پاس ہے۔''

''رہنے دو اسی کے پاس...... بڑا ہوگا تو تمہارے ہی پاس آئے گا...... انسانی فطرت ہے جو چیز پاس نہ ہو اسی کی تلاش میں لپکتا ہے۔ تمہاری اولاد تمہارے ہی پاس آئے گی...... فی الحال اسی کے پاس رہنے دو...... اٹھائے ذمے داری...... بندھی بیٹھی رہے گی۔ تمہاری میں دوسری شادی کروں گی۔ کسی اچھے گھر کی لڑکی سے...... لڑکیوں کی کوئی کمی تھوڑی ہے......

اسے تم طلاق دو گے مگر آف دی ریکارڈ اس شرط کے ساتھ کہ وہ آیان کو تمہاری جانب سے کسی تصفیے کے بغیر اپنے پاس رکھنے کے عوض تم سے اپنے حق مہر یا بچے کے خرچ کا مطالبہ نہیں کرے گی۔''

انیسہ تو علیحدہ گھر میں رہنے کی شرط پر ضیغم سے اپنا رشتہ برقرار رکھنا چاہتی تھی مگر ضیغم نے ماں کی مرضی کے تابع ہو کر انیسہ کو طلاق دے دی۔ کٹھ پتلی مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔

آیان کو بغیر کسی تصفیہ کے اپنے پاس رکھنے کے عوض انیسہ نے بڑے لوگوں کی کم ظرفی کی شرط بے چوں وچرا۔ قبول کی۔

صدمہ گہرا تھا، خود انیسہ کے لیے اور بڑھاپے کی منزل سے گزرتے اس کے والدین کے لیے بھی مگر تقدیر کا لکھا یہی تھا۔

زندگی پھر پرانی ڈگر پر آگئی۔ البتہ آیان کی صورت ایک خوب صورت اور بامعنی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس پرانی ڈگر پر...... اماں، ابا، انیسہ تینوں کی آنکھ کا تارا اور جینے کا سہارا بن گیا تھا۔ اس کے ننھے سے وجود سے زندگی میں بڑی رونق رہتی...... اماں اس کی چھوٹی، چھوٹی ضرورتوں کی تسکین میں لگی رہتیں...... ابا، اسے بہلاتے، ٹہلاتے، انیسہ کو وہ کم ہی ہاتھ لگتا، آیان کو اماں، ابا کے پاس چھوڑ کر وہ بہت اطمینان سے کالج جاتی، گھنٹوں سکون کے ساتھ لکھتی۔ میڈیا جس نے اس کی طلاق کے ذاتی المیے کو عوامی بنا دیا تھا اپنی قیاس آرائیوں پر اس کی مسلسل خاموشی سے عاجز ہو کر چپ ہو چکا تھا۔ طلاق کے بعد اس نے ذرائع ابلاغ کے کسی نمائندے کو انتہائی کوشش کے باوجود کوئی بیان نہیں دیا تھا۔ نہ ہی ضیغم یا اس کے گھر والوں کے بارے میں کوئی منفی بات کی تھی۔ اس نے فقط اتنا کہا تھا۔

''ازدواجی زندگی کی کامیابی یا ناکامی قسمت کا معاملہ ہوتا ہے، تیراک ڈوب جاتے ہیں اور ڈوبتے ہوئے پار لگ جاتے ہیں۔''

ضیغم اور اس کے گھر والوں کے بارے میں نہ اس نے کبھی ٹوہ رکھنے کی کوشش کی نہ کسی ذریعے سے کوئی خبر ملی۔ وہ اکثر دل ہی دل میں سوچتی کہ ضیغم اور وہ دو مختلف دنیاؤں کے باسی تھے۔ جنہیں قسمت نے کچھ عرصے کے لیے صرف اس لیے یکجا کیا کہ اسے آیان ملنا تھا...... آیان اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور امید بن گیا تھا۔

☆☆☆

متواتر تین سال سے انیسہ کی تحریر کردہ کوئی نہ کوئی سیریل کسی نہ کسی ایوارڈ کے لیے نامزد ہو رہی تھی۔ انیسہ کے لیے یہ نامزدگیاں محنت وصول ہو جانے کا احساس بخشنے کا سبب ضرور بنتیں مگر وہ ہواؤں میں نہ اڑتی، کالج میں اس کی ساتھی استاد اس سے کہا کرتی تھیں۔

''تم عجیب ہو انیسہ...... نہ اپنی کسی ناکامی پر افسردہ ہوتی ہو، نہ کسی کامیابی پر غرور کرتی ہو۔''

وہ دھیرے سے مسکرا دیتی۔

''ایسا کیوں؟''

''پتا نہیں......''

''نہیں، نہیں بتاؤ...... یہاں تو یہ حال ہے کہ لوگ ذرا سی کامیابی پر گردن اکڑا لیتے ہیں اور ایک تم ہو...... ڈاؤن ٹو ارتھ...... بتاؤ ناں ایسا کیوں ہے؟''

''پوچھ کر بتاؤں گی۔''

''کس سے؟''

''اللہ میاں سے۔''

"توبہ، توبہ...... اللہ میاں سے بھی کوئی پوچھتا ہے۔"

"میں تو اللہ میاں سے ہی ساری باتیں کرتی ہوں۔"

یہ سچ بھی تھا، وہ اپنے دل کی ساری باتیں اللہ میاں سے ہی کرتی تھی۔ جب دل بھاری ہو رہا ہوتا، جب رونے کو جی چاہتا، جب کوئی خوشی کی خبر ملتی صبح آنکھ کھلنے پر...... رات کو بستر پر، اپنے پیاروں کی درازیِ عمر اور خیر کی دعا مانگتے ہوئے، کبھی شکر کبھی صبر، کبھی حوصلہ، کبھی اطمینانِ قلب کے لیے۔

اماں، ابا کو اس کی دوبارہ خانہ آبادی کی فکر لگی ہوئی تھی۔ اماں موقع دیکھ کر اسے سمجھاتیں۔

"ایسے زندگی نہیں گزرے گی بیٹا...... اور ہم بوڑھے ماں، باپ کا کیا بھروسا...... چراغِ سحری ہیں...... تمہارا گھر دوبارہ آباد ہونا چاہیے۔" وہ ٹال جاتی۔

"ہمارے بعد کون ہوگا تمہارا اور آیان کا پرسانِ حال۔"

"اماں پلیز...... ایسی باتیں نہیں کیا کریں...... میں تو اللہ میاں سے دن رات آپ کی اور ابا کی درازیِ عمر کی دعائیں مانگتی رہتی ہوں۔"

"بیٹا ایک نہ ایک دن تو سیٹی بجنی ہے پھر چاہے تم کچھ ہی کر لینا واپسی نہیں رکے گی...... تمہارے ابا کو بھی بہت فکر ہے تمہاری۔"

"بیٹا تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" ایک روز ابا خود اس کے سامنے آ بیٹھے۔

"جی ابا" وہ سمجھ گئی ابا کیا بات کرنا چاہتے تھے۔

"میرے ایک پرانے شناسا ہیں...... ان کا بیٹا...... شادی ہوئی تھی اس کی مگر نباہ نہیں ہوا...... طلاق ہو گئی...... دو بچے ہیں...... دونوں ماں کے پاس...... وہ جو ہمارے پڑوس میں غزالی صاحب رہا کرتے تھے۔ ان کا داماد اور انہی افسر کا بیٹا ایک ہی ادارے میں کام کرتے ہیں۔ غزالی صاحب نے مجھے فون کیا کہ اگر آپ کہیں تو میں اپنے داماد سے کہوں ذرا ٹوہ لے اور اگر ان کی کوئی منشا ہو تو انیسہ بیٹی کے لیے بات کی جائے۔" ابا نے توقف کیا پھر بولے۔ "تمہاری کیا مرضی ہے؟"

"نہیں ابا...... انہیں منع کر دیں۔"

"کیوں؟"

"میرے لیے ایک خراب تجربہ ہی کافی ہے...... میں اب اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔"

"عورت اکیلے زندگی نہیں گزار سکتی...... بہت مشکلات ہوتی ہیں۔" ابا بولے۔

"اکیلے کہاں! آپ اور اماں کو اللہ سلامت رکھے۔"

"کب تک......" ابا نے بھی وہی بات کی جو اماں کیا کرتی تھیں۔

"میں آیان کو کسی اور کے رحم و کرم پر نہیں پالنا چاہتی۔"

"تمہیں اپنے لیے بھی تو سہارے کی ضرورت ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں ابا...... مجھے سہارے کی ضرورت نہیں۔"

"یہ بھول ہے تمہاری...... اکیلی عورت کو سو طرح کی بلائیں آ لیتی ہیں۔"

"مقابلہ کر سکتی ہوں ابا......"

"نہیں کر سکتیں...... یہ میری زندگی کا تجربہ ہے۔" انیسہ انہیں دیکھنے لگی۔

"کچھ حادثے سامنے آ جاتے ہیں لیکن بے شمار ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں سامنے آنے سے روک دیا جاتا ہے...... دبا دیا جاتا ہے...... کبھی کسی وجہ سے کبھی کسی سبب سے...... کبھی کسی خوف کے باعث کبھی کسی دباؤ کے تحت......" ابا نے توقف کیا پھر بوجھل آواز میں بولے۔ "تمہیں یاد ہے کالونی کے ایک بنگلے میں ایک خاتون افسر اور اس کے دو بچوں کا قتل ہوا تھا۔"

"جی...... میں ان دنوں کالج میں تھی۔" انیسہ حیران تھی کہ ابا کو برسوں بعد وہ واقعہ کیوں یاد آیا تھا۔

"انتظامیہ نے محکمے کو بدنامی سے بچانے کے لیے اس واقعے کو ڈکیتی کا واقعہ قرار دیتے ہوئے جلد ہی رفع دفع کرا دیا تھا حالانکہ وہ محکمے کے دو افسران کی بدمعاشی تھی جن میں سے ایک شادی شدہ تھا اور دوسرا غیر شادی شدہ...... اکیلی عورت کو ان درندوں نے...... بے آبرو کرنے کے بعد اس کے بچوں سمیت قتل کر دیا تھا۔"

"اوہ...... ! آپ کو کیسے معلوم ابا؟"

"دفتر میں لوگ دبی زبان سے ایک دوسرے کو بتاتے تھے...... بعد میں ان دونوں کو کسی اور بہانے نوکری سے برخاست کر کے کالونی سے نکال دیا گیا تھا۔" ابا نے توقف کیا پھر بولے۔ "دنیا بڑی بے رحم ہے بیٹا...... نہ عورت کی مجبوری کا احساس کرتی ہے نہ عزت کا خیال۔"

"اور اس خاتون کا شوہر؟ اکیلی کیوں رہتی تھی وہ؟"

"بیوہ تھی بیچاری...... سننے میں آیا تھا کہ اس کا شوہر روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو چکا تھا۔" ابا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری پھر بولے۔ "میں اور تمہاری ماں، ہم دونوں تمہارے بارے میں بہت فکر مند رہتے ہیں بیٹا...... ہم تمہیں اکیلا چھوڑ کر چین سے مر بھی نہیں سکتے بیٹا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں ابا...... ایسی باتیں نہ کیا کریں میرا دل اداس ہونے لگتا ہے۔"

"اور ہم جو عمر کے آخری حصے میں تمہاری فکر میں ہر پل اداس رہتے ہیں۔"

"آیان کو کچھ سمجھدار ہو لینے دیں ابا۔"

"اور اس کے سمجھدار ہونے تک ہماری زندگی کی شام ہو گئی تو......؟"

"پھر وہی بات......"

"آخری عمر میں یہی ہوتا ہے بیٹا...... آدمی فکر مند رہتا ہے کہ کام جلدی، جلدی مکمل ہو جائیں...... ادھورے نہ رہ جائیں۔" ابا پل بھر کو خاموش ہوئے پھر گمبھیر لہجے میں بولے۔ "آج اپنی غلطی کا اعتراف بھی کر لوں...... مجھے اس لڑکے سے ضرور ملنا چاہیے تھا جو یونیورسٹی میں تمہارے ساتھ پڑھتا تھا اور تمہارے رشتے کے لیے اپنے گھر والوں کو ہمارے ہاں بھیجنا چاہتا تھا۔"

اینیہ دم بخود رہ گئی۔

کس داستانِ خاکستر کو کرید رہے تھے ابا! اس راکھ میں تو اب موہوم سی چنگاری بھی نہیں بچی تھی۔ وہ دل گرفتہ ہو رہی تھی۔ ابا نے اپنا بازو آگے بڑھایا اور اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

"زندگی کا پہیا الٹا گھمایا جا سکتا بیٹی تو میں دریغ نہ کرتا مگر افسوس کہ گئے وقت کو پلٹنا ناممکن نہیں...... بس پچھتاوے رہ جاتے ہیں...... خیر میری نیت میں کوئی فتور نہیں تھا...... اپنی بچیوں کا نصیب اچھا دیکھنا چاہتا تھا۔ انہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔" ابا دھیمے لہجے میں بولے۔

زندگی کسی میگا ڈراما سیریل کی طرح ہے...... مرکزی اور ثانوی کردار...... ایک کے بعد دوسرا منظر...... واقعات کا تسلسل...... کبھی، کبھی ناقابلِ گمان سچویشنز...... اور...... دل کو برما دینے والے مکالمات......

ابا کے اعترافِ شکست نے ان کی بابت موہوم سا گلہ، شکوہ بھی اینیہ کے دل سے دھو ڈالا۔

"ہر شخص کو وہی ملتا ہے ابا جو اس کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے......" اس نے ابا کے دل سے پچھتاوا رفع کرنے کی کوشش کی۔

ابا چپ رہے مگر دل گرفتہ دکھائی دیے۔

☆☆☆

غزالی صاحب کے بیٹے کی بات تو آئی گئی ہو گئی مگر اینیہ کی بابت اماں اور ابا کی فکر رفع نہ ہوئی۔ امیدوار اور بھی تھے۔ اینیہ کی ایک کولیگ کا بھائی، دوسری کا دیور شوبز سے بھی دو تین نے اشاروں کنایوں میں دلچسپی ظاہر کی تھی...... اپنے وقت کا ایک خوبرو ہیرو جو کہ اب پینتیس، چالیس کے پیٹے میں تھا اور ڈراموں میں ثانوی کردار ادا کر رہا تھا اینیہ کے لیے دیے رہنے کے باعث براہِ راست تو امیدواری ظاہر نہ کر سکا اپنی بہن سے فون کروایا۔

"میڈم! میرا بھائی اس وقت سے آپ کا فین ہے جب آپ صرف رسالوں میں کہانیاں لکھا کرتی تھیں۔ بہت اچھا ہے میرا بھائی...... اونسٹ، ہمبل اور کیئرنگ لوگ تو حیران ہوتے ہیں کہ اس کی فرسٹ وائف کو کیا مصیبت پڑی تھی جو اتنے اچھے آدمی کو چھوڑ کر چلی گئی...... میرا بھائی اتنا ڈیسنٹ ہے کہ اس کی بیوی نے کہا مجھے ڈیورس چاہیے۔ بھائی نے اس سے کوئی جھگڑا نہیں کیا، طلاق دے دی۔ اصل میں وہ کسی اور میں انٹرسٹڈ ہو گئی تھی۔ ایک بیٹی بھی ہے اس کے ہاں

بھائی سے۔ وہ اسی کے پاس ہے۔ بھائی، بیٹی کو باقاعدگی سے خرچ دیتے ہیں، آپ پریشان نہیں ہوں بیٹی، ماں کے پاس ہی رہے گی۔"

انیسہ چپ چاپ سنتی رہی۔ وہ باضابطہ پیام لے کر گھر آنے کی خواہش ظاہر کرنے کے بعد جواب کی متقاضی ہوئیں تو انیسہ نے کہا۔

"آئی ایم سوری...... آپ کے بھائی یقیناً بہت اچھے ہیں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں لیکن...... میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں...... آپ کے علم میں ہوگا کہ میری اپنے سابقہ شوہر سے ڈیورس ہو چکی ہے اور میرا ایک بیٹا بھی ہے۔"

"جی، جی ہمیں معلوم ہے...... بھائی آپ کے بیٹے کو اپنے ہی بیٹے کی طرح رکھیں گے۔"

"ان کا بہت شکریہ مگر...... میں دوبارہ شادی کرنے میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔" انیسہ نے کہا۔

"میڈم آپ سوچ لیں...... ہم انتظار کر سکتے ہیں۔"

"آپ کا وقت ضائع ہوگا۔"

"پلیز......!"

"سوری......"

"میرا بھائی بہت اچھا انسان ہے۔"

"میں نے کب کہا کہ برے ہیں۔"

"کیا یہ آپ کا فیصلہ ہے؟"

"جی...... آخری فیصلہ......"

"اوکے......" وہ نہایت مایوسی سے بولیں۔

بعد میں انیسہ کا اس شخص سے جب بھی سامنا ہوا۔ وہ جھینپا، جھینپا نظر آیا۔ مگر انیسہ نے ہمیشہ پورے اعتماد سے اس کا سامنا کیا۔ جب دل میں کوئی چور نہ ہو تو نظریں کیوں چرانا۔

پھر برطانوی شہریت کے حامل ایک صاحب انگلستان میں مقیم تارکینِ وطن کے بارے میں ایک ڈراما سیریل لکھوانے کے لیے اس کے کالج آکر اس سے ملے...... پہلی ملاقات میں خاصے معقول سی شخصیت لگے...... دوسری نشست میں کھل گئے۔

"مائنڈ نہ کریں تو ایک ذاتی سوال پوچھ سکتا ہوں؟" وہ بولے۔
انیسہ ان کے پوچھنے سے پہلے ہی سمجھ گئی کہ وہ کیا پوچھنا چاہتے تھے۔
"فرمایئے......" اس نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔
"سنا ہے آپ کی اپنے ہسبینڈ سے علیٰحدگی ہو چکی ہے؟"
"جی ہاں...... ایک بیٹا بھی ہے میرا۔"
"میرے بھی اپنی مسز سے اختلافات چل رہے ہیں۔"
"خدا خیر کرے۔"
"مائنڈ نہ کریں تو ایک بات کہوں......؟"
"جی فرمائیں......"
"کیا میں آپ کو پرپوز کر سکتا ہوں؟"
"جی نہیں......" انیسہ نے بلا جھجک کہا۔
"وجہ......؟"
"پہلے آپ اپنی مسز کے ساتھ اپنے اختلافات نمٹائیں......"
"وہ نمٹتے رہیں گے، آپ اپنی مرضی بتائیں......"
"جہاں تک میری معلومات ہیں برطانوی شہریت کے حامل مرد کو برطانیہ میں ایک وقت میں قانونی طور پر ایک ہی بیوی رکھنے کی اجازت ہے۔"
"ایک سے زیادہ رکھنے کے راستے بھی کھلے ہیں جی...... آپ ہاں کر دیں......"
"میں معذرت خواہ ہوں......"
"وجہ......؟" حضرت کا منہ لٹک گیا۔
"آئی ایم سوری...... میں شاید آپ کے لیے اسکرپٹ لکھنے کے لیے بھی وقت نہ نکال سکوں۔"
اور وہ جو پہلی ملاقات میں اس سے اسکرپٹ لکھوانے کو انتہائی بے تاب دکھائی دیتے تھے اس کے جواب کے بعد ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ......
انیسہ کو غصہ بھی آتا افسوس بھی ہوتا۔ لوگ کتنے خود غرض اور بے درد تھے۔ معاشرے میں اس جیسی چند نہیں طلاق کا زخم کھائی لاتعداد عورتیں تھیں ان میں سے کتنی تھیں جن کے لیے اس تواتر سے رشتے آتے تھے جیسے اس کے لیے...... کیا صرف اس لیے کہ وہ مشہور و معروف تھی۔ شوبز میں بحیثیت قلم کار اس کا نام بکتا تھا۔ وہ شوبز کی سفاکیت سے بھی بخوبی آگاہ تھی۔ چہرے جب تک شاداب رہتے بکتے جہاں مرجھانا شروع کرتے خریداروں کی نظریں بدل جاتیں...... چہروں کی نسبت قلم کی عمر اور گرفت البتہ زیادہ تھی۔ وہ خوش نصیب تھی کہ اس کے ہاتھ میں قلم تھا۔

☆☆☆

شیکسپیئر نے کہا تھا۔ یہ دنیا ایک اسٹیج ہے جہاں ہر شخص اپنا، اپنا کردار ادا کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔
انیسہ بھی تو اسی اسٹیج پر کھڑی تھی۔
ڈراما نگاری کرتے، کرتے وہ خود بھی ایک ڈرامائی سچویشن کا کردار بن گئی۔ ان دنوں وہ برطانیہ میں قلمبند ہونے والے ایک ڈراما سیریل کے اسکرپٹ کے سلسلے میں برطانیہ آئی ہوئی تھی۔ آیان پاکستان میں اماں، ابا ہی کے پاس تھا۔ آیان کے سلسلے میں یہ دو ہی ہستیاں تھیں جن پر وہ آنکھ بند کر کے بھروسا کر سکتی تھی۔ تاہم ماں تھی بیرون ملک ہوتے ہوئے بھی اسے دن رات میں ان گنت مرتبہ آیان کا خیال آتا۔ روزانہ فون پر بات بھی ہوتی۔ دل وہیں گمشدہ رہتا۔
کاسٹ میں شامل فنکاروں کو برطانیہ میں مقیم تارکینِ وطن کی جانب سے خوب پزیرائی مل رہی تھی۔ انیسہ کو بطور ایک معروف ڈراما نگار خاصی تکریم دی جا رہی تھی۔ مداح اس سے رشک سے ملتے۔ ایک ادبی انجمن نے ایک شام اسے مدعو کیا اور اس کی زبانی اس کا ایک مختصر افسانہ بھی سنا۔ بڑی اشاعت کے ایک اردو اخبار نے برطانیہ میں اس کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا انٹرویو بھی شائع کر دیا۔
سمندر سے گھرے برطانیہ کے بعض ساحلی علاقے اپنے حسن اور سکوت میں جواب نہیں رکھتے۔ ساحل پر مرکزی کرداروں کا ایک منظر فلم بند کرنے کے لیے ڈائریکٹر نے رمزگیٹ کا انتخاب کیا۔ موقع پر ہی اسکرپٹ میں ترمیم و تبدیلی کے لیے انیسہ بھی ہر جگہ ٹیم

کے ساتھ، ساتھ تھی۔ ڈائریکٹر کی منشا پر وہ مکالموں میں تبدیلی کے لیے کنارِ آب ایک فولڈنگ چیئر پر بیٹھی اپنا کام مکمل کرنے کے بعد اسکرپٹ کا مطلوبہ حصہ دور کھڑے ڈائریکٹر کو بھجوانے کے لیے مددگار لڑکے کی منتظر تھی کہ کسی نے کہا۔

''میم آپ کے مہمان آئے ہیں۔''

''کون......؟'' وہ بے ساختہ چونکی۔

اطلاع دینے والے نے اس کے عقب میں اشارہ کیا۔ اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا اور اسے یوں لگا جیسے ایک لمحے کو اس کا دل اپنی جگہ پر ہی تو تھم گیا ہو۔ اس چہرے، اس شخص کو تو وہ اربوں، کھربوں انسانوں کے ہجوم میں بھی ایک نظر میں پہچان سکتی تھی۔

''اسامہ!''

نہایت متانت سے قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھا اور وہ کرسی سے ایسی تنویمی کیفیت میں اٹھی جیسے اسے حقیقت پر خواب کا گمان ہو۔

''ہائے......'' وہ اس کے روبرو پہنچ کر بولا۔

اس نے فقط دیکھنے پر اکتفا کیا۔

''آئی ایم سوری...... مصروفیت میں بہت مخل تو نہیں ہوا؟''

''نہیں، نہیں......''

''تھینک یو......'' وہ مسکرایا۔ ''کیسی ہو؟''

''الحمدللہ...... ٹھیک ہوں۔''

''اتنا بے خبر رہتا ہوں کہ تمہاری یہاں موجودگی کی خبر مجھے گزشتہ اتوار کے اخبار سے ملی جو میں نے اتفاقاً آج ہی پڑھا...... کب سے ہو یہاں؟''

''آج سترھواں دن ہے۔''

''اور......؟''

''اور کیا......؟''

''کہیں بیٹھ سکتے ہیں؟''

''یہیں......''

''او کے......'' کرسیاں کھینچ کر دونوں وہیں بیٹھ گئے۔

''کیا ہو رہا ہے آج کل......؟''

''کالج ٹیچنگ اور...... یہی اسکرپٹ رائٹنگ...... تم کیا کر رہے ہو؟'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''ڈیجیٹل مارکیٹنگ...... کئی سال سے یہیں ہوں۔ پہلے بہن، بھائیوں کو سیٹل کرنے میں لگا رہا...... خدا کا شکر ہے سب بہنوں کی شادیاں ہو گئیں...... بھائی بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہیں...... وقفے، وقفے سے پاکستان بھی جاتا رہا ہوں مگر دن کم ہوتے تھے کام بہت۔''

''اور......؟'' انیسہ کے اس ایک لفظی استفسار میں کئی سوال پنہاں تھے۔

''راحب نہیں تھا۔'' اس نے انیسہ کو دیکھا۔

''شادی بھی کی تھی۔''

''تھی...... '' وہ چونکی۔ ''یعنی؟''

''کیمسٹری نہیں بن سکی۔''

''تو......؟''

''تو وہی ہوا جو ہونا تھا...... ختم ہو گئی۔''

''بچے......؟''

''نہیں......'' اس نے یوں گہری سانس کھینچی جیسے داستان ختم ہو گئی ہو...... ''تم اپنی سناؤ ہاؤ از یور لائف......؟''

''سیم......!'' وہ دل گرفتگی سے مسکرائی۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونکا۔

''کیا تم نہیں جانتے......؟'' انیسہ نے اسے شک سے دیکھا۔

''کیا نہیں جانتا......؟''

''اس کی اور میری بھی کیمسٹری نہیں بن سکی۔''

''کیا واقعی......؟''

''تمہیں معلوم تو ہونا چاہیے۔''

''اتنا الجھا رہا ہوں کہ خود اپنا بھی ہوش نہیں تھا...... کام، کام، کام...... کھانا اور سو جانا۔''

انیسہ نے پھر اسے شک سے دیکھا۔

''یقین کرو...... ایسا ہی رہا۔ میری زندگی کا اہم ترین مقصد یہی تھا کہ میری بہنیں عزت سے اپنے گھروں کی ہو جائیں اور بھائی تعلیم حاصل کر کے

باعزت زندگی بسر کریں...... اسی دائرے میں گھومتا رہا ہوں ..... شادی راحت کی امید کے ساتھ کی تھی مگر راحت کے بجائے کلفت ملی......" اس نے توقف کیا پھر پوچھا۔ "تمہاری شادی کیوں ٹوٹی......؟"

"کیا ہوتا ہے ایسی شادیوں کا انجام جن کی بنیاد خلوص پر نہیں توقعات پر رکھی جائے...... جہاں انسان پر نہیں اس سے وابستہ فائدوں پر نظر ہو...... ایسے رشتہ کو بالآخر ٹوٹنا ہی ہوتا ہے۔"

"افسوس ہوا۔"

"میں مطمئن ہوں۔"

"کوئی ایشو......؟"

"ہاں......" انیسہ کھل اٹھی۔ "ایک بیٹا...... میرے لیے وہی اب میری دنیا ہے۔"

"گڈ......"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم لوگ آج یہاں ہیں۔"

"ایک بات بتاؤں تمہیں......" وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آدمی کسی کو کھونا چاہے تو بہانے بہت...... ڈھونڈنا چاہے تو راستے ہزار...... یہ دنیا اتنی بڑی نہیں ہے کہ ہم کسی کھوئے ہوئے کو ڈھونڈ نہ سکیں...... میں نے تہیہ کیا کہ تم سے ملنا ہے...... نشانِ قدم ملتے چلے گئے۔"

"تھینک یو......"

"فار واٹ......؟"

"تم نے مجھے ڈھونڈ لیا۔"

"پانا چاہوں تو؟"

"کیا مطلب......؟"

"تمہارے والد صاحب حیات ہیں؟"

"ڈرے ہوئے ہو؟" انیسہ بے ساختہ ہنسی۔

"ایسا ہی ہے۔"

"آکر ملو بھی ان سے...... وقت بہت کچھ بدل دیتا ہے۔"

"کیا تمہارے والد کو بھی؟"

"ہاں......" وہ زور سے ہنسی پھر دھیرے سے کہا۔ "وقت نے ابا کو بھی بدل دیا ہے۔"

"پھر تو ملنا پڑے گا۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"تمہاری کیا مرضی ہے؟"

"جو پہلے تھی۔"

"میم جی...... ! سین ہوگیا؟" دور کھڑے ڈائریکٹر نے بہ آواز بلند ہانک لگائی۔

انیسہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے لڑکے کو دوڑانے کا اشارہ کیا۔

"آئی لو یو انیسہ......" اسامہ نے پہلی بار کہا۔

انیسہ کو یوں لگا جیسے ایک ڈرامائی سچویشن نے اس کی زندگی کے اسکرپٹ کو ہپی اینڈنگ سے ہم آغوش کر دیا ہو۔

فضاؤں میں جرس کی صدا تھی۔

اِک گمشدہ راہ کی راہ یابی۔

اِک نئے سفر کا پیان!

"ساری عورتوں کا نصیب ایک جیسا ہوتا ہے۔" اماں کہا کرتی تھیں۔

زندگی میں پہلی بار اس کا اماں کی دانش پر مسکرانے کو جی چاہ رہا تھا...... ساری عورتوں کا نصیب ایک جیسا کب ہوتا ہے اماں......؟ کچھ اس کی طرح بالآخر پار بھی لگ جاتی ہیں کچھ ڈولتی ہی رہ جاتی ہیں۔

"ہر شخص اپنا نصیب آپ لکھتا ہے۔" ابا کہا کرتے تھے۔

ایسا کب ہے!

اگر ہر شخص اپنا نصیب آپ لکھ سکتا تو دنیا میں کوئی بھی بدنصیب نہ ہوتا...... وقت نے...... اور زندگی کے داؤ پیچ نے ثابت کیا تھا کہ نہ ساری عورتوں کا نصیب ایک جیسا ہوتا ہے...... نہ انسان اپنا نصیب آپ لکھ سکا ہے...... بساط بچھی ہے...... ہم تو مہرے ہیں...... تقدیر لکھنے والا جس خانے میں چاہے بٹھا دے جب بے بسی کی انتہا یہ ہے تو پھر ناشکری کیوں...... ہر حال میں شکر ہی شکر......!

(ختم شد)



ع عورت ظاہر

ایک عام تاثر یہی ہے کہ عورت ایک کمزور اور کم تر ہستی ہے۔۔۔ مگر یہی کمزور اور کم تر ہستی صنف مخالف پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتی اور وقت پڑنے پر چٹان جیسی مضبوطی بھی دکھاتی ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے عورت کہانی میں ہماری معروف قلم کار فرحین اظفر نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔

جداگانہ موضوعات کے کہانیوں کا نیا سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر

خوب صورت چہرے کے پیچھے اگر خوب صورت دل نہ ہو تو چہرہ بہت جلد اپنی قدر و قیمت کھو دیتا ہے۔ خوب صورت دل کے ساتھ اگر خوب صورت چہرہ نہ بھی ہو تو دل کبھی اکیلا نہیں پڑتا...... اور اگر صورت اور سیرت دونوں اچھی ہوں تو کیا ہی کہنے......

ظاہر اور باطن میں یہ ایسا تال میل ہے، جس کی حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ جو کرتے ہیں وہ صرف نظر چراتے ہیں۔ جھٹلانے کی جھوٹی کوشش کرتے

ہیں اور ناکام ٹھہرتے ہیں۔

ایسی ہی ایک ناکامی کا منہ دیکھتے اسے کافی عرصہ ہو چلا تھا۔

زُہرہ، اپنے محلے کی سب سے خوب صورت بہو اور بھابی مشہور تھی۔ بھابی اس لیے کہ قصبے اور گاؤں کی درمیانی آبادی اور شہر اور قصبے کی درمیانی سہولتوں والے اس علاقے میں، ہر جوان عورت کسی نہ کسی کی بھابی، ہر بوڑھی عورت دادی، نانی، ہر کنواری لڑکی آپی، باجی اور ہر مرد چاچے ماما جیسا کوئی نہ کوئی رشتہ رکھتا تھا۔

جیسے دکھ سکھ سانجھے تھے ویسے ہی رشتے بھی سانجھے ہی تھے۔

کئی دہائیوں کے سفر نے آبادی کے ساتھ، ساتھ گاؤں کے درجے کو بھی جہاں تبدیل کیا تھا۔ وہیں ریت رواجوں میں کٹڑ پن کی جگہ ماڈرن ازم کی لچک نے بھی لے لی تھی۔ بڑی بوڑھیاں، اب بھی محترم تھیں۔ پورے محلے کے گھر گھر جھانکتی پھرتی تھیں لیکن گئے وقتوں کی اپنائیت کی بُو باس کو نئے زمانے میں معدوم ہوتا دیکھ رہی تھیں۔

اب بھی لوگ ایک دوسرے کو رشتوں، ناتوں سے پکارتے تو تھے لیکن دل اس خالص پن سے لبالب بھر نہیں پاتا تھا۔ وہ محبت کی چاشنی جو ابھی لفظوں میں باقی تھی لہجوں میں سوکھتی جا رہی تھی۔

وہ اسی آدھے سچے، آدھے جھوٹے، تھوڑے کھرے، تھوڑے کھوٹے معاشرے میں پروان چڑھتی ہزاروں عورتوں کے جیسی ہی تھی...... پر سمجھتی خود کو لاکھوں میں ایک تھی۔

ایسے ماحول میں جہاں ہونٹوں سے نکل کر کوٹھوں چڑھ جانے کو ایک "شششش"...... ہی کافی تھی وہاں، اس کے حسن کے چرچے کیوں نہ ہوتے۔ ایک تو حسن، اندھوں میں کانا راجا بلکہ رانی کے مصداق...... پھر الہڑ نار جیسی دہکتی جوانی اور وہ بھی پچی پکی والی سہاگن کے ٹائٹل کے ساتھ کیونکہ وہ اپنے سہاگ کی سر چڑھی، منہ لگی بھی بہت تھی۔

دن کو دن اور رات کو رات کہے جیسی...، بااختیار...... سسرال کا جھنجٹ نہ دیورانی، جیٹھانی کا ٹنٹا...... پیسے کی ریل پیل نہ سہی پر کھلا ہاتھ...... کوئی روک ٹوک نہیں کوئی پوچھ گچھ نہیں۔

پاس کے گاؤں میں خاوند کی ذاتی زمینداری اور بہت تھوڑی سی انگریزی زبان کی شُدھ بُدھ نے گویا اسے اپنی سُدھ بُدھ ہی بھلا دی تھی۔

اس کا حال اس جادوگرنی جیسا تھا جو روز آئینے سے پوچھتی کہ بتاؤ اس دنیا میں مجھ سے زیادہ خوب صورت بھی کوئی ہے...... اور ہر بار آئینے کے منفی جواب پر دل کھول کے ٹھٹھے لگاتی۔

آئینہ دراصل سچ نہیں بولتا بلکہ وہی بولتا ہے جو آپ سننا چاہتے ہیں...... وہ بھی یہی سننا چاہتی تھی کہ اس کے آس پاس اس جیسا کوئی نہیں۔ آئینہ تو یہی بولتا تھا لیکن سمو کچھ اور بول گئی۔

"پچو کے آگے کسی کا چراغ نہیں جلتا بھئی۔"

اپنے حسن کے خمار میں ڈوبی زُہرہ کا نشہ ٹوٹ گیا۔

یوں لگا جیسے بھرا ہوا جام عین لبوں کے پاس آ کر چھلکا ہو۔

سمو ہمیشہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتی تھی۔ اس لیے اس کی دوست تھی۔ اب اس بات کے بعد وہ اس کے عہدے پر بھی غور کرنے والی تھی۔

"کون...... کون وہ پچو...... وہ؟" اس نے ذرا بن کے ہاتھ کو پیچھے دور کی طرف اشارہ کر کے، بڑے انداز سے پوچھا۔

"وہ نادر کی بیوہ......؟"

"ہئے، ہئے بیچاری بھری جوانی میں کیسا روگ لگ گیا......" سمو ابھی اپنے غم سے باہر نہیں نکلی تھی۔

"تو پاگل تو نہیں ہو گئی سمو......!"

ناگواری اس کی تنی ہوئی جلد پر پھسلی۔

"ایک سہاگن سے بیوہ کا بھلا کیا مقابلہ؟"

سمو اپنے افسوس سے نکل کے ٹھٹکی۔

"پاگل میں ہوں کہ تو...... یہاں سہاگن اور بیوہ

کی بات کہاں سے آگئی...... میں تو اس کی صورت کی بات کر رہی تھی...... بلکہ قسمت کی...... ہک ہا......" سمو کو نئے سرے سے دکھ ہوا۔

"ابھی مدت ہی کیا گزری تھی۔ ایسے بھی ابھاگن ہوتی ہے کوئی۔ پانچ سال کا بچہ اور خاوند کی فوتگی...... اجاڑ، بلکتی جوانی کو زمانے سے چھپا کے خود ہی چور بنی پھرتی ہے مظلوم......"

سمو نے ایک جھرجھری سی لی۔ زُہرہ بھی چونک سی گئی۔ کچھ لمحوں کے لیے سمو کے لہجے نے اسے بھی اداسی میں دھکیل دیا تھا۔ اس نے خود کو فوراً اس کیفیت سے آزاد کرایا۔

وہ خوش رہنے اور صرف خود ہی خوش رہنے کے فلسفے پر یقین رکھتی تھی کیونکہ افسردگی سے چہرے پر چھائیاں اور جھرّیاں بڑھنے کا امکان تھا۔ باقی دنیا بھاڑ میں جائے چاہے اس دنیا کے ساتھ اس کا اپنا شوہر بھی ہو۔

"تجھے آج کیسے اس کی یاد آگئی......!"

اس نے سمو کو ٹھوکا دیا۔

"کل آئی تھی ناں میری اماں کے پاس...... ہائے بیچاری بہت پریشان تھی۔ ترکے کا مکان بیچنے کا کہہ رہے ہیں اس کے سسرال والے۔ یہی بیچاری پریشان ہے کہ اکیلی جان کہاں جائے گی ننھے بچے کو لے کے۔"

"اور اس کی ساس بھی تو تھی ساتھ میں......؟"

"ارے وہ تو بڈھی بیمار۔ آج مرے کل دوسرا دن...... اسے تو بیٹے رکھ لیں گے۔ اصل مسئلہ تو اس دکھیاری کا ہے۔"

زُہرہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی۔

سمو بھی چپ، چپ تھی۔ لگتا تھا زہرہ کی پریشان حالی نے اس کے دل پہ کچھ زیادہ ہی اثر کر دیا ہے۔

"اوپر سے یہ محلے والے ایسے خبیث ہیں۔ بس بھئی اللہ معاف کرے عورت کو تو مرد کا وہی سہارا ہے۔ مرد نہ ہو تو کچا ہی چبا جائیں۔"

اس نے دانت پیسے...... زہرہ پھر چونک گئی۔ یقیناً سمو کے پاس کوئی چٹپٹی بات بھی تھی۔ پر اسے سننے کے ساتھ، ساتھ اگر چائے کا چسکا بھی ہو جاتا تو مزہ آجاتا۔

"رک جا...... میں چائے بناتی ہوں پھر بتانا آرام سے......"

سمو کے روکنے سے پہلے وہ اٹھ گئی۔

☆☆☆

شام کو وہ ہمیشہ کی طرح بن ٹھن کے ایاز کا انتظار کرنے لگی۔ یوں تو خاص تیاری اسی دن ہوتی تھی جس دن اسے ایاز سے کوئی بات منوانی ہوتی لیکن آج سمو نے جو باتیں بینو کے بارے میں کی تھیں، انہوں نے اس کے اندر ایک انجانا سا احساس جگا دیا تھا۔ شاید یہ غیر محفوظ ہونے کا احساس تھا۔ کیونکہ سمو کے بقول اس جمعے کو مولوی صاحب نے خطبے سے پہلے بینو کی بیوگی اور اس کے اکیلے پن کے بارے میں بات کر کے نمازیوں کو خوفِ خدا یاد دلایا تھا۔ ان میں خوف خدا آیا ہو یا نہیں لیکن زُہرہ کے دل میں اندر ہی اندر کہیں کوئی انجانا خوف سر اٹھا رہا تھا۔

وہ اسی خوف سے نجات پانے کے لیے تیار ہوئی تھی۔ اس کی تیاری بہت مناسب تھی بالکل شام کے وقت ہلکا سا سج بن کے اپنے خاوند کا انتظار کرنے والی سہاگن کی طرح۔

اس نے ایاز سے اصرار کر کے جو فون منگوایا تھا اور جو نیٹ کا کنکشن لگوایا تھا اس سے اور کچھ سیکھا ہو یا نہ لیکن یہ ضرور سیکھ لیا تھا کہ اپنے حسن کو کس طرح وقت کے حساب سے چار چاند لگانے ہیں۔

شام آئی، شام سے رات آگئی لیکن ایاز کا کچھ پتا نہ تھا۔ ایک بار پھر دل اور ذہن میں وسوسوں کے نت نئے شکلے ناگ پھن اٹھانے لگے۔

ایاز کو آفس سے واپسی پر کبھی دیر سویر ہو جاتی تھی لیکن وہ ہمیشہ بتا دیتا تھا۔ آج موبائل بھی بند تھا۔

آدھے ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد اس نے گلی میں جھانکا۔ تھوڑی دیر بعد محلے کے بچے نے گزرتے ہوئے بتایا۔

''رسولاں خالہ کے گھر سیاپا ہو گیا ہے۔ ایاز بھائی کو بھی وہیں دیکھا تھا۔''

''اللہ خیر......'' اس کا دل بری طرح ہول سا گیا۔

پتا نہیں کیا بات تھی۔ آج ہی سمو نے اول فول بک دیا۔ آج ہی رسولاں خالہ کے گھر پتا نہیں کیا ہو گیا اور آج ہی ایاز وہاں پہنچ بھی گیا۔

پینو، رسولاں خالہ ہی کے مرحوم بیٹے کی بیوہ تھی۔

اس نے آناً فاناً اپنی چادر سر پر رکھی اور خود بھی وہاں پہنچ گئی۔

پچھلی گلی میں خالہ کا گھر تھا۔ اگلی گلی والوں کے گھروں کے پچھلے آنگن یا دروازے اس گلی میں کھلتے تھے۔ تنگ گلی میں، پچھلے دروازوں سے لوگ صرف ضرورت کے تحت ہی نکلتے تھے۔ یا کبھی گٹروں وغیرہ کی صفائی ہوتب...... زیادہ تر سنسان رہنے والی گلی میں اس وقت ایک رونق سی تھی۔ رسولاں خالہ کے دروازے پر لگا بلب جل رہا تھا۔ جو کسی ہنگامی کارروائی کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ آنگن میں دو چار محلے کے لوگ تھے۔ رسولاں خالہ چارپائی پر بیٹھی ہانپ، ہانپ کے بول رہی تھی یا بول، بول کے ہانپ رہی تھی۔ بہرحال وہ لڑائی جھگڑے والی کیفیت جو بھی ہو گی اب ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔

جس وقت زُہرہ نے صحن میں قدم رکھا، اسی وقت اندر کے نیم اندھیرے کمرے سے پینو باہر آئی۔ اور جانے کیا بات تھی کہ زُہرہ لمحے بھر کو ٹھٹک سی گئی۔

جانے کیوں ایسا لگا تھا جیسے اماوس میں سے چاند نکل آیا ہو۔ گو کہ اس نے اگلے ہی لمحے اپنا چہرہ کالی چادر کے پلو سے ڈھانپ لیا تھا۔ لیکن خالہ کے پاس چارپائی پر نیچے بیٹھے ایاز اور زُہرہ کی نظر بیک وقت اس پر پڑی تھی، اگلے ہی پل زہرہ نے تیر کی سی تیزی سے ایاز کو دیکھا، جو سر جھکا چکا تھا لیکن دو پل کا نظروں کا ٹکراؤ بھی زہرہ کے دل پر چھری پھیر گیا۔

اس نے جان کو۔۔ ذرا زور سے آواز دی۔

''خالہ......''

اس کی آواز دروازے کی طرف پشت کیے بیٹھے ایاز کے لیے بہت اچانک تھی۔ وہ تیزی سے مڑا۔ اور حیرت آمیز سوالیہ نظروں سے اسے قریب آتا دیکھنے لگا۔

دوسری طرف سے پینو بھی نزدیک آ چکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔

''کسی بچے نے بتایا تھا۔ کوئی بات ہو گئی ہے خالہ کے گھر...... یہ (ایاز) آئے نہیں تھے دیر ہو گئی تو میں گھبرا کے نکل آئی۔''

وہ واقعی میں لاشعوری طور پر بوکھلا سی گئی تھی۔

اس نے نامحسوس انداز میں پینو کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کے خالہ کی طرف بڑھا دیا اور تیز رفتاری سے بولتی گئی۔

''کیا ہو گیا خالہ سب خیر تو ہے......؟''

''ارے خیر کہاں میرے نصیبوں میں......''

خالہ روہانسی بیٹھی تھی۔ ہمدردی کی نئی کمک پا کر ایک بار پھر ڈبڈبا گئی۔

''جب سے میرا نادر گیا ہے۔ ایک دن بھی سکھ کا نہیں دیکھا۔''

پاس بیٹھی محلے کی عورت ہمدردی سے دھیرے، دھیرے اس کا شانہ دبانے لگی۔ خاموش ماحول میں خالہ کی سسکیاں گونجنے لگیں۔

ایک دو عورتیں اور واحد مرد ایاز ایسے چپ ہو گئے جیسے کہنے کو کچھ باقی نہ بچا ہو۔

زُہرہ کو تو ڈھنگ سے تسلی دینی بھی نہیں آتی تھی۔

''ہوا کیا ہے؟''

اس نے پھر ایک بے تکا سوال پوچھا۔ پاس بیٹھی خالہ کی پڑوسن کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔

''کچھ نہیں ہوا۔ خالہ اٹھو تم...... اندر جا کے آرام کرو اپنی دوا کھاؤ......'' عورت کا انداز صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ زُہرہ کی بات سے کتنی بیزار ہوئی ہے۔

ایاز بھی ایک دم کھڑا ہوا۔ اس نے زُہرہ کو دیکھا اور پھر چونک کے دوبارہ دیکھا۔

زہرہ بھی برا سا منہ بنا کے رہ گئی پھر بنا کچھ کہے

باہر کی طرف بڑھ گئی۔

پڑوسن کی بات اور انداز اسے مرچیں لگا گیا تھا۔ اس لیے اس نے خدا حافظ کہنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی نہ پیچھے مڑ کے یہ دیکھا کہ ایاز آرہا ہے کہ نہیں۔

جاتے وقت اس کے قدم جتنے تیز تھے واپسی پر اتنے ہی مرے ہوئے۔

☆☆☆

آنے والے دنوں میں کموہی کی زبانی محلے میں جاری رسولاں خالہ کے لیے خیر سگالی پروگرام کی اپ ڈیٹ اسے ملتی رہی تھی۔

محلے والے دراصل خالہ کے بیٹوں کو سمجھانے کے لیے گئے تھے۔ ایاز اس کمیٹی میں شامل تھا۔ خالہ کے گھر کی دال روٹی چلانے کے لیے سب نے اپنا، اپنا حصہ ڈالا، ایاز اس میں بھی شامل تھا۔ خالہ کو سب نے اپنی فل مورل سپورٹ کا یقین دلایا۔ ان یقین دہانی کرانے والوں میں بھی ایاز شامل تھا۔ کچھ گھروں سے بچے پڑھنے کے لیے جانے لگے تاکہ ٹیوشن فیس سے اسے کچھ سہارا مل سکے۔ اس کام میں ایاز شامل نہیں تھا اور اب جا کے اسے اپنی زندگی میں بچوں کی کمی کا شدت سے احساس ہوا۔ اس سے پہلے شادی کے بعد پانچ سال تک زُہرہ کی مرضی چلی تھی۔ بقول اس کے۔

''ابھی تو ہمارے اپنے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ ابھی سے بچے پیدا کر کے میں اپنی زندگی جھنجٹ میں کیوں ڈالوں، میرا حسن اور جوانی سب کھا جائیں گے بچے۔''

وہ توپ کے گولوں کی طرح بے دریغ اپنی بات داغتی تھی۔ اسے یہ اعتماد ایاز نے ہی دیا تھا۔ اسی کے بل بوتے پر اس نے اتنے سال نکالے تھے۔ اور اب یہ ایاز ہی تھا جو اس کا دل دہلائے دے رہا تھا۔ پہلی بار وہ اس وقت ہق دق رہ گئی جب، خالہ کے گھر سے واپسی پر ہی اس نے زُہرہ کو دیکھ کے کہا تھا۔

''یہ اتنا سج دھج کے کیوں آئی تھی وہاں۔ سارے لوگ جمع تھے۔''

زہرہ اسی وقت سکتے میں چلی گئی تھی۔

ایاز کی بات اس کے لیے اتنی ہی نئی اور انوکھی تھی۔ اس سے پہلے وہ جب بھی شام میں تیار ہوتی ایاز اس پر لالوٹ ہو جاتا۔ وہ خود بدشکل یا کم صورت نہیں تھا۔ لیکن پہلے دن سے زہرہ نے جس طرح اس کی نبض پکڑ رکھی تھی۔ اس سے وہ خود کو ایسا گیا گزرا سمجھنے لگا تھا جس پر زُہرہ نے شادی کر کے احسانِ عظیم کر ڈالا ہو۔ اس کی تیاری کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نئی بات وہ تھی جو اس دن ایاز نے کی تھی۔

زُہرہ نے بعد میں ایاز کو خوب، خوب جتایا۔ وہ شرمندہ بھی ہوا لیکن اس طرح نہیں جیسے ہونا چاہیے تھا۔ اس کی بات اپنی جگہ قائم تھی۔

''اپنے گھر میں ہوتی تو الگ بات تھی لیکن اس طرح اٹھ کے باہر آجانا۔''

''کیوں، اس میں نیا کیا تھا۔ میں تو ایسے ہی جاتی ہوں ہر جگہ...... آخر خوب صورت ہوں اور دکھنا بھی چاہتی ہوں۔ تو چاہتا ہے سر جھاڑ منہ پھاڑ اٹھ کے چلی جاؤں اور اس سے بے عزتی کس کی ہوتی...... تیری ہی ناں...... ویسے بھی میں تو گھر پر ہی تیرا انتظار کر رہی تھی۔ وہاں جانے کے لیے نہیں تیار ہوئی تھی۔''

جب دو تین بار تکرار ہو چکی تو وہ ایاز سے روٹھ گئی۔ اور یہ اس کا سب سے کامیاب حربہ تھا۔ ایاز اسے منانے میں بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہمیشہ رہا تھا۔

لیکن اس کی بات زُہرہ کے دل میں کھب کر رہ گئی تھی۔ اس کے لاشعور سے ایک بے داغ چہرہ بار، بار نکل کر سامنے آتا اور وہ بری...... طرح جھنجلا جاتی۔

ابھی اسی دن کی گرد نہیں بیٹھی تھی کہ ایاز کے منہ سے بچے کی ضرورت کی بابت ایک جملہ نکلا۔

زُہرہ کو پہلے کئی دنوں تک چلنے والی تلخی یاد تھی۔ اور ایاز کی اچانک پڑ جانے والی ضرورت کے محرکات کی بھی۔ وہ بنا کچھ کہے اس کی بات کو دل ہی دل میں تولتی رہی۔ جیسے ایاز کی سنجیدگی کا اندازہ لگانا چاہتی ہو...... بظاہر تو وہ ناشتا کر رہا تھا۔ شاید اس نے یونہی ایک بات کی تھی لیکن زُہرہ جانتی تھی یہ بات اتنی بھی یونہی نہیں......

اس نے آگے سے کوئی بحث نہیں کی۔ وہ چاہتی تھی جتنے ہلکے موڈ میں ایاز نے بات کی ہے اتنی ہی آہستگی سے اس کا دھیان ہٹ جائے۔

پر ایسا نہیں ہو سکا......

☆☆☆

پنو کا بیٹا ابھی بہت کم عمر تھا۔ ایک چھ، سات سال کا بچہ بھلا کیا کر سکتا تھا۔ جو یتیم تھا اور جس کی ماں کا اس دنیا میں شوہر کے بعد کوئی سہارا نہ تھا لیکن زُہرہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے سنا کہ پنو، بلو کے اسکول میں آلو کے چپس بیچنے لگی ہے۔

وہ بریک کے وقت چپس بنا کے وہاں لے جاتی اور بلو بھاگم بھاگ، جا کے اپنے اسکول کی ٹیچرز کو چپس کی پلیٹیں پکڑا آتا۔

''اتنے سے بچے کو کام پر لگا دیا......'' زُہرہ کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''ائے ہائے اسے کہاں لگایا۔ وہ تو بیچارہ بس اس کا ہاتھ بٹا دیتا ہے......''

''اور وہ جو ٹیوشن پڑھا رہی تھی؟''

''اسے کتنا پڑھانا آتا ہے بھلا۔ الف، بے سکھا دے گی۔ زیادہ سے زیادہ...... اے بی سی...... اس سے بھلا کیا بنتا تھا۔ اب سنا ہے کہہ رہی تھی شام میں بھی بنایا کرے گی۔ جس کو منگوانے ہوں گے اپنے بچے کے ہاتھ اس کے گھر بھیج دیا کرے گی...... بس اللہ برکت دے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔'' سمو ہی خبریں لایا کرتی۔

زُہرہ کے دل میں لمحے بھر کو ترس جاگ گیا...... جسے فوراً ہی پنو کی شکل کی ایک جھلک نے میٹھی نیند سلا دیا۔

''لو بھلا...... آلو کے چپسوں سے بھی گھر چلا کرتے ہیں۔''

''ہاں بالکل...... گھر تو مرد کی کمائی سے ہی چلتے ہیں۔ ایاز بھائی بھی یہی کہہ رہے تھے اس دن......'' سمو نے بات کرتے کرتے پتا خاچھوڑ دیا۔

''کیا......؟ ایاز...... کس سے، کس دن......؟''

اتنے سارے سوال...... زُہرہ جیسے بوکھلا سی گئی۔

''ارے ان سے ملے ہوں گے کہیں باہر تو بات ہوئی تھی۔''

سمو بھی روایتی بیویوں کی طرح اپنے شوہر کا نام لینے سے کتراتی تھی۔ یہ فیشن بھی زُہرہ نے ہی اپنایا ہوا تھا۔

اس نے نوٹ کیا کہ سمو جب بھی آتی تھی اسی پنو منحوس کا نام لے کے بیٹھ جاتی تھی۔

ایاز بھلے پہلے سے زیادہ میٹھا ہوتا جاتا لیکن زُہرہ کے دل میں پنو نے آگ لگا رکھی تھی۔

محلے کی مسجد کے امام نے اِک دن پھر سے جوان بیواؤں سے نکاح کا بیان دے دیا۔ یہ بات بھی اسے سمو نے ہی بتائی تھی۔ تب سے زُہرہ جیسے جلتے توے پر بیٹھی تھی۔

''ہو نہ ہو ایاز کے دل میں ضرور اس سے شادی کا خیال آ سکتا ہے۔ کیوں نہیں...... وہ بھی تو ایک مرد ہے۔ ابھی اگر بچوں کا خیال آ گیا تو شادی کا کیوں نہیں......''

اپنے ہی جلے کٹے خیالات میں گھر کر صبح سے شام کرتی تو آفس سے واپس آئے ایاز کے منہ سے اگر غلطی سے بھی پنو کا ذکر نکل جاتا تو زُہرہ کس دل سے برداشت کرتی تھی یہ وہ خود ہی جانتی تھی۔

اسے اپنے دل پہ بیتنے والی تو خوب پتا تھی لیکن اس بات کی خبر نہیں تھی کہ کس کارن وہ اس آگ میں جل رہی ہے۔ ایک ایسی آگ جس میں حقیقت میں کوئی بجھا ہوا انگارہ تک نہ تھا۔

ایاز کے دل، دماغ میں تو ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں۔ وہ تو محلے والوں کی دیکھا دیکھی اور پنو کے سسرال والوں کا سلوک دیکھ کر اگر اس کی ہمدردی میں کچھ کر رہا تھا تو اس میں انوکھا کیا تھا۔ وہ تو اور لوگ بھی کر رہے تھے۔ لیکن زُہرہ کی صرف خود کو دیکھنے اور خود ہی کو سوچنے کی عادت نے آج اسے اس حال میں پہنچایا تھا۔

اس رات ذرا دیر سے واپسی ہوئی۔ زہرہ نے بہت دل لگا کے باہر کھانا کھانے کی فرمائش کی تھی۔ لیکن ایاز کو دیر ہو گئی۔

''وہ میں خالہ رسولاں کے یہاں تھوڑا راشن

دینے چلا گیا تھا۔ ابھی اس بیچاری نے آلو کے چپس بنانے شروع ہی کیے تھے کہ آلو اور تیل دونوں ہی مہنگا ہوگیا۔ میں نے سوچا میں......"

وہ زُہرہ کے دل سے بے خبر اپنی کہے جا رہا تھا۔ زہرہ نے کچھ دیر تو برداشت کیا پھر ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس زمین پر دے مارا۔

ایاز اس حرکت کے لیے کہاں تیار تھا، اس نے معاملے کو لمحے بھر میں بھانپ کر زہرہ کی شکل دیکھی۔

"کیا ہوا تجھے زُہرہ...... تجھے برا لگا میرا وہاں جانا۔"

وہ منہ پھیر کے کھڑی رہی۔

"اچھا چل میں نہیں جاؤں گا...... اگلی واری تو جا کے دے آنا...... مجھے پتا ہے تو میرے وہاں جانے سے چڑتی ہے...... پر نیکی سے تو نہیں چڑتی ناں...... چل اب غصہ تھوک دے۔"

اس نے فی الفور ایسی بات کی کہ زہرہ کی سمجھ میں نہ آیا، اب ہنسے یا روئے...... اس کے ساتھ بحث بھی کیا کی جا سکتی تھی اس نے بات ہی ختم کر دی تھی۔

☆☆☆

آنے والا وقت زُہرہ کے لیے خود ہی مشکل سے مشکل ہوتا گیا۔ اس نے ایاز کے کہنے پر خود کو رسولاں خالہ کے گھر جانے پہ آمادہ کیا۔ ورنہ وہ دوسری عورتوں کی طرح ان کے گھر کے چکر لگاتی تھی نہ تسلی ڈھارس جیسے جذبے کو کوئی اہمیت دیتی تھی۔

بادلِ ناخواستہ وہ جانے تو لگی لیکن اس لگاوٹ کا مظاہرہ نہیں کر پاتی تھی جو وہاں آنے والی دوسری خواتین کا خاصہ تھی۔

لگائیاں بجھائیاں، غیبت ان سب کی زندگیوں کا حصہ تھی، وہ بھی اس طرح کہ کسی کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔

خالہ کا گھر بھی بظاہر انسانیت اور ہمدردی کی عملی تصویر نظر آتا تھا۔ لیکن وہاں سے باہر نکلتے ہی وہ سب پھر سے عام سی عورتیں ہوتیں...... وہی برائیاں، جلن، عیب جوئی......

گھر

گھر کیا ہے؟ گھر وہ جگہ ہے جہاں سب ہنسی، خوشی، پیار اور عزت سے رہتے ہوں، ایک دوسرے کی مدد کرنا جانتے ہوں۔ تحمل و برداشت ہو۔ عزت کرنا اور دینا آتا ہو تب گھر، گھر کہلاتا ہے۔ لیکن آج کے اس معاشرے میں نہ تو ایسے گھر نظر آتے ہیں نہ گھروں میں سکون ہے۔ اور یہ سکون برباد کرنے کی وجہ بھی ہم خود ہی ہیں، اگر تھوڑا صبر کر لیں تھوڑا برداشت کر لیں تو اس سے کیا ہوگا، کوئی ہماری جان و مال میں تو فرق نہیں آئے گا ناں...... جہاں پر ساس، بھابیوں اور نندوں کی نہیں بنتی وہاں آج کل میاں، بیوی کی بھی نہیں بن رہی۔ اس میں بھی ایک دوسرے کا احترام اور عزت لازمی ہے۔ میاں، بیوی کے اتنے پیارے خوب صورت رشتے کو سمجھنے کے بجائے الجھا لیتے ہیں۔ شوہر مجازی خدا ہے۔ وہ عورت کا محافظ ہے، کفیل ہے آپس کے اعتماد سے ہی گھر بنتا ہے، شوہر سے ہر بات شیئر کریں۔ عزت دیں پھر دیکھیں شوہر آپ کی کتنی عزت کرتا ہے اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو شوہر اور بیوی سے بڑھ کر ایک دوسرے کا غم گسار کوئی نہیں۔ میاں، بیوی ہی ایک دوسرے کا ساتھ نبھاتے ہیں اور نبھانا بھی چاہیے۔

شوہر گھر بنانے کا سامان مہیا کرتا ہے راہیں، ہموار کرتا ہے اپنے خاندان کو ہر طرح سے خوش اور مطمئن رکھتا ہے اور عورت بحثیت بیوی اس کے ہم قدم ہوتی ہے جبھی ایک پُرسکون گھر بن پاتا ہے۔

اگر گھر میں ہر آسائش ہو پر وہ گھر عزت اور پیار سے محروم ہو تو وہ گھر نہیں کہلاتا، آج بہنوں اگر میں یہ سب لکھنے کے قابل ہوئی ہوں تو مجھے اپنے شوہر کی بہت سپورٹ ہے۔ ہم ایک دوسرے کی بہت عزت کرتے ہیں۔ آج اگر میری وہ نادان بہنیں جو اپنے شوہر کی وجہ سے پریشان ہیں یا میرا کوئی بھائی اپنی بیوی کے رویے سے پریشان ہے تو ایک دوسرے کی پسند ناپسند اور رائے کا احترام اور صبر کا ساتھ نہ چھوڑیں، مل بیٹھ کر اپنی غلط فہمیوں کو دور کریں اپنے گھر کو امن کا گہوارہ بنا دیں تبھی تو بہترین معاشرہ تشکیل پائے گا۔ صرف میاں بیوی کے رشتے میں ہی نہیں ہر رشتے کو بچانے اور خوب صورت بنانے کے لیے یہی اصول اپنا لیں۔

دعا گو...... بختاور ابڑو، اوستہ محمد، بلوچستان

ہر بار پینو کے گھر سے واپسی پر اس کے منہ کوئی لگی ہوتی۔ اس کی بیوگی سے، پہلے بھی وہ کوئی خاص مغموم نہ تھی کہ بھئی یہ تو قسمت کی بات ہے لیکن اب جب سے ایاز نے اس کا خیال کرنا شروع کیا تھا بقول زُہرہ درد سری پالی تھی۔ تب سے وہ ٹھیک ٹھاک خار کھانے لگی تھی۔

''یہ کوئی بات ہے۔ میں یہاں اپنے خاوند کے انتظار میں بیٹھی ہوں اور وہاں جناب کسی اور کے ساتھ لگے ہیں۔''

کچھ نئی بات نہیں تھی کہ ایاز آفس سے واپسی پر سیدھا وہاں چلا گیا۔ رسولاں خالہ کی طبیعت خراب تھی اور وہ دوائیں خریدتا ہوا آیا تھا۔ سو جا دیری کس بات کی۔ جتنی جلدی دوا ملے گی اتنی جلدی چنگی ہوگی۔

وہاں اندر سے نکلتے پینو کے جیٹھ سے سلام دعا ہوئی اور بس۔ اس نے تو دہلیز سے ایک قدم تک اندر نہ رکھا تھا لیکن زُہرہ کچھ سننے کو تیار ہوتی تب ناں......

''کسی اور کے ساتھ لگے ہیں مطلب......؟''

ایاز کی تیوری اس کے تیکھے الفاظ سے چڑھی تھی۔

''خود بھی سمجھدار ہو، کوئی بچے نہیں جو عقل میں بات ہی نہ آئے۔''

''پاگل ہوگئی ہے کیا۔ کیوں فضول باتیں کر کر کے دماغ خراب کر رہی ہے۔''

''دماغ تو میرا خراب ہوگیا ہے۔ دن رات پینو، پینو...... اور کوئی بات ہی نہیں بچی کرنے کے لیے......''

''تیرے پاس بات نہیں بچی، اس کا سوچا ہے جس کا شوہر ہی نہیں بچا۔ سر اِلی دن رات گھر خالی کرنے کو بول رہے ہیں...... تو، تو مجھ سے کہہ کے ہلکی ہو جاتی ہے۔ اور بات نہیں بچی تو چپ کر کے بیٹھ۔''

زُہرہ کو تو کسی نے بھڑوں کے چھتے پر بٹھا دیا۔

''اچھا...... بڑے مروڑ اٹھ رہے ہیں تیرے پیٹ میں۔ وہ پہلی بیوہ ہے دنیا کی...... اس سے پہلے کسی کا خصم نہیں مرا کیا۔ اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی ہے۔ مجھے بھی تو پتا چلے۔''

''تجھے کیا پتا چلے گا۔ آنکھیں کھول کے دل کو بڑا کر کے دیکھ...... وہ جوان بھی ہے۔ خوب صورت بھی ہے۔ ایسی عورت کا مرد نہ ہونا اس کا گناہ بن جاتا ہے۔ بجائے رب کا شکر ادا کرنے اور پیار کے دو بول بولنے کے۔ تو روز وہاں جا کے پتا نہیں کیا، کیا بک کے آتی ہے۔ اب تو خالہ نے بھی کہہ دیا ہے کہ اتنی مہربانی نہ کر کہ لوگوں کی زبانیں کھل جائیں۔''

''زبان۔''

''خوب صورت۔''

''پیار کے بول۔''

''بک بک......''

سن، سن، سن...... سنسناتے ہوئے تیر اس کی زبان سے نکل کے، زُہرہ کے سینے میں پیوست ہوگئے۔

ایاز سیدھا سادہ آدمی تھا۔ اسے زبان کے داؤ پیچ نہیں آتے تھے۔ اسے کیا پتا تھا کہ جو بات وہ اپنی سادگی میں کہہ رہا ہے اس کی گھر والی کتنا بڑا بتنگڑ بنا دے گی۔

جھگڑا ہوا پھر بڑھا اور آوازیں اتنی اونچی ہو گئیں کہ چار دیواری سے باہر نکل گئیں۔

ایک چٹپٹا موضوع سب کے ہاتھ لگا سو لگا، زُہرہ نے خود بڑھ، بڑھ کے معاملے کی سنگینی کو ہوا دی۔ ہر، ہر زبان پہ مہ وہ، وہ چرچے ہوئے کہ ایک دن پینو، ہاتھ جوڑے اس کے آگے بلک ہی پڑی۔

''آپ کو اللہ کا واسطہ ہے۔ ایسی ہمدردی نہ کریں جو میری آخرت خراب کر دے۔ میں غربت اور تنگدستی سہہ سکتی ہوں لیکن بدنامی کسی صورت نہیں......''

اس کے سفید چہرے پر آنسوؤں کی قطاریں بہہ نکلیں، کس مشکل سے اس نے دو جملے بولے۔ اور ایاز کو آئندہ وہاں آنے سے منع کرنے کے بعد لڑکھڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔

وہ چارپائی کی پائنتی پر بیٹھی خالہ رسولاں سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہا۔ دل میں غم اور غصے نے اودھم مچا کے رکھ دیا۔ اسے پہلی بار زُہرہ پہ ایسا طیش آیا جو بالکل نیا، اجنبی اور تباہ کن تھا۔

گھر آ کے اس نے زُہرہ سے کوئی دوسری بات

نہیں کی۔

وہ اس کے نزدیک ذہری گناہ گار تھی۔ اس نے پچو کی جلن میں اپنی عزت بھی خراب کر لی تھی۔ وہ ایاز سے معافی مانگ کر اسے منا بھی لیتی تب بھی وہ پچو کی تو گناہ گار تھی۔

"کل تو جائے گی۔ رسولاں خالہ کے گھر...... اور پچو اور خالہ سے معافی مانگے گی......"

زُہرہ پہلے تو اس کے تیور دیکھ کے سہم گئی لیکن پچو کا نام سن کے اسے آگ ہی تو لگ گئی۔

"کس بات کی معافی...... اور میں کیوں......؟"

"دیکھ زُہرہ!" اس نے بہت تحمل سے اس کی بات کاٹی۔

"جو بھی جھوٹی سچی بکواس تو نے پچو کے بارے میں کی ہے۔ مجھے سب پتا چل گئی ہے۔ میں مرد ہوں مجھے فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اسے پڑتا ہے۔ تجھے اندازہ نہیں ہے تو نے اسے خبر بنا کر کیسے، کیسے رکے ہوئے قدموں کو بڑھاوا دیا ہے۔ اب اس کی تلافی تو ہو نہیں سکتی لیکن تیرے معافی مانگنے سے کم از کم میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگا۔ میں یہی چاہتا ہوں۔" اس کا لہجہ بے حد ٹھنڈا لیکن دوٹوک اور ہموار تھا۔ وہ بات مکمل کر کے رکا نہیں۔ اسے ہکا بکا چھوڑ کے نہانے چل دیا۔

نہا کے نکلا تو زہرہ بڑے آرام سے پُرسکون انداز میں، اس کے لیے معمول کے مطابق کھانا لے آئی۔

اس کے ہموار تیوروں کے پیچھے کیسا طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔ اگر ایاز جان جاتا تو شاید زہرہ کو لے کے پچو کے بجائے وہ خود یہ محلّہ چھوڑ دیتا۔

☆☆☆

"پچو کے منہ پر کسی نے تیزاب پھینک دیا۔"

تیزاب کی طرح جلتی ہوئی خبر اگلے کچھ دن کے بعد اس کے کانوں میں پڑی...... اس کا وجود جل اٹھا۔ تکلیف اور اذیت ایک ایک رگ میں سما گئی۔ سنتے ہی بھاگم بھاگ اسپتال پہنچا۔ حالت خراب تھی۔ حالانکہ کسی نے بتایا کہ اس کے نقاب اور بروقت منہ ہٹا لینے کی وجہ سے پورا چہرہ تو جھلسنے سے بچ گیا۔ لیکن حالت اب بھی خطرے سے باہر نہ تھی۔

خالہ رسولاں سینہ پیٹ، پیٹ کر دہائیاں دے رہی تھی۔

کچھ پتا نہیں تھا کس نے کیا اور کیوں کیا۔

"ہائے، ہائے ظالم...... میری پچو کی تو کسی سے دشمنی بھی نہ تھی۔"

پولیس کیس تھا۔ سسرالی رشتے دار جو گھر بیچنے کے لیے زور لگا رہے تھے خود بخود دائرۂ تفتیش میں آ گئے تھے۔

ان کی بوکھلاہٹیں عروج پر تھیں۔ انداز بتاتے تھے کہ وہ خود بدحواس ہیں۔ وہ اس درجے نیچ نہیں ہو سکتے لیکن کیا کیجیے کہ اس عالم میں کسی پر بھروسا بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

محلے کے گھروں سے کئی عورتیں خالہ کے پاس جمع تھیں۔ پولیس بیان لینے کو اس کے ہوش میں آنے کی منتظر تھی۔

اس کا ننھا سا لختِ جگر پریشان حال ایک کونے میں بھوکا پیاسا بیٹھا سسکیاں بھر رہا تھا۔

ایاز کا کلیجا کٹ سا گیا۔ اس نے اسے پیار کیا۔ گود میں اٹھا کے تسلی دی۔ وہ کئی گھنٹے کا بھوکا تھا۔ اسے کینٹین لے جا کر کھانا کھلایا۔

خجل خواری اور آبلے کی طرح سلگتے دل کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہوا تو اسے جھٹکا لگا۔

☆☆☆

ایاز کو اس سے پہلے کبھی، زہرہ شام کے وقت تیار ہو کر اپنا انتظار کرتی اتنی بری نہیں لگی تھی جتنی آج لگ رہی تھی۔

اس کے انداز سے لگتا تھا جیسے اسے کسی بات کا پتا ہی نہیں یا اگر پتا ہے تو پروا نہیں......

"پچو کے بارے میں سنا......؟" اس نے کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں...... کیا؟"

ایاز نے بغور اس کا چہرہ کھوجا۔

''اس کے منہ پر کسی نے تیزاب پھینک دیا ہے۔''
''ہا...... ہئے...... یہ تو بہت برا ہوا۔''
الفاظ کے برعکس اس کے انداز میں کہیں بھی ایک اندوہ ناک خبر کے اچانک سن لینے والے تاثرات نہیں تھے۔ حالانکہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو سن کے ہی دہل جاتی۔

ایاز نے سر جھٹک دیا۔
''میرے ذہن میں اس کا معصوم بچہ گھوم رہا ہے۔''
زُہرہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ بڑی رغبت سے مسالے والی دال کھا رہی تھی۔ شاید پہلی بار...... کیونکہ یہ دال وہ ہمیشہ ایاز کی خواہش پر مہینوں بعد بناتی بھی تو اپنے لیے ضرور کچھ اور ساتھ رکھتی تھی۔ کچھ نہ ہوتا تو انڈا ہی تل لیتی۔

اس کے انداز آج بڑے عجیب تھے۔ ایسا واقعہ دور و نزدیک کے کسی محلے، رشتے دار کے گھر کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ اور زہرہ ایسے تھی جیسے یہ روز کی بات ہو۔ اس نے ایک بار بھی، پینو کی طبیعت نہیں پوچھی۔ نہ اس کے بیٹے کی بابت کوئی سوال کیا۔ نہ رسولاں خالہ کو پوچھا۔ پینو کے بیٹے کی یاد آتے ہی اس کا دل عجیب سے احساس سے بوجھل ہو گیا۔

''آج اگر ہمارے گھر میں بچے ہوتے تو میں کچھ دیر کو اسے گھر لے آتا۔ اس کا دل بہل جاتا۔''
زُہرہ کا ہاتھ رک گیا۔ ناگواری سے ماتھے پر شکن آ گئی۔
''کیوں......؟ اس کے اپنے چاچے، تائے نہیں ہیں کیا۔ رکھ لیں گے وہی۔'' اس کا انداز کس قدر بے پروا تھا کسی پر قیامت گزر گئی تھی۔ اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں تھی۔

''وہ لوگ خود پریشان ہیں۔ پولیس ان پر شک کر رہی ہے۔''
''ویسے ان کا کام نہیں ہے یہ۔''
روانی میں ایک دم اس کے منہ سے نکلا۔ اگلے ہی لمحے ایاز کو اپنی طرف دیکھتا پا کے وہ گڑبڑا گئی۔
''میرا مطلب ہے۔ ایسی حرکتیں تو یاریوں میں ہوتی ہیں۔ دکھائے ہوں گے کسی کو ہرے باغ۔''

ایاز کو ایک دم غصہ چڑھا لیکن اس نے ضبط کر لیا۔
''بغیر کسی ثبوت کے، کسی پر بہتان لگانا۔ وہ بھی کسی کے کردار پر، کوئی اچھی بات نہیں۔''
''ہاں لیکن ثبوت ملے گا تب کی بات ہے ناں...... پولیس کہاں کوئی کیس حل کرتی ہے۔ غریبوں کے لیے تو ویسے ہی انصاف نہیں ہے۔''
ایاز کے دل میں بار، بار کوئی پرندہ پھڑ پھڑاتا اور لمحے بھر کے بعد دُبک جاتا۔
''ساری بات پینو بہن کی ہے۔ ابھی اس کا بیان باقی ہے۔''
پانی پیتے ہوئے زُہرہ ایک لمحے کو کھنکھاری۔ اس کے گلے میں کچھ پھنس گیا تھا لیکن ایاز ہاتھ دھونے اٹھ چکا تھا۔
بیسن پر ہاتھ دھوتے سے اس نے باورچی خانے کی کھڑکی سے سنک میں چائے کے دو جھوٹے کپ رکھے دیکھے اور خاموشی سے ہاتھوں پر پانی بہانے لگا۔

☆☆☆

ٹھیک ہی کہا تھا زُہرہ نے پولیس بھلا غریبوں کو کہاں لفٹ کراتی ہے۔
پینو کے ہوش میں آنے کے بعد اس کا بیان قلمبند کیا گیا۔ کچھ دن پوچھ گچھ ہوئی لیکن پینو حملہ آور سے مکمل انجان تھی۔
ایاز کو ساری تفصیلات محلے والوں سے ملتی رہیں لیکن کسی انجانی احتیاط کے پیشِ نظر وہ خود وہاں نہیں گیا۔ وہ کافی دن زیرِ علاج رہی۔ پھر گھر آنے کے بعد اس نے زُہرہ سے اس کی عیادت کو کہا۔
اس نے دوسرے دن بتا دیا کہ وہ پینو کے گھر سے ہو آئی ہے۔
''بڑی تکلیف میں ہو گی بیچاری۔''
''ہوں۔'' اس کا انداز ازلی بے پروا تھا۔ وہ اپنے نئے سوٹ کی فٹنگ دیکھ رہی تھی اور مکمل طور پر اس میں گم تھی۔
''اب تو اس کا منہ پورا خراب ہو گیا ہو گا۔''

''ہوں پتا نہیں۔'' اس نے جھنجلا کے آستین جھٹکی پھر اپنے جھٹکے سے خود ہی چونک گئی۔

''ہاں وہ میرا مطلب ہے کہ انہوں نے اس کا منہ تھوڑا ہی دکھایا کسی کو۔ وہ تو چادر ڈال کے چھپایا ہوا تھا۔''

ایاز کی اندر تک اترتی نظریں اسے نظر چرانے پر مجبور کر رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر گہری سانس بھر کے چپ ہوگیا۔ اس نے یہ نہیں جتایا کہ بُنتوں میں تہ در تہ لپٹے ہوئے چہرے پر کون چادر ڈالتا ہے اسے تو شناخت کرنا ہی مشکل ہوتا ہے۔

☆☆☆

''پینو پر جس نے تیزاب پھینکا تھا اسے پولیس نے پکڑ لیا ہے اور اس نے بندے کا نام بتا دیا ہے جس نے اسے بھیجا تھا۔''

اگلے دن آفس سے واپسی کچھ جلدی ہوئی تھی اور اس نے گھر آتے ہی پہلی بات جو کی اسے سن کے زُہرہ کا منہ فق ہوگیا۔ اس نے تھوک نگل کے ایاز کا منہ دیکھا۔

''پھر...... کیا کہا اس نے؟'' وہ کچھ کہے بغیر اس کا منہ دیکھتی رہی۔

''اب بھی تم پوچھ رہی ہو کہ اس نے کیا کہا؟''

وہ انگلیاں مروڑنے لگی۔ ایاز نے سختی سے اس کا بازو پکڑا۔

''کوئی بات چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے زُہرہ...... مجھے سب کچھ پتا چل چکا ہے...... سب کچھ...... اور مجھے یقین نہیں آتا کہ تم......''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ زُہرہ اس کے پیروں میں گر کر دھاڑیں مار، مار کر رونے لگی۔

وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی پچھل پیری دیکھ لی ہو۔

☆☆☆

تھکے، تھکے قدم گھر کی طرف ڈھلان سے اترنے جیسے پڑ رہے تھے۔ جسم اور اعصاب پر بے انتہا بوجھ تھا۔ وہ گھر کی طرف جا رہا تھا لیکن ایسے۔ جیسے اسے پیچھے سے زبردستی دھکیلا جا رہا تھا۔

آنکھوں کے سرخ ڈوروں میں بار، بار نمی چھا جاتی جسے وہ کبھی پلکیں جھپک کے کبھی انگلی کی پور سے جھٹک دیتا۔ جھکا ہوا سر بے انت افسوس کا غماز تھا۔

صورت، سیرت اور فطرت کا آپس میں کوئی تال میل ہوتا تو...اچھے اور برے لوگوں میں تمیز کرنا کتنا آسان ہوتا۔

یہ اچھا ہے، یہ بہت اچھا اور یہ بے عیب......

یہ برا ہے، یہ بہت برا اور یہ مکمل برا ہی برا......

اس نے گھر کے دروازے پر رک کر، ایک خالی، خالی نگاہ دروازے پر ڈالی۔

اس دروازے سے اندر داخل ہوتے سے کبھی اس کا دل جوش و جذبے سے بھر جاتا تھا۔ آج اتنا ہی مردہ تھا۔

''ایاز بھائی...... زُہرہ کو کچھ عقل دیں...... پاگل ہی ہوگئی ہے۔ پینو کے ساتھ اتنی بڑی بات ہوگئی اور اس نے جا کے ایک بار بھی نہیں پوچھا...... حالانکہ میں سب سے پہلے بھاگی، بھاگی اسے ہی بتانے گئی تھی...... پر وہ تو ایسے مزے سے بیٹھی رہی جیسے اسے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔''

سمو نے ایک دن راستہ چلتے میں رک کر اسے یونہی بتایا تھا اور اس کے ذہن میں وہ سنک گھوم گیا تھا جس میں چائے کے دو گندے کپ پڑے تھے۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن ایاز کے ذہن میں کسی انہونی کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ اس کے بے پروا رویے نے ہی ایاز کے شک پر یقین کی مہر لگائی تھی۔

کوئی لڑکا پولیس کو ملا نہ کوئی چھان بین ہوئی لیکن اس کے اپنے ہی گھر میں سانپ کا بل نکلا۔ وہ حیران ہوا، بے یقین پھر دکھی، شدید دکھی، کئی دن دکھ اور افسوس و پچھتاوا اسے انگاروں پر نچاتا رہا۔ اور بالآخر اس کی جگہ شدید غیظ نے لے لی...... زُہرہ دن رات اس سے معافی مانگتی رہتی اور اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس کا منہ بھی اسی طرح تیزاب سے جھلسا دے۔

اسے کسی نے بتایا تھا کہ پینو کا چہرہ بچتے، بچتے بھی

ہونٹوں اور ٹھوڑی کے پاس سے اتنا مسخ ہو گیا کہ اس کا اپنا بیٹا اس کے پاس آنے سے ڈرنے لگا تھا۔

یہ آخری خبر تھی جو اس نے چو کے بارے میں سنی اور اسی خبر نے اسے وہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔ جس کے بارے میں وہ عام حالات میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور جو پہلے دن سے خدشہ بن کر زُہرہ کی نیندیں حرام کیے ہوئے تھا۔

"میں نے چو سے نکاح کر لیا ہے۔"

زُہرہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ کے زمین پر آ رہی۔ اس نے دہل کے لبوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ گرم گرم چائے ایاز کے کپڑوں اور پیروں کو جلانے لگی۔ کمرے میں شور کے بعد گہرا سکوت چھا گیا۔

ایاز پتھر کے بت کی طرح ساکت تھا۔ اس کے وجود میں اِک ذرا سی بھی جنبش نہیں ہوئی۔ زُہرہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اس کا پتھرایا ہوا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جو اس کی حالت سے بے خبر اپنی ہی کیے جا رہا تھا۔

"میں نے بساط بھر تمہاری ہر خواہش پوری کی۔ ہر بات تمہاری مانی۔ مجھے تم سے محبت بھی تھی۔ کسی کو بھی ہو سکتی تھی۔ کیونکہ تم خوب صورت ہو لیکن مجھے افسوس ہے تمہارا صرف ظاہر خوب صورت ہے۔ اندر سے تم ایک گھٹیا اور بدصورت عورت ہو۔ بھول تھے، غلط تھے وہ سب الفاظ اور خیالات جو میں تمہاری مدح میں کہتا رہا اور تمہارے بارے میں سوچتا رہا۔ تم نے چو کی خوب صورتی کو دیکھ کے میری وفا پر شک کیا۔ میری نیت پر بدگمان ہوئی۔ اور اس بات کا انکشاف ہوتے ہی میں نے سخت شرمندگی محسوس کی۔ جب انسان بے گناہ ہو اور اس کا اپنا شریکِ حیات اسے شک کی نگاہ سے دیکھے تو وہ اپنی ہی نظروں میں گر جاتا ہے۔ بے اعتباری اسے گھن کی طرح اندر سے کھانے لگتی ہے۔ اپنا اعتبار نہ دے پانے کا احساس روگ بن جاتا ہے...... لیکن اس سے بڑھ کے دکھ مجھے اس بات کا تھا کہ تم نے چو کی ظاہری خوب صورت دیکھ لی۔ لیکن میری باطنی خوب صورتی نہیں دیکھ سکیں۔ تم سمجھی تھیں میں چو کے ظاہر سے موم ہو جاؤں گا...... پھسل جاؤں گا۔ بہک جاؤں گا۔"

اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ جھلکی۔

"بیوقوف...... اگر مجھے ظاہر پر ہی مرنا ہوتا تو میرے لیے تم کافی نہیں تھیں۔ اگر میں بھٹکنے والا ہوتا تو دنیا میں صرف چو ہی پہلی اور آخری عورت تھی کیا۔

لیکن اب وہ میری بیوی ہے۔ اب اسے میں نے اپنی زندگی میں شامل کر لیا ہے...... اب جبکہ اس میں ظاہری طور پر کشش نہیں...... ہاں لیکن اس کا باطن بے داغ اور پاکیزہ ہے۔ کیونکہ تم نے جب اس کی کردار کشی کی تھی تو اس نے خود مجھ سے ہاتھ جوڑ کر التجا کی تھی کہ میں اس سے ہمدردی نہ کیا کروں۔ اس نے میرے دیے ہوئے پیسے، میرے ہاتھ میں نہیں، میرے پیروں کے پاس زمین پر ڈالے تھے اور اس وقت بھی میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ وہ نقاب میں تھی۔"

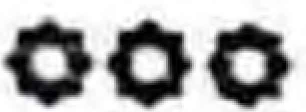
وہ رکے بغیر آرام سے بولتا چلا گیا۔ جیسے جانے کب کا غبار آج کہیں جا کے نکالنے کا موقع ملا ہو۔

"جس خوب صورت ظاہر کے پیچھے تم خوار ہوئیں، وہ نہ کل میرے راستے میں تھا نہ آج ہے...... کاش تم نے بھی صورت کے بجائے کردار پرکھنا سیکھا ہوتا۔ کاش تم نے اپنے بجائے کسی اور طرف بھی دیکھا ہوتا۔ کاش تم نے ظاہر کے بجائے، کسی کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی ہوتی......"

زُہرہ کی سانسیں چکی کی طرح چل رہی تھا۔ اس کی حالت غیر تھی۔ یوں لگتا تھا وہ کسی بھی سے زمین پر ڈھے جائے گی۔ لیکن ایاز نے اس پر ایک نگاہِ غلط انداز تک نہ ڈالی۔

وہ اٹھا اور اپنی داغدار قمیص کو جھاڑتا ہوا باہر چلا گیا۔

اسے اطمینان تھا، سکون تھا کہ کپڑے بے شک خراب ہو گئے تھے لیکن اس نے کسی کی بگاڑی ہوئی ایک زندگی کو سنوارنے کی کامیاب کوشش ضرور کی تھی۔





بہترین انتقام

فرحت جبین

"آئی ایم سوری اجمل؟ میں امی کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ مجھ میں اتنا حوصلہ ہے اور نہ ہی ہمت کہ انہیں سنبھال سکوں۔" رات کے کھانے کے برتن سمیٹ کر اس نے سبز قہوے سے بھری پیالیاں میز پر لا کر رکھیں۔ اور

اپنے ان قیمتی خیالات کا اظہار کیا۔ کھانے کے بعد بچیاں اپنے کمرے میں چلی جاتی تھیں اور وہ دونوں میاں، بیوی سبز قہوے سے لطف اٹھاتے ہوئے ٹی وی پر اپنا من پسند

یہ وقت وہ دونوں اکٹھے گزارتے تھے۔
''یار اتنی سنگدل تو نہ بنو......امی کو ہماری ضرورت ہے۔ وہ بیچاری کہاں جائیں اب......؟'' اکمل دھیمے لہجے میں بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
''جہاں وہ ساری زندگی رہی ہیں وہیں رہیں ناں......جن لوگوں کی خدمت میں دن رات ایک کرتی رہی ہیں کیا اب ان سے خدمت نہیں کرواسکتیں؟''
اکمل اس کی ناراضی سے بخوبی واقف تھا۔ وہ اسے حق بجانب سمجھتا تھا لیکن اس وقت وہ ماں کی مجبوری سے بھی واقف تھا اور ان کے مزاج سے بھی۔
''بھابی امی کا ویسے خیال نہیں رکھ سکتیں جیسے کہ تم رکھ سکتی ہو۔'' وہ اس کا ہاتھ نرمی سے پکڑ کر کہہ رہا تھا۔
ادیبہ کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔
''یہ کیوں نہیں کہتے کہ ساری عمر امی سے فائدہ اٹھا کر اب تمہاری بھابی انہیں بوجھ سمجھ رہی ہیں۔ جب تک انہیں امی کی ضرورت رہی انہیں اپنے پاس رکھے رکھا۔ اب جب وہ بوڑھی ہوگئی ہیں، کمزور ہوگئی ہیں تو اُن کے لیے بیکار ہوچکی ہیں، بستر سے لگ چکی ہیں تو وہ چاہتی ہیں کہ چھوٹا بیٹا اور بہو انہیں لے جائیں۔ اب امی کی ذات سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ وہ ان سے خدمت...... لے، لے کر ان کی ہڈیاں تک تو گلا چکی ہیں۔ اب بھلا وہ ان کے کس کام کی۔'' اکمل اس کی بات پر خاموش ہوگیا تھا۔ ادیبہ کا بے رحم تبصرہ حرف بہ حرف درست تھا۔ ایسا ہی تھا جیسا وہ کہہ رہی تھی۔ اسے کل رات ہی بھابی نے فون کیا تھا کہ وہ امی کو اپنے ہاں لے جائے...... بچے بڑے ہوچکے ہیں......عدنان کی شادی کرنی ہے جس کے لیے انہیں علیحدہ کمرا درکار تھا۔ ایسے میں گھر میں جگہ کم پڑ رہی تھی۔ حالانکہ جگہ گھر میں نہیں ان کے دل میں تنگ پڑ چکی تھی لیکن اکمل بھی کیا کرتا...... اپنی ماں کو ایسے بے یار و مددگار تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔
''ادیبہ میری خاطر ہی سہی...... سب بھول جاؤ......'' وہ بالکل بے بس دکھائی دے رہا تھا۔
''کیسے بھول سکتی ہوں میں وہ سب......؟ میں نے اتنا کچھ سہا ہے صرف اور صرف آپ کے گھر والوں کی.... بے اعتنائی کی وجہ سے۔ آپ بھول سکتے ہیں کیونکہ آپ مرد ہیں، باپ ہیں، میں نہیں بھول سکتی کیونکہ میں ماں ہوں...... میں نے کوکھ میں رکھا تھا اسے پانچ ماہ تک...... بے حد تکلیف سہی تھی...... میں کیسے بھول سکتی ہوں؟'' اس کی روتی آواز پر اکمل بالکل خاموش ہوگیا تھا۔ وہ ایک بیوی کو سمجھا سکتا تھا لیکن ایک ماں کو کیسے سمجھاتا۔

☆☆☆

ادیبہ سراسر امی اور بھابی کی پسند تھی۔ اکمل نے تو منگنی سے قبل اسے دیکھا تک نہیں تھا۔ جاننا تو دور کی بات...... بھابی امی کے خاندان سے تھیں اور سراسر بھیا کی پسند تھیں۔ امی انہیں کسی طور بہو بنانے کو تیار نہیں تھیں لیکن بھیا کی ضد کے آگے امی ہار گئی تھیں۔ جوان بیٹے کو خود سے دور یا متنفر کرنے کا ان میں حوصلہ نہ تھا۔ سو یوں لیلیٰ بھابی اس گھر میں بڑی بہو بن کے آگئیں۔ انہوں نے آتے ہی بھیا کو تو مٹھی میں کیا ہی تھا ساتھ، ساتھ امی پر حکم چلاتے، چلاتے انہیں دیوار سے لگا دیا تھا۔ بھیا کی ساری آمدنی بھابی کی مٹھی میں تھی اور امی کو وہ اپنے حساب سے کبھی رقم دیتیں اور کبھی نہیں...... بھیا تو ایسے بن گئے جیسے کچھ دکھائی دیتا اور نہ ہی سنائی دیتا ہو۔ بھابی نے حسبِ منشا امی سے خوب خدمت کروائی۔ کبھی میاں کے ساتھ گھومنے کا پلان ہے تو سارا کام امی کے ذمے کر کے خود بری الذمہ ہوجاتیں۔ دل کیا تو کام کو ہاتھ لگایا نہ کیا تو سارا دن ٹی وی دیکھا اور کام کرنے کو تو جوان ہنرمند ساس حاضرِ خدمت ہوتیں۔ اس پر بھی انہوں نے بس کیا ہوتا تو کیا بات تھی، وہ تو ساس سے سارے کام بھی نکلواتیں اور خاندان میں مشہور بھی کرواتیں کہ وہ سارا گھر سنبھالے ہوئے ہیں اور ساس کی خوب، خوب خدمت بھی کرتی ہیں۔ اکمل ان دنوں ہاسٹل میں رہتا تھا لیکن پھر بھی گھر کے حالات سے واقف تھا۔ بھیا سے کتنی مرتبہ دبے لفظوں میں بھابی کو سمجھانے کو بھی کہا لیکن بھیا کی آنکھوں پر تو محبت نام کی پٹی بندھی تھی سو وہ کیسے سمجھتے۔

جب اکمل کی شادی کی باری آئی تو اکمل نے خود ہی فیصلہ کرلیا کہ وہ اس گھر میں رہنے کے بجائے اپنی بیوی کے ساتھ الگ گھر میں رہے گا۔ بھابی نے جو گھر کا ماحول بنا رکھا تھا اس میں کوئی بھی شریف اور سادہ مزاج لڑکی گزارہ نہیں کرسکتی تھی اور وہ اپنی شادی شدہ زندگی بھابی کی وجہ سے برباد نہیں کرسکتا تھا۔ بھابی گو اس فیصلے سے ناخوش تھیں لیکن شوہر اور ساس کی طرح دیور پر بس نہیں چلتا تھا۔ سو یوں اکمل، ادیبہ سے شادی ہوتے ہی الگ ہوگیا۔ وہ دونوں امی کو بھی ساتھ رکھنا چاہتے تھے لیکن بھابی نے ایسا واویلا کیا کہ امی نے اکمل اور ادیبہ کے ساتھ جانے سے ہی توبہ کرلی۔ یوں امی، بھابی کے ساتھ ہی رہ گئیں اور اکمل، ادیبہ کو لے کر الگ ہوگیا۔

ادیبہ نے امی کو کبھی ایک بہو ہونے کا احساس نہیں دلایا تھا۔ وہ ان سے بیٹیوں کی طرح مخلص تھی۔ موسم کے تغیر و تبدل پر اپنے جیب خرچ سے ساس کو کپڑے بنوا کر دیتی۔ دور رہ کر بھی ان کی ادویات اور دیگر ضروریات کا نہ صرف خود خیال رکھتی بلکہ اکمل کو بھی یاد کرواتی رہتی۔ ہر دوسرے دن انہیں فون کرتی اور ہفتے میں ایک بار اکمل کو لے کر ان سے ملنے بھی جایا کرتی۔ امی دل سے تسلیم کرتی تھیں کہ ان کی چھوٹی بہو ان کی بہو نہیں بیٹی ہے۔ بھلے وہ خاندان کے باہر کی ہے مگر اس نے کبھی انہیں پرایا ہونے کا احساس نہیں دلایا بالکل ویسے ہی جیسے کبھی لیلیٰ بھابی نے انہیں اپنا ہونے کا احساس نہیں دلایا تھا حالانکہ وہ خاندان کی تھیں۔

ادیبہ جب امید سے ہوئی تو اس کی گری ہوئی طبیعت کے سبب اکمل نے امی سے درخواست کی کہ اب انہیں ان کے ساتھ آکر رہنا چاہیے۔ وہ ادیبہ کو گھر میں اکیلا چھوڑنے کے حق میں نہیں تھا مگر امی...... بھابی کی زبان سے اتنا ڈرتی تھیں کہ اپنی زبان ہلانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھیں۔

"امی اگر تمہارے ساتھ چلی گئیں تو میرے بچوں کو کون دیکھے گا؟" بھابی نے اکمل سے صاف، صاف کہہ ڈالا۔

"لیکن ادیبہ کو اس وقت امی کی ضرورت ہے۔

فساد

قتل کسی نے کیا
الزام کسی پہ آیا
بدنام کوئی ہوا
سزا کو کسی نے بھگتا
ظالم کوئی اور بنا
مجرم کوئی اور ہوا
اس شہر میں
اِک فساد ہوا
قاتل کوئی تھا
ملی کسی اور کو سزا
کسی کے نام پر خون بہا
اذیت میں کوئی رہا
رسمِ ونی کا نام آیا
حقیقت کا پردہ چاک ہوا
قاتل کوئی تھا
مجرم کوئی اور بنا
جھگڑا غیروں سے تھا
قربان اپنا ہوا
بس دکھ کا نام رہا
وہاں بھی انصاف نہ ملا

از: نرمین سرھیو، حیدرآباد

احساس

شکر ہے
کہ سکھ کی ساری دعائیں
قبول نہیں ہو جاتیں
ورنہ نہ تو کبھی ہم
اپنے آپ کو دیکھ سکیں
نہ سن سکیں
اور نہ کبھی چھو سکیں

از: فرحت عباس شاہ

پسند: ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ

آپ کے بچے اب بڑے ہیں، اسکول جاتے ہیں، آپ خود بھی انہیں دیکھ سکتی ہیں۔ ادیبہ کی طبیعت ایسی نہیں ہے کہ اسے اکیلے گھر میں چھوڑا جا سکے...... پہلی، پہلی دفعہ ہے اسے کسی بڑے کی ضرورت ہے بھابی!''

''الگ ہونے کا فیصلہ تم دونوں کا اپنا تھا...... کسی نے مجبور تو نہیں کیا تھا تم دونوں کو......'' بے مروتی تو یوں بھی ان پر ختم تھی۔

''اگر اسے لے کر الگ نہ ہوتا تو ہم دونوں اس گھر کے ماحول کی وجہ سے اب تک الگ ہو چکے ہوتے جو آپ نے بنا رکھا ہے۔'' اکمل نے بھی انہیں صاف سنائی۔

''تو ٹھیک ہے اسے اس کی ماں کی طرف چھوڑ آؤ......'' بھابی نے مزے سے کہا۔

''جب آپ کے بچے ہوئے تھے تو کیا آپ اپنی ماں کے پاس جا کر رہی تھیں۔ بچہ اس خاندان کا ہے تو اس کی امی کیوں اسے سنبھالیں؟'' اکمل سے ضبط محال ہو گیا تھا۔

''امی آپ چل رہی ہیں میرے ساتھ......؟'' اس نے بھابی کے ماتھے کی تیوری کو نظرانداز کرتے ماں سے براہ راست پوچھا۔

''میں کچھ دن تک آ جاؤں گی۔'' اور وہ دن کبھی نہ آیا کہ امی، اکمل کی طرف رہنے اور چھوٹی بہو کو سنبھالنے آئی ہوں...... ادیبہ، شوہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر ماں کے ہاں جا کر رہنے کو تیار نہیں تھی اور اس کی ماں، دادی کو پیچھے اکیلا چھوڑ کر اسے سنبھالنے نہیں آ سکتی تھیں۔ مجبوراً ادیبہ کو خود ہی سب کرنا پڑا۔ گھر بھی سنبھالنا پڑا اور اپنا آپ بھی......

''میری سسرال نے مجھے ایسے بے آسرا چھوڑ دیا ہے جیسے میں بیاہ کر نہیں بھاگ کر آپ کے ساتھ آئی ہوں۔'' وہ کبھی کبھار تھک کر رو دیتی اور اکمل لب بھینچے اسے دیکھا کرتا۔

''میں بھی اسی خاندان کی بہو ہوں، آپ کی اولاد بھی اس خاندان کا خون ہے پھر ایک بہو اور اس کے بچوں کو تو سر آنکھوں پر بٹھایا جا رہا ہے اور دوسری کو ایسے در بدر ہونے کے لیے پھینک دیا گیا ہے۔ آپ کی شادی کا شوق تھا سب کو لیکن اب ذمے داری کوئی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ بہوئیں اس حالت میں ہوں تو ساسیں ہی سنبھالا کرتی ہیں نہ کہ مائیں، میری ماں نے مجھے بیاہ دیا۔ اب ان کی ذمے داری ختم ہے۔'' وہ اپنی جگہ ٹھیک تھی۔

''امی، بھابی سے بہت ڈرتی ہیں، اس لیے کچھ بول نہیں سکتیں۔ میں خود بھی سمجھتا ہوں کہ امی کو اس وقت تمہارے پاس ہونا چاہیے تھا۔''

''جو سنائے اس کی حکومت اور جو خاموش رہے تو وہ دبایا جائے۔ بہت خوب...... میں نے تو بہو نہیں بیٹی بننے کی کوشش کی لیکن آپ کی امی میری ماں نہ بن سکیں۔'' اکمل شرمندہ تھا۔ اس کے گھر والوں نے جیسے انہیں اکیلا چھوڑ دیا تھا، اس سب کے سامنے وہ بالکل بے بس تھا۔ اکمل نے کئی بار امی کو فون کیے لیکن بھابی ان کے جانے کا سن کر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتیں۔ نتیجتاً امی خاموش ہو جاتیں۔ وہ دونوں بہوؤں اور بیٹوں کے درمیان پھنس چکی تھیں۔ اکمل چاہتا تو زبردستی بھی ماں کو لا سکتا تھا مگر وہ ماں کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

ادیبہ کو پانچواں مہینہ لگا تھا جب گھر میں کام کاج کے دوران اس کا کہیں پاؤں پھسلا اور گھر میں اکیلے ہونے کی وجہ سے وہ کتنی دیر ایسے ہی پڑی رہی۔ نہ جانے کیسے اس حالت میں اس نے اکمل کو فون کیا تھا لیکن اسے دفتر سے آنے میں اتنا وقت لگ گیا کہ اسپتال پہنچتے، پہنچتے معاملہ خاصا بگڑ چکا تھا۔ اس کا کافی خون بہہ چکا تھا۔ ڈاکٹرز نے اسے بچانا اولین ترجیح جانا جس کے نتیجے میں ادیبہ کی کوکھ اجڑ گئی۔ دونوں میاں، بیوی کی یک دم ساری خوشی ہوا برد ہو گئی۔

''میں تم سے معافی چاہتا ہوں، شاید میرے گھر والے ہمارا ساتھ دیتے تو آج یہ سب نہ ہوا ہوتا۔'' متورم آنکھیں لیے وہ بیوی کا ہاتھ تھامے اسے تسلی دے رہا تھا۔

''میرا بیٹا چلا گیا اکمل......'' وہ پھوٹ، پھوٹ کر

رو رہی تھی۔

''اللہ کا یہی حکم تھا، صبر کرو اور بھول جاؤ......''

''بطور بہو تو شاید میں سب بھول جاتی اکمل لیکن ایک ماں یہ سب نہیں بھول سکتی......اب مجھ سے اپنے گھر والوں کے لیے کبھی کسی نیکی کی توقع مت کیجیے گا۔''

امی اور بھابی اس سے ملنے آئی تھیں لیکن اس نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ملے بغیر واپس چلی گئی تھیں۔ اس دن کے بعد سے وہ کبھی سسرال نہیں گئی تھی۔ ہاں اس نے اکمل کو جانے سے کبھی نہیں روکا کہ اس کے رشتے اس پر ذمے داری کی طرح فرض تھے۔ وہ اسی طرح ماں کی ضروریات پوری کرتا رہا۔ لیکن وہ ان سے تعلقات بنائے رکھنے پر خود کو کبھی آمادہ نہیں کر پائی۔ اوپر نیچے اس کی تین بیٹیاں ہوئیں لیکن جو پہلا، پہلا بیٹا اس نے کھو دیا تھا اس کا غم ہمیشہ تازہ رہا تھا۔

☆☆☆

''میری ماں کو اب میری ضرورت ہے۔'' اکمل پھر سے اسے منا رہا تھا۔

''مجھے بھی کبھی آپ کی ماں کی ضرورت تھی۔'' اس نے دو بدو جواب دیا۔

''وہ بیمار ہیں، مجبور ہیں، بھابی انہیں پوچھتی تک نہیں......ایسے میں وہ کہاں جائیں؟ ان کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔''

''میں بھی بیمار تھی، مجبور تھی۔ مجھے بھی کسی نے نہیں پوچھا۔ میں نے خود کو خود ہی سنبھالا۔ اپنی اولاد تک کھو دی۔ میرا درد آج بھی مجھے رُلاتا ہے۔ میرا بچہ آج بھی مجھے بلاتا ہے۔ میں وہ سب نہیں بھول سکی۔'' اس کی آنکھیں برس پڑی تھیں۔

''ایک ماں، ایک بہو، ایک عورت بن کر مت سوچو......بس ایک انسان بن کر سوچو......انہوں نے جو کیا غلط تھا لیکن تم جو کر رہی ہو وہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں معاف کر کے بڑے پن کا مظاہرہ کرو۔ ہمارا بھی بڑھاپا آتا ہے، بیٹا ہمارا نہیں، آج تم ان کا سہارا بنو گی، ان کی خدمت کرو گی تو اللہ ہمارا بڑھاپا بھی آسان کرے گا۔ ہمارے لیے رستے نکالے گا۔ ایک لمحے کو ہی سہی ایک انسان بن کر تو سوچو......'' اکمل بس اتنا کہہ کر باہر نکل گیا۔

''کیا بھولنا اتنا آسان ہوتا ہے اللہ تعالیٰ......؟'' وہ رو دی تھی۔

اکمل چاہتا تو آج بیوی کی بات نہ سن کر زبردستی ماں کو گھر لا سکتا تھا مگر وہ بیوی کی رضامندی سے خوشی، خوشی انہیں لانا چاہتا تھا تاکہ کل کو گھر کا ماحول خراب نہ ہو اور وہ دل و جان سے ان کی خدمت کرے۔

ادیبہ کسی گہری سوچ میں تھی اس کے دل میں آج بھی ساس کی عزت تھی مگر......بیٹے کی یاد جب آتی تو وہ......تڑپ جاتی......وہ گہری سوچ میں تھی۔

''آج تمہارے پاس بدلے کا اختیار ہے۔ تم انہیں یہاں نہ لا کر اپنا بدلہ پورا کر لو گی تو تم میں اور ان میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ بلکہ تم زیادہ ظالم ہو گی کیونکہ وہ مجبور تھیں بڑی بہو کے ہاتھوں لیکن تم مجبور نہیں ہو ادیبہ......'' یہ اس کے اندر کا وہ انسان تھا جو آج بھی زندہ تھا اور اسے نیکی پر ابھار رہا تھا۔

اس نے بے بسی سے لب کاٹے۔ اپنا سینہ ٹٹولا۔ وہاں پتھر نہیں، اب بھی ایک دل دھڑکتا تھا جو جذبات سے معمور تھا۔ اس نے بس ایک پل لگایا تھا سوچنے میں......

''میں...انہیں معاف کر کے سب بھول کر اس گھر میں لانے پر تیار ہوں، صرف اور صرف اپنے اللہ کے لیے......اور میں اس کا بدلہ بھی اللہ تعالیٰ سے ہی چاہتی ہوں کہ وہ ہمارے بڑھاپے میں ہم پر رحم کریں، ہمیں بے یار و مددگار نہ چھوڑیں، ہمارے حق میں ہماری اولاد کو نرم کر دیں۔ معافی بہترین انتقام ہے اور میں یہی بہترین انتقام چنتی ہوں۔'' اس نے گہری سانس لی اور پُرسکون ہو گئی۔

☆☆☆

ناولٹ

ایک سجدہ

عائشہ خان



"یا اللہ! میں کیسے اس شخص کو یقین دلاؤں کہ میں......" بے اختیار اس کے حلق سے سسکی نکلی تھی اور لفظوں نے اس کے لرزتے لبوں پر ہی دم توڑ دیا تھا۔

بکھرے بالوں کے ساتھ گھٹنوں پر سر رکھے، سردی سے بری طرح کپکپاتے جسم کو گیٹ کا سہارا دیے وہ جیسے بے بسی کی انتہا پر تھی۔

کچھ ہی دیر میں یہ تیسری مرتبہ تھا کہ اس کے اپنے الفاظ بھی اسے دغا دے رہے تھے۔ ابھی کچھ ہی دیر قبل جب اس پر فردِ جرم عائد کی جارہی تھی، ایک ایسے گناہ کی سزا سنائی جارہی تھی جو اس نے کیا ہی نہیں تھا...... تب بھی لفظوں نے یونہی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ پھر زمین اس کے قدموں کے نیچے سے کھینچ لی گئی۔ اسے جنت بدر کر دیا گیا لیکن اس کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا...... اور جب نکلا تھا تو سننے والے نے گھر کے اور دل کے دروازے کے ساتھ کان بھی بند کر لیے تھے۔

وہ دونوں ہاتھوں کے ساتھ گیٹ کو دھڑ دھڑاتے

ہوئے روتی رہی..... چلاتی رہی لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ روتے، چلاتے اور پکارتے، پکارتے اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ آواز بند ہوگئی تھی..... گیٹ کو پیٹتے، پیٹتے اس کے ہاتھ لہو رنگ ہوگئے تھے، بازو اور کندھے شل ہوگئے تھے..... وجود نڈھال ہوگیا تھا۔ آخر وہ بے دم ہوکر گیٹ کے آگے ہی ڈھے گئی تھی لیکن اندر سے کوئی نہیں نکلا تھا۔

''میں نے ..... میں نے ....'' بند آنکھوں اور کپکپاتے لبوں کے ساتھ اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ کیا.....؟ وہ خود بھی جیسے نہیں جانتی تھی۔

اس کے چاروں طرف ایک خلا تھا، تاریک اور مہیب خلا..... جس میں اس کا وجود معلق تھا..... یوں کہ جان تھی مگر توانائی نہیں تھی..... آنکھیں تھیں مگر بینائی نہیں تھی اور زبان تھی مگر گویائی نہیں تھی۔

ٹھنڈی یخ ہوا اس کے وجود کو برف بنا رہی تھی..... خون کو اس کی رگوں میں جما رہی تھی لیکن اندر ہنوز خاموشی تھی..... گہری ٹھنڈی، خاموشی۔ موت کا سا سناٹا..... مگر وہ تو یہاں رہی تھی..... پھر اندر کیوں موت کا سناٹا تھا۔ یک دم اسے اس سناٹے سے شدید وحشت ہونے لگی۔ اسی وحشت نے اس کے بے جان وجود کو اٹھ کھڑا ہونے پر مجبور کردیا۔ نہ صرف کھڑا ہونے پر بلکہ وہ ایک عالم جنون میں آگے بڑھی تھی۔ اور دونوں ہاتھوں سے گیٹ کو پاگلوں کے مانند دھڑ دھڑا ڈالا تھا۔ لیکن اس مشقت نے اس کی سانس پھلادی۔

گیٹ کے اوپر ہی سر ٹکائے وہ سانسوں کو ہموار کرنے کی کوشش کررہی تھی جب گیٹ کی اندرونی جانب سے دبی، دبی آواز ابھری تھی۔

''رات بہت ہوگئی ہے باجی..... اتنی رات کو آپ کا یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں ہے..... زمانہ بہت خراب ہے، آپ اب گھر جائیں..... صاحب اس وقت فرعون بنے ہوئے ہیں اور میری دادی کہتی ہیں..... ''بندہ جدوں فرعون بن جائے تے اوہدے کولوں بھلائی دی امید نہ رکھیو.....''

''دادی جان .....؟'' اس کے ہونٹ ہلے تھے لیکن آواز نہیں نکلی تھی۔

اس کا دل چاہا وہ چلا، چلا کر دادی جان کو پکارے..... لیکن وہ جتنا بھی پکارتی اس کی پکار ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس کے منہ سے بے اختیار سسکی نکلی تھی۔

''آپ ٹھیک کہتی تھیں دادی جان..... آپ بالکل ٹھیک کہتی تھیں.....''

''ہک ہا.....'' فیروزاں نے بے حد صدمے اور تاسف سے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے گیٹ کی جھری سے اپنی بے حد خوب صورت باجی کو دیکھا۔

''مگر وہ تو اپنی دادی کی بات کررہی تھی اور باجی.....؟'' یقیناً صدمے نے ان کے دماغ پر اثر ڈالا تھا۔ ''ہائے اس کی اتنی سوہنی باجی اور..... چچ..... چچ.....'' سخت صدمے کی کیفیت میں فیروزاں نے گیٹ کھولنے کے لیے لاک پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اندر سے گرجدار آواز میں اسے پکارا گیا۔

جبکہ اس بات سے بے خبر کہ گیٹ کی دوسری جانب اب کوئی نہیں تھا وہ کہہ رہی تھی۔

''تمہیں پتا ہے فیروزاں میری دادی جان نے کیا کہا تھا..... انہوں نے کہا تھا۔ ''انسان کو کبھی رب کی طرح مت چاہنا میرے بچے..... جو بھی انسان کو رب کی طرح چاہتا ہے، اسے رب کے مقام پر لا بٹھاتا ہے تو وہ بڑی ذلت اٹھاتا ہے، بے حد ذلت..... ہاں انہوں نے بالکل ٹھیک کہا تھا..... لیکن..... افسوس میں نے ان کی بات کو بھلا دیا۔ پھر میں کیسے نہ ٹھکرائی جاتی، کیسے نہ ذلت اٹھاتی۔'' اس کا وجود کانپ رہا تھا..... آواز کانپ رہی تھی اور دل کانپ رہا تھا۔

یہ اس سے کیسا گناہ سرزد ہوا تھا۔ اور کیا اس ذلت کے بعد اس گناہ کا کفارہ ادا ہوگیا تھا؟ گیٹ پر ڈھیلی پڑتی گرفت کے ساتھ یہ آخری سوچ تھی جو اس کے ذہن میں آئی تھی۔ اور آخری آواز جو اس نے سنی تھی وہ کسی گاڑی کے بریک چرچرانے کی تھی۔

اس نے خود کو سنبھالنا چاہا لیکن اس کی ہر سعی بیکار

گئی تھی۔ گیٹ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا تھا۔ زمین اس کے پاؤں تلے سے نکل گئی تھی اور وہ بھر بھری مٹی کے بے جان تودے کے مانند زمین پر آ رہی تھی۔

☆☆☆

"زارا..... !تم بہت لکی ہو یار....."

"اچھا وہ کیسے.......؟"

"دیکھو ناں پھپھو تم سے کس قدر محبت کرتی ہیں..... انہیں بس ہر وقت تمہارا ہی خیال رہتا ہے۔ دنیا کی ہر اچھی چیز وہ تمہارے لیے لینا چاہتی ہیں اس لیے کچھ لینے مارکیٹ جاتی ہیں تو ہر دوسری چیز تمہارے لیے پسند آ جاتی ہے۔

"یہ ڈریس زارا پر سوٹ کرے گا۔ یہ بیگ اسے اچھا لگے گا، یہ شوز اسے پسند آئیں گے۔" سچ مجھے تو تم پر بہت رشک آتا ہے، ایک ہماری ماما ہیں کہ شاپنگ کا کہتے جاؤ..... فوراً انکوائری شروع کردیں گی۔ "کیوں؟ کس لیے.....؟ ابھی چند دن پہلے تو شاپنگ کی ہے۔"

"اجیہ کی بچی..... کب کہتی ہیں ممانی یہ سب.....؟" دل کی اداسی پر قابو پاتے ہوئے اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں اسے ٹوکا تھا۔

"یہ پوچھو کب نہیں کہتیں وہ یہ سب..... اب بھی یہ ہی کہہ رہی ہیں۔"

"یعنی تمہارا پھر شاپنگ کا موڈ بن رہا ہے..... ابھی تم پرسوں تو گئی تھیں مال..... کچھ خدا کا خوف کرو لڑکی....."

"وہ تو دو چیزیں ہی خریدی تھیں یار..... دیکھا یہ ہوتی ہے کیئر....." "آپ بھی ناں پھپھو جان....." اس سے بات کرتے کرتے وہ ماما سے مخاطب ہوئی تھی۔

زارا ٹی وی اسکرین پر نگاہ جمائے منتظر تھی کہ وہ بتائے ماما نے کیا کہا ہے۔

"فرما رہی ہیں کہ جلدی فون بند کردوں، تم مشاعرہ دیکھ رہی ہو....."

"اجیہ..... ! میری طرف سے بہت پیار کرو میری ماما کو....."

"ہاں تم امریکا میں بیٹھی ہو ناں..... پھپھو نے سر چڑھایا ہوا ہے تمہیں..... کوئی بات ہے بھلا بجائے اس کے تمہیں شاپنگ کے لیے بلائیں خود ڈیزائن سلیکٹ کر کر کے واٹس ایپ کر رہی ہیں..... سچ بتاؤ زارا اتنے دن ہو گئے تمہارا دل نہیں چاہتا ہم سب سے ملنے کو.....؟" اس نے ایک دم پوچھا تھا۔ اور پھر جیسے خود ہی سمجھ گئی تھی کہ اس نے زارا کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔

"چلو بھئی ہمارا تو دل کرتا ہے ناں..... ہم آ جائیں گے..... اچھا وہ کل والا ڈیزائن فائنل ہے ناں سوٹ کا؟"

"ہاں....." اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا تھا..... دل ان کی محبتوں پر گداز ہونے لگا تھا۔

"اوکے ڈیئر ہم چلتے ہیں مارکیٹ..... تم مشاعرہ انجوائے کرو..... بٹ لیسن اگر تم اسکرین کے ساتھ تمہیں بھی چپکی رہو گی ناں تو بھی تمہارے میاں صاحب مشاعرہ لوٹ ہی لیں گے....." اجیہ نے اسے چھیڑنے والے انداز میں کہا تھا اور خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

لیکن وہ کتنی ہی دیر یونہی فون تھامے گم صم سی بیٹھی رہی تھی۔ ان سب کی محبتیں ہی تو اس کی توانائی تھیں ورنہ تو..... ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اس نے ٹی وی اسکرین کی جانب دیکھا تھا اور بہت دیر یونہی ایک ٹک دیکھتی رہی تھی۔

جانے انہوں نے غزل پڑھی یا نظم..... اسے کچھ پتا نہیں چلا تھا..... وہ تو بس ان کے چہرے کو دیکھ رہی تھی اور خود سے سوال کر رہی تھی کہ کیا کوئی ایسا اسم یا..... کوئی ایسا ورد ہو سکتا ہے جسے پڑھنے سے جسے کرنے سے یہ شخص شزا احمد کو بھول جائے..... اور..... مجھ سے ویسی ہی شدید محبت کرنے لگے جیسی وہ شزا احمد سے کرتا ہے۔

یہ وہ سوال تھا جو دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں چوبیس مرتبہ تو وہ ضرور خود سے کرتی تھی..... جواب ہر مرتبہ نفی میں آتا تھا لیکن پھر بھی نہ تو وہ خود سے یہ سوال کرنا ترک کرتی تھی اور نہ ان سے محبت کرنا..... بلکہ ہر گزرتا دن اس کی اس محبت میں اضافہ کرتا تھا..... اور ہر طلوع ہوتی صبح اس کے جنون کو بڑھاتی تھی..... بہت

گھبرا جاتی...... خود کو نا امیدی اور یاس کے گرداب میں گھرا پاتی تو چپکے سے اشک بہا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی اور پھر سے اِک نئی امید کو زادِ راہ بنائے اِک نئی آس کو آنکھوں میں بسائے اس شخص کی محبت کو پانے کے لیے کربستہ ہو جاتی جو کسی اور سے محبت کرتا تھا اور اتنی ہی شدید جتنی وہ اس سے کرتی تھی۔ کیسا المیہ تھا یہ......!

بے اختیار اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبایا تھا۔

وہ کبھی ان کی راہ میں نہ آتی...... اور اگر بے خبری میں آ ہی گئی تھی تو علم ہوتے ہی پیچھے ہٹ جاتی بلکہ ان کی محبت کے حصول کو ممکن بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی۔ اگر اسے یہ علم ہوتا کہ یہ ممکن تھا مگر یہ ممکن نہیں تھا...... ان کی محبت لاحاصل تھی، رائگاں تھی، صرف اور صرف دل کا زیاں تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنے دل کا یوں زیاں کریں...... لیکن اس کے چاہنے سے کیا ہوتا تھا جبکہ وہ خود......

ایک دم اس کے حلق میں جیسے آنسوؤں کا گولہ سا پھنسا تھا...... وہ ان کی ہر بے رخی اور کج ادائی سہنے کے بعد بھی یوں تازہ دم رہتی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں لیکن جانے کیوں آج ان کا سنگدلانہ رویہ بھلائے نہیں بھول رہا تھا۔

ہاتھ پر لگے زخم میں ہی نہیں، دل میں بھی عجیب سا درد تھا جب، جب ہاتھ پر لگے زخم میں ٹیس اٹھتی، دل نئے سرے سے کرچی، کرچی ہونے لگتا تھا۔ آنکھوں کے سامنے بار، بار وہی منظر آ ٹھہرتا۔ اس کے ہاتھ سے ٹپاٹپ گرتا خون دیکھ کر بھی سنگدلی کی انتہا کرتے...... اپنی باتوں سے دل کو لہولہان کرتے اثیر احمد......

دلِ ریزہ، ریزہ کو سنبھالنا مشکل تھا...... مگر سنبھالنا تھا اگر وہ اس کے حوصلے کو آزما رہے تھے تو اسے اپنا حوصلہ بلند رکھنا تھا اور اگر وہ اس کی محبت کو آزما رہے تھے تو اسے اس آزمائش پر پورا اترنا تھا۔

ہر قدم پر اِک نیا پتھر ہے حائل راہ میں
میں تجھے سر کر رہا ہوں کو ہساروں کی طرح
ہم کہ ذرّوں کی طرح قدموں میں تیرے بچھ گئے
تو کہ اِستادہ رہا اونچے مناروں کی طرح

☆☆☆

اسٹیئرنگ گھماتے ہی وہ پہلے چونکے پھر حیران ہوئے تھے انہیں تو آفس جانا تھا لیکن وہ گاڑی گھر کی جانب والی سڑک پر موڑ چکے تھے۔ اسپیڈ ہلکی کرتے ہوئے چند لمحے وہ گومگو کے عالم میں کچھ سوچتے رہے تھے پھر زارا کا نمبر ملایا تھا۔

''میں دس منٹ میں آ رہا ہوں، تیار ہو جاؤ۔ تمہیں انکل، آنٹی کی طرف چھوڑ دوں گا...... مس کر رہے تھے وہ تمہیں۔'' کال ریسیو ہوتے ہی انہوں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ایک لمحے بعد ہی ان کے موبائل پر اس کا پیغام موصول ہوا تھا۔

''ماما پاپا گھر پر نہیں ہیں۔'' ایک مختصر سا جملہ......

بظاہر اس جملے میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا لیکن جانے کیوں اسے پڑھتے ہی ان کا اچھا بھلا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

وہ جو رات سے اس کی آنسوؤں سے بھری متورم آنکھیں اور سرخ تمتماتا چہرہ انہیں بے کلی سے دوچار کیے ہوئے تھا...... اب پھر اس بے کلی پر غصہ حاوی ہونے لگا تھا۔

گاڑی گیٹ پر روکتے ہوئے انہوں نے ایک ہاتھ ہارن پر رکھا اور دوسرا بالوں میں پھیرتے ہوئے جیسے اندر کے اضطراب کو کم کرنا چاہا تھا۔

''سلام صاحب جی......!'' گیٹ کھولتے ہوئے حامد نے سلام جھاڑا تھا۔ جواب دیتے ہوئے بے اختیار ان کی نگاہ اٹھی۔

ڈارک ڈمنانٹ بلیو اور نارنجی رنگوں سے مزین کرتا پاجامہ پہنے اور نچ لپ اسٹک لگائے وہ ہمیشہ کی طرح بے حد ...تروتازہ لگ رہی تھی۔ چہرے پر رات والی کسی کیفیت کا، کسی ملال کا یا اضمحلال کا نام ونشان تک نہیں تھا۔

وہ حیران ہوئے تھے...... حالانکہ اب تو انہیں عادی ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ حیران تو وہ انہیں پہلے دن سے کر رہی تھی۔

☆☆☆

انہیں آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔ بہار کی

آمد تھی...... پیڑ پودے سبز پیراہن پہن رہے تھے۔ یہ موسم عموماً انہیں خود سے کچھ بیزار کرنے لگتا تھا...... لیکن اس دن حیرت انگیز طور پر ان کا موڈ بے حد خوشگوار تھا۔

عرصے کے بعد وہ بغیر کسی اشد ضروری کام کے یونہی گھومنے پھرنے اور ہلکی پھلکی شاپنگ کے خیال سے مال پر چلے آئے تھے...... اور شاپنگ ہو اور کتابیں نہ خریدی جائیں، یہ تو ہو نہیں سکتا تھا۔ کتابوں کا بنڈل تھامے بک شاپ سے نکلتے ہوئے اچانک ان کی نظر اس پر پڑی تھی۔

وہ گاڑی کے دروازے سے پشت ٹکائے...... آنکھوں میں شوق کا اک جہان بسائے بڑی محویت سے انہیں تک رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے انہیں عجیب سا احساس ہوا...... پھر وہ سر جھٹک کر پارکنگ کی طرف بڑھے تھے۔

''ایکسکیوزمی......!'' بالکل ان کے پاس سے خاصی بلند آواز میں کہا گیا۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ چونک کر مڑے۔

بلیو جینز پر ریڈ کلر کی ٹی شرٹ پہنے تیکھے سے نقوش والی وہ لڑکی نخوت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''جی فرمائیں......؟''

''وہ سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھ رہے ہیں آپ......؟''

عجیب سا سوال تھا...... اور اس سے بھی عجیب اس کا انداز...... انہوں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔ بے حد صاف، چمکتی ہوئی رنگت والی لڑکی اب اپنی پیشانی پر ہاتھ دھرے پریشانی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے نگاہ موڑ کر سوالیہ انداز میں اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا۔

''وہ پوچھ رہی ہے کیا آپ اس سے شادی کریں گے؟''

''محترمہ...... آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے ناں......؟''

انہوں نے انتہائی تلخی سے کہتے ہوئے کھا جانے نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

''میرا تو ٹھیک ہے...... مگر کیا، کیا جائے، اس کا خراب ہو چکا ہے...... ورنہ شاعروں پر مرنے کا دور کہاں رہا ہے اب...... ایک اینٹ اٹھاؤ تو نیچے سے شاعر نکل آتا ہے۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک دل جلا دینے والی مسکراہٹ تھی...... ان کا خون جیسے رگوں میں کھولنے لگا تھا...... دانت پر دانت جماتے ہوئے انہوں نے شعلے برساتی نگاہوں سے اسے گھورا تھا۔

''اینی ویز...... یہ اس کا بائیوڈیٹا ہے......'' اس نے ہاتھ میں تھاما کاغذ ان کی جانب بڑھایا تھا۔

''شٹ اپ...... مجھے ایسا بے ہودہ مذاق قطعاً پسند نہیں...... اب آپ شرافت سے تشریف لے جائیں...... ورنہ......'' کاغذ کے ٹکڑے کر کے پھینکتے ہوئے انہوں نے بے حد تلخی سے کہا تھا۔

''ہونہہ...... دل میں تو آپ کے لڈو پھوٹ رہے ہوں گے کہ اس عمر میں بھی آپ میں ایسی کشش ہے کہ ایک حسین لڑکی آپ کے لیے پاگل ہو رہی ہے۔'' انتہائی طنزیہ لہجے میں ایک، ایک لفظ چبا کر کہتی وہ انہیں جیسے بھڑکتے الاؤ میں دھکیل گئی تھی۔

''شٹ اپ...... یو......'' مٹھیاں بھینچتے ہوئے...... بمشکل انہوں نے اپنے حواس کو برقرار رکھا تھا...... ورنہ دل چاہتا تھا کہ اسے اٹھا کر چلتی ہوئی سڑک پر دے ماریں...... اور اس کی انتہائی تمسخرانہ انداز میں تکتی ہوئی نگاہوں اور جلتی پر تیل چھڑکتی مسکراہٹ پر شاید وہ برداشت کھو بیٹھتے کہ وہ لپک کر ان کے قریب آ گئی تھی۔

''اچھا...... اسٹوپڈ...... چلو اب...... دیکھنا ساری زندگی بات نہیں کروں گی تم سے......'' اسے کھینچتے ہوئے وہ روہانسے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

جاتے، جاتے پلٹ کر اس نے ایک نگاہ ان پر ڈالی تھی اور بھیگی، بھیگی اس نگاہ نے ان کے بھڑکتے دل و دماغ پر جیسے پانی کی ٹھنڈی پھوار کا سا کام کیا تھا اور اپنی کیفیت پر وہ لمحے بھر کو حیران رہ گئے تھے۔

اس کے چہرے پر نگاہ جمائے انہیں اپنی اس دن کی کیفیت یاد آئی تو لب بے اختیار مسکرائے تھے اور اس مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے وہ چند لمحے خود کو موبائل پر مصروف ظاہر کرتے رہے تھے۔

انہیں مسکراتے ہوئے دیکھ کر زارا کے چہرے پر

ایک لمحے کے لیے تاریک سا سایہ لہرایا تھا۔ کتنے مطمئن اور خوش تھے وہ......؟ کیا انہیں اپنے کل کے رویے پر ذرہ برابر افسوس نہیں تھا...... اس کے دل پر جیسے منوں بوجھ آ پڑا تھا۔ لیکن خود کو بہ مشکل کمپوزڈ کیے وہ منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔

وہ گاڑی سے نکلے تو وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھی تھی اور سلام کرتے ہوئے کوٹ ان کے ہاتھ سے تھام لیا تھا۔

سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ ہنوز موبائل اسکرین پر نگاہ جمائے رہے تھے۔ زارا کا دل بھی جیسے ایک دم سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ جو انہیں بتانا چاہتی تھی کہ اس نے پورا مشاعرہ اسکرین کے سامنے سے ہلے بغیر سنا تھا...... ان کے ہر پوز کو بغور دیکھا اور ہر شعر کو بغور سنا تھا۔ اب اس نے مشاعرے کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ ان پر یہ ظاہر ہی نہیں کیا تھا کہ اس نے مشاعرہ سنا تھا۔ بیڈ روم میں آتے تک دونوں کے درمیان خاموشی حائل رہی تھی۔ پھر زارا نے ہی اس خاموشی کو توڑا تھا۔

''صبح آپ بہت جلدی چلے گئے تھے۔''

''ہاں...... ایک دوست کی گاڑی خراب تھی اسے بھی پک کرنا تھا۔'' انہوں نے سیٹی پر بیٹھتے ہوئے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا تھا...... وہ سوچ رہی تھی کہ کھانے کا پوچھے یا چائے کا...... کھانے کا ٹائم تھا نہ چائے کا...... لیکن وہ خود کو کہیں مصروف کرنا چاہتی تھی۔ مصروفیت کے بہانے ان کے سامنے سے ہٹ جانا چاہتی تھی۔

''چائے بناؤں......؟''

''بنالو......''

پانی کا گلاس انہیں تھماتے ہوئے وہ خاموشی سے واپس مڑ گئی تھی۔ لیکن سوچیں نہ چاہتے ہوئے بھی دل و دماغ کو الجھا رہی تھیں۔ زندگی کیا اب اسی روٹین سے گزرنی تھی۔

پانی، چائے، کھانے کے بہانے اِدھر اُدھر منہ چھپاتے، نگاہ چراتے یا پھر زبردستی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے اور شرمندگی اٹھاتے۔

میاں بیوی کا رشتہ تو بڑا خوب صورت ہوتا ہے...... اور ان کے درمیان تو جیسے کوئی رشتہ تھا ہی نہیں...... اجنبی، نہ آشنا...... لیکن نہیں...... آشنا تو تھے ورنہ...... اس کی نگاہ اپنے ہاتھ کی جانب گئی تھی اور آنسوؤں سے بھیگی مسکراہٹ لبوں پر بکھر گئی تھی۔

''چائے......'' انہوں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا...... آواز ہی بوجھل نہیں تھی چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔ عجیب لڑکی تھی...... پل، پل رنگ بدلتی تھی۔ ان کی نگاہوں کے ارتکاز کو محسوس کر کے اس کے لہجے میں ہلکا سا ارتعاش آیا تھا اور چائے ذرا سی چھلک کر ان کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر گری تھی۔

''اوہ...... سوری......''

اس نے جلدی سے کہا تھا اور کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بے قراری سے آگے بڑھی تھی اور ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''زیادہ جلن تو نہیں ہو رہی......'' وہ بے حد متفکر سی پوچھ رہی تھی۔ انہوں نے گہری نگاہوں سے اس کے شفاف چہرے کو دیکھا تھا۔ کچھ تھا اس چہرے میں...... ان آنکھوں میں...... اس لہجے میں...... جو وہ چاہ کر بھی نظر انداز نہیں کر پا رہے تھے۔ تبھی ان کی نگاہ اس کے انگوٹھے کے ساتھ آئے اچھے خاصے گہرے کٹ پر پڑی تھی۔

''یہ کیا ہوا ہے......؟'' انہوں نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''کچھ نہیں......'' اس نے دھیرے سے کہا اور ساتھ ہی ایک آنسو بے قراری سے پلکوں کا بند توڑتا ہوا ان کے ہاتھ پر آ گرا تھا۔

بے حد چونک کر انہوں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا...... لرزتے لبوں کے ساتھ آنسوؤں کو روکنے کی سعی میں مصروف وہ انہیں بری طرح مضطرب کر گئی تھی۔

''کیسے لگا ہے یہ کٹ......؟ اور اس پر کچھ لگایا بھی ہے یا نہیں؟'' ان کے اپنائیت بھرے لہجے نے اس کے زخم پر مرہم کے بجائے نشتر کا کام کیا تھا اور

صرف اس زخم کا ہی نہیں بلکہ دل پر لگے ہر زخم کا، ہر گھاؤ کا منہ کھول دیا تھا۔ تکلیف تھی کہ ناقابلِ برداشت ہوئی جا رہی تھی...... دل چاہتا تھا کہ دھاڑیں مار، مار کر روئے...... مگر اس سے کیا ہوگا کچھ بھی تو نہیں...... انتہائی دلگرفتگی سے اس نے سوچا تھا اور بھاگتی ہوئی روم سے باہر نکل گئی...... اور وہ پتھر کے بے جان مجسمے کے مانند ساکت وجامد بیٹھے رہ گئے تھے۔

شدتِ رنج سے کپکپاتے لب اور چھلک پڑنے کو آنکھوں کے بے تاب پیمانے انہیں پل میں یہ ادراک دے گئے تھے کہ اس کی رات کی گریہ وزاری اور اس وقت کے شکستہ وپُرملال رویئے کا سبب کیا تھا۔

اور یہ احساس کس قدر تکلیف دہ تھا کہ وہ ہاتھ جو اُن کے ذرا سے ''سی'' کرنے پر بے تاب ہو کر ان کی تکلیف سمیٹ لینے کے لیے آگے بڑھے تھے...... وہ خود ان سے بہتا خون دیکھ کر بھی نہیں پسیجے تھے...... جانے کیوں وہ اس معاملے میں اس قدر سخت دل ہو جاتے تھے۔

☆☆☆

کل شام کا منظر ان کے تصور کے پردے پر لہرایا تھا اور ان کا دل شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا تھا...... مگر اس وقت وہ اپنے حواسوں میں ہی کب تھے...... عالمگیر خان کی ڈنر پارٹی میں انہوں نے شزا احمد کو دیکھا تھا۔

شزا احمد...... جو کبھی اُن کی منگیتر تھی...... جس سے انہوں نے ٹوٹ کر محبت کی تھی...... جس کی ہر غلطی پر ہمیشہ چشم پوشی کی تھی...... جس کی خاطر وہ دنیا تیاگ بیٹھے تھے۔ حالانکہ ایسا کیا تھا اس میں...... کچھ بھی تو خاص نہیں...... مگر یہ تو وہ اب سوچ رہے تھے...... تب ان کی ہر سوچ شزا احمد سے شروع ہوتی اور اسی پر ختم ہو جاتی۔

وہ ان کے سب سے چھوٹے چچا کی اکلوتی، لاڈلی بیٹی تھی اور ان کے بچپن کی منگیتر اور بچپن کی محبت...... وہ اس سے اس وقت سے محبت کرتے تھے جب ابھی محبت کے لفظ سے آگاہ تھے نہ اس کے مفہوم سے......

لیکن ان کی ہر دلچسپی، ہر خوشی اس کے بغیر ادھوری تھی...... جس دن انہیں پہلے دن اسکول جانا تھا انہوں نے رو، رو کر سارا گھر آسمان پر اٹھا لیا تھا۔ اس لیے کہ...... اتنی دیر کے لیے شزا احمد سے دوری انہیں گوارا نہیں تھی۔ یہ چند گھنٹے انہیں گھنٹے نہیں صدیاں محسوس ہو رہے تھے...... ان کی ایک ہی ضد تھی کہ وہ اسکول تبھی جائیں گے جب شزا کو بھی بھیجا جائے اور آخر کار ان کی یہ ضد مان لی گئی تھی۔

اور پھر اسکول میں وہ سارا وقت روتی، بسورتی ہوئی شزا کو بہلاتے رہے تھے۔ اُسے کھیل میں مشغول کرتے رہے تھے...... شزا نے فراک پر مٹی لگالی ہے تو وہ جھاڑ رہے ہیں...... شزا نے آئس کریم گرالی ہے تو وہ صاف کر رہے ہیں...... شزا نے تسمے (لیسز) کھول لیے ہیں تو وہ باندھ رہے ہیں...... شزا نے بال بکھیر لیے تو وہ باندھ رہے ہیں...... ان کی عمروں میں صرف تیرہ ماہ کا فرق تھا لیکن خود کو وہ اس سے تیرہ سال بڑا سمجھتے تھے۔ ٹیچرز ان دونوں کو دیکھ، دیکھ کر ہنسا کرتی تھیں۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا تھا...... کیسے اسے کھلاتے، کھلاتے، بہلاتے بہلاتے، وہ خود بھی اس کے لیے جیسے ایک کھلونا ہی بن گئے تھے...... کھلونا...... جس سے جب تک دل چاہے ذوق وشوق سے کھیلا جاتا ہے...... اور دل بھرنے پر ایک طرف کو پھینک دیا جاتا ہے...... اب وہ ٹوٹے یا سلامت رہے، کھیلنے والے کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... ہوش سنبھالنے پر جب انہیں اپنے اور اس کے درمیان اس دُہرے رشتے کا پتا چلا تھا جو اس کے پیدا ہوتے ہی طے کر دیا گیا تھا تو وہ بے حد مسرور تھے...... خود پر نازاں...... ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔

انہوں نے بے تابی سے یہ خبر اسے سنائی تھی۔

''کمال ہے، دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے...... اور ہم ابھی تک وہیں کھڑے ہیں...... سو سال پرانے دور میں......'' بیزاری سے دیا گیا اس کا یہ جواب ایک لمحے کے لیے تو انہیں منجمد کر گیا تھا۔

نوعمر دل میں ابھرتا نیا، نیا سا احساس...... انوکھے جذبوں کا ادراک...... محبتوں کی شوریدہ سری اور

دوسری طرف یہ سرد مہری...... وہ کتنی ہی دیر مہر بہ لب اسے تکتے رہے تھے۔

"کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی......؟" کئی لمحوں بعد انہوں نے بہ مشکل آواز جیسے کھینچ کر حلق سے نکالتے ہوئے پوچھا تھا۔

"خوشی...... کیوں......؟" وہ بے پروائی سے بالوں میں برش چلاتے ہوئے بولی تھی۔

"تو کیا تمہیں دکھ ہوا ہے......؟"

"کیا ہوگیا ہے اشیر...... دکھ کیوں ہوگا بھلا...... تم میں آخر کیا برائی ہے؟" اس نے تنک کر کہا تھا لیکن ان کے دل کی کلی جو یک دم مرجھا گئی تھی پھر کھل نہ سکی۔

وہ چپ چاپ اٹھ کر بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئے تھے۔ دل میں جو ایک ہلکی سی امید تھی کہ وہ انہیں پکارے گی وہ خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ اور وہ زندگی کی پہلی رات تھی جو بے کلی میں بسر ہوئی تھی لیکن اس کے بعد تو جیسے بے چینی و... بے کلی اور ان کا چولی دامن کا ساتھ ہو گیا تھا...... جو کبھی چھوٹا نہیں تھا۔

وہ اس قدر خوب صورت نہیں تھی جس قدر خود پرست تھی لیکن وہ اس کی محبت میں یوں پاگل تھے کہ انہیں اس کی ہر خامی بھی خوبی محسوس ہوتی تھی...... اپنی محبتوں کے جواب میں اس کی بے نیازی بھی بھلی لگتی تھی۔ ہاں کبھی، کبھی دل مچلتا تھا، تڑپتا تھا، ہمکتا تھا کہ کبھی تو وہ بھی ان کی محبت میں بے قرار نظر آئے...... لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا...... ان کی روح کے ریگزار پیاسے ہی رہے تھے۔

ان کے دل کی یہ خواہش حسرت بن گئی تھی اور بات اس حسرت تک ہی رہتی تو وہ ساری زندگی اس سے گلہ تک نہ کرتے کہ ان کا دل اس کا ایسا ہی شیدائی تھا...... اس کی محبت میں یونہی سودائی تھا...... مگر شزا احمد نے تو انہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کتنے آرام سے اس نے اپنی راہیں الگ کرلی تھیں...... سر راہ ملنے والے ایک اجنبی شخص کی خاطر...... جس سے اس کی شناسائی کو مہینے اور سال نہیں صرف چند دن ہی گزرے تھے۔ اور ان چند دنوں میں وہ اس کے لیے اس قدر اہم ہوگیا تھا کہ اس کے سامنے وہ اور ان کا رشتہ تو کسی گنتی میں ہی نہیں تھے...... اس کے لیے تو ماں، باپ اور بہن، بھائی بھی غیر اہم ہوگئے تھے۔ حیرت، صدمے اور تذلیل کے احساس نے انہیں گنگ کر کے رکھ دیا تھا، اندر باہر ایسی ٹوٹ پھوٹ مچی کہ باوجود کوشش کے وہ خود کو سنبھال نہیں پائے اور بکھر کر رہ گئے تھے۔

کئی سال انہوں نے اپنے دل کے زیاں کا، اپنی محبتوں کی ناقدری کا ماتم کیا تھا...... اور پتا نہیں کب تک کرتے رہتے۔ اگر یہ انوکھی سی لڑکی زارا علی ان کو نہ مل جاتی۔

زارا علی، نہیں زارا احمد...... کیسا خوب صورت ہے یہ نام...... کیسی انوکھی سی مٹھاس ہے اس میں...... اور وہ خود کیا کم انوکھی تھی۔ پتا نہیں اسے ان میں کیا نظر آیا تھا کہ وہ خود کو ان کے پیچھے خوار کرنے پر تل گئی تھی۔

☆☆☆

مسلسل بجتی فون کی بیل پر ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ دوسری طرف وہ ہوگی۔

"ہیلو......" جمائی روکتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

"ہیلو......" نسوانی مترنم سی آواز پر وہ چند لمحے سانس روکے کھڑے رہ گئے تھے۔

"آئی ایم زارا علی...... کل بک شاپ کے سامنے ملاقات ہوئی تھی آپ سے......"

رک، رک کر کہے گئے اس جملے نے ان کے حواس پوری طرح بیدار کردیے تھے۔ ساری نیند جیسے پل میں اڑن چھو ہوگئی تھی۔

"وہ...... آپ...... سن رہے ہیں ناں...... پلیز فون مت بند کیجیے گا...... کل اجیہ نے آپ سے بدتمیزی کی...... میں سوری کرنا چاہ رہی تھی......" کچھ ڈرتے، ڈرتے کہا گیا تھا۔

اور وہ...... اپنی دلی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھے۔ سارے دن کی تھکن کے باوجود، عین آرام کا ٹائم ہونے کے باوجود انہیں اس سے بات کرنا برا لگ رہا تھا نہ ہی اس

کے بے وقت فون کرنے پر غصہ آرہا تھا...... حالانکہ غصہ آنا چاہیے تھا۔اور شدید آنا چاہیے تھا...... تو پھر کیوں نہیں آرہا تھا...... وہ الجھے، الجھے سے خاموش کھڑے تھے۔

"میں...... میں آپ کی شاعری بہت شوق سے پڑھتی ہوں...... آپ کی شاعری میں رچا ہوا اک عجیب سا گداز اور اداسی کا تاثر مجھے بے حد انسپائر کرتا ہے...... سوتے ہوئے آپ کی کوئی نہ کوئی کتاب ضرور میرے سرہانے ہوتی ہے۔" اس کے لہجے سے عیاں گھبراہٹ دور ہو چکی تھی اور اب وہ خاصی روانی اور اعتماد کے ساتھ بول رہی تھی۔

"میں نے اب تک آپ کی سو بکس تو ضرور اپنی فرینڈز کو گفٹ کی ہوں گی اور آپ کو پتا ہے...... آپ کی ہر بک دیتے ہوئے میں ان سے پرامس لیتی ہوں کہ وہ آپ کی باقی بکس ضرور خریدیں گی۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی اور ان کے دل کے مندر میں جیسے ایک عرصے کے بعد گھنٹیاں سی بجی تھیں۔

پھر اسے جیسے اچانک ہی ان کی خاموشی کا احساس ہوا تھا۔

"آپ کیا اپنی آواز نہیں سنوائیں گے...... ڈانٹ ہی لیں مگر پلیز بولیں تو سہی......"

کتنا انوکھا انداز تھا اس کے بات کرنے کا...... اُن کی دھڑکنیں ایک پل کو بے ترتیب ہوئی تھیں۔

"آپ کے سامنے کوئی بول سکتا ہے......" وہ بے اختیار بولے تھے اور بول کر بری طرح پچھتائے تھے...... بھلا کیا ضرورت تھی یہ کہنے کی...... کیا سمجھتی ہو گی وہ، انہوں نے جھنجلا کر سوچا...... اور خود کو ڈپٹنے کے ساتھ، ساتھ اسے بھی ڈانٹتے ہوئے دوبارہ فون نہ کرنے کی تنبیہہ کی تھی اور ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا تھا۔

لیکن دل...... عرصے کے بعد اپنے ہونے کا احساس دلا رہا تھا کروٹیں بدل، بدل کر نیند کی دیوی مہربان ہوئی تھی نہ ہی ان ڈبڈبائی ہوئی بھرائی ہوئی سی آنکھوں نے پیچھا چھوڑا تھا اور صبح ابھی وہ بیدار بھی نہیں ہوئے تھے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

"ہیلو......!" بوجھل نیند بھری آواز میں انہوں نے کہا تھا۔

"کسی کی نیندیں چرا کر خود کتنے مزے سے سو رہے ہیں آپ...... اور کہا جاتا ہے کہ شاعر لوگ بڑے حساس ہوتے ہیں۔" تاسف بھرے اداس لہجے میں کہا گیا...... ان کا دل بری طرح دھڑکا تھا اور ساتھ ہی دل کی اس شتر بے مہاری پر غصہ بھی آیا تھا۔

"آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟"

"کیا واقعی...... ابھی تک آپ یہ بھی نہیں سمجھ پائے...... سویٹ......" اس نے طنزیہ کہا۔

"میں آپ کو چاہتی ہوں...... اور جنہیں چاہا جاتا ہے انہیں پانے کی خواہش نیچرل سی بات ہے...... I mean I want to marry you."

"دیکھیے محترمہ!"

"زارا علی...... زارا علی نام ہے میرا اور مجھے اچھا لگے گا اگر آپ میرا نام لے کر پکاریں......" دھیمے سے انداز میں ٹوکتے ہوئے قدرے التجائیہ انداز میں کہا گیا۔

"محترمہ زارا علی...... کیا جانتی ہیں بھلا آپ میرے بارے میں......"

"مجھے کچھ نہیں جاننا...... سوائے اس کے کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں...... اور جس انسان سے محبت کی جائے دل ہر دم اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے...... دیٹس اِٹ......" عجیب سی ہٹ دھرمی لیے وہ لہجہ ان کی دھڑکنوں کو بری طرح منتشر کر گیا۔

"اگر آپ مذاق کر رہی ہیں تو انتہائی فضول مذاق ہے......"

"کمال ہے جناب...... آپ محبت کو مذاق کہہ رہے ہیں......"

"ہاں...... تو اور کیا ہوتی ہے محبت آپ لڑکیوں کے لیے...... بولیے جواب دیجیے......" جانے دل کے کس حصے کو ٹھیس پہنچی تھی کہ وہ یک دم بے حد تلخ ہو گئے تھے...... ایک جھٹکے سے ریسیور کریڈل پر پٹخا اور بند

کراؤن سے پشت ٹکاتے ہوئے خود کو نارمل کرنے کی سعی کرنے لگے۔

پھر بہت سے دن گزر گئے تھے۔ اس کا فون نہیں آیا تھا۔ لاشعوری طور وہ شدت سے اس کے فون کے منتظر تھے...... اس کا ثبوت ان کا بے اختیار ہر بیل پر فون کی طرف لپکنا تھا...... حالانکہ ہر بار اپنی اس حرکت پر وہ خود سے ہی ناراض بھی ہوتے تھے اور پشیمان بھی۔

پورے ہفتے کے بعد اس دن اس کی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تھی اور ان کا دل دھڑک اٹھا تھا اور تمام تر حسیات جیسے سماعت بن گئی تھیں...... اسے سننے کے لیے بے تاب اور مشتاق......

''کیسے ہیں آپ......؟''

''فائن......''

''آپ سمجھ رہے ہوں گے میں نے ہمت ہار دی ہے...... مگر زاراعلیٰ نے ہارنا نہیں سیکھا......'' ایک عجیب سا یقین تھا جو اس کے لہجے میں جھلک رہا تھا...... اور یہی یقین تھا جو انہیں بری طرح تاؤ دلا گیا تھا۔ ان کے دل میں جیسے ایک آگ سی سلگ اٹھی تھی۔ دل و روح پر لگے زخم کسی نے ادھیڑ کر رکھ دیے تھے۔

ان کے سامنے یک دم شہزاد احمد آ کھڑی ہوئی تھی۔ چمکتے چہرے کے ساتھ...... اپنی جیت کے نشے میں سرشار...... اور اس کے سامنے وہ کھڑے تھے...... مایوس، ملول اور اپنی ہی زندگی سے بیزار...... انہیں ایک دم لگا تھا جیسے زاراعلیٰ بھی انہیں ہرانا چاہتی تھی...... اپنے سامنے جھکانا چاہتی تھی۔

انہیں اس کا انداز...... اس کے الفاظ چیلنج کرتے ہوئے محسوس ہوئے تھے اور انہوں نے یہ چیلنج قبول کرتے ہوئے پل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اور پھر سب کچھ جیسے بے حد آسانی سے ہوتا چلا گیا تھا...... لیکن جلد ہی انہیں پتا چل گیا تھا کہ یہ سب کچھ ایسی بھی آسانی سے نہیں ہوا تھا۔

وہ جو اپنے والدین کی اکلوتی اور بے حد لاڈلی اولاد تھی...... اس نے جانے کتنے جتنوں اور منتوں سے انہیں منایا تھا وہ نہیں جانتے تھے۔

لیکن وہ کس دل سے مانے تھے، یہ بارات اور ولیمے والے دن ان سب کے بجھے، بجھے چہرے اور سپاٹ انداز دیکھ کر وہ بخوبی جان گئے تھے۔ گو ان کی خوشی یا ناراضی سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن پھر بھی اُن کا دل برا ہوا تھا۔ وہ خود بھی ان کے ساتھ انتہائی لیے دیے انداز میں رہے تھے۔

''کیا آپ کے پیرنٹس اس شادی پر ناراض ہیں......؟'' اس کا خوشبوئیں بکھیرتا حسین سراپا جانچتے ہوئے انہوں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔ وہ کچھ حیران، حیران سی...... خاموش سی انہیں دیکھنے لگی تھی...... حیرانی تھی بھی بجا...... ولیمے کی دلہن سے تنہائی میسر آتے ہی انہوں نے یہ کیا کہہ دیا تھا۔

ان کے رویّے کی وجہ سے اسے ان سے کسی خوب صورت جملے کی امید تو تھی ہی نہیں...... مگر...... اِک سراہتی نگاہ بھی نہیں ملے گی...... یہ وہ نہیں جانتی تھی۔

''اگر ناراض ہوتے تو شادی کیوں کرتے...... اور میں بے شک بہت اچھی بیٹی نہیں ہوں...... مگر اتنی بری بھی نہیں کہ انہیں ناراض کر کے شادی کر لیتی......'' اس نے دھیمے لہجے میں سنجیدگی سے کہا اور جیولری اتارنے لگی تھی۔

کم از کم اس وقت وہ اس پر غصہ کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن اس کے انداز نے انہیں غصہ دلا دیا تھا...... انہیں لگا تھا جیسے وہ ایک ہی دن میں ان پر حاوی ہو رہی تھی۔

''اچھا تو وہ سب بہت خوش تھے......'' تلخی سے کہتے وہ اس کے سامنے آ رکے...... ان کے انداز پر اس نے جیسے ہڑبڑا کر انہیں دیکھا تھا۔

''خوش تو نہیں تھے...... لیکن مجھے خوش دیکھ کر بہت جلد خوش ہو جائیں گے...... بلیوی......'' وہ صرف ایک لمحے کے لیے بوکھلائی تھی...... پریشان نظر آئی تھی پھر مطمئن سی انہیں یقین دلانے لگی تھی۔

اور وہ پتا نہیں کیا چاہتے تھے...... کھا جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھتے بیڈ سے اپنا تکیہ اٹھایا تھا اور

لائبریری کے اندرونی دروازے کی جانب بڑھے تھے..... وہ ہکا، بکا سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

"مجھے اکیلے سونے کی عادت ہے اور فی الحال میں کسی کی وجہ سے اپنی عادت کو بدلنے کے موڈ میں نہیں ہوں..... اس لیے میں لائبریری میں سوؤں گا..... آپ چینج کر کے سو جائیں..... اور ہاں..... صبح جب دروازہ ناک ہو تو مجھے اٹھا دیں....."

اطمینان سے کہتے ہوئے انہوں نے لائبریری کا اندرونی دروازہ کھولا تھا اور اندر داخل ہو کر بند کر دیا تھا..... اپنے تئیں انہوں نے ایک ہی وار میں اسے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ لیکن اگلی صبح وہ حیران رہ گئے تھے۔ بے حد خوب صورت اور نفیس سے کرتے پاجامے میں ملبوس ہلکا، ہلکا میک اپ کیے وہ بے حد ہشاش بشاش اور خوش باش تھی۔

عجیب لڑکی تھی..... اس کا شوہر اس پر نگاہ ڈالے بنا..... دوسرے کمرے میں جا سویا تھا اور اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔

"خوب صورت بھی کس قدر ہے ظالم..... نگاہ ہی نہ ہٹے..... اسی خوب صورتی کی وجہ سے شاید محترمہ اس گمان میں ہیں کہ چار دن میں اثیر احمد کی ساری اکڑ دھری رہ جائے گی....." ان کی ذہنی رو پھر بدلی تھی اور ساتھ ہی نگاہ اور موڈ بھی.....

وہ تیز، تیز قدموں سے دروازہ کھول کر واش روم میں گھس گئے تھے اور وہ ٹوٹے دل کی کرچیوں کو سنبھالتی، لبوں پر مسکراہٹ سجاتی کمرے کا دروازہ کھولنے لگی تھی۔

وہ جان چکی تھی کہ انہوں نے اسے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا..... دل میں گھر اسے خود کرنا تھا۔

اور وہ ایسا کر لے گی..... اسے خود پر..... اپنی محبت پر یقین تھا۔

☆☆☆

"آپ کتنے بد ذوق ہیں..... آپ کو شوق ہی نہیں ہے خود کو دولھا بنے دیکھنے کا....." انہیں ایک مرتبہ سرسری سا بلانے کے بعد وہ خود ہی بے حد ذوق و شوق سے شادی کی مووی دیکھنے لگی تھی۔

وہ یونہی خواہ مخواہ الماری میں کھٹر پٹر کرتے رہے تھے اس کی بات پر کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔

پھر الماری کا پٹ بند کرتے ہوئے وہ پلٹے تھے۔ ایک اچٹتی سی نگاہ سے اس کا سجا سنورا سراپا دیکھا پھر..... لیپ ٹاپ کی جانب دیکھا تھا۔

جو چہرہ ان کی نگاہوں کے سامنے تھا وہ اس سے ملے تو لمحہ بھر کے لیے ہی تھے۔ وہ آیا تھا اور رسمی علیک سلیک کے بعد گفٹ دیتا واپس پلٹ گیا تھا مگر ان چند لمحوں میں بھی جانے کیوں وہ ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کر گیا تھا۔

"یہ کون ہے.....؟" بے اختیار ہی انہوں نے پوچھا تھا۔

"حنان..... میرا ماموں زاد ہے..... اگر آپ سے میری شادی نہ ہو سکتی تو شاید حنان سے ہوتی..... ماما، پاپا بہت پسند کرتے تھے حنان کو....."

آرام سے کہہ کر وہ پھر اسی محویت سے اسکرین کی جانب دیکھ رہی تھی اور وہ اس کے چہرے پر نگاہ جمائے کچھ دیر خاموش کھڑے رہے تھے پھر سر جھٹک کر کمرے سے نکل گئے تھے۔

مگر وہ نام..... "حنان....." سارا دن ان کے دماغ سے نہیں نکل سکا تھا..... وہ بے حد ڈیشنگ، انتہائی اسمارٹ نوجوان..... بھلا زارا علی کو وہ کیوں پسند نہیں تھا؟ یا پھر اسے زارا علی..... حالانکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے پرفیکٹ تھے..... بے اختیار انہوں نے سوچا تھا اور پھر اپنی سوچ پر جھنجلا کر رہ گئے تھے۔

اس دن وہ لوگ زارا کے انکل وسیم احسن کے گھر ڈنر پر مدعو تھے..... کھانے کے بعد وسیم احسن ملک کی سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال پر بات چیت کرنے لگے تھے..... مسز احسن کھانے کے برتن اٹھوا رہی تھیں۔ زارا اور راجیہ باہر چلی گئی تھیں۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ جانے کی اجازت لیتے باہر نکلے تو وہ دونوں لان کی چیئرز پر بیٹھی نظر آئیں۔ ذرا سا آگے بڑھنے پر حسان کا نام ان کی سماعت سے ٹکرایا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ستون کی آڑ میں رک گئے تھے۔

"تم جانتی ہو زارا۔۔۔۔ حسان کو اس قدر چپ اور کھویا، کھویا دیکھ کر مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے اور تم پر کس قدر غصہ آتا ہے۔۔۔ تم دونوں میرے دوست ہو۔۔۔۔ میں نے تم دونوں کو ہمیشہ ساتھ، ساتھ دیکھا تھا۔۔۔ تم دونوں یوں الگ ہو جاؤ گے ایسا تو میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔۔۔" وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی تھی پھر تیز لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

"اسے بکھرا، بکھرا دیکھتی ہوں اور تمہیں اس سڑیل۔۔۔"

"اسٹاپ اٹ اجیہ۔۔۔ میں تمہاری سب باتیں برداشت کر سکتی ہوں بٹ۔۔۔ اثیر کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں۔۔۔" اس نے فوراً ہی اپنی تنک مزاج کزن کی بات کاٹ دی تھی۔ چند لمحے دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھتی رہی تھیں۔۔۔۔ پھر اجیہ نے گہری سانس لی تھی۔

"اللہ کرے میرا یہ خیال غلط ہو۔۔۔۔ لیکن پتا نہیں کیوں مجھے بار، بار لگتا ہے کہ تم نے ایک غلط decision لیا ہے۔۔۔ سچ میں زارا۔۔۔۔ مجھے تو ان اثیر صاحب سے ڈر لگتا ہے۔۔۔ بہت زیادہ۔۔۔۔ بڑے سخت بلکہ کرخت آدمی لگتے ہیں مجھے۔۔۔۔ اوں ہوں۔۔۔۔ ڈونٹ وری۔۔۔ یہ میرا خیال ہے اور تمہیں پتا ہے ناں میرے خیال اکثر غلط نکلتے ہیں۔"

وہ یقیناً اچھی دوست تھی۔۔۔۔ انہوں نے وہیں کھڑے اعتراف کیا۔ زارا کے اترے چہرے کو دیکھ کر پل میں اس نے اپنا لہجہ اور انداز بدل لیا تھا۔ کہاں تو اس کا انداز تھا کہ پھونک مارے اور بھسم کر دے اور کہاں وہ ہلکے پھلکے لہجے میں خود کو غلط کہہ رہی تھی۔

"میری دعا ہے کہ تم بہت خوش رہو۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ اثیر بھائی کے دل میں تمہارے لیے بہت ساری محبت پیدا کر دے۔۔۔۔" بے حد جذب سے کی گئی اس دعا سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ اس سے کس قدر محبت کرتی تھی۔ اس کی اس محبت نے جہاں انہیں مرعوب کیا تھا وہیں ان کے دل میں ایک خلش سی ابھری تھی۔

وہ خاموشی سے پلٹ آئے تھے۔۔۔۔ جانے کیوں وہ اس لڑکی اجیہ سے سامنا کرنے سے کترا رہے تھے۔

مگر جس وقت وہ لوگ گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے وہ اچانک ان کے قریب چلی آئی تھی۔

"السلام علیکم اثیر بھائی! کیسے ہیں آپ۔۔۔۔؟"

"فائن۔۔۔۔"

"میری طبیعت ذرا ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے آپ کو کمپنی نہ دے سکی۔۔۔۔ سوری فار دیٹ۔۔۔۔"

"اٹ ڈزنٹ میٹر۔۔۔۔"

"زارا کا بہت خیال رکھیے گا۔۔۔۔ یہ آپ سے بہت محبت کرتی ہے۔۔۔۔ امید ہے آپ جان گئے ہوں گے۔" دھیمے محبت بھرے لہجے میں کہتے، کہتے یک دم اس کا لہجہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کی بات کے جواب میں کیا کہیں۔۔۔۔ تبھی آنٹی کی بات نے ان کی مشکل آسان کر دی تھی۔

"ارے ہماری زارا ہے ہی اتنی اچھی۔۔۔۔ کون ہے جو اس کا خیال نہیں رکھے گا۔"

پیار سے زارا کو ساتھ لگاتے ہوئے وہ محبت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک نظر اس کے چمکتے دمکتے خوب صورت چہرے پر ڈالی تھی اور خاموشی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھے تھے۔

محتاط رفتاری سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے انہوں نے چور نظروں سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ اپنے کیوٹکس سے سجے نیلو والے خوب صورت ہاتھوں پر نگاہ جمائے وہ جیسے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"کس سوچ میں ہے یہ۔۔۔۔؟" ان کے اندر اضطراب کروٹیں لینے لگا۔ "شاید پچھتا رہی ہے۔ ہونہہ۔۔۔۔ یہ لڑکیاں۔۔۔۔ اور ان کی محبت۔۔۔۔" تلخی

سے سر جھٹکتے ہوئے انہوں نے یک دم اسپیڈ بڑھائی تھی۔ جھٹکا لگنے پر اس نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا تھا۔

ان کے چہرے کے کرختی سے تاثرات پر اک لمحے کے لیے اس کا دل ڈوبا تھا لیکن اگلے ہی لمحے وہ خود کو سنبھال کر مسکرائی تھی اور انہیں مخاطب کیا تھا۔

''کیسی لگی آپ کو انکل کی فیملی......؟''

''جیسے لوگ ہوتے ہیں۔''

''لوگ تو ہر طرح کے ہوتے ہیں......اچھے، برے، بہت اچھے، بہت برے......'' اس نے عام سے لہجے میں کہا تھا لیکن انہیں لگا تھا جیسے وہ جرح کر رہی ہو۔

جواب میں انہوں نے اسے ایسی نگاہوں سے گھورا کہ اس کے چہرے پر اک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا پھر اس نے سارے راستے کوئی بات نہیں کی تھی......

انہوں نے ایک دو مرتبہ چور نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تھا اور اس کے اترے، اترے چہرے کو دیکھتے ہوئے خود کو اِک موہوم سے ملال میں بھی گھرتے محسوس کیا تھا۔

''مجھے لگتا ہے میں آپ کو بالکل بھی اچھی نہیں لگتی......اگر ایسا ہے تو پھر آپ نے مجھ سے شادی ہی کیوں کی؟'' وہ کوٹ اتار رہے تھے جب ان سے کوٹ لینے کے لیے اس نے ہاتھ ان کی جانب بڑھاتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں پوچھا تھا۔

انہوں نے ایک نظر اس کے جھکے ہوئے چہرے پر ڈالی کوئی الٹی سیدھی بات کرنے کو دل نہیں چاہا تھا اس لیے کوئی جواب دیے بغیر واش روم کی جانب بڑھ گئے تھے۔

لیکن اس کا سوال......

''پھر آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟'' مسلسل ان کے ذہن میں چکرا رہا تھا۔

اور اس سے انہیں لگا تھا کہ انہوں نے اس سے شادی اس کے غرور، اس کے طنطنے کی وجہ سے، اسے ہرانے یا جھکانے کے لیے نہیں کی تھی......بلکہ......بلکہ اور اس بلکہ کے آگے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتے تھے......کچھ ماننا نہیں چاہتے تھے۔ چینج کر کے باہر آئے تو وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی میک اپ صاف کر رہی تھی۔ آہستہ، آہستہ حرکت کرتے ہاتھ اور کھویا، کھویا سا چہرہ کسی سوچ کا غماز تھا۔

وہ چند لمحے واش روم کے دروازے پر کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ پھر بے دلی سے چلتے سائڈ کا دروازہ کھول کر اسٹڈی روم میں چلے آئے تھے لیکن پڑھنا لکھنا خاک تھا......ہر صفحے پر اس کا اترا ہوا چہرہ تھا......اداس آنکھیں تھیں۔

''واہ اثیر صاحب......آپ کو تو بڑا زعم تھا اپنی جیت کا......'' کسی نے جیسے اس کا تمسخر اڑایا تھا۔

انہوں نے جھنجلا کر کتاب بند کی اور کمرے میں چلے آئے۔ نگاہ بے اختیار بیڈ کی جانب اٹھی تھی۔ وہ کروٹ لیے سو رہی تھی وہ دبے قدموں چلتے ہوئے بیڈ کی جانب آئے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی نگاہیں اس کے چہرے پر جا ٹکی تھیں......اس کی جڑی، جڑی پلکیں......چہرے پر ثبت آنسوؤں کے نشان دل ایک لمحے کے لیے ملال کی زد میں آیا تھا۔

یہ پیارا سا چہرہ بھلا رُلانے کے قابل کب تھا......چند لمحے وہ ایک ٹک اس کے چہرے کو تکے گئے......پھر آہستگی سے آگے بڑھے......دل چاہا اس کے رخسار پر ٹکے اس آنسو کو جو ابھی پوری طرح خشک نہیں ہوا تھا اپنی پوروں پر چن لیں......مگر اگلے ہی لمحے نگاہوں کے سامنے کئی بیتے منظر آ ٹھہرے تھے۔ ساتھ ہی اس کا فخر و غرور بھرا لہجہ......

''زارا علی نے ہارنا نہیں سیکھا۔''

''تو کیا ہار ہمیشہ اثیر احمد ہی کا مقدر ہے......'' تلخی سے سوچتے، سر جھٹک کر وہ آگے بڑھے تھے اور بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔ نیند تو کروٹیں بدل، بدل کر تھکنے کے بعد کسی طرح آ ہی گئی تھی۔

صبح آنکھ اس کی آواز پر کھلی تھی......یا اس کا ہلکا سا تکیہ کھینچنے پر......

''آپ کا الارم بج رہا ہے شاید آپ نے نماز کے لیے لگایا تھا۔'' انہوں نے آنکھیں کھولیں تو وہ مندی،

مندی آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
انہوں نے موبائل اٹھا کر الارم بند کیا اور تیزی سے اٹھ کر واش روم کی جانب بڑھ گئے۔
نماز پڑھنے کے بعد بستر کی جانب دیکھا تو محسوس ہوا وہ جاگ رہی تھی مگر یا تو سونے کی کوشش کر رہی تھی یا خود کو سوتا ظاہر کر رہی تھی۔
دعا مانگنے کے بعد وہ بیڈ کے قریب آ کر ایک لمحے کو کھڑے ہوئے تھے تبھی اس نے ذرا سی آنکھیں کھول کر دیکھا تھا اور انہیں اپنی جانب متوجہ پا کر پٹ سے دوبارہ آنکھیں بند کر لی تھیں۔
اس کی اس حرکت پر ایک موہوم سی مسکراہٹ نے بے اختیار ان کے لبوں کو چھوا تھا۔ لیکن صرف ایک پل کو...... اگلے ہی لمحے ان کا چہرہ ویسا ہی سپاٹ تھا۔
''کیا آپ کو نماز پڑھنا منع ہے......؟''
''جی......'' وہ بوکھلا کر جلدی سے اٹھ بیٹھی تھی۔
وہ آرام سے لیٹ گئے تھے اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا تھا۔
دوبارہ جب الارم بجا اور وہ اٹھے تو وہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ انہوں نے اسے دیکھا تھا اور چند لمحے دیکھتے رہے تھے۔
آتشی گلابی، فیروزی اور نیلے رنگوں سے مزین بے حد خوب صورت فراک پر اس نے ایپرن پہن رکھا تھا۔ بال کیچر میں قید تھے۔ شفاف چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ اس وقت وہ ایک مکمل خاتون خانہ لگ رہی تھی۔
''میں نے آپ کے کپڑے نکال دیے ہیں...... دیکھ لیں ٹھیک ہیں، ناشتا بس ریڈی ہونے والا ہے۔ جلدی سے اٹھ جائیں آپ......'' سلیپر پہنتے ہوئے ان کی نگاہ سیٹی کی جانب گئی تھی اور چند لمحوں کے لیے ان کا دل عجیب سے احساسات کی زد میں آیا تھا۔ پینٹ، کوٹ، شرٹ، ویسٹ، ٹائی حتیٰ کہ رومال، جرابیں بھی......
''ٹھیک نہیں ہیں تو کوئی اور نکال دوں......؟'' انہیں کپڑوں پر نگاہ جمائے دیکھ کر اس نے فوراً پوچھا تھا۔

''ٹھیک ہیں...... لیکن اب دوبارہ آپ میرے کپڑے نکالنے کی زحمت مت کیجیے گا...... میں خود نکال لوں گا۔''
''خود کیوں......؟'' اس نے اپنے پھیکے پڑتے لہجے پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔
''کیونکہ مجھے یہ سب خود کرنے کی عادت ہے۔''
''لیکن اب تو آپ کو اپنی یہ عادت ختم کرنا پڑے گی۔'' وہ سادہ سے لہجے میں کہہ کر باہر نکل گئی تھی لیکن انہیں محسوس ہوا تھا جیسے وہ ان پر دھونس جما رہی تھی۔
اور انہیں اس کی یہ دھونس بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔ اس لیے جب ڈائننگ ٹیبل پر آئے تو چہرے پر معمول سے زیادہ سرد مہری تھی۔ چیئر گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے انہوں نے تنقیدی نگاہ ٹیبل پر ڈالی تھی۔ جوس، فرنچ ٹوسٹ، چکن سینڈوچ، آملیٹ اور ایک پلیٹ میں کچھ ٹیڑھا میڑھا سا پراٹھا تھا۔
''جو کام نہیں آتا ہو اس میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔'' انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہے ہوں جو کام نہ آتا ہو اس میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔
اس کا چمکتا چہرہ ماند پڑ گیا تھا۔ جو چیزیں اچھی بنی تھیں ان پر خوش ہونے کے بجائے وہ ایک خراب چیز پر فوکس کیے تنقید کر رہے تھے۔
''کچھ دن پہلے ہی سیکھا ہے ناں...... اس لیے...... دو تین مرتبہ بنایا تھا پھر بھی اچھا نہیں بنا...... آپ یہ سینڈوچ لے لیں یا پھر فرنچ ٹوسٹ......'' اس نے بجھے، بجھے لہجے میں کہا اور پراٹھے والی پلیٹ سائڈ پر رکھ دی۔
ان کے دل میں ایک لمحے کے لیے ملال نے سر ابھارا۔ لیکن وہ دل کو ڈپٹ کر خاموشی سے ناشتا کرنے لگے تھے۔
وہ وقفے، وقفے سے کوئی نہ کوئی بات کر رہی تھی۔ حالانکہ انہوں نے اس کی کسی بات کے جواب میں کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔ لیکن وہ عجیب مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ چند لمحے پھیکے پڑتے چہرے کے ساتھ خاموش ہوتی اور ذرا دیر بعد پھر نارمل سی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتی۔
''امی جان کا نمبر نوٹ کروا دیجیے اور آفس کا بھی......'' جب وہ آفس کے لیے نکلنے لگے تو وہ ان کے

ساتھ باہر آتے ہوئے بولی تھی۔
انہوں نے ایک نظر اس کے چہرے کی جانب دیکھا پھر فوراً ہی نگاہ پھیر لی۔ لیکن انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ اس چہرے سے نگاہ پھیرنا اتنا آسان نہیں تھا۔
''آفس کا کیوں......؟'' انہوں نے بھویں اچکا کر پوچھا۔
''کوئی ضرورت ہی پڑ جاتی ہے۔'' ان کے انداز پر اضطراری انداز میں ہاتھوں کو مسلتے ہوئے اس نے دھیرے سے کہا تھا۔
''تو موبائل کس مرض کی دوا ہے......؟''
''موبائل کسی وقت آف ہوسکتا ہے...........
چارجنگ وغیرہ......'' اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئے اور بنا کوئی جواب دیے گاڑی نکال لے گئے تھے۔ بیک مرر میں دیکھا تو وہ حیرانی سے کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی پھر تو ان کے دن رات جیسے اسے حیران و پریشان کرنے میں ہی گزرنے لگے تھے۔ لیکن ہو یہ رہا تھا کہ وہ انہیں حیران و پریشان کر رہی تھی...... عجیب لڑکی تھی...... حیران بھی ہوتی، پریشان بھی...... رنجور اور ملول بھی نظر آتی۔ لیکن کچھ ہی دیر میں خود ہی نارمل ہو جاتی۔
خوشگوار لہجے میں باتیں کرتی، ان کا خیال رکھتی...... روٹین کے کام کرتی...... یوں مطمئن ہوتی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں...... اور انہیں اس کا یہ ''کچھ ہوا ہی نہیں......'' والا مگن انداز ہی بری طرح چڑاتا تھا، تاؤ دلاتا تھا۔ لیکن جانے کیوں جب اس کی آنکھوں میں اداسی نظر آتی...... آنکھیں بھر آتیں تو ان کا دل گداز ہونے لگتا۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ بڑے شوق سے تین چار ہینگر تھامے ان کے قریب آئی تھی۔
''دیکھیں اشیر......! ان میں سے کون سا ڈریس پہنوں......؟''
''جو مرضی پہن لیں......'' کپڑوں کی طرف دیکھے بنا اخبار پر نگاہ جمائے انہوں نے جواب دیا تھا۔
''پہلی مرتبہ آپ کے چچا کی طرف جانا ہے تو میں چاہ رہی تھی کہ......''
''میرے چچا کہیں کے پرائم منسٹر تو ہیں نہیں جو آپ تیاری میں اس قدر ہلکان ہو رہی ہیں۔'' ان کا موڈ ایک دم بگڑا تھا۔
''امی جان نے اچھی طرح تیار ہونے کے لیے کہا تھا...... اس لیے میں کچھ کنفیوز ہو رہی ہوں۔'' ان کے موڈ کو خاطر میں لائے بغیر اس نے آرام سے اسی انداز میں کہا تھا جس سے انہیں چڑ تھی۔
''نئی اطلاع ہے کہ آپ بھی کنفیوز ہوتی ہیں۔'' ان کے لہجے پر اس نے چونک کر ان کی جانب دیکھا تھا۔
''میرا تو خیال ہے آپ زندگی کے بڑے، بڑے فیصلے بغیر کسی کنفیوژن کے کر لیتی ہیں۔'' ان کے لہجے میں زیادہ کاٹ تھی یا ان کی آنکھوں میں...... وہ سمجھ نہیں پائی تھی لیکن دل میں جیسے نشتر سا چبھا تھا...... آنکھوں میں نمکین پانی امڈ آیا تھا۔
ان کے سامنے ہینگر رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ کئی لمحے وہیں ساکت رہے تھے۔ پھر اس نے ہینگر اٹھائے تھے اور خاموشی سے وارڈ روب کی جانب بڑھ گئی تھی اور ایک گہرا ملال ان کے دل کو بے کل کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

زندگی ایک عجیب سی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ ولیمے سے اگلے دن ہی اس کی ساس چھوٹے بیٹے کی طرف چلی گئی تھیں کیونکہ اس کی دیورانی کے ہاں ڈلیوری ہونے والی تھی۔ ویسے بھی ان کی رہائش چھوٹے بیٹے کے ساتھ ہی تھی کیونکہ بچوں کے بغیر ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ سارا دن گھر میں وہ ہوتی تھی یا گیارہ بارہ سالہ ایک لڑکا جو گھر کے چھوٹے، موٹے کاموں کے لیے رکھا گیا تھا۔ صفائی اور گھر کے کاموں کے لیے ماسی آتی تھی جو کام کر کے چلی جاتی تھی۔
انہوں نے کبھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ سارا دن اکیلے کیا کرتی رہتی ہے...... گھبراتی تو نہیں...... بور تو نہیں ہوتی...... اور وہ سارا دن کیسے گزارتی تھی...... وہی جانتی تھی وہ اکلوتی تھی۔ لیکن اکیلی کبھی نہیں رہی تھی۔

پھپھو اور ماموں کے گھر ساتھ، ساتھ تھے۔۔۔۔ ہر وقت کزنز میں سے کوئی نہ کوئی آیا رہتا۔۔۔۔ اکثر وہ لوگ ایک دوسرے کی طرف اکٹھے ہو جاتے۔۔۔ آؤٹنگ کے لیے نکل جاتے۔۔۔۔ ایسے میں ایک دم یوں اکیلے رہنا، خاموشی اسے خوفزدہ کر دیتی۔۔۔ کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ وہ کبھی کوئی مارننگ شو لگاتی، کبھی کوئی چینل، کبھی کوئی مووی لگاتی کبھی کوئی نئی ڈش ٹرائی کرتی۔۔۔۔ لیکن وقت پھر بھی جیسے بچ رہتا۔

سارے دن کے انتظار کے بعد وہ آتے اور اس کا دل کھل اٹھتا۔۔۔۔ چہرے پر رونق آجاتی۔۔۔۔ لیکن وہ۔۔۔۔ انہیں تو جیسے اس سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا، ان کے نزدیک تو شاید وہ کمرے میں رکھے فرنیچر یا ڈیکوریشن پیس کی طرح کی کوئی چیز تھی۔۔۔۔ یا شاید ان سے بھی کم حیثیت کی حامل۔۔۔۔ بے حد رنجیدگی سے سوچتے ہوئے اس کا دل بھر آتا۔

ایسے میں اس کا دل چاہتا کہ وہ اس کے سامنے ہوں تو وہ انہیں جھنجوڑ کر رکھ دے۔۔۔۔ ان سے پوچھے کہ اگر وہ انہیں اتنی بری لگتی تھی تو انہوں نے اس سے شادی ہی کیوں کی۔

وہ اسے حقارت سے ٹھکرا دیتے تو اسے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اب تھی۔۔۔۔ وہ اس کے قریب تھے لیکن جیسے صدیوں کے فاصلے پر تھے۔ وہ ان کے سامنے تھی لیکن جیسے انہیں نظر نہیں آتی تھی۔۔۔۔ مگر کیوں، کس وجہ سے۔۔۔۔ اس نے بے حد مضطرب ہوتے ہوئے سوچا تھا اور ایک گہری اداسی اسے اپنے حصار میں لینے لگی تھی۔

محبت اور اداسی کا بھی جیسے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادھر محبت دل میں بسیرا کرتی ہے۔۔۔۔ اُدھر اداسی آنکھوں میں ڈیرا ڈال لیتی ہے جانے کیوں۔۔۔۔

لیکن اجیہ اور سمیر بھی تو ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔۔۔۔ انہیں تو اس نے کبھی اداس نہیں دیکھا تھا۔

پھر وہ کیوں۔۔۔۔؟

اس نے جانے کس سے شکوہ کیا تھا اور کرتے ہی دل کچھ بے چین ہوا تھا۔ آنکھیں کچھ اور اداس ہوئی تھیں کیونکہ اسے پھر اس "جانے کیوں" کا جواب سمجھ میں آ گیا تھا۔

اس کی محبت یکطرفہ تھی۔ اور یکطرفہ محبت سوائے دکھ اور درد کے کچھ نہیں دیتی۔ "کاش میں اس دن اجیہ کو یہ نہ کہتی کہ "اگر میں کسی یورپین کنٹری میں ہوتی تو بھاگ کر اشیر احمد کو روکتی اور انہیں پرپوز کر دیتی۔ اور اگر میں نے کہہ ہی دیا تھا تو اجیہ ہمیشہ کی طرح سر جھٹک کر غصہ بھی جھٹک دیتی۔" اس دن اس نے بے حد اداسی سے سوچا تھا۔

کمرے میں خاموشی تو پہلے بھی تھی اب تو جیسے جنگل کا سا سناٹا تھا جو کمرے کے ساتھ، ساتھ اسے اپنی روح میں بھی پھیلتا محسوس ہوا تھا۔ پھر یک دم اس سناٹے میں ارتعاش پیدا ہوا تھا۔۔۔۔ گیٹ کی بیل بج رہی تھی۔ اس نے وال کلاک کی جانب دیکھا۔ شاید ماسی آئی تھی۔ جلدی سے دروازہ کھول کر وہ باہر نکل آئی تھی۔۔۔۔ حامد گیٹ کھول کر نذیراں کو اندر لا چکا تھا۔

"سلام بی بی! اج میں جھیتی آ گئی۔۔۔۔ جھیتی کم نبیڑ کے اج پنڈ جاناں اے۔۔۔۔" وہ جلدی، جلدی کہتی دوپٹا اتار کر ایک طرف رکھ چکی تھی۔ کام کرتے ہوئے مسلسل نذیراں کو بولنے کی عادت تھی۔ لیکن زارا کو اس کی یہ عادت بری نہیں لگتی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کی باتوں سے سناٹے میں آوازیں گونجنے لگتی تھیں۔

نذیراں کے جانے کے بعد اس نے دوپہر کا کھانا بنایا تھا۔ یہ سب کچھ چند دنوں میں اس نے ماما سے سیکھا تھا اور جیسے سیکھا تھا اسے یاد کر کے اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"ماما اب مٹن بنائیں۔۔۔۔"

"زارا تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔۔۔ صبح سے کچن میں گھسی ہوئی ہو، رنگ دیکھو ذرا اپنا۔۔۔۔ مجھے ایک بات بتاؤ۔۔۔۔ تم بیوی بن کر جا رہی ہو اس اشیر احمد کی یا کک۔۔۔۔"

"بیوی بھی اور کک بھی۔۔۔۔"

"لگ تو ایسا رہا ہے جیسے صرف کک۔۔۔۔"

انہوں نے اس کے لال بھبھوکا چہرے کو دیکھتے ہوئے جل کر کہا تھا اور وہ ان کے گلے میں بازو حمائل کرتی کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ ہر فکر سے آزاد ہنسی...... وہ ہنسی جو اب خواب وخیال ہو کر رہ گئی تھی۔

کبھی اس نے کہا تھا...... ہنسنا اور رونا بھی بھلا اپنے اختیار میں ہوتا ہے...... لیکن اب وہ جان گئی تھی کہ کبھی، کبھی ہنسنا اور رونا بھی اختیار میں کرنا پڑتا ہے۔ ہنسی نہ آرہی ہو پھر بھی زبردستی ہنسنا پڑتا ہے اور دل رو رہا ہو مگر آنکھ میں آنسو نہ آئے...... اس فن میں ماہر ہونا پڑتا ہے۔

☆☆☆

ہر اک زخم کو اس نے ہدف بنایا تھا
ستم ظریف! میرا راز دار کتنا تھا
تیرے شہر میں یہ جو اک فقیر پھرتا ہے
انا پرست کبھی باوقار کتنا تھا
پھر اس کے بعد جو چاہے وہ سزا دینا
یہ سوچ لینا مجھے اختیار کتنا تھا
مجھے تو راس نہ آئے ملاپ کے موسم
شکستِ دل کا سماں سازگار کتنا تھا
یہ تپتی دھوپ ازل سے میرا مقدر تھی
شجر وفا کا مگر سایہ دار کتنا تھا
تمام عمر مجھے جو رُلا کے ہنستا تھا
وہ میرے بعد مگر اشکبار کتنا تھا
میں ہار کر بھی بہت مطمئن سا لگتا ہوں
وہ جیت کر بھی ضیا سوگوار کتنا تھا

وہ دل کی اداسی کو شاعری سے بہلانے کی کوشش کرتی لیکن نادانستگی میں شاعری بھی ایسی پڑھ رہی تھی جو اداسی کو کچھ اور بڑھا رہی تھی۔

''وہ جی بڑی بی بی آئی ہیں۔'' تبھی حامد دانت نکالتا ہوا لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔

''امی جان......!'' وہ ہاتھوں سے اپنے کپڑوں کو برابر کرتی جلدی، جلدی باہر نکل آئی اور ان کے گلے لگ گئی تھی۔

''آپ کو پتا ہے آج میں دعا کر رہی تھی آپ آ جائیں...... اور اب کچھ بھی ہو میں نے آپ کو جانے نہیں دینا...... آخر ہمارا بھی تو برابر کا حق ہے ناں آپ پر......'' اس کے اپنائیت اور دھونس بھرے لہجے پر انہوں نے اس کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

''وہ دیکھو حامد کی طرف......'' اس نے قدرے حیرانی سے حامد کی طرف دیکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں سفری بیگ دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔ گویا وہ ان کے پاس رہنے کے لیے آئی تھیں۔ وہ حقیقتاً خوش ہوئی تھی اور یہ خوشی اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔

''آپ کے لیے چائے بناؤں یا جوس......'' اس نے جلدی، جلدی انہیں فریج میں رکھے جوس گنوائے تھے۔

''ابھی کچھ نہیں...... چائے پیوں گی کچھ دیر بعد...... بلکہ اثیر آئے تو مل کر پئیں گے......'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

اس نے جلدی سے ان کا کمرا ٹھیک کیا تھا اور ان کے کپڑوں کو الماری میں ہینگ کر دیا تھا۔ ساتھ، ساتھ ان سے باتیں بھی کرتی رہی تھی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ان کے پاس رہنے کے لیے آئی تھیں...... وہ چاہتی تھی کہ ان کا ہر طرح سے خیال رکھے، انہیں آرام پہنچائے...... وہ جانتی تھی کہ دوسرے بیٹے کے گھر وہ بچوں میں گھری رہتی تھیں...... اس لیے اس کی کوشش تھی کہ وہ انہیں خوب کمپنی دے تاکہ وہ بور نہ ہوں...... لیکن اس وقت وہ یک دم پریشان ہوئی تھی جب انہوں نے باتیں کرتے، کرتے اچانک کہا۔

''زارا بیٹی! نماز کا ٹائم ہو گیا ہے...... پہلے نماز پڑھ لیں...... وضو کر کے ادھر ہی آ جاؤ...... میری الماری میں جانمازیں پڑی ہیں۔ وہ نکال لاؤ...... آج اکٹھے نماز پڑھتے ہیں......''

''جی......!'' اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہتے ہوئے انہیں اٹھتے دیکھا اور اضطراری انداز میں پہلو بدلا تھا۔

یہ نہیں تھا کہ اسے نماز بالکل نہیں آتی تھی...... بچپن میں قاری صاحب سے سیکھی تو تھی لیکن اتنے سال

ہو گئے تھے، پڑھی نہیں تھی تو اندر، اندر سے کافی بھول گئی تھی۔شادی کے شروع کے دنوں میں ایک مرتبہ اشیر کے کہنے پر فجر کی نماز پڑھی تھی تو کافی جگہ... اٹکی تھی...... تب دل ہی دل میں اللہ سے سوری کرتے ہوئے سوچا تھا کہ وہ کیسی مسلمان ہے کہ اسے نماز تک نہیں آتی اور یہ کہ اگلے ہی دن غلطیاں دور کرلے گی۔اور وہ اگلا دن آج آرہا تھا۔

''اب وہ پھر ان ہی غلطیوں کے ساتھ نماز پڑھے گی۔'' یہ خیال اسے پریشان بھی کررہا تھا اور نادم بھی۔

''امی جان...... کیا اللہ تعالیٰ سے ایک ہی غلطی پر دوسری بار سوری کی جاسکتی ہے...... میرا مطلب ہے کیا اللہ تعالیٰ دوسری بار بھی معاف کردیتے ہیں؟'' نماز ختم کرتے ہی اس نے بے اختیار پوچھ لیا تھا۔

''دوسری بار......! اللہ تعالیٰ تو اس قدر رحیم و کریم ہے کہ سو بار بلکہ بے شمار اور لاتعداد بار بھی بندے کو معاف فرمادیتے ہیں......''

''کل ہی امام غزالیؒ کی کیمیائے سعادت میں ایک حکایت پڑھ رہی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک بے حد ظالم شخص تھا جس نے ننانوے قتل کیے تھے۔اس نے تائب ہونے کا ارادہ کیا اور ایک عابد کے پاس گیا۔گناہوں کی تفصیل بتاکر عابد سے پوچھا...... کیا اللہ میری توبہ قبول کرلے گا۔عابد نے کہا نہیں اس نے کہا اچھا...... معافی تو ملے گی نہیں تو پھر سو پورے کردیتا ہوں خنجر نکالا اور عابد کو بھی قتل کردیا۔باہر نکلا تو ایک عالم ملے...... آدمی نے یہی سوال دُہرایا۔عالم نے کہا اللہ بے حد رحیم و کریم ہیں وہ ہمیشہ بندے کی توبہ کے انتظار میں رہتے ہیں۔تم سچے دل سے توبہ کرو اور فلاں بستی میں چلے جاؤ...... وہاں نیک لوگ رہتے ہیں تمہیں نیکی کی تحریک ملے گی...... اس آدمی نے ایسا ہی کیا اور سامان لیا اور عازم سفر ہوا۔کچھ سفر ہی طے ہوا تھا کہ موت نے اس کو آلیا۔رحمت اور عذاب کے فرشتوں میں اختلاف ہوا۔ہر ایک کا اصرار تھا کہ روح کو وہ لے کر جائے گا...... وہ رب رحیم و کریم جس کو چاہیں معاف فرمادیں...... چاہیں تو اسباب بنادے، چاہیں تو بلا سبب...... حکم ہوا زمین ناپو ساتھ ہی نیک لوگوں کی طرف کے راستے کو حکم ہوا سمٹ جا۔فاصلہ ناپا گیا تو وہ شخص نیک لوگوں کی بستی کے زیادہ قریب تھا۔چنانچہ رحمت کے فرشتے اس کی روح کو لے گئے۔''

وہ جو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ رکھے بڑی محویت سے ان کی بات سن رہی تھی ان کے خاموش ہوتے ہی چونکی پھر بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔

''ہاؤ امیزنگ......'' دل جو اتنی دیر سے پریشانی کے حصار میں تھا مطمئن ہوگیا تھا۔پھر ایک دم اسے ایک بھولا بسرا چہرہ یاد آیا اور ساتھ ہی کچھ باتیں کچھ یادیں...... حیرت کی بات تھی کہ جو باتیں سالوں یاد نہیں آئی تھیں...... اب یاد آئی تھیں تو لگتا تھا جیسے ابھی کل کی ہی بات تھی۔

''دادی جان! آپ کو پتا ہے مما کہتی ہیں میں سب سے زیادہ زارا سے پیار کرتی ہوں...... دادی جان آپ کس سے کرتی ہیں سب سے زیادہ پیار......'' ان کے گلے میں بازو حمائل کیے وہ ایک ٹانگ ان کی ٹانگ پر رکھے ان کے ساتھ لیٹی بڑے اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

''حسان سے ناں......'' ان کے ذرا سے توقف پر اس نے جیسے اندازہ لگایا تھا...... انداز کوئی بڑا معرکہ سر کرنے والا تھا۔

''نہیں......'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''مجھ سے؟'' سر ہلاتے ہوئے خوشی سے چمکتی آنکھوں کے ساتھ اس نے اپنے سینے پر انگلی رکھی تھی۔

''نہیں...... اللہ سے...... میں سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتی ہوں۔ تمہیں پتا ہے بھلا کیوں؟'' انہوں نے اس سے پوچھا تھا۔

''کیوں......؟'' اس نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائی تھیں۔

''کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔اس لیے اللہ کا حق ہے کہ ہم

بھی سب سے زیادہ اللہ سے پیار کریں۔"

"سب سے زیادہ......؟" کچھ سوچتے ہوئے انداز میں دونوں ہاتھوں کو پھیلاتے ہوئے اس نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا تھا۔

"سب سے زیادہ......" انہوں نے پیار سے اس کے بالوں کو سنوارا تھا۔

"اس کے بعد ماما اور پاپا سے...... ہے ناں......" وہ بڑی سمجھداری سے بولی تھی۔

"نہیں......" اس کے بعد اللہ کے پیارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔"

"ان سے کیوں دادی......؟"

"اس لیے میری جان کہ یہ اللہ کا حکم ہے...... اللہ کو پسند ہے۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے۔ "کوئی شخص اس وقت تک سچا مومن یعنی اچھا مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے اپنے ماں، باپ، اپنی اولاد اور سارے انسانوں سے زیادہ عزیز نہ ہوجائیں......"

دادی جان نے بے حد جذب کے عالم میں کہا تھا۔ جانے کیسے وہ یہ باتیں بھول گئی تھی جو اس وقت یوں اس کے دل میں اتر گئی تھیں جیسے اب کبھی نہیں نکلیں گی۔

"آپ کی باتیں سن کر مجھے اپنی دادی جان یاد آگئی تھیں امی جان...... وہ بھی ایسی ہی باتیں کیا کرتی تھیں...... کتنی اچھی، اچھی باتیں بتائی تھیں انہوں نے مجھے...... جو میں نے سب بھلادیں......" بے حد تاسف بھرے لہجے میں کہتی وہ انہیں بے حد پیاری لگی تھیں۔ انہوں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا تھا جس نے ان کے بیٹے کو اتنی خوب صورت اور خوب سیرت بیوی عطا کی تھی۔

اشیر آئے تو ماں کو دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی......

"صبح بات ہوئی تو آپ نے ذکر نہیں کیا آنے کا۔"

"میں نے سوچا اپنی بہو کو سرپرائز دیتی ہوں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے زارا کی طرف دیکھا تھا۔

اشیر احمد کی نگاہ بھی اٹھی اور پھر چند لمحوں کے لیے پلٹ نہ سکی...... نارنجی رنگ کے اسٹائلش سے سوٹ میں نفاست سے میک اپ کیے، آنکھوں میں خوب بھر کر کاجل لگائے وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔ انہیں دیکھتے پاکر اس کے چہرے پر خوب صورت سی مسکراہٹ پھیلی تھی جس نے اس کے حسن میں کچھ اور اضافہ کیا تھا۔

"آپ جلدی سے چینج کرلیں، میں چائے لارہی ہوں......" چمکتی آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھتی وہ کچن کی جانب بڑھ گئی تھی۔

چائے پر اس نے اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ اشیر احمد جانتے تھے کہ امی جان ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے کھانے پینے میں بہت احتیاط کرتی تھیں۔ لیکن ماں کی یہ خاطر مدارات انہیں پسند آئی تھیں۔

"دل موہ لینے میں تو ماہر ہیں محترمہ......" امی جان کو اس کی تعریف میں رطب اللسان دیکھ کر انہوں نے سوچا تھا۔

"رات کو کھانے میں کیا بناؤں امی جان......؟"

"کیا، کیا بنانا آتا ہے......؟"

"مٹن کڑاہی، کوفتے، بریانی۔" وہ جلدی، جلدی گنوا رہی تھی۔

امی جان کھل کر مسکرائیں اور اشیر احمد نے بہ مشکل مسکراہٹ چھپائی۔

"اتنی جلدی اتنا کچھ بنانا سیکھ لیا میری بہو نے اور اشیر تم نے مجھے بتایا ہی نہیں۔"

"آج کے دور میں یہ کون سا ایسا کارنامہ ہے امی جان ایک دو نہیں، بیسیوں چینل ہیں جہاں دن رات یہ سب کچھ سکھایا جارہا ہے۔"

"بے شک سکھایا جارہا ہے لیکن سیکھتی وہی لڑکیاں ہیں جن کو اپنے شوہر اور گھر سے محبت ہوتی ہے۔" امی جان نے فوراً کہا تھا۔

"دنیا کا حیرت انگیز واقعہ......" وہ بولے۔

امی جان نے حیرانی سے انہیں دیکھا...... زارا بھی برتن لے جاتے ہوئے ایک لمحے کو رکی۔

''ایک ساس اپنی بہو کی اس قدر والہ وشیدا نظر آرہی ہیں۔''

''بھئی بیٹا والہ وشیدا ہے تو ماں بھی ہوگی ہی......'' اشیر احمد نے بے اختیار زارا کی جانب دیکھا تھا۔اس کا مسکراتا چہرہ یک دم پھیکا پڑا تھا۔

مسکراہٹ ایک لمحے کو کہیں گئی تھی لیکن فوراً ہی اس خود کو سنبھال لیا تھا۔لیکن اس کی دلی کیفیت نہ صرف ان پر پوری طرح آشکار ہوئی تھی بلکہ انہیں بری طرح بے چین و بے قرار بھی کر گئی تھی۔

''ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا امی جان......! آپ کو یاد نہیں ثروت خالہ کیا کہتی تھیں اپنی بہو کے بارے میں......'' اس کا ذہن بٹانے کے لیے انہیں بروقت ایک بات یاد آئی تھی۔

''جادوگرنی ہے جادوگرنی......ایسا جادو کیا ہے میرے بیٹے پر کہ اس کے سوا اسے کچھ نہیں نظر آتا۔'' انہوں نے اس انداز میں کہا تھا کہ بے اختیار اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی اور یہی تو وہ چاہتے تھے۔

مسکراہٹ اس کے چہرے پر اچھی لگتی تھی......اس کی دلکشی کو کچھ اور بڑھا دیتی تھی۔انہوں نے دل سے اعتراف کیا تھا۔

''تم بھی حد کرتے ہو اشیر......کہاں ثروت کی نک چڑھی اور سازشی بہو اور کہاں ہماری زارا......'' ان کے لہجے میں زارا کے لیے بے حد محبت تھی۔

اس کی آنکھیں بے اختیار نم ہوئی تھیں۔

رات کا کھانا اس نے خوب دل لگا کر بنایا تھا اور جس طرح انہوں نے تعریفیں کر کے اور شوق سے کھایا تھا اس کی ساری محنت وصول ہوگئی تھی۔

وہ رہنے دو دن کے لیے آئی تھیں مگر پورا ہفتہ رہ کر جا رہی تھیں لیکن زارا کا اب بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ جائیں لیکن زیادہ روک نہیں رہی تھی کہ وہ بچوں کے لیے اداس ہوگئی تھیں۔

☆☆☆

گاڑی گیٹ سے نکلی تو وہ اداس سی لان میں چلی آئی۔ہوا میں ہلکی، ہلکی خنکی تھی جو اسے خوشگوار محسوس

دوستی

دوستی موسم نہیں جو اپنی مدت پوری کرے اور رخصت ہو جائے۔

دوستی ساون نہیں جو برسے اور تھم جائے۔

دوستی آگ نہیں جو سلگے، بھڑکے اور بجھ جائے۔

دوستی گلاب نہیں جو کھلے اور مرجھا جائے۔

دوستی تو سانس ہے جو چلے تو زندگی......

اور رُکے تو موت......

از: بیگم یاسمین جانی، لیہ شہر

نذرانۂ حریت

ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں

سندھی و پنجابی، بلوچی و پختون

رواں سب کے دلوں میں ہے درد کشمیر

گلگت ہو، جموں ہو کوہاٹ ہو کہ کوئٹہ

سب کو جمع کر کے ہی بنتی ہے مسلمانوں کی زنجیر

یاالٰہی کرم کر کھول دے بند اسیر

کر دے کفر کے دل میں پیدا رعب خالد بن ولید

از: حدیث اختر، حاصل پور

ہو رہی تھی۔چپل اتار کر پاؤں گھاس پر رکھا تو گھاس کی نمی اچھی لگی۔اس نے دوسری چپل بھی اتار دی۔

''باجی جی آپ اداس ہو گئے ہو ناں......بی بی جی کے آن نال رونق بھی تو کنی ہو گئی تھی......'' حامد اپنے مخصوص انداز میں اردو پنجابی مکس کیے کہہ رہا تھا۔

زارا نے حیرانی سے اسے دیکھا۔وہ بھی تو ابھی یہی سوچ رہی تھی۔

گزرے چند دن اس کی شادی شدہ زندگی کے خوب صورت اور خوشگوار دن تھے۔روزانہ اشیر احمد آفس سے فارغ ہوتے ہی سیدھے گھر آجاتے تھے۔امی جان کو دکھانے کی خاطر ہی سہی لیکن اسے لگاوٹ سے دیکھتے تھے۔ہلکا پھلکا ہنسی مذاق کرتے تھے اور

سوتے بھی بیڈروم میں تھے۔ ان کا گھر صحیح معنوں میں گھر لگنے لگا تھا۔

"کتنا اچھا ہو کہ امی جان ہمیشہ ہمارے ساتھ رہنے لگیں۔" اس نے بے اختیار خواہش کی۔

"اِک واری صاحب جی بی بی کے ساتھ لڑ پڑے۔" حامد باتیں کرنے کے موڈ میں تھا..... وہ بھی خاموشی سے گھبرا رہی تھی توجہ سے سننے لگی۔

"کہنے لگے..... آپ نے ہمیشہ مجھے کم پیار کیا اور بھائی کو زیادہ اب آپ کو میرے ساتھ رہنا چاہیے، میں اکیلا رہتا ہوں پر آپ کو اور ابا جان کو میرا کوئی خیال ہی نہیں....."

"بی بی جی نے کہا..... ہم رہتے ہیں پر توں شاموں شام گھر آ جانا جس کو بھی ملنا ہو اِدھر ہی آ کر ملے۔ صاحب جی من گئے..... پر بس دو دن جلدی آئے..... تیسرے دن پھر کسی شاعر نے روک لیا..... صاحب جی آئے تو بی بی جی نے گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ صاحب جی نے ہاتھ جوڑ دیے..... پر اگلے دن پھر وہی ٹائم بس بڑے صاحب جی اور بی بی جی ناراض ہو کے چلے گئے کہ ایسے اکیلے گھر میں ہمیں نہیں رہنا۔" حامد مزے لے لے کر بتا رہا تھا۔

"آپ کو پتا اے باجی جی....." اس نے راز داری کے سے انداز میں کہا تھا۔

"کیا.....؟"

"تسی بی بی جی کو بہت پسند آئی ہو....."

"اچھا....." وہ بے اختیار مسکرائی۔

"ہاں جی....." وہ بڑے پُرجوش انداز میں بتانے لگا تھا لیکن اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔ گیٹ پر ہارن بجا تھا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا اور وہ اجیہ اور حسان کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی تھی۔

"دس منٹ سے فون کر رہے ہیں..... کبھی تو فون ریسیو کر لیا کرو یار....." اجیہ نے اس کے گلے لگتے ہوئے کہا۔

"سوری ڈیئر فون اندر تھا۔ میں امی جان اور اشیر کو گیٹ تک چھوڑنے آئی تو یہیں لان میں بیٹھ گئی۔" اس نے جلدی سے کہا پھر حسان سے حال چال پوچھنے لگی۔

"ہم لوگ آپی کی طرف جا رہے تھے..... سوچا راستے میں تم سے بھی ہیلو ہائے کر لیں..... اور یہ پوئٹری بکس لی تھیں۔ میں نے تمہارے لیے، یہ بھی پہنچانی تھیں....." اجیہ نے گفٹ بیگ آگے کیا تھا۔

کتابیں ہوں اور زارا صبر کر جاتی..... یہ تو ہو نہیں سکتا تھا۔ اس نے تیزی سے بیگ سے کتابیں نکالی تھیں۔

"رُت ہی بدل گئی....." عنوان پڑھتے ہی اس کی آنکھوں میں مسرت آمیز چمک آئی تھی۔

"زیرِ زباں....." سجاد حیدر شاہ کی پہلی کتاب ہے۔ بڑی تعریف کر رہا تھا سیلز مین..... میں نے کہا میری کزن کو پسند نہ آئی تو واپس لے آؤں گی..... یاد رکھنا....."

"اور یہ تو تمہیں پتا ہی ہے کہ اجیہ کا یہ 'یاد رکھنا' کوئی بھول نہیں سکتا۔" حسان نے ہنستے ہوئے کہا تھا اور زارا بھی کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

حسان محویت سے اسے دیکھنے لگا تھا اور کھلے گیٹ سے اندر گاڑی لاتے ہوئے اشیر احمد نے یہ منظر جلتی شعلے برساتی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ابھی کچھ دیر قبل کی گئی امی جان کی ساری باتیں، ساری نصیحتیں بھک سے ذہن سے اڑ گئی تھیں۔

"چلو جی..... آ گئے تمہارے صاحب بہادر..... اب ہمیں اجازت دو....."

حسان نے اشیر احمد کی گاڑی دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ہیں..... ایسے کیسے..... بیٹھ جاؤ آرام سے آج میں تم لوگوں کو اپنے ہاتھ سے....." بے حد جوش و خروش سے کہتے، کہتے وہ ایک دم خاموش ہوئی تھی۔

اشیر احمد لان میں آنے کے بجائے اندر چلے گئے تھے۔ مارے خفت کے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ اور وہ کیا کہہ رہی تھی اس کے ذہن سے بالکل نکل گیا تھا۔

اجیہ، آپی کی طرف جلدی پہنچنے کا شور مچاتی اس کے رخسار پر پیار کرتی، تیز، تیز قدموں سے باہر کی جانب بڑھی تھی۔ اس کے پیچھے، پیچھے حسان تھا۔

وہ جانتی تھی کہ وہ اتنی جلدی میں نہیں تھے جتنی

جلدی ظاہر کر رہے تھے۔ صرف اس لیے کہ نہ تو وہ اپنی شرمندگی اس پر ظاہر کرنا چاہتے تھے نہ اسے شرمندہ دیکھنا چاہتے تھے۔

وہ کتنی ہی دیر گم صم سی وہیں کھڑی رہی تھی پھر شکستہ سے انداز میں چلتی اندر چلی آئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ جو بھی رویہ رکھتے لیکن مہمانوں کے ساتھ تو انہیں یوں ہی ہونہیں کرنا چاہیے تھا۔

اسے اپنا آپ بے حد کمتر محسوس ہو رہا تھا۔ انہوں نے اس کی ہی نہیں حنان اور اجیہ کی بھی انسلٹ کی تھی اور ان کی نظر میں اپنا امیج بھی خراب کر لیا تھا۔

☆☆☆

''حنان تم نے اچھا نہیں کیا......'' اجیہ کے ملال بھرے لہجے پر ڈیش بورڈ میں خواہ مخواہ ہاتھ مارتے ہوئے خود کو کمپوز کرتے حنان نے ایک جھٹکے سے اس کی جانب گردن موڑی تھی۔

''میں نے......؟'' اس کے لہجے میں حیرانی ہی حیرانی تھی اور حیرانی بھی بجا...... اس نے اس وقت بھلا کیا، کیا تھا۔

''ہاں تم نے...... کیا ہوتا جو تم چپ چاپ پیچھے ہٹ جانے کے بجائے زارا کو منانے کی کوشش کرتے...... مجھے یقین ہے وہ ضرور مان جاتی۔''

''وہ کبھی نہ مانتی اجیہ...... کسی کو منایا تب جا سکتا ہے اگر اس کا دل خالی ہوا اور اگر کسی کے دل میں پہلے سے کوئی بستا ہو تو پھر آپ کچھ بھی کر لیں اسے منا سکتے ہیں نہ قائل کر سکتے ہیں اور قائل کرنا بھی نہیں چاہیے...... اگر آپ کی محبت کسی کو اپنی جانب مائل نہ کر سکے تو دلائل اسے کبھی قائل نہیں کر سکتے۔''

اس کے کھوئے، کھوئے سے لہجے میں ایک گہرا رنج تھا جس نے اجیہ کے دل کو بے طرح اداس کیا...... وہ دل ہی دل میں خود کو ملامت کر رہی تھی کہ اس نے کیوں ایسی بات کی تھی جس نے حنان کو یوں رنجیدہ کر دیا تھا۔

وہ کیا نہیں جانتی تھی کہ زارا کو قائل کرنا ناممکن تھا اگر ممکن ہوتا تو اس نے کچھ کم کوشش تو نہیں کی تھی۔ پھر

سارا راستہ دونوں خاموش رہے تھے لیکن دونوں کی سوچیں زارا کے اردگرد ہی گھوم رہی تھیں...... دونوں اس کی خوشیوں کے لیے دعا گو تھے۔

☆☆☆

پہلی مرتبہ زارا نے بہانے، بہانے سے اثیر احمد کے اردگرد چکر نہیں لگائے تھے۔ لاؤنج میں بیٹھتے ہوئے خالد شریف کی رُت ہی بدل گئی نکالی اور پڑھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن دھیان بھٹک، بھٹک کر ان ہی کی جانب جا رہا تھا۔ مگر اندر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

زیادہ ملنے سے دل سے اتر نہ جائے کہیں
وہ شخص جس سے مجھے اس قدر عقیدت ہے

دل ایک دم بوجھل ہوا تھا اس نے آہستگی سے کتاب بند کر دی تھی۔

''یا اللہ...... جو لوگ دل میں بستے ہوں دل سے نہ اتریں کبھی......'' نہ جانے کس احساس کے تحت اس نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دعا کی تھی اور دو آنسو چپکے سے پلکوں کا بند توڑتے رخساروں پر آ ٹھہرے تھے۔

☆☆☆

بہت سارے یکسانیت کا شکار...... بے رنگ اور بے کیف دنوں کے بعد وہ ایک مختلف دن تھا...... اس دن وہ خوش بھی تھی اور پُرجوش بھی...... نذیراں کو ساتھ لگا کر پورے گھر کا کونا، کونا صاف کیا تھا...... مالی کے سر پر کھڑے ہو کر پودوں کی کانٹ چھانٹ کروائی تھی۔

کل اثیر احمد کی پیدائش کا دن تھا یعنی برتھ ڈے...... اسے کئی دنوں سے اس دن کا انتظار تھا...... اس نے امی جان سے معلومات لی تھیں...... اثیر احمد باقاعدہ سالگرہ نہیں مناتے تھے۔ بس بہن، بھائی اور دوست احباب اپنے طور پر انہیں وش کر دیتے۔

وہ چاہتی تھی کہ اس دن کو ان کے لیے بہت خوب صورت، بہت خاص بنا دے...... انہیں یوں وش کرے کہ پہلے کسی نے نہ کیا ہو۔

خاصے غور و خوض کے بعد اس نے ایک خوب صورت طریقہ سوچا تھا۔ اس کے لیے پھول اور سجے

پہنچانے کی ڈیوٹی اجیہ کی تھی کہ جب اثیر احمد سو جائیں تو وہ سمیر کے ساتھ آکر اسے پھول پہنچا جائے وہ اس کے پاگل پن پر برے، برے منہ بناتی اور بالآخر بیسٹ آف لک کہتی یہ سب پہنچا گئی تھی۔ اب وہ شدت سے صبح کی منتظر تھی۔

اس خدشے سے کہ کہیں صبح اس کی جلدی آنکھ نہ کھلے اس نے سونے کا ارادہ ہی ترک کر دیا تھا اور سجاد حیدر کی زیر زباں...... نکال کر پڑھنے لگی تھی۔

ہوش آیا جب مسیحا کو تو پوچھا یہ سوال
ایسی آنکھوں پر بتاؤ تم بھی مرجاتے ہو کیا

''واہ......
ایسی آنکھوں پر بتاؤ تم بھی مرجاتے ہو کیا
گڈ...... سجاد حیدر شاہ...... گڈ...... اچھا لکھا ہے آپ نے...... ٹھیک تعریف کی تھی سیلز مین نے آپ کی......'' اس نے بے اختیار شاعر کو داد دی تھی۔

صبح اثیر احمد کے جاگنے سے پہلے اس نے اپنے ہاتھ سے پینٹ کیے ہوئے کانچ پر کلرفل سا ہیپی برتھ ڈے لکھ کر ایزل کو بیڈ کی پائنتی کی طرف اس طرح ایڈجسٹ کیا تھا کہ آنکھ کھلتے ہی نظر سیدھی اس پر جاتی۔ ریڈ کلر کا سلک کا بے حد اسٹائلش سوٹ پہنے، مہارت سے میک اپ کیے وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی لیکن دل تھا کہ مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔

ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے میں ہر زاویے سے اپنا جائزہ لیتے ہوئے کئی بار میک اپ ٹھیک کیا تھا...... بالوں کو سنوارا تھا اور پھر بے تحاشا دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی جانب بڑھی تھی اور گلاب کی ڈھیر ساری پتیاں ان کے تکیے پر بکھیر دی تھیں...... بیڈ کی دونوں سائڈز پر خوب صورت تر و تازہ بوکے سجاتے ہوئے اس کے لبوں پر بے حد خوشگوار مسکراہٹ تھی۔

ہاتھ میں تھامے بکے کے اندر برتھ ڈے کارڈ کو ٹھیک کیا تھا اور آہستگی سے ان کو آواز دیتے ہوئے نرمی سے ان کا کندھا چھوا تھا۔

ہاتھ لگتے ہی انہوں نے فوراً آنکھیں کھول دی تھیں۔ سوئی، سوئی خمار آلود آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ ابھی تک جیسے نیند میں تھے۔

اس نے لبوں پر دلکش سی مسکراہٹ سجائے انہیں وش کیا تھا اور ''مینی، مینی ہیپی ریٹرنز آف دا ڈے......'' کہتے ہوئے بکے ان کی جانب بڑھا دیا تھا۔

لیکن اگلا لمحہ جیسے اس کے لیے قیامت لے آیا تھا۔ ان کی آنکھوں کے ساتھ، ساتھ زبان بھی شعلے اگلنے لگی تھی اور یونہی شعلے برساتی زبان اور آنکھوں کے ساتھ وہ اٹھے اور بکے اس کے ہاتھ سے چھین کر دیوار پر دے مارا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے وجود کو پوری طاقت سے آسمان سے زمین پر پٹخا تھا۔ بھر بھری مٹی کی طرح ریزہ، ریزہ کر دیا ہو...... اور دل و روح...... لیکن دل و روح کے بارے میں سوچنے کا ہوش ہی کسے تھا...... ابھی تو وہ وحشت زدہ چہرے اور پھٹی، پھٹی آنکھوں کے ساتھ ان شعلوں کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو اس شخص کی آنکھوں اور لبوں سے نکل رہے تھے جسے وہ بے تحاشا چاہتی تھی۔

''حد ہوتی ہے کند ذہنی کی بھی، دو چار دنوں میں انسان کو دوسرے کے مزاج کا پتا چل جاتا ہے لیکن آپ کو سمجھ ہی نہیں آرہی...... پتا نہیں دماغ ہے یا بھوسا بھرا ہوا ہے۔'' زہر بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ تیزی سے اس کے برابر سے گزر کر واش روم میں چلے گئے تھے۔

دھکا لگنے سے اس کے پاؤں زمین سے الگ ہوئے تھے اور وہ گرتے، گرتے بہ مشکل سنبھلی اور پھر بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

گیسٹ روم کے واش روم میں شاور کے نیچے کھڑے ہوتے، ہوئے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ ٹھنڈا پانی بارش کی طرح اس کے وجود کو بھگو رہا تھا۔ لیکن تپش تھی کہ جیسے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جانے کتنی دیر روتی رہی تھی اسے خبر نہیں تھی لیکن یہ خبر ضرور تھی کہ وہ اتنا اپنی اب تک کی زندگی میں نہیں روئی تھی۔

آنکھیں مسلسل رونے سے سوج چکی تھیں کہ کھل کر ہی نہیں دے رہی تھیں۔ ناک سرخ ٹماٹر ہو چکی تھی۔ سر

درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ ا براس سب سے سوا وہ درد تھا جو اس کے دل کو آکٹوپس کی طرح جکڑے اس کے لیے سانس تک لینا دشوار کر رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا دل بند ہو جائے گا۔ اس کے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔

اتنی تحقیر، ایسی تذلیل، اس قدر ذلت، اس کا دل چاہتا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے...... خود کو ختم کرلے...... یا کہیں ایسی جگہ چھپ جائے کہ کبھی اشیر احمد کو نظر نہیں آئے...... وہ جو ماں، باپ کی نہیں پورے خاندان کی پیاری، لاڈلی اور دلاری تھی۔ اس کی ذات اتنی ارزاں بھی ہو سکتی تھی کسی کے لیے...... اور ہونی ہی تھی تو کسی کے لیے بھی ہوتی...... پر اشیر احمد کے لیے تو نہ ہوتی۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے...... دکھ تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

منہ ہاتھ دھونے کے بعد اشیر احمد واش روم سے نکلے تو نگاہ سیدھی دروازے سے باہر پڑے ٹیکے پر پڑی۔ وہاں سے نگاہ پلٹی تو ایزل پر لگی پینٹنگ نے جکڑ لی۔ چند لمحے وہ خالی، خالی نگاہوں سے ایزل پر لگی بے حد خوب صورت پینٹنگ پر لکھے ''ہپی برتھ ڈے ٹو اشیر احمد'' کو تکتے رہے پھر تھکے، تھکے قدموں سے دروازے کی جانب آئے، زمین پر پڑا پھولوں کا گلدستہ اٹھاتے ہوئے ان کا دل ایک گہرے ملال میں ڈوبا ہوا تھا...... انہوں نے برا کیا تھا، بہت برا...... واپس پلٹتے ہوئے وہ خود کو ملامت کر رہے تھے۔

''کیوں ہو جاتا ہوں میں اس قدر سنگدل اور بے حس...... کیا فرق ہے آخر مجھ میں اور شزا احمد میں...... کچھ بھی تو نہیں...... کیوں نہیں بھول جاتا ہوں میں وہ سب تکلیف دہ باتیں...... اذیت رساں یادیں...... جو نہ صرف مجھے...... بے سکون رکھتی ہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی دکھ کا باعث بنتی ہیں۔'' گرنے کے انداز میں سیٹی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے شکستگی سے سوچا تھا۔

☆☆☆

وہ بھی تو ایک ایسی ہی صبح تھی...... نم، نم سی......

انہیں رات سے ہی اس صبح کا انتظار تھا...... شاید سب ہی محبت کرنے والے ایک جیسے ہوتے ہیں...... جس سے محبت کرتے ہیں اس کی زندگی کے سارے خاص دن...... سب خاص لمحے...... انہیں یونہی از بر رہتے ہیں اور انہیں خاص تر بنانے کی خواہش یونہی ان کے دل میں مچلتی رہتی ہے۔

اس صبح شزا احمد کا میٹرک کا رزلٹ آنا تھا اور ساری رات بے چین وہ رہے تھے۔ اللہ، اللہ کر کے رات گزری اور رات کا اندھیرا صبح کے پُرنور اجالے میں تبدیل ہوتے ہی وہ بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''خیریت ہے برخوردار......؟'' اخبار گرنے کی آواز پر تیز، تیز اپنے کمرے سے نکلے تو لاؤنج کا دروازہ کھولتے بابا جان نے پلٹ کر حیرانی سے انہیں دیکھتے ہی پوچھا تھا۔

''جی بابا جان......'' وہ خجل سے ہو کر سر کھجانے لگے۔

''کیا بات ہے...... طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' انہوں نے فکرمندی سے اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھا تھا۔

''جی ٹھیک ہے۔''

''لگ تو نہیں رہی...... آنکھیں بھی سرخ ہو رہی ہیں......''

''بس وہ رات کو ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔''

''کیوں؟'' اب وہ بھلا اس کیوں کا کیا جواب دیتے۔

''یہ کہ آج شزا احمد کا رزلٹ ہے اور وہ اسے سب سے پہلے مبارک دینا چاہتے ہیں۔ اس کا خوشی سے دمکتا چہرہ دیکھنا چاہتے ہیں۔'' یہ سب وہ دل ہی دل میں کہہ سکتے تھے۔

''بابا جان! آپ بیٹھیں، میں اخبار لے کر آتا ہوں۔'' ان کی بات گول کرتے جلدی سے کہتے وہ سائڈ سے ہو کر باہر نکل گئے اور بابا جان الجھی، الجھی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ڈائننگ ٹیبل پر آ بیٹھے تھے۔

انہوں نے جلدی سے اخبار سیدھا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ رزلٹ اناؤنس ہو چکا تھا۔ اخبار بابا جان کو تھماتے ہوئے وہ تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے تھے۔

☆☆☆

شاور لینے اور چینج کرنے میں انہوں نے چند

منٹ لگائے تھے باہر نکلے تو بابا جان کے ساتھ امی جان بھی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھیں۔

''ہیں......ایں...... یہ صبح، صبح کدھر؟'' انہیں دیکھ کر ان کے منہ سے نکلا تھا اور ساتھ ہی یک دم انہیں یاد آ گیا۔

''حد ہوگئی ہے بیٹے...... جس کا رزلٹ ہے وہ گھوڑے بیچ کر سو رہی ہے اور تم......''

''اچھا میں بھی کہوں...... آج صبح، صبح کیوں اٹھے ہوئے ہیں صاحبزادے......'' بابا جان بھی مسکراتے ہوئے بولے تھے اور وہ جھینپے، جھینپے انداز میں خدا حافظ کہتے باہر کی جانب بڑھے تھے۔

''ارے اللہ کے بندے...... بیٹھو ناشتا کرو...... نو دس بجے سے پہلے تو کہیں گزٹ بھی نہیں آتا......'' بابا جان نے کہا تھا۔

''ابھی بھوک نہیں ہے بابا جان......'' وہ کہتے باہر کی جانب بڑھ گئے تھے۔

لیکن ساری رات کے اس بے چین انتظار کا صبح، صبح نیند کی قربانی کا پہروں رش میں لائن میں لگنے کا نتیجہ کیا نکلا تھا۔

☆☆☆

اس کا رزلٹ ہمیشہ کی طرح شاندار تھا۔ صبح، صبح پھولوں کی شاپس تو کھلی نہیں تھیں۔ انہوں نے لان سے تین چار گلاب توڑے اور دادی جان کے کمرے کا رخ کیا تھا۔ دادی جان حسب معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں اور وہ ساتھ دوسری جائے نماز پر پڑی بے سدھ سو رہی تھی۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر دادی جان کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے وہ آہستگی سے جھکے اور پھول اس کے چہرے سے کچھ فاصلے پر رکھ دیے۔

اس سے پہلے کہ وہ اسے پکارتے اور رزلٹ کی مبارک باد دیتے اس نے تیزی سے کروٹ بدلی تھی۔

ٹہنی کے ساتھ لگا ہوا کانٹا اس کے نرم و نازک رخسار میں چبھا تھا اور وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی تھی نیند کے خمار سے بھری اس کی آنکھیں ہمیشہ انہیں بے حد دلکش لگا کرتی تھیں۔

اس وقت بھی بے خود سے اس کی آنکھوں کو دیکھتے وہ صورت حال کو سمجھ ہی نہیں سکے تھے۔

پتا تو تب چلا تھا جب آنکھوں کے ساتھ، ساتھ زبان سے بھی قہر برساتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے انہیں دھکا دیا تھا اور وہ زور سے سر کے بل پیچھے جا گرے تھے۔ دادی جان بے اختیار چیخی تھیں۔

بابا جان اور امی جان بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے تھے گرتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کا ٹوٹا ہوا کنارہ ان کے سر میں لگا تھا۔

خون ان کے سر سے بہتا گردن پر آ رہا تھا۔ مگر لب بھینچے ہر آہ کو، ہر آواز کو وہ اندر ہی گھونٹ رہے تھے۔

بابا جان نے بھاگ کر انہیں سیدھا کیا تھا...... ان کی سفید شرٹ خون سے سرخ ہو رہی تھی۔

''اماں جان! کیا ہوا ہے میرے بیٹے کو کیسے گرا......'' امی جان متوحش سی چلائی تھیں۔ ان کی ساری شرٹ خون سے بھیگ گئی تھی۔

''توفیق جلدی سے اسپتال لے کر چلیں...... دیکھیے کیسے خون بہہ رہا ہے۔'' وہ حواس باختہ سی ہو کر ابا جان کے ساتھ مل کر انہیں اٹھانے کے ساتھ، ساتھ گھبرائے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھیں اور جب بابا جان اثیر احمد کی کمر میں بازو ڈالے انہیں باہر کی جانب لے جا رہے تھے...... انہوں نے اس دشمن جاں کی طرف دیکھا تھا۔

وہ بے حد پریشان نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انہیں اپنی تکلیف ایک لمحے کے لیے کم ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ ان کے لیے پریشان تھی۔ یہ خیال ان کے لیے بے حد خوش کن تھا۔ انہوں نے مسکرا کر اس کی پریشانی رفع کرنے کی کوشش کی تھی۔ تبھی وہ یک دم اٹھی اور تیزی سے ان کے برابر آئی تھی۔

''اثیر...... تایا ابو کو مت بتانا پلیز......'' اس کی سرگوشی کسی زہریلے تیر کے مانند ان کے دل میں گڑ گئی تھی۔ قدم بے اختیار تھمے تھے۔ لبوں سے اک کراہ نکلی تھی۔

ہاتھ سر کے پچھلے حصے کی جانب گیا تھا...... اور جب انہوں نے اسے دوبارہ نگاہوں کے سامنے کیا

تو وہ خون سے تر تھا۔
ان کے لبوں سے کچھ نہیں نکلا تھا..... لیکن نگاہوں نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ شزا احمد نے بے اختیار نگاہ چرائی تھی۔
''صاحب جی! چھوٹی بی بی کا موبائل (موبائل) بہت دیر سے بج رہا ہے۔'' حامد نے دروازہ ناک کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا تھا۔ انہوں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور خنجر کی نوک کی طرح دل کو لہولہان کرتی یادوں کو جھٹکتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
''لاؤ دے دو..... بی بی کچن میں نہیں ہیں کیا؟''
''نہیں جی..... چولہے پر توا جل رہا تھا میں نے چولہا بند کر دیا ہے۔''
''اچھا ٹھیک ہے.....تم جاؤ۔'' انہوں نے موبائل اس کے ہاتھ سے لے کر اسکرین پر نگاہ ڈالی تھی۔
چار مسڈ کالز تھیں، موبائل ابھی ان کے ہاتھ میں ہی تھا کہ اسکرین ایک مرتبہ پھر روشن ہوئی تھی۔
''صبح، صبح انہیں جانے کون سا کام پڑ گیا ہے۔'' وہ جھنجلائے تھے اب انہیں کون بتاتا کہ ماؤں کو کام نہیں پڑتے الہام سے ہوتے ہیں۔
''السلام علیکم آنٹی.....! آپ کو تکلیف ہوئی..... ایکچوئلی فون زارا کچن میں ہی چھوڑ آئی تھی..... کمرے میں بیل کی آواز نہیں آئی۔''
''تھینکس گاڈ..... میں تو بے حد فکر مند ہو رہی تھی ویسے ہی صبح سے دل زارا کے لیے بہت اداس ہو رہا ہے..... اس کے پاپا بھی اسے بہت مس کر رہے ہیں۔''
''زارا واش روم میں ہے..... نکلتی ہے تو میں بات کرواتا ہوں آپ سے..... اور شام کو ہم چکر بھی لگائیں گے آپ کی طرف.....'' انہیں مطمئن کرتے ہوئے وہ جلدی، جلدی باہر نکلے تھے وہ کچن میں نہیں تھی تو ڈرائنگ روم میں ہوگی۔ اس خیال سے انہوں نے ڈرائنگ روم کا رخ کیا لیکن وہ وہاں بھی نہیں تھی۔
اب انہیں پریشانی لاحق ہوئی تھی جس حالت میں وہ کمرے سے نکلی تھی اس طرح لان میں جانے سے تو رہی..... تو پھر..... اچانک ان کا دھیان گیسٹ روم کی جانب گیا تھا۔
کمرا اندر سے لاک تھا..... گہری سانس لیتے ہوئے وہ چند لمحے دروازے پر ہاتھ رکھے کھڑے کچھ سوچتے رہے پھر واپس اپنے بیڈروم کی طرف چلے آئے۔
لیکن ایک گہرا اضطراب دل و دماغ کے ساتھ پورے وجود کو اپنے حصار میں لے چکا تھا۔ کتنی دیر وہ بے چینی سے کمرے میں اِدھر اُدھر چکر لگاتے رہے تھے۔ نگاہوں کو ان پھولوں سے، اس پینٹنگ سے اور اس پر بے حد خوب صورتی سے لکھے..... ''ہیپی برتھ ڈے ٹو ناشر احمد.....'' سے بچاتے رہے اور آخر تھک کر کمرے سے باہر نکل آئے۔
تھکے، تھکے قدم بے اختیار گیسٹ روم کی جانب بڑھے ''جانے کیوں کرتے ہیں ہم ایسا.....؟ جو دکھ خود اٹھاتے ہیں، انہیں اتنے آرام سے کسی دوسرے کا مقدر بنا دیتے ہیں..... جو کرچیاں ہمیں لہولہان کر لیتی ہیں، انہیں ذرا بھی سوچے سمجھے بنا کسی دوسرے کی راہوں میں بچھا دیتے ہیں..... ساری زندگی کسی کی بے حسی کا رونا روتے ہیں اور ویسی ہی بے حسی کا مظاہرہ کسی دوسرے کے ساتھ کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں نہ شرماتے ہیں۔''

☆☆☆

انہوں نے آہستہ سے دروازہ ناک کیا..... اندر سے کوئی آواز نہیں ابھری تھی..... دوسری تیسری مرتبہ ناک کرنے پر بھی کوئی آواز نہ آئی تو ان کی بے چینی کچھ اور بڑھ گئی۔ فکرمندی سے بند دروازے کو دیکھتے ہوئے اچانک کسی خیال کے تحت وہ پلٹ کر کچن کی جانب آئے اور ڈائننگ ٹیبل پر نگاہ پڑتے ہی ان کا دل ندامت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا تھا۔
ایک پُرتکلف ناشتا ٹیبل پر سجا ہوا تھا اور خود ناشتا بنانے والی.....؟ کیا محبتوں کا جواب یوں بھی دیا جاتا ہے..... شرمندگی سے سوچتے ہوئے انہوں نے دراز سے چابیاں نکالیں اور ایک عجیب سے ملال میں گھرے واپس آ کر دروازہ کھولنے لگے۔

(باقی آئندہ)

پکا رشتہ دوستی کا

روحیلہ خان

"تو ایسا کیوں کرتی ہے ری؟"

"پاپی پیٹ کے لیے۔" اس نے ذرا سا برا منہ بنا کر کہا تھا۔

"بس دو وقت کی روٹی کے لیے تو اتنا گناہ سمیٹتی ہے۔"

"تو پھر کیا کروں...... تو بتا...... ایک چھوٹا بچہ ہے میرا۔ کون پالے گا اسے؟"

"گاؤں سے بھاگ کر شادی کی تھی ناں...... اب سنبھال......" وہ ذرا ہنسا تھا۔

"سنبھال ہی تو رہی ہوں......" اسے واقعی دکھ سا ہوا تھا۔

"شادی کرلے...... اس گناہ گاری سے نکل......"

"کون کرے گا مجھ سے شادی...... دھندا کرتی ہوں بول۔ تو کرے گا مجھ سے شادی؟"

"دھندا چھوڑتی ہے تو میں تیار ہوں......" اس نے گویا اس کی ہنسی اڑائی تھی۔

"چل چھوڑا دھندا...... ابھی چل دو بول نکاح کے پڑھوا۔" وہ بھی جذباتی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سوچ لے گھر میں رہنا ہوگا...... شریف بیوی بن کر...... رہ سکتی ہے؟"

"سوچ لیا...... ابھی چل......" وہ ڈٹ گئی۔

"شریف بننا اتنا آسان نہیں ہے بانو......"

"میں کب بچپن سے دھندا کرتی تھی، خصم (فحش گالی) نکلا...... چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

"شریف عورتیں اس طرح گالیاں نہیں بکتیں۔"

"زبان کو تالا لگالوں گی...... بول...... تو پکا ہے قول کا......" مغلظات ابلتے، ابلتے تھم سے گئے تھے۔

وہ بے وفا اب بھی یاد تھا۔ کیسا گبرو جوان تھا، وہ تو مرمٹی تھی اس کی مردانہ وجاہت پر، اوپر سے شہر میں رہنے کا سحر اور کشش بڑھتی جا رہی تھی لیکن سارے سہانے خواب دھپ سے ٹوٹ گئے۔ کسی دوست کے گھر پر چند دنوں کا پڑاؤ تھا پھر جب گاؤں سے اس کی فیملی لوٹی تو عشق و محبت کا سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ پلے جتنے پیسے تھے سب خرچ ہو چکے تھے یہاں تک کہ اماں نے بڑا جوڑ کر جو اس کے لیے ناک کی سونے کی کیل خریدی تھی وہ بھی بک گئی، ماں بننے کی خوشخبری بھی اس بے وفا پر کوئی اثر نہ کرسکی۔ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ کچھ دنوں تو اس گھر کی مالکن نے برداشت کیا پھر سب کچھ دیکھ بھال کر کہ کہیں اس کے گھر کی کوئی چیز ادھر اُدھر تو نہیں ہوئی اسے نکال باہر کیا۔

"کیا ہوا؟" کیا سوچنے لگی۔

"کچھ نہیں......" وہ جان بوجھ کر کترا رہی تھی۔

"دیکھ بانو......! اگر تو واقعی تیار ہے تو تجھے میری کمائی کی سوکھی روٹی بھی کھانی ہوگی۔ تیرا بچہ میرا بچہ...... لیکن شرط شرافت کی ہے۔ تجھے کوئی حرام کام نہیں کرنا ہوگا۔"

"مجھے منظور ہے صادق...... تو اچھا بندہ ہے جب بھی میرے پاس آتا ہے کچھ نہ کچھ دے کر ہی جاتا ہے پر وصولی نہیں کرتا۔"

"اس لیے کہ یہ ناجائز ہے بانو......! تو...... تو کیوں نہیں سمجھتی۔" وہ شش و پنج میں مبتلا تھا۔

"سب سمجھنے لگوں گی۔ چل دو بول پڑھوالے...... میں بھی اس دھندے سے تنگ آگئی ہوں...... تھک گئی ہوں......"

"میں عمر میں تجھ سے پندرہ برس تو بڑا ہوں گا ہی...... پھر بھی......"

''ہاں ...... پھر بھی ۔ خیر اب تو بڈھا بابا بھی نہیں ہے۔''اس نے ذرا سامنہ بنا کر کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

''ٹھیک ہے، میں کل تجھے لینے آؤں گا۔ ہم کل ہی نکاح کر لیں گے...... لے یہ کچھ پیسے رکھ لے، بچے کے لیے کچھ خرید لینا۔''

اسے چند نوٹ پکڑا کر وہ چلا گیا اور وہ بے قراری سے کل کا انتظار کرنے لگی۔

یوں بانو، صادق کی بن گئی وہ رکشا چلاتا تھا۔ پچھلے سال ہی اس کی بیوی ڈینگی بخار میں مبتلا ہو کر مر گئی تھی۔ بچہ کوئی نہیں تھا زندگی جیسے الجھ سی گئی تھی۔ ڈپریشن اسے خودکشی کرنے کی صلاح دیتا تھا۔ تب ہی ایک دن اچانک ایک نیک دل مسافر نے اسے بڑا سیدھا اور آسان سا علاج بتا دیا اور وہ حیران ہی رہ گیا۔ پہلے اسے ایسا خیال کیوں نہ آیا تھا۔

''میاں اپنے رب سے دوستی کر لو...... دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرو۔''

''کیسے کر لوں دوستی؟''اسے حیرت ہو رہی تھی۔

''ایسے جیسے تم اپنے کسی دوست سے بات کرنے کے لیے فون ملاتے ہو۔''

''موبائل فون سے؟ کیا اس طرح اللہ تعالیٰ کا نمبر مل جائے گا؟''

''ارے میاں! سارے نمبر ہی ان کے ہیں، میں دعا کرتا ہوں کہ تمہیں جلدی ان کا نمبر بھی مل جائے۔''

اور پھر اسے ان کا نمبر مل گیا دوسروں کے لیے کام کرتا، ان کے مسئلے سلجھاتا، تکلیفیں، پریشانیاں سمیٹتے اسے مزہ آنے لگا۔ جیسے یہی تو زندگی ہے، وہ پہلے جو گزاری وہ تو شاید خواری تھی، ناشکری تھی، اسے اپنے رب پر پیار آنے لگا۔ انسانوں سے محبت ہو گئی ڈپریشن ہوا ہو گیا۔



ادھوری بات

ادھوری بات کہتا ہے
ادھوری بات سنتا ہے
نہ جانے کب فراغت ہو
ادھوری بات پوری ہو

***

بنجر

ہمارا دل تو بنجر ہے
اور بنجر زمینوں پہ
بھلا کب پھول کھلتے ہیں
خزاں ہی راج کرتی ہے

کلام: افتخار شوق، میاں چنوں

تب ہی اسے ایک دن اچانک سڑک کے ایک کونے پر کھڑی بانو نظر آئی۔ بیس بائیس برس کی چہرے سے معصومیت لیکن لبوں سے نقاہت ٹپکتی۔ اس نے اسے بھی ہاتھ دے کر لفٹ مانگی تھی لیکن جب اس نے اپنا مدعا بیان کیا تو اس کے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا۔ اس نے اپنی دن بھر کی کمائی اس کے ہاتھ پر رکھی تو وہ حیران رہ گئی۔

"سارے دن کی بھاگ دوڑ لیکن وہ صرف مسکرا دیا تھا۔" آج تو آرام سے بیٹھ کر کھا..... کوئی کام نہ کر..... " پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔

"اے بی بی.....!" پکار پر وہ چونک اٹھی، روتے روتے آنکھیں خشک ہی ہو گئی تھیں۔

"جی، جی بھائی....." اس نے اپنا چہرہ اچھی طرح ڈھانپا۔

"آپ اکیلی ہو گیا..... اکیلے میت لے کر کیسے جاؤ گی..... رات بہت ہو چکی ہے۔"

"ہاں رات بہت ہو چکی ہے کچھ نہ کچھ کر ہی لوں گی۔" شدتِ جذبات سے اس کی آواز تھوڑی لرزنے لگی۔

"بی بی! آپ اکیلی صبح تک کا انتظار یہاں کیسے کریں گی۔ آپ میری بہن جیسی ہیں، یہ مردہ خانہ ہے آپ مجھے اپنے عزیز رشتے داروں کا نمبر دے دیں، میں انہیں فون کرتا ہوں۔"

"فون؟" وہ ذرا چونکی۔ "فون تو میں نے کر دیا ہے۔"

"آپ نے فون کر دیا ہے اپنے رشتے داروں کو....." مردہ خانے کے منتظم کو ذرا اطمینان ہوا۔

"اپنے رشتے داروں کو نہیں..... اپنے شوہر کے سب سے بہترین دوست کو....."

بانو کے دل میں بے حد سکون در آیا تھا۔ اس نے وہیں انتظار گاہ میں رکھی بینچ پر اپنا سر ٹیک دیا اور آنکھیں موند لیں۔

"بہن جی..... بہن جی....." اس کے پکارنے پر بھی اس کے وجود میں کوئی جنبش نہ پیدا ہوئی تو اس نے اس کے کندھے کو ذرا جھنجوڑا اور تب ہی اس پر انکشاف ہوا کہ وہ تو رات کے اسی پہر دنیا سے کوچ کر گئی تھی۔

"بڑی اللہ والی تھی جی....."

"جیسا شوہر ویسی ہی بیوی! خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔"

"بڑے نیک لوگ تھے ایسے اچھے پڑوسی اب کہاں نصیب ہوں گے۔"

"اور ان کا بچہ..... وہ تو ابھی تین چار برس کا ہی ہے۔"

"ایسے نیک لوگوں کے بچوں کو کون چھوڑتا ہے۔ اپنے ملک صاحب ہیں ناں..... بیٹوں کی خواہش میں تین شادیاں کرلیں پر بیٹا نصیب نہ ہوا..... جھٹ گود لے لیا انہوں نے سنا ہے کہ پکے کاغذ بنوا رہے ہیں۔ اور ان دونوں میاں، بیوی کی ساری نیازیں بھی انہوں نے اپنے ذمے لی ہیں۔ بڑے پیسے والے ہیں جی۔"

"بڑا نصیبوں والا بچہ ہے۔ نیکوں کی اولاد ہے ناں..... بس جی جسے اوپر والا چاہے جیسے نواز دے۔"



میری بات سنو

افشین نعیم



ثمرہ نے ہلکا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ امی جان، جانماز پر بیٹھی تسبیحات و وظائف میں مصروف تھیں۔ مومنہ اور محسنی سو چکی تھیں۔

اس نے جتنی آہستگی سے دروازہ کھولا تھا۔ اسی آہستگی سے بند کیا۔ ٹی وی لاؤنج کی لائٹ آف کی، گیلری کی لائٹ آن کر کے کچن کا دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے میں آگئی۔

اندر عمر۔ دو تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے، کوئی ٹاک شو دیکھ رہے تھے۔

''ایک تو اس نحوست سے بڑی تنگ ہوں میں۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی ان کے قریب بیٹھی اور ہاتھ بڑھا کر حساب کتاب کی ڈائری اٹھا کر گود میں رکھی۔

''توبہ کرو بیگم توبہ —— شوہر ہوں تمہارا، تم نحوست کہہ رہی ہو۔'' عمر کچھ الرٹ ہو کر بولے۔

''آپ کو نہیں، اس منحوس کو کہہ رہی ہوں۔'' اس نے ہاتھ سے ایل ای ڈی اسکرین کی جانب اشارہ کیا۔ عمر نے حیران ہو کر، بڑھ چڑھ کر بیانات دیتے، منہ سے جھاگ اڑاتے سیاست دان کو دیکھا جو اپنے مخالفین کو

چاروں شانے چت کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔

''اس بیچارے نے آپ کا کیا بگاڑا ہے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ کو تو سیاست سے تو کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں ہے۔''

''سیاست سے نہیں ہے، آپ سے تو ہے۔'' اس نے گردن گھما کر اپنے مجازی خدا کو دیکھا۔

''اچھا، اچھا، آپ کو یہ شخص اس لیے برا لگتا ہے کیونکہ یہ میری مخالف پارٹی کا بندہ ہے۔'' عمر کچھ جوش اور کچھ خوشی کی سی کیفیت میں گھر کر بولے۔

''کون شخص......؟ کیسی پارٹی......؟'' ثمرہ جھنجلائی۔

''میں تو اس ایل ای ڈی کی بات کر رہی ہوں، جس کی موجودگی میں آپ مجھے یکسر نظر انداز کیے رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں کمرے میں کم سے کم اس ٹی وی اسکرین کے سخت خلاف ہوں۔ جب تک خراٹے نہیں گونجنے لگیں گے آپ کے تب تک تو مجھے اس کے بند ہونے کے آثار نظر نہیں آتے۔'' انتہائی خفا، خفا سے لہجے میں بولتی وہ ڈائری پر کچھ نوٹ بھی کرتی جا رہی تھی۔

عمر نے ایک نظر اپنی انتہائی حسین اور طرحدار بیوی کے ناراض چہرے پر ڈالی، دوسری نظر اسکرین پر جہاں بڑی ہی زبردست گرما گرم بحث چل رہی تھی۔ بادلِ ناخواستہ والیوم کم کیا۔

''بس، اب ٹھیک ہے۔'' بیگم کے چہرے پر رضامندی کا تاثر ڈھونڈنا چاہا۔ جہاں بڑا، بڑا ''نو'' درج نظر آیا۔

''کیا کروں......؟'' سر کھجاتے ہوئے سوچا۔

''مجھے ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔'' ثمرہ صاف، صاف مدعا بیان کرنے پر اتر آئی۔ تو عمر کو مجبوراً ٹی وی آف کرنا پڑا۔

''کہیے بات......'' ایک تکیے کو سر کے نیچے سے نکالتے وہ کروٹ کے بل لیٹ کر بیگم کو تکتے ہوئے بولے۔

ثمرہ نے بھی سارے دن کا حساب کتاب لکھ کر ڈائری بند کر کے دراز میں رکھی اور صاحب کی جانب متوجہ ہوئی۔

''میں آپ کو بتا رہی ہوں، کسی دن بہت بڑی جھڑپ ہونے والی ہے۔''

''پاکستان اور بھارت کی......؟'' وہ جوش سے پوچھتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ مطلب ملکی حالات پر ایسی نظر، امپریسو۔

''نہیں......'' وہ زچ ہو کر بولی۔

''آپ کی والدہ کی اور میری......''

''اوہ......تو یہ بات تھی۔'' وہ ہونٹ سکوڑ کر بولے۔

''مجھے لگا، آپ کوئی ضروری بات کرنے والی ہیں۔'' سکون سے کہتے وہ ثمرہ کو تو سلگا ہی گئے۔

''یہ ایک بہت ضروری بات ہے۔'' ثمرہ بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔

''یقیناً ہے۔'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مگر اس میں میرا کردار وہی ہوگا جو کشمیر کے مسئلے پر یو این او کا ہوتا ہے۔'' منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ جمائی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

''دیکھیے، آج پھر امی جان میرے مظالم کے قصے خوب بڑھا چڑھا کر برابر والی صفیہ خالہ کو بتا رہی تھیں جو ان کے خیال میں، میں مومنہ اور حمنٰی پر توڑتی ہوں۔'' ثمرہ سخت خفا نظر آ رہی تھی۔

''اچھا، چلو میں امی جان کو کہہ دوں گا کہ میری بیگم جتنے مظالم ڈھاتی ہے بچیوں پر بس اتنے ہی بتایا کریں۔ بڑھا چڑھا کر نہیں۔'' عمر نے تکیہ سیدھا کر کے دوبارہ سے لیٹتے ہوئے کہا۔ یونہی، جو بھٹکتی ہوئی سی نظر ثمرہ کے چہرے پر پڑی تو اسے خشمگیں نگاہوں سے اپنی طرف گھورتے پایا۔

''نظر سے قتل کر ڈالو، نہ ہو تکلیف دونوں کو
تمہیں خنجر اٹھانے کی، ہمیں گردن جھکانے کی''

لہک، لہک کر انہوں نے شعر مکمل کیا۔

مگر افسوس......ثمرہ کے بگڑے تیور ٹھیک ہوتے دکھائی نہیں دیتے تھے۔

''دیکھیے عمر! مومنہ اور حمنٰی میری اپنی بچیاں ہیں......میری سگی اولاد...... خدانخواستہ میں کیوں ان

پر ظلم توڑنے لگی۔'' ثمرہ نے تنک کر کہنا شروع کیا۔ ''بھئی بچوں کی تربیت چھوٹی عمر سے ہی کرنا ہوتی ہے۔ انہیں اعتراض ہے کہ ان سے شام کی چائے کے برتن کیوں دھلواتی ہوں یا دُھلے ہوئے کپڑے ان کو دے دیتی ہوں کہ تہہ لگا کر الماری میں سمیٹ کر دیں یا پھر یہ کہ صبح، صبح اتنی سردی میں فجر کی نماز کے لیے کیوں اٹھا دیتی ہوں۔ یہ سب کر کے، میں اصل میں اپنا کام بڑھا لیتی ہوں۔'' ثمرہ بھری بیٹھی تھی اور قطعاً شوہر کو بخشنے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہی تھی۔

عمر نے جمائی روکتے ہوئے زبردستی آنکھیں کھلی رکھنے کی اپنی سی کوشش کی اگر جو خدانخواستہ ان کی آنکھ لگ جاتی تو بیگم نے انہی کے ساتھ بغیر وقت دیکھے عالمی جنگ چھیڑ دینا تھی۔ سو، یہ الف لیلیٰ سننا ان کی مجبوری تھی۔

''دس اور گیارہ برس کی معصوم بچیاں، کس طرح کا کام کر سکتی ہیں بھلا......؟'' ثمرہ نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

''ظاہر ہے انتہائی بیکار......'' خود ہی جملہ مکمل بھی کیا۔

عمر کی آنکھیں پوری کھل گئیں......مطلب حیرت سے......

''تو، آپ کیوں کرواتی ہیں اُن سے کام؟'' عمر نے زبان پر آئے سوال کو روکنے کی قطعاً کوئی کوشش نہ کی۔

''ظاہر ہے بچیوں کو کام سکھانے کے لیے اور کس لیے۔'' ثمرہ نے جواب دے کر اُن کی حیرت رفع کرنے کی کوشش کی۔

''سارے، برتن مجھے بعد میں دوبارہ دھونے پڑتے ہیں۔ ہر وہ کام جو میں مومنہ اور حمنیٰ سے کرواتی ہوں ان کے اسکول جانے کے بعد مجھے نئے سرے سے کرنا پڑتا ہے۔ رہ گئی نماز کی بات تو...'' اس نے چند سیکنڈ توقف کیا۔ ''اسکول کے لیے بھی تو چھوٹی، چھوٹی عمروں سے ہی بچیوں کو اٹھانا شروع کیا تھا ناں......تب تو کوئی اعتراض نہیں کیا انہوں نے؟''

''دیکھو یار......'' عمر نے تحمل سے بات شروع کی۔

''امی جان، صرف یہ چاہتی ہیں کہ ان پر ابھی سے اتنا بوجھ نہ ڈالو کام کا......وقت کے ساتھ، ساتھ

غزل

وہ عام سی شام تھی جب جدا ہوئے ہم
نہ ٹوٹ کر ہی پیار کیا اور نہ رو ہی سکے ہم

جو رنجشیں، جو گلے تھے ہونٹوں پہ رہ گئے سب
بس اِک دوسرے کی چشمِ نم دیکھتے رہے ہم

وہ دن بھی کیا تھے، سارے لمحے گلاب سے تھے
یہ دن بھی کیا ہیں کہ خوشیوں کو ترس گئے ہم

فراقِ جاناں بھی کسی قیامت سے کم نہیں تھا
پر اے غمِ یار اب تو پتھر ہو چکے تھے ہم

حسن رضا کن رُتوں سے مانگیں وصال گھڑیاں
کہ اب نہ وہ ہے، نہ چاند راتیں نہ پہلے سے ہم

شاعر: حسن رضا
پسند: فصیحہ آصف خان، ملتان

سب سیکھ جائیں گی۔''

''پڑھائی کے بوجھ کے بارے میں کیا خیال ہے......؟'' ثمرہ نے میاں کی رائے جاننا چاہی۔

''یار......'' وہ ایک دم خاموش ہوئے۔ ''سوچ رہے تھے کیا کہنا چاہیے۔

''وہ تو وقت کی ضرورت ہے ناں......'' کچھ سمجھ نہ آیا تو یہی کہہ دیا۔ مزید کیا بولتے۔

''تربیت بھی وقت کی ضرورت ہی ہے۔'' وہ اپنی بات پر زور دے کر بولی۔

''امی جان نے اپنے زرّیں اصول اپنی اولاد کی تربیت میں بھی آزمائے تھے، جس کے نتیجے میں بینش (نند) نے کس قدر مشکلات کا سامنا کیا۔ آپ سے کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔'' ثمرہ نے چوٹ کی۔ عمر نے

ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

بارہ سال قبل عمر اور ان کی بہن بینش کی شادی ایک ساتھ ہوئی تھی۔ بینش سے کبھی امی جان نے گھر کے کام نہیں کروائے تھے۔ جس کی وجہ سے شادی کے اوائل دور میں ہی اسے شدید مشکلات کا سامنا رہا۔

دو، تین برس تک تو، دو، دو ماہ کے لیے روٹھ کر میکے آجانا بینش کی روٹین تھی۔ ہر لڑائی کے تانے بانے جا کر بینش کے پھوہڑپن سے جا ملتے۔ بہت مشکل سے ہی سہی پر...... آخر وہ اپنے گھر میں ایڈجسٹ کر ہی گئی۔

دوسری طرف، عمر کی بیوی ثمرہ انتہائی سگھڑ بہو اور ذمے دار بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے صحیح معنوں میں ان کے گھر کو جنت بنا دیا تھا۔ اب وہ ایسی ہی تربیت اپنی بچیوں کی بھی کرنا چاہتی تھی جس پر دادی کو لگتا تھا کہ پوتیوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ وہ ہر آئے گئے کے سامنے اس کا رونا روتیں۔

کچھ لوگ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے، کچھ ثمرہ کے موقف کی تائید کرتے لیکن ثمرہ اس ساری صورتِ حال سے سخت عاجز تھی۔

"ایک عارضی سا حل تو اس مسئلے کا نکل آیا ہے۔ مستقل کے لیے بعد میں کچھ سوچیں گے۔" عمر نے بات ادھوری چھوڑ کر سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"کیسا حل......؟" ثمرہ کے کان کھڑے ہوئے۔

"امی جان نے بینش کے گھر جانے کا اعلان کر دیا ہے۔ دو ایک روز میں ان کی روانگی متوقع ہے۔ واپسی، بینش کا چھلا پورا ہونے کے بعد ہو گی۔" عمر کی بات پر ثمرہ نے سکون کی سانس لی۔ چلو کچھ عرصہ تو خیر سے گزرے گا۔

ثمرہ اور بینش کی شادی ساتھ، ساتھ ہوئی۔ کچھ دنوں کے فرق سے بچیاں بھی تقریباً آگے پیچھے ہی ہوئیں۔ بینش کو اللہ نے اتنے سال بعد اب خوشی دکھائی تھی سو امی جان اس کے گھر جا رہی تھیں۔

☆☆☆

بینش کو اللہ نے خیر سے بیٹا عطا کیا تھا۔ سب کی خوشی دیدنی تھی۔ عمر اور ثمرہ نے بھی اپنی بساط سے بڑھ کر دینا دلانا کیا تھا۔ اب تقریباً دو ماہ بعد امی جان بینش اور اس کے بچوں کے ساتھ واپس گھر آ رہی تھیں۔

ثمرہ نے گھر کا کونا، کونا چمکا دیا تھا۔ چکن بریانی، قورمہ، شامی کباب، رائتہ، سلاد، فروٹ ٹرائفل......

"ارے ثمرہ...... اتنا کچھ......!" بینش کچھ حیران اور بہت سا خوش ہو کر ایک، ایک ڈش کو دیکھ کر اور چکھ رہی تھی۔

امی جان اور پوتیاں ایک دوسرے پر واری صدقے جا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے مدتوں کی بچھڑی ملی ہوں۔

انتہائی خوشگوار ماحول میں کھانا کھانے کے بعد امی جان تو اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اچھا بھئی، میں تو کچھ دیر کے لیے کمرے میں جاؤں گی۔ بہت یاد کر رہی تھی میں اپنے کمرے کو۔" امی جان اٹھیں۔

"دادو میں بھی جاؤں گی۔" مومنہ دادو کے پیچھے لپکی۔

"میں بھی......" حمنیٰ بھی بھاگی۔

"ہم بھی نانو کے ساتھ جائیں گے۔" ان کے ساتھ، ساتھ بینش کی زارا اور سارہ نے بھی ضد پکڑ لی۔

"نہیں، آنے دو، تھوڑی دیر میں سو جائیں گی۔" ماؤں نے بچیوں کو روکنا چاہا تو امی جان نے منع کر دیا۔

ننھے مصطفیٰ کو بینش نے فیڈر پلا کر اپنے قریب ہی سلا دیا۔ بینش اور ثمرہ بیٹھی گپ شپ کر رہی تھیں کہ عمر بھی وہیں آ گئے۔

"سچ بھائی...... میں تو آپ کی بیگم سے سخت جیلس ہونا شروع ہو گئی تھی۔" بینش ہنستے ہوئے بولی۔

"کیوں بھئی...... ایسا کیا ہوا؟" عمر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بس وہاں تو امی جان ہر وقت مومنہ اور حمنیٰ کی تعریف کرتی رہتی تھیں۔ مطلب ان ڈائریکٹ ثمرہ بھابی کی۔

"کہ میری پوتیاں تو یہ بھی کر لیتی ہیں، وہ بھی

کرلیتی ہیں...... اِدھر میری اولادوں کو تو ہل کر پانی پینے کی عادت بھی نہیں ہے کجا کوئی کام کرنا، امی جان کو عینک بھی منگوانا ہوتی تھی تو دس بار بچیوں کو آواز دیتی تھی میں...... جب جا کر سنتی تھیں۔''

''اس سے تو بہتر ہے کہ انسان خود ہی ہل لے۔'' عمر نے ٹکڑا لگایا۔

''ہاں تو...... آخر میں خود ہی ہلنا پڑتا تھا۔ بچیاں کہاں سنتی ہیں۔'' بینش ہنستے، ہنستے بتا رہی تھی۔

''بات، بات پر امی جان کو اپنی پوتیاں یاد آتی تھیں کہ میری پوتیاں تو ایسا کام کرتی ہیں، کیا کوئی بڑا کرتا ہوگا۔'' بینش بول رہی تھی اور ثمرہ کو لگ رہا تھا کہ اس کی ساری تھکن اترتی جا رہی ہے۔

''ویسے، ثمرہ بھابی، آپ نے بہت اچھا کیا، جو بچیوں کو ابھی سے train کرنا شروع کر دیا ہے۔''

''ابھی سے نہیں...... بلکہ پانچ برس کی عمر سے......'' عمر نے بات کاٹی۔

''کیا......؟'' بینش چیخ ہی اٹھی اور اس کی چیخ پر مصطفیٰ نے کسمسا کر رونا شروع کر دیا۔

''واقعی پانچ برس کی عمر سے......؟'' بینش نے ثمرہ سے تصدیق چاہی۔ آنکھیں حیرت کے مارے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔ ثمرہ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور کہنا شروع کیا۔

''دیکھو بینش! میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تعلیم اور تربیت دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اگر ہم تین، ساڑھے تین سال کے بچے کو سخت سردی، سخت گرمی، آندھی، طوفان، بارشوں میں جگا کر تیار کر کے اسکول روانہ کر سکتے ہیں، اس کے امتحانات کی تیاری کروا سکتے ہیں تو پانچ برس کی عمر سے اس سے چھوٹے، چھوٹے کام بھی شروع کروا سکتے ہیں۔ مثلاً، اپنا اسکول بیگ جگہ پر رکھنا، اپنے جوتے، موزے اور یونیفارم جگہ پر رکھنا، ٹفن اور پانی کی بوتل بیگ سے نکال کر رکھنا۔ بالکل ایسے ہی سات برس کی عمر میں اسے کم سے کم ایک نماز کی عادت ہونی چاہیے۔ پھر ہر سال ایک کلاس کے ساتھ ایک نماز بڑھاتے چلے جائیں۔ پانچویں جماعت تک پہنچتے تک بچے کی پانچوں نمازوں کی عادت پختہ ہو جائے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے بھابی...... پر، بچیاں سنتی کہاں ہیں......'' بینش نے اپنا دکھڑا رو دیا۔

''اگر بچیاں سنتی نہیں ہیں تو پھر اسکول آنا جانا، اسکول کی پڑھائی، امتحانات کی تیاری، بہترین نتائج...... یہ سب کیسے ممکن ہوتا ہے؟'' ثمرہ نے سوالیہ نظروں سے بینش کو دیکھا۔

عمر، اس تمام گفتگو میں خاموش تماشائی کا کردار نبھا رہے تھے یہ اور بات کہ...... دل ہی دل میں بیگم کی فہم وفراست کے قائل ہوتے جا رہے تھے۔

''زبردستی کروانا پڑتا ہے، وہ سب بھی۔'' بینش جیسے ہار مانتے ہوئے بولی۔

''تو، قصور پھر بچوں کا تو نہ ہوا ناں...... دراصل ہم، ماؤں کی ترجیحات میں ہی تربیت شامل نہیں ہے۔ ہم جو ضروری سمجھتے ہیں مطلب تعلیم اور رزلٹ وہ کام زور زبردستی کروا لیتے ہیں ناں...... اور سب سے ضروری کام جو اصل میں تعلیم کی بھی روح ہے یعنی تربیت تو اس کے لیے ہزار، بہانے اور تاویلیں ہمارے پاس موجود ہوتی ہیں۔'' ثمرہ مدھم لہجے میں بولی۔ اس سے پہلے کہ بات چیت تلخی کی جانب گامزن ہوتی۔ عمر ریفری بن کر میدان میں کود پڑے۔

''ارے بھائی...... بچے اور امی جان تو غالباً سو گئے۔ چلو ہم لوگ آئس کریم کھا کر آتے ہیں۔'' وہ اٹھے۔

ثمرہ بھی جوش سے کھڑی ہوئی...... بینش بھی مصطفیٰ کو گود میں لیے ان کی ہم قدم ہوئی۔

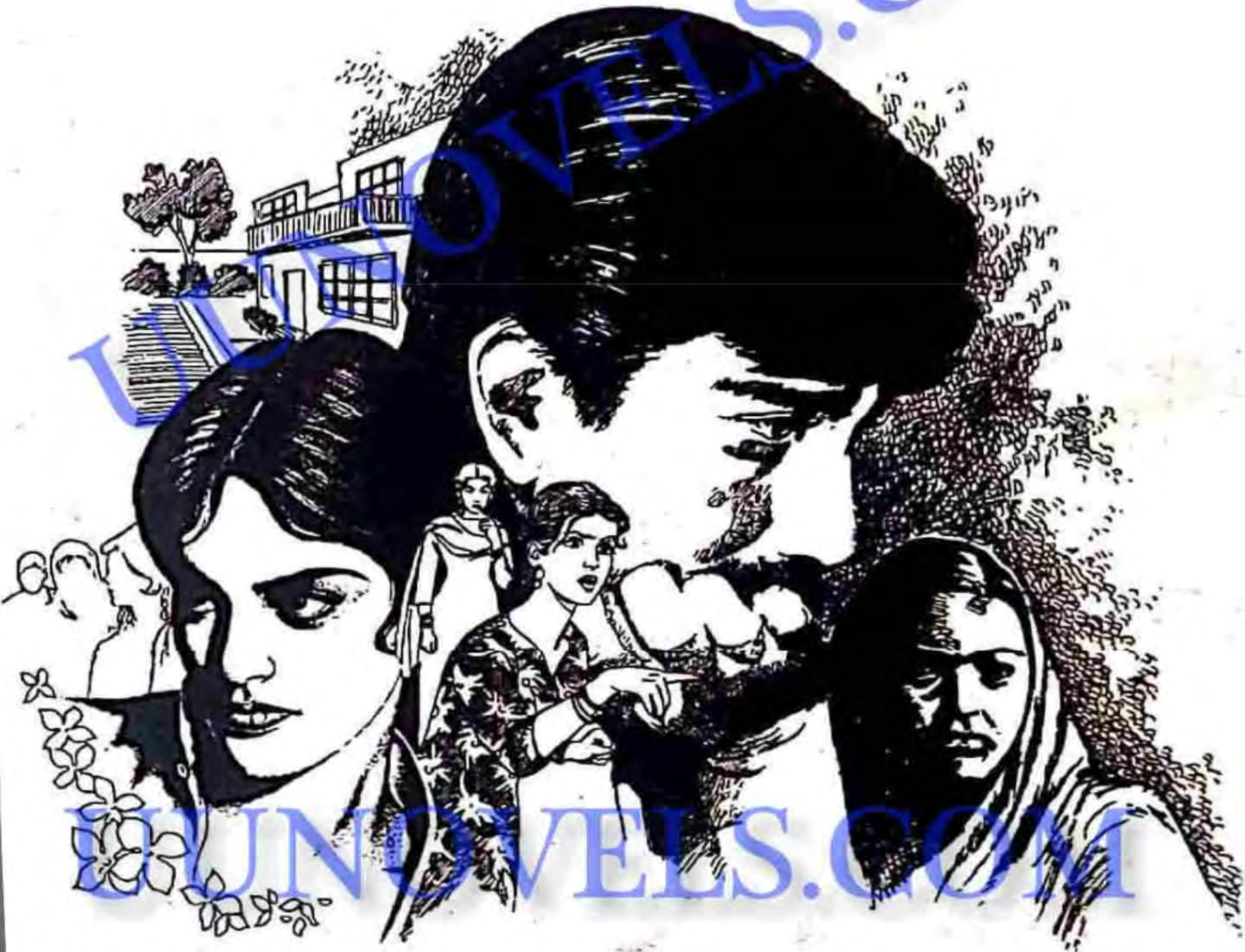
اور راستے میں بینش بس ایک ہی بات سوچ رہی تھی۔ ''مجھے بچوں کے لیے اپنی ترجیحات کا تعین نئے سرے سے کرنا ہوگا۔ ہم ماؤں کو اپنے بچوں کو اپنی کارآمد قوت بنانا ہے ناکہ اضافی بوجھ۔''

اس بار میکے سے واپسی پر ایک نیا عزم اس کے ساتھ تھا۔

مکمل ناول

چلو اب مان بھی جاؤ

نزہت جبیں ضیا



"اماں! یہ سب کیا ہے؟ کیوں گھر کباڑ خانہ بنا رکھا ہے.....؟ میرا سامان صحن میں کیوں بکھرا پڑا ہے؟" گل نین ..... شام کو سو کر اٹھی۔ جیسے ہی کمرے سے باہر نکلی تو صحن میں پھیلا سامان دیکھ کر اس کا دماغ گھوم گیا۔ یوں تو اماں اپنی پلٹن کے ساتھ گھر کو اکثر و بیشتر اُدھیڑتی رہتی تھیں مگر..... آج براہ راست اس کے سامان کی شامت آئی ہوئی تھی۔ جو اوپر چھت پر بنے چھوٹے سے کمرے سے نیچے صحن میں منتقل ہو چکا تھا اور اماں کمر پر ہاتھ رکھے اپنی فوج کو ہدایات دے رہی تھیں۔ گل نین ... کی تیز اور جھنجلائی ہوئی آواز پر ساجدہ بیگم چونکیں۔

"آپا..... حمود بھائی آئے ہیں نوکری کے سلسلے میں تو کچھ دن یہیں رہیں گے ہمارے پاس، اسی لیے اماں نے ہماری یدی لگوائی ہوئی ہے پچھلے دو گھنٹوں سے۔" ارسل نے اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

''ہیں...... پاگل ہوگئے ہیں کیا وہ...... یہاں رہنے کے لیے آگئے یہ ہوٹل ہے؟ کوئی سرائے خانہ ہے کیا......؟ نوکری کریں تو اپنے لیے، ڈھونڈیں کوئی مکان اپنے لیے...... ہم نے ایروں غیروں کا ٹھیکا لے رکھا ہے کیا......؟ اپنی رشتے داریاں اپنے حد تک رکھو اماں، مجھے مت گھسیٹو بیچ میں...... آئی سمجھ۔'' گل نین کے پیروں سے لگ کر سر تک آن پہنچی تھی۔

''چپ کر...... تیرے باپ کے رشتے دار ہیں وہ...... رشتہ ہے ان سے ہمارا۔'' ساجدہ بیگم نے پلٹ کر اسے گھر کا۔

''تو مجھے کیوں کرا بدر کیوں کر رہی ہیں؟ اتنی رشتے داری نبھانی ہے تو نیچے رکھیں ناں اور اماں...... یہ بات یاد رکھو جب تک ابا زندہ تھے...... یہ ایرے غیرے ہمارے رشتے دار تھے...... اب ان سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے اور نہ ہی ان کو رکھنا ہمارا فرض ہے آئی سمجھ۔''

''پاگل...... بکواس کیے جاتی ہے۔ یہ گھر، یہ چھت، جس کے نیچے تو اور میں سکھ کی سانس لے رہے ہیں ناں...... یہ مت بھول کہ اس میں برابر کی حصے داری ہے ان لوگوں کی۔ کل کو حصہ کرنے بیٹھ گئے ناں تو......؟ جھونپڑی لینے کے قابل بھی نہیں رہیں گے ہم لوگ۔ کہاں سر پر سامان اٹھائے، اٹھائے پھروں گی، بچوں کو لے کر...... شکر ادا کر کہ اللہ پاک نے ایک ٹھکانا دے رکھا ہے، تو، تو بس بکواس ہی کرنا جانتی ہے۔ تجھے اندازہ کہاں اس اونچ نیچ کا......'' ساجدہ بیگم بولیں تو بولتی چلی گئیں۔

''تو...... کیوں پوری فوج پیدا کرلی اماں...... پہلے ہم کون سے نوابوں والی زندگی گزار رہے تھے...... تنگی جب بھی تھی اب بھی ہے، چھت کا آسرا ہی تو ہے اور ہے ہی کیا...... وہ بھی اتنی لمبی چوڑی تمہاری فوج کے لیے ناکافی ہے۔ اوپر سے تمہاری دل داریاں......''

''چپ کمبخت، بے شرم...... کیسے فوج...... فوج بکے جا رہی ہے کچھ شرم ہے کہ نہیں تجھے......؟'' ساجدہ بیگم نے بیٹی کی بدتمیزی پر تلملا کر زمین سے چپل اٹھائی اس کی جانب اچھال دی۔ ہمیشہ کی طرح کمال پھرتی کے ساتھ وہ بچ گئی، اسفنج کی ہری پٹی والی چپل لہرا کر جو آگے کی جانب دوڑی تو عین اسی وقت دروازے سے داخل ہوتے ہوئے حمود نے اتنی ہی تیزی اور سرعت سے اڑتی ہوئی چپل قدرے اچھل کر کیچ کرلی۔

''واہ، واہ بہترین کیچ حمود بھائی......'' ارسل نے تالی بجائی۔ حمود بیچارہ منہ پھاڑے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ گھر کے اندر عجیب طوفان مچا ہوا تھا...... وہ دوپہر میں آیا تو امن تھا...... لیکن اس وقت......؟ گل نین نے پلٹ کر دروازے کی جانب دیکھا...... تو نگاہ ساکت ہوگئی...... آنے والے شخص کو دیکھ کر حیرت سے آنکھیں پھیلنے لگیں۔

اماں بری طرح سٹ پٹا گئی تھیں۔ گل نین سمجھ تو گئی تھی کہ یہ حمود ہے۔ ''حمود الرحمٰن......'' اس کا تایا زاد...... عرصہ دراز سے تایا جی سے تعلقات خراب تھے۔ ابا جی کے انتقال پر تایا اور تائی اماں آئے تھے۔ تب سے رکی بات چیت ہوجاتی پھر...... حمود الرحمٰن کو پتا نہیں کتنے سالوں بعد وہ دیکھ رہی تھی...... نگاہ اٹھی تو پلکیں جھپکانا ہی بھول گئی۔ اتنا اسمارٹ، اتنا ہینڈسم...... افسانوی اور ڈراموں کے ہیرو جیسا...... گل نین کو یقین نہیں آرہا تھا کہ ہمارے خاندان میں بھی کوئی اتنا ڈشنگ بندہ ہوسکتا ہے...... بلیک جینز، بلیک اور وائٹ چھوٹے چیک کی شرٹ، متناسب قد اور جسامت...... سانولا چہرہ...... ہلکی، ہلکی مونچھیں اور داڑھی...... اب پر چپل کو کیچ کرتا ہوا بوکھلایا سا انداز...... اچانک افتاد پر گھبرانا اور کنفیوز ہونا فطری عمل تھا۔ گل نین کا دل بری طرح دھڑکا تھا۔

''السلام علیکم......!'' بوکھلا کر حمود نے سلام جھاڑا...... تب گل نین چونکی۔

''اوہ......! آؤ آؤ! وعلیکم السلام بیٹا۔'' ساجدہ بیگم مارے خفت کے جلدی سے بولیں۔

''معاف کرنا بچے...... لگی تو نہیں......؟'' ساجدہ بیگم کی شرمندگی عروج پر تھی۔

''نہیں، نہیں اماں حمود بھائی نے بہترین کیچ لیا ہے۔ قسم سے سیم ایسا ہی کیچ ایک بار انڈیا کے میچ میں

ہمارے آفریدی بھیا نے لیا تھا...... سچ میں آج تو یاد تازہ ہو گئی اس میچ کی کتوں پر آ کر جیتا تھا پاکستان......'' اس سے پہلے کہ حمود کچھ کہتا ارسل نے راگنی چھیڑ دی۔

''نہیں، نہیں چاچی لگی نہیں......'' اتنی دیر میں حمود کے حواس بھی کچھ بحال ہو چکے تھے۔ گل نین کے چہرے کا رنگ یک دم پھر سے بدل چکا تھا۔ اسے حمود پر غصہ آ رہا تھا۔ ساتھ میں کلفتی بھی ہو رہی تھی کہ اتنی جوان جہان لڑکی اماں کی چپلوں کے زد میں تھی۔

''مجھے گھر کے کس کونے میں ٹھونسا جا رہا ہے، وہ حکم بھی سنا کر میرا سامان اپنی فوج سے سیٹ کروا کر مجھے بتا دینا۔'' گل نین نے غصہ، خفت اور شرمندگی کو ایک پوٹلی میں باندھ کر پلٹ کر ساجدہ بیگم کی طرف دیکھا اور پوٹلی ان کی طرف اچھال کر برا سا منہ بناتی ہوئی واپس کمرے کی طرف چلی گئی۔ ساجدہ بیگم بیچاری کلس کر رہ گئیں...... حمود حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس دبلی پتلی سی لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو بدتمیزی سے کہتی ہوئی منظر سے غائب ہو چکی تھی۔ سلام نہ دعا نہ ہی کوئی مثبت ردِعمل...... حمود سمجھ تو گیا تھا کہ یہ اس گھر کی سب سے بڑی بیٹی گل نین ہے بچپن میں دیکھا تھا تب اچھی بھلی خوش مزاج، تمیز دار اور شریفانہ انداز ہوا کرتے تھے۔ اب تو جارحانہ اور جاہلانہ طرزِ گفتگو اور اندازِ بیاں حیران کن تھا۔

''چاچی میں دراصل یہ بتانے آیا تھا کہ آج رات کو میں دیر سے آؤں گا پہلا دن ہے ناں تو شاید کام زیادہ کرنا پڑے...... اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ پریشان نہ ہوں...... آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن...... اگر مناسب سمجھیں تو مجھے باہر کے دروازے کی چابی دے دیں...... میں خود آ جاؤں گا۔'' حمود نے دو قدم آگے بڑھ کر ساجدہ بیگم کو مخاطب کیا۔

''بیٹا...... ایک ہی چابی ہے...... ابھی تو نہیں دے سکتی...... چلو بنوا کر دے دوں گی تمہیں......'' ساجدہ بیگم نے کہا۔

''ٹھیک ہے چاچی میں چلتا ہوں......''

''ارے حمود بھائی چائے تیار ہے۔ دو منٹ رک جائیں میں گرم کر کے لے آتی ہوں......'' ازمہ کو وقت کا احساس ہوا تب اس نے آفر کر ڈالی۔

''نہیں بہنا! بہت شکریہ ابھی جلدی میں ہوں...... کھانا پینا تو چلتا رہے گا......'' حمود نے پلٹ کر ازمہ کی جانب دیکھ کر نرم لہجے میں کہا۔ اس کے ساتھ شازمہ اور کاظمہ بھی کھڑی تھیں۔ حمود گھر سے باہر نکل گیا تب ہی کام میں ایک بار پھر تیزی آ گئی...... اماں کا پلنگ برآمدے کے کونے میں منتقل ہو گیا...... اس جگہ گل نین کا پلنگ ڈال دیا گیا، الماریاں تو مشترک تھیں سو کمرے میں بدستور اپنی جگہ پر قائم رہیں...... جبکہ گل نین کی چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل، کرسی اس کی ضرورت کی چیزیں اماں کے کمرے میں سیٹ کر دی گئیں...... ویسے بھی ارسل کا پلنگ بھی برآمدے میں ہی تھا۔ چھوٹے سے گھر میں بھلا کہاں الگ، الگ کمروں کی سہولتیں موجود ہوتی ہیں...... پلاٹ تو بڑا تھا مگر چونکہ کارنر کا تھا، آمدنی کم اور اخراجات کی زیادتی تھی بیٹیوں کا ساتھ اور معمولی سی نوکری...... اسی وجہ سے فخرالدین نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے باہر کی جانب تین دکانیں نکال دیں تھیں جن سے کرایہ آ جاتا یہ اُن کی عقلمندی تھی یا کہ چھٹی حس...... کہ ان کو جلد ہی فوت ہو جانا تھا۔ اب ان کے پیچھے پنشن کے ساتھ دکانوں کے کرایے کی آمدنی بھی مل جاتی جس سے جیسا تیسا گزارہ ہو جاتا تھا۔ بی ایس سی کے بعد گل نین نے گھر کے حالات دیکھتے ہوئے اسکول میں جاب کر لی تھی۔

فخرالدین اور سمیع الدین دو بھائی تھے۔ جب ساجدہ بیگم اس گھر میں بیاہ کر آئیں تو بڑے سمیع الدین ان کی بیوی بتول آرا اور تین سال کا حمود الرحمٰن تھا۔ یہ گھر دونوں بھائیوں کی ملکیت تھا۔ بتول آرا تھوڑی تنگ مزاج اور حاکمانہ فطرت والی خاتون تھیں...... ساجدہ بیگم بھی کوئی اللہ میاں کی گائے نہیں تھیں۔ دونوں بھائیوں کی سرکاری نوکریاں تھیں۔ فخرالدین کو جو ہے جیسا ہے کی بنیاد پر جینے کی عادت تھی جبکہ سمیع الدین کال بیلی تھے ہاتھ پیر مارتے رہتے اور آگے

بڑھنے کی کوشش کرتے رہتے حالانکہ ان کو حمود الرحمٰن کے بعد کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی گو کہ دیورانی، جیٹھانی کا کھانا پکانا الگ تھا مگر گھر ایک ہی تھا باقاعدہ لڑائی جھگڑے تو نہیں ہوتے۔ وقت آنے پر ایک دوسرے کا خیال بھی رکھتیں اس طرح وقت گزرتا رہا۔ ساجدہ بیگم کی گود میں گل نین اور ازمہ کے بعد شازمہ بھی آ گئی تھی۔ بچیاں ہونے کے بعد ساجدہ بیگم سے اکثر کام میں کوتاہی ہو جاتی، وہ کچن کی صفائی نہیں کر پاتیں، گھر کو پونچھا لگانے سے کمر دکھنے لگتی۔ کچن میں کام کرتے، کرتے کوئی بچی روتی تو وہ کام چھوڑ چھاڑ کر کمرے کی جانب بھاگتیں پھر کتنی، کتنی دیر کمرے سے نہیں نکلتیں ایسی باتوں سے بتول آرا کو بہت کوفت ہوتی۔

ایک تو لاکھ علاج اور کوششوں کے بعد ان کو اولاد نہیں ہو رہی تھی ایک حمود کے بعد گویا امیدیں ختم ہو چکی تھیں...... اوپر سے دیورانی کی حرکتوں سے وہ غصہ کرنے لگتیں۔ ان کو لگتا کہ ساجدہ بیگم بچیوں کے بہانے کام سے بچنے لگی ہیں...... کچن، غسل خانے اور گھر کی صفائی میں بالکل دلچسپی نہیں لیتیں۔ رفتہ، رفتہ یہ باتیں جھگڑوں کا سبب بننے لگیں...... جبکہ نو، دس سالہ حمود کو چاچی کی ننھی منی گڑیا ئیں بہت اچھی لگتیں۔ وہ اسکول سے آ کر کتنی، کتنی دیر بچیوں سے کھیلتا رہتا، بچیاں بھی اس کو دیکھ کر خوش ہو جاتیں...... اس کے ساتھ کھیلتیں۔ سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا، روایتی، دیورانی، جیٹھانی جیسے حالات پیدا ہو چکے تھے، بتول آرا اب باقاعدہ جھنجلاہٹ کا شکار ہونے لگی تھیں۔ ننھی بچیوں کی ہنسی، شور اور مصروفیت سے ان کو جیلسی ہونے لگی تھی۔ وہ احساسِ کمتری کا شکار رہنے لگیں۔ سمیع الدین سمجھدار تھے، بیوی کی کیفیت اچھی طرح سے سمجھ رہے تھے۔ بیوی اکثر ہی جھنجلاہٹ میں الٹی سیدھی بولے جاتیں...... ان سے ہی جھگڑنے لگتیں پسِ پردہ دیورانی پر طنز کرتیں، ان کو بے بھاؤ کی سنا دیتیں...... فخر الدین بیچارے تو سیدھے سادے تھے، ساجدہ بیگم بھی کب تک برداشت کرتیں، آخر کار انہوں نے بھی مورچہ سنبھال لیا۔ ہلکی، پھلکی بارڈر پر ہونے والی جھڑپوں نے بڑی جنگ کا روپ دھار لیا۔ ایسے میں بھائیوں میں تلخ کلامی ہوئی حالات بگڑنے لگے تو سمیع الدین نے اس گھر کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر...... ساجدہ بیگم اس گھر کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں...... مسئلہ گھمبیر تھا حل نکالنا مسئلہ کشمیر سے بھی بڑھ گیا تھا۔ تب بھائی اختلافات کے باوجود سر جوڑ کر بیٹھے دو پلاٹ پر بنے ہوئے مگر ایک ہی گھر کی صورت میں ایک سو ساٹھ گز کا گھر تھا۔ جس میں فخر الدین نے تین دکانیں بھی نکالی تھیں جن کا کرایہ وہ خود وصول کرتے...... اب اس جگہ کو دو حصوں میں تقسیم کرنا اور ایک حصہ فروخت کرنا مشکل مرحلہ تھا سو سمیع الدین نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ جس پورشن میں دکانیں ہیں وہ حصہ فروخت نہیں کرتے، دکانوں کا کرایہ بدستور فخر الدین وصول کرتے رہیں گے اور دوسرا پورشن فروخت کر دیتے ہیں اچھا اور مفید مشورہ تھا...... بات بھی فخر الدین کے حق میں تھی یعنی کہ سمیع الدین بڑے ہونے کی حیثیت سے بڑے دل کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھر کے کچھ حصے سے فخر الدین کے حق میں دستبردار ہو رہے تھے...... بتول آرا کو یہ فیصلہ بالکل پسند نہیں آیا۔

''ارے واہ جی...... ! بھلا یہ کیا بات ہوئی......؟ ہم کیوں اپنا حصہ چھوڑ دیں برابر کا حصہ کرو۔''

''اری نیک بخت، فخر کی اوپر تلے کی بیٹیاں ہیں...... اس کی ملازمت بھی معمولی سی ہے...... اللہ ہمارے لیے بہتر کرے گا، کیوں دل برا کرتی ہو تم...... میرا تو ارادہ ہی نہیں تھا کہ ماں، باپ کی نشانی یوں ٹکڑوں میں تقسیم کر دوں...... مگر تمہاری ضد اور اصرار پر یہ سب کرنے جا رہا ہوں...... ہمیں تو اللہ پاک نے بیٹا دیا ہے کل کو وہ کمانے لائق ہو جائے گا۔ مجھے تو قرض بھی مل سکتا ہے کمپنی سے ہم دوسرا گھر لے سکتے ہیں...... مگر فخر الدین کے لیے یہ سب کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اب حالات اتنے پیچیدہ ہو گئے تو کیا کروں......؟ وہ ہے تو میرا چھوٹا بھائی...... میرے

ماں، باپ کی نشانی ہے......'' سمیع الدین نے نرم لہجے میں بیوی کو سمجھایا ان کا لہجہ نمناک تھا۔ گو کہ بتول آرا نے اپنے طور پر بھرپور احتجاج کیا...... بچیاں تو خیر چھوٹی تھیں گل نین چار برس کی ازمہ ڈھائی اور شازمہ ڈیڑھ برس کی تھی ان کو تو اتنا احساس نہیں تھا جبکہ حمود کو گھر چھوڑنے کا سوچ کر ہی برا لگ رہا تھا۔ اسے اپنا بڑے آنگن والا یہ گھر بہت اچھا لگتا تھا جس کی بڑی سی چھت پر وہ پتنگ اڑاتا تھا۔ بارشوں میں خوب بھاگ، بھاگ کر نہایا کرتا تھا۔ چھت کے کونے میں چھوٹے سے دڑبے میں ننھے، ننھے رنگ برنگے چوزے پالتا۔

☆☆☆

گھر کے درمیان دیوار کھڑی ہو گئی۔ چھت کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا...... ساتھ ہی گھر کی قیمت بھی لگا دی گئی......اِدھر گھر کی فروخت کا سلسلہ شروع ہوا اُدھر سمیع الدین کے ٹرانسفر آرڈر آ گئے۔ ان کو لاہور کے کسی دور دراز کے ایریا میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ کہیں آس پاس ہی چھوٹا سا گھر لے لیں گے لیکن......نوکری تو نوکری ہے......گھر سے کیا نکلے کہ شہر سے ہی نکل گئے۔ ساتھ، ساتھ خواتین ایک دوسرے کے دلوں سے نکل گئیں۔ جہاں رشتوں کی عمارتوں کی بنیادوں میں کینہ، نفرت، حسد اور نااتفاقی ہو وہاں عمارتوں میں دراڑیں پڑ ہی جاتی ہیں۔ دیواریں بوسیدہ اور دیمک زدہ ہو جاتی ہیں اور ایسی خستہ حال اور بوسیدہ عمارتیں بہت جلد ڈھے جاتی ہیں اور بہتری اسی میں ہے کہ جہاں بنیادیں ہلنے لگیں وہاں بوجھ کم کر دیا جائے......لیکن سمیع الدین کی یہ مہربانی چھوٹے بھائی بھاوج کے لیے قابلِ ستائش تھی کہ انہوں نے بڑے دل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے گھر کا کچھ حصہ انہیں دے دیا تھا لیکن جاتے، جاتے بتول آرا یہ احسان جتانا نہ بھولی تھیں...... گویا اس بات کا احساس بھی دلا گئی تھیں کہ اس گھر میں اب بھی ان کا حصہ موجود ہے...... عرصہ دراز سے ساتھ رہتے، رہتے دونوں بھائی الگ، الگ ہو چکے تھے۔

☆☆☆

یوں سمیع الدین فیملی کے ساتھ لاہور چلے گئے اور فخر الدین کراچی میں ہی رہے......اب وہاں جا کر کس طرح رہائش کا انتظام کیا کیسے گھر لیا ان سب باتوں سے کم از کم ساجدہ بیگم کو تو کوئی دلچسپی نہیں تھی ہاں بھائیوں کی آپس میں کبھی، کبھی بات ہو جاتی تھی۔

دو کمروں اور کھلے صحن اور چھوٹے سے برآمدے والا گھر فی الحال ان لوگوں کے لیے کافی تھا۔ ساجدہ بیگم اکیلی ہوئیں تو اپنی مرضی سے گھر کی اٹھا پٹخ کرنے لگیں۔ جب اکیلے گھر کی ذمّے داری آن پڑی، فخر الدین صبح کے جاتے شام کو لوٹتے......بچیوں کو سنبھالنا، کام کرنا ساجدہ بیگم کے لیے مشکل ہو جاتا۔ جیٹھانی جیسی بھی تھیں کبھی، کبھار بچیوں کو سنبھالتیں......ساجدہ بیگم کا چھوڑا ہوا ادھورا کام نپٹا دیتیں......حمود اسکول سے آ کر کتنی دیر بچیوں کو بہلاتا...... سمیع الدین، بچیوں کے ساتھ کھیلتے مگر اب تو وقت گزر چکا تھا۔

''ہونہہ......!'' کبھی، کبھی اپنی سوچ پر خود ہی سر جھٹک کر کہتیں۔

''نہ بابا اچھا ہے کہ وہ لوگ چلے گئے...... مجھے تو کبھی، کبھی ڈر لگتا تھا کہ کہیں ہماری بیٹیوں کو بھابی کی نظر ہی نہ لگ جائے......عجیب، عجیب نظروں سے دیکھ کر آہیں بھرتی رہتی تھیں۔''

وقت گزرتا رہا، وقت کے ساتھ، ساتھ......گل نین۔ ازمہ، شازمہ اور پھر کاظمہ چار بھاری سلوں کی طرح یکے بعد دیگرے گود میں آتی چلی گئیں۔ ساجدہ بیگم کے ساتھ، ساتھ فخر الدین کو بھی بیٹے کی شدید خواہش تھی بیٹیوں کا بھاری بوجھ ان کے کاندھوں پر آ پڑا تھا۔ ساجدہ بیگم بیٹیوں کو دیکھ، دیکھ کر ہولتی رہتیں......صورت شکل میں بھی کوئی حور پریاں نہیں تھیں......بس قبول صورت لڑکیاں تھیں......گل نین کی طبیعت میں...چڑچڑا پن تھا وہ خود گیارہ، بارہ سال کے درمیان تھی۔ تین چھوٹی بہنوں کی ذمّے داری کے ساتھ، ساتھ ننھے، ننھے، ہاتھوں سے گھر کے کام بھی کرنا پڑتے۔ پڑھائی بھی کرنی

ہوتی ساتھ، ساتھ بہنوں کا خیال بھی رکھنا پڑتا...... اسے اماں پر غصہ آجاتا۔ اپنی دوسری سہیلیوں کو دیکھتی جن کے ایک یا دو چھوٹے، بہن، بھائی تھے۔ گھر میں پھپو، چاچی، دادی وغیرہ تھیں تو وہ سپورٹ کر دیتیں مگر یہاں پر تو سوائے اماں اور ابا کے تیسرا کوئی تھا ہی نہیں۔ ابا جو دن بھر نوکری کرتے رات کو تھکے ہارے گھر آتے، گھر کا سودا سلف لاتا، اماں کی دوائیں لاتا، ان کو اسپتال لے جاتا...... یہ ان کے کام تھے...... اماں تو ہر وقت کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا رہتیں...... کچھ نہیں تو گھر میں ایک نئے فرد کا اضافہ کرنے کو ہر وقت تیار رہتیں...... کمزور ناتواں اور بیمار اماں، مصروف ابا اور لڑتی جھگڑتی چھوٹی بہنیں...... گل نین کو یہ سب کچھ بے حد برا لگتا۔ تب وہ چڑ کر اماں سے بدزبانی کرنے لگتی...... اور ایک بار پھر...... اماں دو دن کے لیے اسپتال جانے کو تیار کھڑی تھیں۔

ابا جی تین دن کی چھٹی لے چکے تھے درد سے تڑپتی، تکلیف سے کراہتی ہوئی اماں کمر پر ہاتھ رکھے باسکٹ میں چھوٹی، چھوٹی چیزیں رکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر ان کے اندر اٹھتا ہوا درد نمایاں تھا...... آس و نراش کے درمیان سے گزرتی کیفیت سے دوچار تھیں۔

”اماں...... کیا ہوا......؟“ ننھی کاظمہ اماں کے گھٹنے سے لگ کر کھڑی اُن کا درد محسوس کر رہی تھی۔

”شازمہ، ازمہ، کاظمہ میں اسپتال جا رہی ہوں، اللہ پاک سے دعا کرنا تم لوگوں کے لیے گڈے جیسا بھائی لاؤں گی...... آپا کو تنگ نہیں کرنا...... برابر والی قدسیہ خالہ کو کہہ دوں گی...... تمہارے ابا مجھے چھوڑ کر آجائیں گے۔ تب تک قدسیہ خالہ تمہارے پاس آجائیں گی......“ ساجدہ بیگم نے کراہتے ہوئے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے ٹھہر، ٹھہر کر سمجھایا۔

”گل نین! پریشان مت ہونا...... ابھی تمہارے ابا آجائیں گے۔ رات کی ہانڈی اور روٹی میں نے بنا دی، بہنوں کو کھلا دینا......“ ابھی بات مکمل ہوئی تھی کہ ابا ٹیکسی لے آئے...... اماں نے بڑی سی چادر اوڑھی درد کی شدت سے نبرد آزما ہوتے ہوئے بچیوں کو دیکھا۔ قدسیہ خالہ بھی دروازے پر موجود تھیں۔ ابا جی نے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے ساجدہ بیگم کو سنبھالا دوسرے ہاتھ سے باسکٹ اٹھائی اور سہارا دے کر باہر کے دروازے کی جانب بڑھ گئے۔

دو ڈھائی گھنٹے بعد ابا لوٹے تو خوشی ان کے انگ، انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ چہرہ کھلا ہوا تھا ہاتھوں میں گلاب جامن کا ڈبا سنبھالے وہ گھر میں داخل ہوئے تھے...... کاظمہ اور شازمہ دوڑ کر ان سے جا لپٹی تھیں۔

”ابا، اماں، کہاں ہیں...... وہ کیوں نہیں آئیں؟“ کاظمہ نے منہ بسورتے ہوئے پوچھا تھا جبکہ ازمہ اور گل نین کی نظریں مٹھائی کے ڈبے پر تھیں...... پہلی بار ابا، اماں کو اسپتال چھوڑ کر مٹھائی لے کر اتنی خوشی، خوشی لوٹے تھے ورنہ شازمہ اور کاظمہ کے وقت تو نڈھال، تھکے، تھکے سر جھکائے گھر میں داخل ہوئے تھے۔

”ارے میری بٹیا...... تمہاری اماں کل آجائیں گی، وہ تمہارے لیے تم سب بہنوں کے لیے پیارا سا گڈے جیسا بھائی لانے گئی ہیں ناں بس وہ لے کر آئیں گی...... جب تک تم لوگ مٹھائی کھاؤ، دیکھو اللہ پاک نے تم لوگوں کو منا سا بھائی بھی دے دیا ہے ناں......“ فخرالدین خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

”ارے واہ...... ہمارا منا سا بھائی آیا ہے۔“ تینوں خوشی سے تالیاں بجانے لگیں۔

☆☆☆

دوسرے دن صبح، صبح ابا جاگ گئے تھے بیکری سے پاپے لے آئے خود ہی چائے بنائی بچیوں کو جلدی اٹھنے کی عادت تھی سو چاروں اٹھ گئی تھیں۔ گل نین نے سب کی چائے نکالی۔ ابا نے ناشتا کروایا۔ ساتھ ہی اماں کی چارپائی جھاڑ کر صاف کی چادر ٹھیک سے بچھائی...... اور ہاتھ منہ دھو کر باہر جانے کی تیاری کرنے لگے۔

”گل نین بیٹی بہنوں کا خیال رکھنا دروازہ اندر سے بند کر لینا، میں تمہاری اماں کو لینے جا رہا ہوں، تھوڑی دیر میں ہم لوگ آجائیں گے، اچھا......؟“ جاتے، جاتے ابا تاکید کر گئے تھے۔

''ارے واہ......اماں آجائیں گی ہمارا منا سا بھائی بھی آجائے گا......'' شازمہ اور ازمہ خوشی سے تالیاں بجانے لگیں۔

''ہاں بھئی تمہارا بھائی بھی آئے گا۔'' ابا کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں...... گل نین رات سے ابا کے چہرے کو...... بغور دیکھ رہی تھی پہلی بار...... ابا اتنے خوش دکھائی دے رہے تھے...... گویا بیٹے کی آمد نے ابا کے اندر توانائی بھر دی تھی۔

اماں کے ساتھ منا بھائی گھر آگیا تھا کاظمہ جو اب تک اماں کے ساتھ سوتی تھی اب اس کی جگہ بھائی نے لے لی تھی اب اماں اسے پیار سے سمجھا رہی تھیں۔

''اب تو تم بڑی ہوگئی ہو ناں...... اپنی آپا کے ساتھ سونا، آپا ہے ناں......'' ساجدہ بیگم نے کاظمہ کو بلا کر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھایا۔

''ہاں ہے ناں...... دوسری اماں تمہاری...... اس کا کام ہی بچوں کو سنبھالنا ہے۔'' گل نین جو زمین پر گدے بچھا کر ازمہ کے ساتھ مل کر تکیے لگا رہی تھی جل کر دل ہی دل میں بولی۔

اگلی صبح حسبِ معمول اسکول کے ٹائم پر گل نین جاگی...... ابا جی کچن میں تھے۔ ناشتے کے لیے ڈبل روٹی، پاپے، انڈے اور مکھن رات کو ہی لے آئے تھے...... اماں کو انڈا ابال کر توس پر مکھن لگا کر وہ دے چکے تھے۔ چائے بھی تیار تھی۔ گل نین نے جلدی، جلدی بہنوں کو اٹھایا منہ دھو کر گل نین یونیفارم پہن کر باہر آئی تب تک دونوں بہنیں بھی تیار ہو چکی تھیں...... اماں کی چائے لے کر وہ کمرے میں آئی تو اماں کے ساتھ بیٹھے ابا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''تم اسکول جا رہی ہو گل بیٹی......؟'' اماں نے اسے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا، ساجدہ میں چلتا ہوں پہلے ہی دو دن کی چھٹی کر لی۔ کوشش کروں گا کہ شام کو جلدی لوٹ آؤں......'' ابا کہتے ہوئے اٹھ کر باہر کی طرف چل دیے۔

''تو اور کیا......؟ دو دن کی چھٹی تو کرلی...... پچھلے ہفتے بھی آپ نے دو دن کی چھٹی کروا دی تھی۔ بہت نقصان ہوا پڑھائی کا...... امتحان ہونے والے ہیں میرے...... ٹیچر بھی ناراض ہو رہی تھیں اماں......'' گل نین نے کہا۔

''نہیں بیٹی تم کم از کم دو دن تو اور چھٹی کرلو...... دونوں چھوٹیوں کو جانے دو...... ایک دو دن میں، میں کھڑی ہو جاؤں گی...... ابھی تو میرا چلنا پھرنا بھی مشکل ہے...... بھلا اکیلی کس طرح رہوں گی......'' ساجدہ بیگم نے منہ بنا کر ہاتھوں کے سہارے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''عجیب بات ہے اماں ......؟ لگتا ہے ساری ذمے داری میری ہی ہے۔ کیا ضرورت ہے تمہیں ہر وقت یوں بیمار رہنے کی...... جب دیکھو چھٹی کرلو...... چھٹی کرلو، اسکول نہ ہوا تماشا ہو گیا۔ دوسروں کی اماں دیکھو سارے کام کرتی ہیں...... میری سہیلیوں کی امائیں ان کا ناشتا بناتی ہیں۔ لنچ دیتی ہیں، چٹیا ڈالتی ہیں، کپڑے دھوتی ہیں، ایک تم ہو اماں...... ہر وقت پلنگ پر پڑی رہتی ہو...... میری تو اپنی مرضی ہے نہ اپنی خواہش، بس تمہارے اشاروں پر ناچتی رہوں۔ اللہ پاک نے اس گھر میں پیدا کر دیا ہے جہاں بارہ سال کی عمر میں تم نے مجھے تیس سال کی عورت بنا دیا ہے اماں......'' ساجدہ آنکھیں پھاڑے اس بارہ سال کی بچی کے منہ سے زہر اگلتا دیکھ رہی تھیں۔

پہلی بار، پہلی بار گل نین نے اتنی بدتمیزی دکھائی چڑ چڑی تو ہمیشہ سے تھی مگر آج...... اس نے عمر سے بڑی باتیں کی تھیں...... ویسے بھی کچھ حالات نے اور کچھ ساجدہ بیگم نے اسے اپنی عمر سے زیادہ بڑا بنا دیا تھا۔ یونیفارم اتار کر پھینکتے ہوئے بھی وہ مسلسل بڑ بڑ کرتی رہی۔ ناشتا کر کے ساجدہ بیگم نے دوا لی اور دوبارہ لیٹ گئیں۔ شازمہ اور ازمہ اسکول جا چکی تھیں...... کاظمہ اٹھی تو گل نین نے اس کو ناشتا کروایا۔ کچن صاف کر کے برتن دھوئے اسے معلوم تھا کہ اماں ایسے وقتوں میں کیا کھاتی ہیں سو اماں کے لیے دلیہ

پڑھا کر کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔ نے بھائی سے اسے اتنا خاص دلی لگاؤ نہیں تھا۔ اسے یہی لگتا کہ گھر میں اضافہ کرنے والا ہر فرد اسی کی ذمے داریاں بڑھا رہا ہے۔ اس کے کاندھوں پر بوجھ بڑھا رہا ہے۔ وہ شدید ذہنی اور جسمانی اذیت کا شکار ہو رہی تھی۔ نتیجتاً وہ اپنی ساری بھڑاس، ساری فرسٹیشن بہنوں اور اماں پر نکالتی...... کبھی، کبھی ساجدہ بیگم اسے دل کھول کر سناتیں...... تو کبھی، کبھی موقع دیکھ کر دو چار تھپڑ، ایک آدھ دھموکا یا پھر لہراتی ہوئی چپل سے اس کی تواضع کرڈالتیں۔ مگر اس کی چلتی ہوئی زبان کو بریک نہیں لگتا۔ وہ عمر سے بڑی، بڑی باتیں کرنے لگی تھی۔ لگتا تھا وقت کے ساتھ، ساتھ اس کے ڈھیٹ پن میں اضافہ ہی ہو رہا ہے، نہ اس پر ڈانٹ کا اثر ہوتا، نہ گالیوں کا اور نہ ہی اماں کی چپلوں کا۔

دن گزرتے رہے...... نرم گرم چلتا رہا، موسم بدلتے رہے...... ماہ و سال بدلے تو کل کے بچے آج کے جوان تھے۔ وقت کے ساتھ، ساتھ حالات بھی بدلتے گئے۔ گزرتے وقت نے مہنگائی کو بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ فخر الدین بھی اس کا شکار تھے۔ کم آمدنی، بڑھتی ہوئی ہوشربا، مہنگائی، ڈھلتی عمر اور اوپر سے جوان بیٹیوں کے بوجھ نے ان کو وقت سے پہلے ہی جیسے بوڑھا کر دیا تھا۔ بیٹیاں گورنمنٹ اسکول میں ہی پڑھ رہی تھیں مگر اخراجات تو بہر حال تھے۔ کھانے پینے کا تو ہر حال میں پورا کرنا پڑتا تھا...... گل نین جیسے، جیسے بڑی ہو رہی تھی اس کی فطرت میں عجیب و غریب تغیر آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ تنہا رہے...... کوئی شور، کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ وہ ہو اس کی کتابیں ہوں، وہ اپنی مرضی سے زندگی گزارنا چاہتی تھی...... اسے بہت زیادہ کی خواہش نہ تھی۔ نہ اونچے، اونچے خواب دیکھنے والی، خوابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی تھی...... معصوم سی خواہش تھی۔ اِدھر ساجدہ بیگم کھیرے، ککڑی کی طرح بڑھتی ہوئی عام سی صورت شکل والی بیٹیوں کو دیکھ ٹھنڈی آہیں بھرتی رہتیں۔

''ہائے فخر الدین! میرا تو کلیجا پھٹنے لگتا ہے...... جب ان چاروں کو آنگن میں دندناتا ہوا دیکھتی ہوں...... کیسے ڈولیاں اٹھیں گی ان کی...... کون بیاہ کر لے جائے گا انہیں۔ خوب صورتی ہے، نہ دولت اور نہ ہی ہماری رشتے داریاں ہیں...... بھلا کیسے رشتے ہوں گے ان کے...... ارسل تو ابھی بہت چھوٹا ہے، وہ کب پڑھائی کرے گا...... کب نوکری کرے گا اور تمہارا سہارا بنے گا...... تب تک...... تب تک تو...... بیٹیوں کی عمریں...... اُف......'' شدتِ جذبات سے ساجدہ بیگم کی آواز رندھ جاتی...... فخر الدین ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتے۔

''ہاں...... ساجدہ! تم ٹھیک کہتی ہو مگر...... اللہ پاک جب کسی پر کوئی آزمائش ڈالتا ہے تو اللہ پاک کی یہ خاص مہربانی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اس بندے کو خاص سمجھ کر اس کو اس قابل سمجھتا ہے۔ بندے کا اللہ پر کامل یقین اور پختہ ایمان اس بات کی گواہی ہے کہ وہ...... اپنے اللہ پر مکمل یقین رکھتا ہے کہ جس نے اسے آزمائش کے لیے چنا ہے اور وہ ہی اس آزمائش سے نکالنے والا ہے۔ وسیلے بنانے والا ہے۔ مایوسی کفر ہے...... مایوسی کمزور ایمان کی علامت ہے...... اور میرا ایمان کمزور نہیں ہے۔ مجھے اس ذات پر بھروسا ہے جس نے ہمیں بیٹیاں دی ہیں وہی ان کے نصیب بھی کھولے گا۔ تم دل چھوٹا مت کرو...... بس دعا کرو اپنے رب سے...... جس نے دیا ہے وہی پورا کرے گا......

ان شاءاللہ۔'' گو کہ فخر الدین خود بھی بیٹیوں کی طرف سے فکر مند اور پریشان رہتے مگر بڑی نرمی اور سلیقے سے بیوی کو سمجھاتے اور ان کی بات سن کر ساجدہ بیگم اثبات میں سر ہلا کر ٹھنڈی آہ بھرتیں۔

انسان کی کچھ عادتیں وقت کے ساتھ بدل جاتی ہیں۔ اگر کہ وہ خود اپنی عادت کو بدلنے کی کوشش کرے لیکن کچھ عادتیں وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ مزید پختہ ہو جاتی ہیں کیونکہ وہاں پر انسان خود کو بدلنے کی سعی کرتا ہی نہیں...... یہی حال گل نین کا تھا۔ وقت کے ساتھ، ساتھ اس کی تنک مزاجی، مردم بیزاری اور جھنجلاہٹ میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا...... حالانکہ گھر

میں ہمیشہ اس کو اہمیت دینے کی کوشش کی گئی۔ فخرالدین اس کا خاص خیال رکھتے۔ اس کی بات کو فوقیت دیتے۔ اماں بھی اس سے اچھی طرح پیش آتیں مگر...... نہ جانے کیوں اس میں احساسِ محرومی تھا، اسے اپنے آپ میں کمی دکھائی دیتی...... وقت اور حالات کے ہاتھوں، وقت کے اشاروں پر ناچتے، ناچتے وہ بچپن سے جوانی کی دہلیز تک آ پہنچی تھی اور یہی سب کچھ اس کی شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔

گل نین گرتے پڑتے آخر گریجویشن تک آ پہنچی۔ ازمہ سیکنڈ ائیر، شازمہ، میٹرک اور کاظمہ آٹھویں کلاس میں تھیں جبکہ ارسل کلاس فورتھ میں تھا۔ گل نین نے ابا سے کہہ کر چھت پر سیمنٹ کی چادریں ڈلوا کر اپنے لیے کمرا بنوالیا تھا۔ ویسے بھی چار، چار لڑکیاں، ایک لڑکا ابا اور اماں کے لیے دو کمروں کا گھر ناکافی تھا۔ ابا کی چارپائی برآمدے میں تھی۔ جبکہ اماں اور ارسل ایک کمرے میں رہتے۔ چاروں بہنیں ایک کمرے میں رہتی تھیں۔ اس روز تھکی ہاری گل نین کالج سے لوٹی تو لائٹ نہیں تھی۔ کھانا کھا کر اماں تو برآمدے میں آ کر لیٹ گئی تھیں، ارسل اور کاظمہ کا دوپہر کا اسکول تھا وہ دونوں گھر پر نہیں تھے ازمہ اور شازمہ نے اماں کی چارپائی کے ساتھ دری بچھالی اور دونوں وہاں لیٹ گئیں اب رہ گئی گل نین۔

''ایک تو گرمی، اوپر سے اسٹاپ سے یہاں تک چل کر آنے میں سارا تیل نکل جاتا ہے اوپر سے گھر آؤ تو بیٹھنے، لیٹنے کے لیے کوئی کونا بھی نصیب نہیں ہوتا...... عجیب ہی زندگی ہے ہماری تو...... خانہ بدوشوں کی طرح کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اب تم لوگوں کے سر پر لیٹوں میں؟'' کپڑے بدل کر آئی اور اپنے لیے مناسب جگہ نہ پا کر اسے غصہ آرہا تھا۔ اندر کمروں میں تو آگ برس رہی تھی یہاں برآمدے میں ہوا کا ایک آدھ جھونکا آ ہی جاتا اور یہ جگہ اس وقت خالی نہ تھی۔

''گل نین! کیوں شور کرتی ہے......؟ ادھر آجا میرے پاس چارپائی پر لیٹ جا...... ابھی لائٹ آجائے گی تھوڑی دیر کی بات ہے......'' ساجدہ بیگم نے پرے سرک کر جگہ بنائی۔

''اماں...... اتنی سڑی ہوئی گرمی میں مجھے چپک کر لیٹنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ میں اندر ہی لیٹ جاتی ہوں......'' اس نے پلٹ کر تیز لہجے میں جواب دیا۔

''آپا یہاں آجاؤ، اچھی خاصی کھلی جگہ ہے۔'' شازمہ نے بھی کہا۔ مگر وہ سنی ان سنی کرتی ہوئی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''عجیب وغریب فطرت ہے اس لڑکی کی...... پتا نہیں کیسے نباہ کرے گی یہ سسرال والوں کے ساتھ...... ہروقت غصہ، ہروقت ناراضی، کسی سے بھی راضی نہیں ہوتی یہ...... اللہ ہی رحم کرے اس کے حال پر۔'' ساجدہ بیگم نے تاسف سے کہا اور منہ پر ململ کا دوپٹا ڈال لیا۔ مکھیوں سے بچاؤ کے ساتھ، ساتھ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ وہ سونے والی ہیں۔ تھوڑی دیر میں ازمہ اور شازمہ کی آنکھ بھی لگ گئی۔ گل نین کمرے میں لیٹی کروٹیں بدلتی رہی۔ کافی دیر تک مارے گرمی کے نیند نہ آئی تو اٹھ کر باہر آگئی۔ اماں اور بہنیں مست سو رہی تھیں۔ دھوپ آہستہ، آہستہ ڈھل رہی تھی شام ہو رہی تھی۔ گل نین نے گھڑی دیکھی اور نہانے چلی گئی۔ نہا کر نکلی تو تب تک اماں، شازمہ اور ازمہ اٹھ گئے تھے۔ شازمہ کچن میں تھی غالباً چائے بنا رہی تھی۔ ارسل اور کاظمہ اسکول سے واپس آگئے تھے۔ ساجدہ بیگم ہاتھ منہ دھو کر بھنڈیاں کاٹنے بیٹھ گئیں۔ رات کی ہانڈی میں مسالے والی بھنڈی اور بینگن کا رائتہ بنانا تھا۔ کام تو سب مل کر کر لیتے...... گل نین کو زوروں کی بھوک لگی تھی۔ کالج سے آکر بھی اس نے غصے میں کھانا نہیں کھایا تھا اس لیے وہ کچن میں آگئی۔

''شازمہ چائے بنا چکی ہو تو میرے لیے ایک روٹی گھی میں فرائی کردو...... بھوک لگی ہے مجھے۔''

''اچھا آپا! ابھی کر کے لاتی ہوں۔'' شازمہ نے ساس پین پر ڈھکنا رکھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی دوسرا چولھا جلا کر اس پر توا چڑھا دیا۔

''ارے واہ! تلی ہوئی روٹی...... شازمہ آپا میں

بھی کھاؤں گا۔" ارسل نے جو شازمہ کو ٹرے میں چائے کے ساتھ تلی ہوئی روٹی کی پلیٹ لاتے دیکھا تو خوش ہو کر بولا۔

"نہیں...... یہ گل آپا کی ہے انہوں نے کھانا نہیں کھایا...... تم تو کھانا کھا کر گئے تھے ناں اور ساتھ لنچ بھی لے کر گئے تھے۔" شازمہ نے سختی سے منع کر دیا۔

"آپا دو تو اے ہی لوں گا ناں بس......" ارسل نے ندیدہ پن دکھایا۔ اتنے میں کاظمہ بھی آ گئی تھی اور چائے کے کپ کے ساتھ رکھی لال، لال کڑک تلی ہوئی روٹی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ارے بھئی! شازمہ بچے سے کیا ضد...... دے دو ذرا سی اور تل کر کے لے آؤ دوپہر کی بچی ہوئی ہو گی......" ساجدہ بیگم نے کٹی ہوئی بھنڈیاں ٹوکری میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"توبہ ہے...... یہ جنجال پورہ تو حلق کا کانٹا بنا ہوا ہے۔ لو مرو تم لوگ ہی ٹھونس لو سارا...... مر جاؤ گے اگر یہ نہ ٹھونسا تو...... پتا نہیں کب اس فوج سے جان چھوٹے گی میری۔" گل نین نے غصے سے جھنجلاتے ہوئے کہا اور اپنا چائے کا کپ اٹھا کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

"ارے آپا......! میں اور فرائی کر دوں گی، بیٹھو تو......" ازمہ بھی آ گئی تھی۔

"نہیں ضرورت ہے مجھے جن کو ضرورت ہے ان کو ہی بھرو......" وہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہی تھی۔

"ارے جانے دو! خواہ مخواہ کا دماغ دکھاتی ہے۔ شرم نہیں آتی...... دیکھو ذرا زبان کیسی چلتی ہے۔ جانے اللہ واسطے کا بیر کیوں ہے اسے چھوٹی بہنوں سے۔" ساجدہ بیگم بھی آپے سے باہر ہو گئی تھیں۔ گل نین تیزی سے چھت پر جانے والی سیڑھیاں عبور کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

"ابا جی......! ایک بات کہنی تھی آپ سے......" رات کے کھانے کے دوران گل نین نے باپ کو مخاطب کیا۔

"کیا ہوا بیٹا کہو...... کیا کہنا ہے......؟" انہوں نے ڈونگے سے سالن نکالتے ہوئے رک کر بیٹی کی طرف دیکھ کر ملائم لہجے میں کہا۔

"اوپر چھت پر دیواریں تو کھڑی ہیں ناں...... مجھے اس پر سیمنٹ کی چادریں ڈلوا کر ایک کمرا بنا دیں اوپر...... اب گھر تنگ پڑنے لگا ہے...... میں اوپر رہوں گی......" اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"ہائیں آپا! ڈر نہیں لگے گا تمہیں یوں اکیلے رہتے......" ارسل نے حیران نظروں سے بہن کو دیکھا۔

"ڈر کس بات کا میں بچی تھوڑی ہوں...... ویسے بھی ابا یہاں سال کے آٹھ، نو ماہ تو گرمی ہی پڑتی ہے اچھا ہے ناں دن میں بھی اوپر جا کر تھوڑی بہت ہوا ہی مل جائے گی۔ گھر میں تو آگ برستی ہے آگ۔" پہلے بھائی کی طرف اور پھر ابا کی طرف دیکھتے ہوئے گل نین نے اپنی بات جاری رکھی۔

"ہم......ہم۔" فخر الدین نے سر ہلایا۔ بات تو گل کی ٹھیک ہی تھی مگر ساجدہ بیگم کو یہ بات مناسب نہیں لگی۔ "چلو کل پتا کرتا ہوں کتنا خرچہ آئے گا۔" فخر الدین نے کہا۔

"فخر الدین! تمہیں اندازہ بھی ہے کہ آج کل سیمنٹ کی چادریں، سیمنٹ، بجری، اینٹ اور سب سے بڑھ کر مزدوریاں کتنی بڑھ گئی ہیں۔ خواہ مخواہ ہی کیوں اس چکر میں پڑ رہے ہو...... اچھے خاصے پیسے اٹھ جائیں گے...... ان پیسوں سے تو گل نین کے لیے ہم کوئی جہیز کی چیز لے سکتے ہیں۔ گزارہ تو چل رہا ہے ناں چلو اسے اب تنگی محسوس ہو رہی ہے تو میں اپنا اور ارسل کا پلنگ بھی برآمدے میں ڈال لیتی ہوں۔ اچھا بھلا برآمدہ تو ہے...... وہ محترمہ......! الگ کرا لے لیں باقی بچیاں بیچاریاں تو ساتھ رہ لیں گی...... کل کو ان کی شادیاں ہو جاتی ہیں تو رہنا تو یہاں صرف ارسل کو ہی ہے۔" ساجدہ بیگم حال کو نہیں بلکہ بہت دور کی کوڑی لاتے ہوئے مستقبل کو سوچ رہی تھیں۔

"ساجدہ بیگم! سچ کہہ رہی ہے گل گھر واقعی تنگ پڑ رہا ہے یا تو صحن میں کمرا بنواؤں یا پھر چھت پر...... صحن

یونہی کھلا بہتر ہے کیونکہ کل کو بچیوں کی رسم وغیرہ ہوتی ہے تو گنجائش رہے گی۔ بہتر ہے کہ چھت پر ایک چھوٹا سا کمرا بنا دوں......'' فخر الدین بھی دور کی کوڑی لا رہے تھے۔ ساجدہ بیگم صرف سر ہلا کر رہ گئیں۔

پھر چند روز میں اوپر چھوٹا سا کمرا تیار ہوا گیا تھا۔ گل نین بہت خوش تھی جیسے قید سے چھوٹی ہو...... اس نے کمرے کی جھاڑ پونچھ کر کے کونے میں چھوٹی سی لکڑی کی میز اور پلاسٹک کی کرسی ڈال دی، ساتھ ہی پلنگ اور بستر بھی سیٹ کر دیا۔ ابا کہیں سے پرانا سٹینگ فین بھی لے آئے۔

''واہ بھئی آپا مزے ہی مزے ......'' شازمہ حسرت سے کہہ رہی تھی۔ گل نین ٹھاٹ سے پلنگ پر لیٹی لمبی، لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ پُرسکون اور مطمئن...... اپنی کتابیں ٹیبل پر سیٹ کر کے وہ کچھ دیر دیکھتی رہی، کب سے اسے خواہش تھی کہ وہ اپنا الگ کمرا بنوائے ...... بے شک اس میں جہازی سائز پرانا سا بیڈ، ڈریسنگ ٹیبل، قیمتی شوپیسز، بہترین پردے اور قالین نہ ہوں مگر ایک ایسا پُرسکون گوشہ ہو جہاں پر وہ خود کو ریلیکس کر سکے، جہاں آ کر اسے کوئی فکر اور ٹینشن نہ ہو...... نہ کوئی یہ کہے کہ لائٹ بند کر دو نیند آ رہی ہے اور پڑھتے' پڑھتے نہ چاہتے ہوئے بھی لائٹ بند کرنی پڑے پھر بے شک کوفت سے ساری رات نیند نہ آئے مگر ...... کہنے والے کو کب خبر ہوتی ہے وہ تو کہہ کر پلٹ کر دوبارہ گہری نیند میں چلے جاتے ہیں...... کبھی چادر چینج کرتی تو کوئی بہن کہتی۔

'' ارے آپا یہ ڈارک چادر کیوں بچھائی رات بھر مچھروں نے میرا برا حال کر دیا۔'' اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے چادر اٹھا کر دوسری بچھانی پڑتی...... لیکن اب اپنی مرضی سے سو سکتی تھی...... اپنی مرضی سے لائٹ بند کر سکتی تھی۔ اپنی مرضی سے چادر بچھا سکتی تھی...... لگا جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

''ہاں بھئی ہماری بیٹی خوش تو ہے ناں......؟ اپنے کمرے میں مزہ آ رہا ہے......؟'' فخر الدین نے اس کی بدلی ہوئی کیفیت دیکھ کر پوچھا۔

''جی ابا......!'' وہ مسکرائی...... ساجدہ بیگم اسے بغور دیکھ رہی تھیں...... واقعی کبھی، کبھی معمولی سی بات، چھوٹی سی خواہش کی تکمیل انسان کو کتنی بڑی خوشی دے دیتی ہے۔ مگر وہ معمولی اور چھوٹی خواہش پوری کرنے کے لیے بھی کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں...... کتنی ضرورتوں کی قربانی دینی پڑتی ہے یہ تو وہی جان سکتا ہے جو ان حالات سے گزرتا ہو۔ ساجدہ بیگم ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں...... گل نین کے کمرے میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی...... وہ اپنی ساری ذمے داریاں، اپنی باری کے سارے کام نپٹا کر اپنے کمرے میں چلی جاتی جو اس کے لیے گوشۂ عافیت تھا۔ سب کچھ اسی طرح سے چل رہا تھا۔ اماں کے ساتھ گل نین کے پھڈے ہنوز برقرار تھے۔

ساجدہ بیگم اب بیٹیوں کے رشتے کے حوالے سے بھی ہاتھ پیر مارنے لگی تھیں۔ اب ساجدہ بیگم محلے میں بھی نکل جاتیں...... لوگوں سے بھی راہ و رسم بڑھانے شروع کر دیے تاکہ رشتوں کے حوالے سے کہیں سے کوئی بات بن سکے۔ فخر الدین نے بھی اپنے خاص دوستوں سے کہہ رکھا تھا۔ بقول فخر الدین اللہ پاک کے ہاں ابھی وقت نہیں آیا۔ جو وقت انسان کے حق میں بہتر اور مناسب ہوتا ہے میرا رب اسی وقت کو انسان کے نصیب میں لکھ دیتا ہے...... یہ انسان ہی بے صبرا اور جلد باز ہوتا ہے کہ وہ اس بات کی گہرائی کو سمجھ نہیں پاتا۔

لیکن کبھی، کبھی انسان کے ساتھ وہ سب ہو جاتا ہے جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا...... جو وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ دل و دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ساجدہ بیگم اور ان کے بچوں کے ساتھ ہوا۔ اچھے بھلے رات کے کھانے کے بعد فخر الدین بچوں کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ پھر بچے سونے چلے گئے...... تو وہ بھی چارپائی پر آ لیٹے۔

''کیوں فخر الدین! صبح آفس نہیں جانا جو اتنی رات تک جاگ رہے ہو۔'' ساجدہ بیگم نے ان کی

جانب کروٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"بس ایسے ہی بچوں کو وقت نہیں دے پاتا...... اسی لیے آج گپ شپ کرنے بیٹھ گیا۔ اچھی بری باتیں سمجھا رہا تھا۔ ٹائم کا پتا بھی نہیں چلا...... پتا نہیں کیوں آج سمیع الدین بھائی نے بھی کافی عرصے بعد کال کی تھی آفس کے نمبر پر...... کافی باتیں کیں، آج کل ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ دل عجیب سا ہو رہا تھا میرا...... گھبراہٹ اور بے چینی سی تھی اللہ پاک سمیع الدین بھائی کو صحت دے۔"

"کیوں گھبراہٹ ہو رہی ہے...... لیموں کا قہوہ بنا دوں......؟" وہ شوہر کو بغور دیکھتے ہوئے بولیں۔

"نہیں، نہیں اب ٹھیک ہوں...... میں نے اپنے دوست اجمل صاحب سے بچیوں کے رشتے کے حوالے سے بات کی تھی دیکھو ان شاء اللہ جلد ہی وہ کسی کو لے کر آئیں گے۔" فخر الدین نے کہا۔

"اچھا شب بخیر...... صبح جلدی جگا دینا آج بھی فجر کا وقت بہت تنگ ہو گیا تھا۔" کروٹ بدلتے، بدلتے فخر الدین نے بیگم کو یاد دلایا۔

"ہاں جی الارم لگوا لیا ہے ارسل سے فکر نہ کریں۔ صبح جلدی اٹھ جاؤں گی۔" انہوں نے تسلی دی اور خود بھی کروٹ بدل لی۔

واقعی یہی تو ہوا اب صبح فجر کے وقت سے بھی پہلے اچانک ساجدہ بیگم کی آنکھ کھل گئی...... مندی آنکھوں سے دیکھا تو فخر الدین پلنگ پر بیٹھے ہوئے نظر آئے۔

"ارے فخر الدین......! خیریت تو ہے ابھی تو فجر میں کافی وقت باقی ہے۔" ساجدہ بیگم نے گھڑی کی طرف دیکھ کر خمار آلود لہجے میں کہا۔

"ہاں ساجدہ! پتا نہیں کیوں طبیعت بوجھل سی ہو رہی ہے...... اور گھٹن کا احساس بھی ہو رہا ہے۔" فخر الدین نے ہتھیلی سے سینہ رگڑتے ہوئے کہا۔ "شاید کھانا ہضم نہیں ہوا۔" وہ بے چینی سے پہلو بدل کر بولے۔ ساجدہ بیگم اگلے ہی لمحے چادر پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پہلے برآمدے کی لائٹ جلائی۔

"میں ابھی باورچی خانے سے ادرک لے کر آتی ہوں...... ادرک اور پودینے کے پتے چبا لو آرام آ جائے گا۔" انہوں نے کہا اور کچن کی طرف قدم بڑھایا۔

"ساجدہ...... سا...... ج...... دہ......" فخر الدین سینے کے بائیں طرف ہاتھ رکھے جھکتے چلے گئے۔ ان کے منہ سے بہ مشکل ٹوٹے سے الفاظ ادا ہو رہے تھے۔ فخر الدین کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار نمایاں تھے...... ان کا وجود پسینہ، پسینہ ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند ہونے لگی تھیں...... ہونٹ خشک ہو رہے۔ وہ درد برداشت کرنے کی کوشش میں بری طرح ناکام ہو رہے تھے، ساجدہ بیگم پلٹیں تو آنکھیں پھٹنے لگیں۔

"فخر الدین......!" وہ شوہر کی حالت دیکھ کر اتنی حواس باختہ ہوئیں کہ ان کی آواز سے چھت پر کمرے میں سوتی ہوئی گل نین سمیت سارے بچے جاگ گئے۔

"اماں...... کیا ہوا؟ ابا... ابا!" شازمہ، ازمہ، کاظمہ اور ارسل پاگلوں کی طرح چیخ کر کمرے سے باہر آ گئے تھے...... گل نین بجلی کی تیزی سے اٹھی اور شور سے گھبرا کر تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی تقریباً دوڑتی ہوئی ابا کے پلنگ کے پاس آئی۔

"آپا...... ایمبولینس کو بلاؤ۔" شازمہ پوری قوت سے چلائی تھی...... گل نین بغیر چپل کے باہر کے دروازے کی جانب بھاگی۔

"آپا...... آپا......" دوسری جانب سے ازمہ چلائی تھی۔

"ابا کو کیا ہو رہا ہے......؟" گل نین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے...... الٹے پاؤں واپس پلٹی۔

ابا نے بہ مشکل تمام آنکھیں کھولیں تھیں۔ ازمہ، شازمہ ان کی ہتھیلیاں رگڑ رہی تھیں، کاظمہ، ارسل تلوے سہلا رہے تھے اور ساجدہ بیگم ان کے سینے کو سہلا رہی تھیں۔

"یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے...... قبل اس کے گل نین ایمبولینس کو فون کرتی ابا نے نحیف آواز میں کلمہ پڑھا اور ان کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔ شازمہ، ازمہ کے ہاتھوں میں ان کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے...... اماں

کے ہاتھ کے نیچے سینے میں دھڑکتے دل کی دھڑکن ساکت ہوگئی...... چہرے پر چھایا کرب، اطمینان میں تبدیل ہوگیا۔ تڑپتے وجود کو سکون مل گیا۔ ساجدہ بیگم کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔

''فخر الدین!'' وہ پوری قوت سے چلائیں، ساتھ ہی فخر الدین کے بے جان وجود کو جھنجوڑنے لگیں۔

''فخر الدین، فخر الدین چپ کیوں ہوگئے...... تم ابھی ٹھیک ہوجاؤ گے...... میں پودینہ، ادرک دوں گی...... تم، بالکل ٹھیک ہوجاؤ گے...... آنکھیں تو کھولو......''

''اماں، اماں......'' بچے ماں کو دیکھ کر تڑپ رہے تھے...... ساجدہ بیگم ہوش و خرد سے بیگانہ ہوتی جارہی تھیں...... گھر میں کہرام مچ گیا تھا۔ فجر کا وقت قریب تھا۔ اتنی زور سے آہ و بکا، چیخ و پکار جاری تھی کہ سارے محلے میں آواز گونج رہی تھی ویسے بھی اس وقت خاموشی کا راج تھا ایسی آبادی میں دیوار سے دیوار ملی گھر ہوتے ہیں...... کھلے صحن اور چھتوں والے گھروں میں تو ایک گھر کی زور سے بات کرنے کی آواز بھی دوسرے گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ وقت تو پُرسکون تھا...... آس پاس کے لوگ بھاگے چلے آئے تھے۔ گویا ایک قیامت تھی جو ساجدہ بیگم اور بچوں پر آپڑی تھی۔ فخر الدین یوں چپ چاپ اور اچانک سے چلے گئے تھے۔ چار، چار جوان بیٹیاں اور ایک کم سن بیٹا چھوڑ کر وہ خود ابدی نیند سوچکے تھے۔ ساری فکرات، پریشانیاں اور مسائل سے مبرا ہوچکے تھے۔

''فخر الدین! اللہ کا واسطہ ہے تم کو...... یوں ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ۔'' ساجدہ بیگم بین، بین کر کے تڑپ رہی تھیں، بلک، بلک کر رو رہی تھیں۔ آس پاس بیٹیاں بیٹا چمٹے ہوئے تھے ان کی دلخراش چیخوں سے ہر آنکھ اشکبار تھی۔ بیٹیاں تڑپ رہی تھیں...... ارسل کبھی اماں تو کبھی بہنوں کی بانہوں میں بلک رہا تھا...... رات کو تو ابا جی نے اس کے لیے کیرم بورڈ لے کر آنے کا وعدہ کیا تھا...... اور آج...... آج وہ چھوڑ کر جارہے تھے۔ ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے، نصیحتیں کرتے، کرتے وہ چپکے

سے چلے گئے۔ ارسل آٹھ، نو سال کا تو تھا معصوم، ننھا سا بچہ...... اسے تو اب تک اماں کے سینے سے لگ کر ابا کی چھاتی سے لگ کر سونے کی عادت تھی۔ بے تحاشا آہوں، سسکیوں اور چیخوں کے ساتھ فخر الدین کا جسدِ خاکی اٹھایا جا رہا تھا۔

فخر الدین سفرِ آخرت کو روانہ ہوئے اور اپنے پیچھے بے شمار مسائل کا انبار اور روتے بلکتے پیاروں کو چھوڑ گئے تھے۔ آفس والوں کی طرف سے اسی وقت گل نین کے ہاتھوں میں کچھ رقم آئی تھی جو اس نے اماں کی الماری میں منتقل کر دی تھی۔ اتنے پیسے...... دولت پھر ابا کی پنشن، گریجویٹی، یہ سب کچھ...... ایک ابا کی کمی تو کسی صورت پوری نہیں کر سکتے تھے جو خلا زندگی میں آ گیا تھا وہ تو ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے آ چکا تھا۔

موت اور زندگی دینے والی ذات تو اللہ پاک کی ہے وہ جسے چاہے دنیا میں بھیجے اور جسے چاہے اپنے پاس بلا لے۔ مگر وقت بھی ایک مرہم کی طرح ہوتا ہے۔ رفتہ، رفتہ گہرے سے گہرے زخم کو بھی مندمل کر دیتا ہے۔ آخر کار ان لوگوں کو بھی اللہ پاک نے صبر اور حوصلہ بخش دیا تھا اور ایک بار پھر سب نے اپنی ذمے داریاں سنبھال لیں۔ فخر الدین کے انتقال کے ہفتے بعد بھی آنگن میں سب لوگ بیٹھے ان کے ایصالِ ثواب کے لیے کلام پاک پڑھ رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''اماں! کوئی آنٹی، انکل آئے ہیں......'' ارسل نے دروازے سے ہی آواز لگائی...... ساجدہ بیگم اندر کمرے کی جانب بھاگیں کیونکہ وہ عدت میں تھیں۔ بتول آرا کمرے میں آئیں تو ساجدہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ اتنے سالوں بعد انہیں سامنے دیکھ کر ضبط جواب دے گیا۔ وہ بھی دوڑ کر دیورانی سے لپٹ گئیں اور زار و قطار رونے لگیں۔ باہر صحن میں سمیع الدین بچوں سے مل رہے تھے۔ وہ بھی رو رہے تھے۔ کل انہوں نے آفس کے نمبر پر کال کی تو وہاں سے پتا چلا کہ فخر الدین صاحب فوت ہو چکے ہیں، بس سمیع الدین نے اسی وقت رختِ سفر باندھا۔ اب سب ایک دوسرے سے مل کر رو رہے تھے۔ گل نین کو خواب کی طرح سے تائی یاد تھیں۔ بتول آرا اور سمیع الدین کو لے کر کوئی اچھی یاد وابستہ نہیں تھی۔ اسے ویسے بھی ان لوگوں سے چڑ تھی...... جو سگے ہو کر بھی اتنے لاتعلق رہتے تھے۔ بہ مشکل ایک دو روز دونوں رکے کیونکہ ساجدہ بیگم کی عدت کی وجہ سے یہاں زیادہ رکنا بھی مناسب نہیں تھا۔ جاتے، جاتے بتول آرا دیورانی کو گلے لگا کر آخر کار اصلیت بھی دکھا گئیں۔

''ساجدہ! فکر مت کرنا اللہ پاک پر بھروسا رکھنا ساری مشکلیں حل کرنے والا ہے وہ۔ فخر الدین کا پیسہ ویسے تو ملے گا ہی...... ڈھنگ اور طریقے سے کہیں جمع کروا دینا تاکہ بیٹیوں کے لیے پس انداز کر سکو۔ بہن یہ تو دور ایسا ہے کہ یہاں پر اپنے، اپنے گھروں کی گاڑیاں چلانا ہی مشکل ہے...... اسی لیے کسی زمین والے کی امداد سے بہتر ہے کہ آسمان والے سے مدد مانگو...... اور ہاں! یہ جو دکانوں والے پلاٹ کا ہمارا حصہ ہے ناں اس کی بھی فکر مت کرنا...... بس اللہ پاک کسی کو بھی کسی کا محتاج نہ کرے۔ اپنا خیال رکھنا...... اب تم ہی تو ہو ان بچوں کے سر پر ماں بھی اور باپ بھی اس لیے خود کو کمزور مت کرنا مضبوط رکھنا اپنے آپ کو...... میں رکتی مگر تمہارے جیٹھ کی طبیعت خراب رہتی ہے۔ دل کا مرض لگ گیا اس لیے انہیں چھوڑ نہیں سکتی...... اچھا خدا حافظ......'' باری، باری سب بچیوں کو گلے لگا، لگا کر رخصتی کی رسم نبھا کر وہ چلی گئیں۔ گل نین تائی جان کی ایک، ایک بات کو غور سے سن رہی تھی۔ اور اس کا مطلب سمجھ رہی تھی۔

''اچھا ہی ہوا چلی گئیں...... آنا بھی کوئی اتنا ضروری نہیں تھا ان کا ہمارے لیے...... اچھے رشتے دار ہیں...... دیکھا کیسے جاتے، جاتے اپنے معمولی سے حصے کا طعنہ بھی دے کر گئی ہیں۔ توبہ ہے بھئی، اتنے عرصے میں بھی وہ نہیں بھولیں ایسے نمونے رشتے داروں سے تو دشمنی ہی بھلی ہے۔ غیر بھی دل میں ہمدردی اور ترس کا جذبہ لے کر ملتے ہیں مگر یہ لوگ...... لعنت ہے ان پر اور

ان کی سوچ پر......" گل نین بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی......ساجدہ بیگم سوائے آنسو بہانے کے اور کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ سمیع الدین اور بتول آرا ایسے گئے کہ پھر تین ماہ بعد ہی ایک کال کر کے بس خیر خیریت پوچھی۔

"سچ اماں......! آپا سچ کہتی ہیں...... مجھے تو لگتا ہے تائی اماں صرف یہ یاد دلانے کے لیے اتنے عرصے بعد آئی تھیں کہ اس گھر میں ان کا بھی حصہ ہے...... اور...... جاتے، جاتے کیسے کہہ گئی تھیں کہ صرف اللہ پر بھروسا رکھو۔ اسی سے مانگو......تو ہم کون سا ان کے آگے ہاتھ پھیلا رہے تھے۔ ان سے بھیک مانگی تھی ہم نے......" ازمہ بھی کبھی، کبھی چڑ جاتی۔

"چپ کرو تم لوگ...... کب سے بکواس کیے جا رہی ہو...... جا کر وضو کر کے مرحوم باپ کو کچھ بخش دو...... بجائے یہ کہ ان کے خون کے بارے میں زہر اگلو......" ساجدہ تنگ آ کر بیٹیوں کو گھرکتیں...... گل نین منہ بنا کر وہاں سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا زندگی میں ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ دو سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ گل نین نے بی اے کرنے کے بعد اسکول میں جاب کر لی تھی...... ازمہ کا فخر الدین کے دوست نے اپنے رشتے داروں میں رشتہ کروا دیا تھا۔ گل نین کے لیے آنے والے رشتے ازمہ اور شازمہ کو پسند کر لیتے آج کل کی سب سے بڑی ڈیمانڈ گوری رنگت تھی...... ازمہ اور شازمہ کی تو کچھ نہ کچھ ترکیبیں کر کر کے کسی حد تک رنگت صاف ہو چکی تھی۔ وہ گل نین کے پیچھے بھی پڑی رہتیں۔

"آپا تم بھی یہ کریم لگایا کرو دیکھو تو کتنا فرق پڑ گیا ہے......" شازمہ اسے بھی مشورہ دیتی۔

"نہ بھئی تمہیں ہی مبارک ہو...... یہ سب میں جیسی ہوں ٹھیک ہوں...... لوگ پسند نہیں کرتے...... نہ کریں، میں کون سا مری جا رہی ہوں کہ لوگ مجھے پسند کریں...... رشتوں کی لائن لگ جائے۔" گل نین جھنجلا کر شازمہ پر چڑھ دوڑتی...... وہ کھسیا کر رہ جاتی۔

آس پاس محلے میں شادی بیاہ کی تقریبات میں گل نین نہیں جاتی، وہ گھر پر رہتی، ساجدہ بیگم باقی بچوں کو لے کر چلی جاتیں۔ وہ چھوٹی بہنوں اور بھائی سے پیار کرتی...... ان کا خیال رکھتی، ماں کی ضرورتوں کا خیال بھی رکھتی۔ مگر فطرت میں جو اکھڑ پن اور جھنجلاہٹ تھی وہ آج بھی ویسی ہی تھی...... نہ جانے یہ احساسِ کمتری تھی یا نظر انداز کیا جاتا تھا...... وقت اور حالات نے اسے عجیب و غریب شخصیت کی مالک بنا دیا تھا۔ ضدی، خود سر، بد تمیز...... اور منہ پھٹ......

☆☆☆

فخر الدین کی پنشن، دکانوں کا کرایہ...... گل نین کی تنخواہ اور ازمہ، شازمہ کے ٹیوشنز ملا کر گھر کا خرچہ بہت اچھی طرح نہ سہی پھر بھی ٹھیک ٹھاک چل ہی جاتا تھا۔ ساتھ، ساتھ ساجدہ بیگم نے کمیٹیاں بھی ڈال رکھی تھیں۔ کچھ فخر الدین کے آفس سے ملنے والا پیسہ تھا۔ اس سے اپنی بساط کے مطابق بچیوں کے لیے جہیز کی تیاری کا سوچ رکھا تھا...... اور تو کوئی راستہ تھا اور نہ کوئی سلسلہ جو کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔ ازمہ کے سسرال والے سیدھے سادے اور اچھے لوگ تھے ان کو حالات کا اندازہ تھا اس لیے ان کی کوئی ڈیمانڈ نہ تھی۔ انہیں صرف نیک اور گھریلو بہو چاہیے تھی۔ اس لیے ساجدہ بیگم کو ازمہ کے لیے اتنی فکر نہ تھی...... مگر گل نین، شازمہ اور کاظمہ کے لیے نہ جانے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑتا۔

☆☆☆

گل نین اسکول سے واپس آئی تو بہت زیادہ تھکی ہوئی تھی۔ آج کل بچوں کے پیپرز ہو رہے تھے۔ پیپرز بنانا، چیک کرنا اور پھر ری چیکنگ کرتے، کرتے دماغ گھوم جاتا۔ آتے ہی کھانا کھایا، ظہر کی نماز پڑھ کر اپنے کمرے میں سونے کے لیے آ گئی۔ پلنگ پر لیٹتے ہی نیند نے آ لیا۔ آنکھ کھلی تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ کسلمندی سے کروٹ بدلی...... پھر اٹھ کر نیچے آ گئی۔ خلافِ معمول گھر بہت صاف ستھرا تھا دھلا دھلایا آنگن، برآمدے کے پلنگ پر صاف چادر بچھی تھی۔ صحن میں لگے پودوں کی دھلائی ہوئی تھی نکھرے، نکھرے صاف پتے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ آج کیاریوں کی بھی صفائی ہوئی ہے۔

''آپا......! اماں بلا رہی ہیں۔'' وہ آخری سیڑھی پر تھی اور گھر کا جائزہ لے رہی تھی کہ کاظمہ نے غسل خانے کی سمت جاتے، جاتے مخاطب کیا۔

''اماں مجھے بلایا ہے......؟'' گل نین ماں کے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ ساجدہ بیگم جو عصر کی نماز کے لیے جائے نماز بچھا رہی تھیں آواز پر پلٹیں۔

''ہاں بیٹا...... آج نفیسہ آپا (محلے والی کچھ لوگوں کو لے کر آ رہی ہیں میں نجو (محلے والی) شادی پر ان لوگوں سے مل چکی ہوں...... وہ لوگ تمہیں دیکھنے کی غرض سے آ رہی ہیں۔ اچھے اور سیدھے سادے لوگ ہیں لڑکا بھی اچھا ہے سرکاری نوکر ہے۔ دو گلیاں چھوڑ کر ہی رہتے ہیں۔ مغرب کے بعد وہ لوگ آئیں گے تم ذرا اچھے کپڑے پہن کر تیار ہو جانا۔'' ساجدہ بیگم نے تفصیل بتائی اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی انہوں نے اپنی توجہ نماز پر مرکوز کر لی گل نین چند لمحے وہیں کھڑی رہی...... پھر چپ چاپ وہاں سے نکل گئی۔ کوئی احتجاج، کوئی فقرے بازی یا منفی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا...... چھوٹے بھائی بہن بھی خوش تھے کہ آپا کے لیے بھی رشتہ آ رہا ہے۔ ارسل بازار سے چپس، نمکو اور مٹھائی لے آیا تھا جبکہ شازمہ نے گھر میں چھولوں کی چاٹ تیار کر دی تھی۔ خلافِ معمول گل نین چپ تھی...... شاید وہ بھی ماں کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

''آپا...... یہ والا فیس پاؤڈر لگا لو...... اور یہ لپ اسٹک براؤن آؤٹ لائن کے ساتھ اچھی لگے گی۔'' جب گل نین کاٹن کا عام سا تھری پیس سوٹ پہن کر آئی تب ازمہ نے مختصر سا میک اپ کا سامان اس کے آگے رکھا۔

''بس، میں نے ٹالکم پاؤڈر لگا لیا ہے۔ باقی کسی بناوٹ کی ضرورت نہیں جس نے دیکھنا اور پسند کرنا ہے یونہی دیکھے۔'' رگ ایک بار پھر پھڑکی تھی۔

''چلو مرضی ہے تمہاری......'' ساجدہ بیگم پیچھے سے بولیں...... وہ جانتی تھیں کہ گل نین کی نہ کو ہاں میں بدلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ سانولی رنگت، مناسب نقوش اور نارمل قد و قامت کے ساتھ وہ اچھی بھلی تو تھی...... مگر نہ جانے کیوں لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔

''حیرت ہوتی ہے ایسی خواتین پر جن کے اپنے بیٹے چاہے اللہ معاف کرے بھینسے جیسے ہوں مگر بہو ہمیشہ سنڈریلا جیسی ڈھونڈیں گی، نہ اپنی گینڈی جیسی بیٹیوں کو دیکھتی ہیں نہ اپنے آپ کو۔'' یہ جملہ اکثر و بیشتر کاظمہ ادا کرتی رہتی تھی۔ اسے بہت برا لگتا جب اس کی آپا کو بار، بار ریجیکٹ کیا جاتا۔ وہ تپ کر رہ جاتی۔

وقتِ مقررہ پر دو خواتین آئیں روایتاً گل نین چائے کی ٹرے کمرے میں لے آئی تھی۔ چار آنکھوں نے جانچا۔ اوپر سے نیچے تک تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لیا۔ چال سے لے کر بال تک بغور پرکھے گئے قد پر خاص دھیان دیا گیا۔ ہاتھوں کی جلد اور بناوٹ سے عمر کا اندازہ لگایا گیا۔ گویا کسی ماہر اور مستند ڈاکٹر کی طرح کمپلیٹ چیک اپ کیا گیا یا شاید چھوٹا موٹا آپریشن کہہ لیں...... اور ان خواتین کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اس بات کا اندازہ لگ جاتا کہ آپریشن کامیاب ہوا کہ نہیں...... بہر حال کچھ امید تو نظر آئی تھی...... کیونکہ صرف گل نین ہی سامنے آئی تھی سو دونوں خواتین کی نظروں میں پسندیدگی کی جھلک نمایاں تھی۔ لیکن ابھی ان خواتین کی جانب سے ایک اور چھوٹا سا ٹیسٹ باقی تھا۔ وہ تھا گھر کا واش روم اور کچن دیکھنا...... جس سے لڑکی کے سلیقے اور صفائی کا اندازہ ہو جاتا ہے...... ساجدہ بیگم جز بز ہو رہی تھیں۔ کچن میں تو شازمہ اور کاظمہ چھپی بیٹھی تھیں...... اماں کا سخت آرڈر تھا کہ مہمانوں کے سامنے مت آنا...... ازمہ کا تو رشتہ طے تھا سو اس کی فکر نہ تھی...... بہر حال وہی ہوا جس کا ڈر تھا...... شازمہ اور کاظمہ بیچاریاں گلٹی فیل کر رہی تھیں۔

''ہائے...... لڑکیوں تم لوگ یہاں گرمی میں کیوں بیٹھی ہو...... ہم سے ملی بھی نہیں......'' ایک خاتون نے مضحکہ خیز انداز میں کہتے ہوئے قہقہہ لگایا...... ساتھ ہی ساتھ گہری نظروں سے شازمہ کو جانچتے ہوئے دوسری خاتون کو معنی خیز انداز میں دیکھا۔ شازمہ اور کاظمہ شرمندگی سے کھسیانی ہنسی ہنسنے لگیں۔

''بس ذرا رات کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے ہم لوگ۔'' کاظمہ کو کچھ نہ سوجھا تو گڑبڑا کر بودا سا بہانہ بنایا۔

''اچھا، اچھا چلو اچھی بات ہے۔'' دوسری خاتون نے مصلحت دکھاتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ساجدہ بیگم کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ان کی چھٹی حس انہیں احساس دلا رہی تھی کہ آخر کار گڑبڑ ہو چکی ہے...... دونوں خواتین بہت محبت سے اماں سے ملیں بچیوں کو باری، باری گلے لگایا اور خوشگوار انداز میں رخصتی کا عمل انجام پزیر ہوا۔

نتیجہ وہی نکلا جو متوقع تھا۔ ان خواتین کو کھلی، کھلی رنگت والی دراز قد اور صحت مندی شازمہ زیادہ اچھی لگی تھی اور وہ اپنے بیٹے کے لیے شازمہ کا رشتہ مانگ رہی تھیں۔

''ہائے اللہ جس بات کا ڈر تھا وہی ہوا ناں......'' ساجدہ بیگم نے سینے پر ہاتھ مارا...... شازمہ نے سنا تو خواہ مخواہ اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ اب بھلا اس کا کیا قصور تھا کہ وہ پسند آ گئی، دیکھنے میں گل نین کے مقابلے میں اچھی تھی، صاف رنگت تھی سو نہ خواتین کا قصور تھا نہ اس کا اپنا ہر انسان خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔ پہلے گل نین اچھی لگی مگر جب شازمہ کو دیکھا تو خواتین کو گل نین کی بہ نسبت شازمہ زیادہ اچھی لگی سو انہوں نے اپنی خواہش ظاہر کر دی۔

''اندھی...... عقل کی ماری ہیں...... لو بھلا کیا کمی نظر آئی گل نین میں کہ ارادہ ہی بدل ڈالا منحوس ماریوں نے۔'' ساجدہ بیگم کا غصہ عروج پر تھا۔

''اماں...... کیوں واویلا مچا رہی ہو......؟ کیا قیامت آ گئی ہے آخر......'' گل نین بھی آ گئی تھی اور ساری باتیں سن چکی تھی۔

''ظاہر ہے شازمہ زیادہ اچھی ہے تو وہ پسند آ گئی۔ شازمہ کی بات طے کر دو۔'' وہ بولی۔

''پاگل ہو گئی ہے کیا......؟ پہلے ہی تمہارے ابا کے تعلق کی وجہ سے میں نے ازمہ کی بات تجھ سے پہلے طے کر دی اور اب...... شازمہ کی بھی کر دوں...... ہرگز نہیں......'' ساجدہ بیگم بھڑک کر بولیں۔

''ہاں پاگل ہو گئی ہوں...... نہیں کرنی مجھے شادی وادی...... اور نہ ہی آئندہ نمائش کے لیے آؤں گی کسی کے سامنے...... جیسی ہوں ٹھیک ہوں۔ اپنا کماتی ہوں، اپنا کھاتی ہوں، بوجھ نہیں بنوں گی کسی پر...... تم پر نہ ہی تمہارے اس لاڈلے ننھے سپوت پر...... رہ لوں گی اسی طرح بس...... مجھے اپنے کمرے کی حد تک محدود رہنے دو...... آئندہ مجھ سے شادی کی بات مت کرنا۔ شازمہ کی بات طے کر دو پھر...... کاظمہ کے لیے بھی رشتہ دیکھو...... آئی سمجھ......'' وہ واقعی پاگل ہو رہی تھی۔

''جب فوج تیار کر ہی دی ہے تو ان کو ٹھکانے لگانے کا بھی تو سوچو ناں......''

''بکواس ہی کرتی رہے گی...... ہمیشہ انگارے برستے ہیں تیرے منہ سے تو...... اول فول ہی بکنا ہمیشہ...... آئینے میں خود کو بھی دیکھ جا کر کبھی غور سے...... کیسی حالت بنا رکھی ہے اپنی کوئی لڑکیوں والی بات ہے تجھ میں۔ تئیس، چوبیس برس میں ہی چالیس سال کی عورت بن کر رہتی ہے تو آج کل کی لڑکیوں کو دیکھو کیسی بن ٹھن کر رہتی ہیں...... اپنے آپ پر پوری توجہ دیتی ہیں...... اپنے کھانے پینے کا، پہننے اوڑھنے کا، اپنی خوب صورتی کا پورا، پورا خیال رکھتی ہیں۔ تو، تو سر جھاڑ پھرتی ہے۔ بہنوں کو دیکھ کر ہی سبق حاصل کر لے کچھ بوڑھی روح پتا نہیں کیوں گھس گئی ہے تیرے اندر۔ نہ جانے کیوں ایسی ہے تو...... سب سے الگ...... سب سے جدا......''

''بس کرو اماں میرا منہ مت کھلواؤ اب۔'' ساجدہ بیگم کی بات درمیان سے کاٹ کر وہ بھی جواباً اسی لہجے میں بولی۔

''کیا...... کیا منہ نہ کھلواؤں تیرا...... ہاں کچھ باقی بھی رکھا ہے تو نے اپنے اندر...... جواب منہ کھول کر بکے گی تو...... دن رات تو تیری بکواس سن، سن کر دماغ خراب ہو گیا ہے میرا...... بوڑھی اور پختہ عمر کی عورتوں کی طرح ہر وقت تو بڑبڑ کرتی رہتی ہے۔'' ساجدہ بیگم بھی آج ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔

''ہاں، ہاں ہوں میں بوڑھی، بوڑھی روح ہے

میرے اندر...... نہیں ہوں میں عام لڑکیوں جیسی...... پر اماں، تم نے ہاں تم نے ہی مجھے کیا ہے بوڑھا...... وقت سے پہلے میرے ہاتھوں میں جھاڑو اور میلے کپڑے تھما کر...... میری گود میں ایک کے بعد ایک بہن ڈال کر۔ میں نے تو اپنا بچپن ہی جوانوں کی طرح گزارہ ہے اماں...... اور جب جوانی آئی تو...... تب تک میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔ مجھے کبھی بچی سمجھا ہے تم نے۔ میرے نازک، نازک ہاتھوں سے برتن دھلواتے وقت، راتوں کو اٹھ کر بہنوں اور بھائیوں کے دودھ کے فیڈر بناتے وقت...... تمہاری اس فوج کے لیے کھانا بناتے بناتے کتنی بار، کتنی بار میری نازک ہتھیلیاں جلی ہیں اماں...... کتنی بار پوچھا لگاتے، لگاتے میری کمزور سی کمر میں ٹیس اٹھی ہے۔ تمہاری ہر آنے والی بیٹی کے لیے تیاریاں کرتے، کرتے...... اپنے اسکول سے چھٹیاں کر کر کے تمہارے پیدا ہونے والے ان بچوں کو ممتا دی ہے میں نے...... اپنی نیندیں حرام کر کے ان لوگوں کے لیے جاگی ہوں میں...... اس وقت...... اس وقت تمہیں خیال نہیں آیا کہ میری یہ بیٹی تو ابھی خود بچی ہے...... اس کو بھی بچوں کی طرح جینا ہے...... جب بارہ سال کی عمر میں ماؤں جیسی ذمے داریاں ڈالو...... گی ناں تو...... بائیس سال میں بوڑھی روح تو بن ہی جانا تھا۔ بچپن جیسا اور نہ جوانی کی بے فکری میرے حصے میں آئی...... ہوش سنبھالا تو ابا کی جھکی کمر اور تمہارا واویلا دیکھا۔ بیٹیوں کا بوجھ اور شادیوں کی فکر ہی دیکھی...... ابا کی موت نے مجھے مزید بوڑھا کر دیا ہے۔ اب تو کوئی خواہش ہے نہ کوئی جذبے میرے اندر پلتے ہیں...... نہ ہی اپنے مستقبل کے حوالے سے کوئی اچھے خواب میں نے اپنی آنکھوں میں سجا کر رکھے ہیں...... مجھے پتا ہے مجھے جینا ہے تو اسی جہنم میں اور مر کر نکلنا ہے تو بھی اسی جہنم سے...... اس لیے آئندہ میرے لیے سوچنا بند کر دو اللہ کے واسطے میں جیسی ہوں جس حال میں ہوں مجھے جینے دو......" ساجدہ بیگم کے چودہ طبق روشن کر کے لفظ، لفظ سچائی زہر کی صورت ان کے کانوں میں انڈیل کر وہ دھم، دھم کرتی سیڑھیاں پھلانگ کر اپنی پناہ گاہ کی جانب بڑھ گئی۔

ساجدہ بیگم آنکھیں پھاڑے منہ کھولے اس کی زبان سے نکلا، نکلا ایک، ایک لفظ اپنے سینے پر لگے نشتر کی طرح محسوس کر رہی تھیں...... وہ کیا، کیا کہہ گئی تھی...... شاید...... شاید اس کی باتوں میں سو فیصد سچائی تھی بیٹے کی خواہش اور آرزو میں بیٹیاں پیدا کرتے، کرتے بے دھیانی میں انہوں نے واقعی گل نین پر وقت سے پہلے اور عمر سے زیادہ بوجھ ڈال دیا تھا اور ایسے میں انہیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ چھوٹی سی بچی اپنی شناخت کھو رہی ہے۔ وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہو رہی ہے...... کچھ سمجھ نہ آیا تو ساجدہ بیگم اپنا سر پکڑ کر رونے بیٹھ گئیں۔ آج گل نین کی باتیں سیدھی ان کے دل پر جا کر لگی تھیں مگر...... اب کیا ہو سکتا تھا...... وقت تو گزر گیا تھا۔ حالات اپنی نہج پر آج بھی اسی طرح سے چل رہے تھے۔ آنے والے رشتے کو شازمہ کے لیے پسند کیا گیا...... ان کو شادی کی ابھی جلدی نہ تھی اس لیے بس صرف بات چیت طے کر دی گئی۔ گل نین نے نارمل انداز میں رسم میں حصہ لیا۔ اسے بہنوں سے کوئی بغض نہ تھا۔

☆☆☆

کچھ دنوں سے گھر میں امن ہی تھا۔ گل نین اور ساجدہ بیگم میں بھی کوئی گھمسان نہیں ہوئی تھی۔ معاملات اچھے نہ سہی تو برے بھی نہیں تھے۔ سب اپنی، اپنی جگہ اپنے حصے کے کام انجام دے رہے تھے۔ اس روز گل نین اسکول سے واپس آئی کھانا وغیرہ کھا کر اپنے کمرے میں سونے کے لیے گئی تو پتا چلا کہ کمرے کا پنکھا خراب ہو گیا ہے۔ آج تو حبس بھی تھا کچھ دیر تو وہ دروازے کے قریب پلنگ کھسکا کر لیٹی رہی مگر گرمی نے تنگ کیا تو مجبوراً نیچے سونے کے لیے آنا پڑا سہ پہر سے ہی ٹیوشن کے بچے آنا شروع ہو جاتے اس لیے نیچے کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ سوئی تو وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ ان تین گھنٹوں کے دوران اچانک حمود بھی آ گیا ساجدہ بیگم کو حیرت بھی ہوئی

کہ وہ اچانک کیسے آگیا۔ تب اس نے بتایا کہ ابا نے ہدایت کی تھی کہ آپ کے پاس آؤں...... کچھ دن کا کام ہے کراچی میں زندگی میں پہلی بار نہ جانے کس دل سے بتول آرا نے بھتیجیوں کے لیے کپڑے، دیورانی کے لیے کچھ چیزیں تحفتاً بھیجی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ساجدہ بیگم نے مارے محبت اور مروت کے کھلے دل سے بھتیجے کو رہائش کی آفر کی پیشکش کردی حالانکہ اس وقت شازمہ نے اشارتاً منع بھی کیا کہ جگہ کی تنگی کا احساس بھی دلایا مگر...... ساجدہ بیگم کا دل نہ جانے کیوں اتنا نرم پڑ گیا۔ اخلاقاً حمود نے منع بھی کیا مگر پھر ہامی بھرلی اور کچھ کام نپٹانے واپس چلا گیا۔ اس وقت تک تو گھر میں سکون تھا، امن تھا...... کوئی دکھائی بھی نہیں دیا۔ سوائے شازمہ اور اماں کے لیکن......

''ارسل سے کہہ دینا کہ شام کو کسی کو بلوا کر میرے کمرے کا پنکھا ٹھیک کروادے۔'' دوپہر کو سونے سے پہلے اماں کو وہ کہہ کر گئی تھی مگر تین ساڑھے تین گھنٹے کی پکی نیند پوری کر کے جب وہ باہر نکلی تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ گو کہ پچھلے کچھ دنوں سے شاید بتول آرا سے اماں کی بات ہوئی تھی مگر محبت اور مروت کا یہ ابال دیکھ کر گل نین آپے سے باہر ہوگئی تھی ایک تو ویسے بھی اسے تایا، تائی بالکل پسند نہیں تھے۔ اوپر سے تائی اماں کی باتیں سونے پر سہاگا ثابت ہوئی تھیں اور اب ان کے فرزند ارجمند کو اماں پلکوں پر بٹھانے کو تیار تھیں۔

''بٹھائیں پلکوں پر بٹھائیں...... سر پر چڑھائیں مگر...... میرے کمرے میں مجھے بے دخل کر کے آؤ بھگت کرنا کہاں کی شرافت ہے۔''

اس بات کا اندازہ تو سب کو ہی تھا کہ گل نین اماں کی اس حرکت پر خوب ہنگامہ کھڑا کرے گی اور یہ اس کا حق تھا۔ کسی ناپسندیدہ ہستی سے متعلق کسی چیز کو اگر آپ کے سامنے فوقیت دی جائے تو یقیناً آپ آپے سے باہر ہوں گے...... یہی حال گل نین کا تھا۔

حالات کا اندازہ تو حمود کو بھی تھا وہ اتنا چھوٹا بچہ نہیں تھا جب وہ لوگ یہاں سے گئے تھے۔ پھر عرصہ دراز تک بات چیت نہ ہونا یا پھر ابا اور چاچا جی کی آپس میں بات ہو جانا...... اس بات کی دلیل تھی کہ خواتین کے تعلقات کشیدہ ہیں مگر پھر بھی اماں اور ابا کی تاکید اور خاص ہدایات پر اسے مجبوراً اس گھر میں آنا پڑا۔ اسے یہاں آکر عجیب سا لگا تھا...... جو بھی تھے، جیسے بھی تھے ان لوگوں سے اس کا خون کا رشتہ تھا۔ رشتے تو اللہ پاک بناتا ہے۔ کوئی شخص بھی اپنی مرضی اور خواہش سے کسی کے گھر پیدا نہیں ہوتا...... اور کہتے ہیں خون اپنا جوش ضرور دکھاتا ہے۔ بے شک وقتی طور پر حالات جیسے بھی ہو جائیں آپس میں نااتفاقی اور جھگڑے، فساد بھی ہو جائیں لیکن...... کبھی، کبھی ساری رنجشیں دور بھی ہو جاتی ہیں۔ خون جوش مارتا ہے۔ حمود کو بھی ان لوگوں پر ترس آرہا تھا مرد کے نام پر ان کے گھر بارہ سال کا بچہ تھا جبکہ لڑکیوں کی زیادتی تھی۔ اس میں بھی گل نین کے حوالے سے پہلا تاثر ہی کافی تلخ تھا...... اتنی روڈ لڑکی...... حمود ایک لمحے کو گڑبڑا گیا تھا...... اسے لگا یہاں آکر اس نے غلطی کردی ہے۔ شدید بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا مگر ساتھ ہی چچی اور دوسری کزنز کی شرمندگی دیکھ کر وہ برداشت کر گیا۔ رات گئے تک گل نین کی تن فن اور بڑبڑاہٹ جاری رہی...... رات کا کھانا کھا کر عشا کی نماز پڑھ کر سب لوگ لیٹ گئے تھے۔ مارے کوفت کے گل نین کو نیند نہیں آرہی تھی۔ اوپر سے حمود کی پرسنالٹی بھی خاصی اٹریکٹو تھی...... شاید رات کے ساڑھے بارہ بج رہے ہوں گے جب دروازے پر دستک ہوئی، تھوڑی دیر تک تو گل نین انجان بنی رہی کہ شاید اماں جاگ جائیں...... اس وقت یقیناً حمود ہی آیا ہوگا...... لیکن جب کوئی بھی ٹس سے مس نہیں ہوا تو مجبوراً گل نین کو اٹھنا پڑا۔

''ہم نے گھر میں چوکیدار نہیں رکھ چھوڑے ہیں محترم! صبح سب کو جلدی اٹھنا ہوتا ہے۔ اگر یہاں رہنا ہے تو رات گیارہ بجے سے پہلے گھر آنا ہوگا...... کوئی نوکر نہیں بیٹھا ہے آپ کا۔'' دروازہ کھولتے ہی سلام نہ دعا بلکہ جلے بھنے لہجے میں ناگواری سے وارننگ دی۔ حمود سٹ پٹا گیا۔

"آئی ایم سوری محترمہ..... آج دیر ہوگئی کل سے خیال رکھوں گا میں نے چاچی سے چابی کا کہا تھا مگر....."

"نہیں، ہم گھر کی چابی ہر کسی کو نہیں دیتے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ محتاط رہیں..... اور خود خیال رکھیں۔"

سردمہری عروج پر تھی۔ حمود کو ہنسی آگئی۔

"ہر کسی کو چابی نہیں دیتے گھر میں رہنے کے لیے کرائے دیتے ہیں کمال لوگ ہیں۔" حمود نے وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے بڑی گہری بات کہہ دی تھی۔ ساتھ ہی بنا رکے وہ سیدھا سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ گل نین منہ کھولے اسے جاتا دیکھ رہی تھی منہ سے کچھ کہہ نہ سکی، اسے اماں پر غصہ آرہا تھا خواہ مخواہ یہ طوطا پال لیا تھا۔

"ڈھیٹ انسان....." بڑبڑاتے ہوئے وہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ حمود کو آئے چار پانچ روز ہوچکے تھے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتا، نیچے بھی نہیں آتا کھانا بھی کم گھر میں ہی کھاتا۔ ہاں ناشتا کرلیتا تھا۔ پھر سارا دن اپنے کام کے سلسلے میں مصروف رہتا۔

اس روز اتوار کا دن تھا آج سب ہی گھر پر تھے اس لیے صبح ہی دیر سے ہوئی تھی۔ کاظمہ اور ارسل کی فرمائش پر گل نین نے آج ناشتے میں آلو کے پراٹھے بنائے تھے۔ چھوٹی بہنوں نے ساتھ میں لہسن، لال مرچ کی چٹنی، رائتہ اور پودینے کی چٹنی بھی بنالی۔ جب ناشتا تیار ہوگیا اور دسترخوان لگا تو ساجدہ بیگم نے ایک پلیٹ میں دو پراٹھے ساتھ چٹنی اور رائتہ ڈال کر اس پر دوسری پلیٹ ڈھانپ کر ارسل کی جانب بڑھائی۔

"ارسل بیٹا دیکھو اوپر حمود جاگ گیا ہے اسے یہ دے آؤ ناشتا کرلے گا۔"

"اماں..... پراٹھے کم نہ پڑجائیں۔" ازمہ نے گل نین کی طرف چور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کم تو خیر نہیں پڑیں گے میں نے زیادہ ہی بنائے ہیں مگر اماں، ہفتہ بھر ہونے والا ہے۔ یہ محترم کب واپس جائیں گے؟ دو چار دن کا سنا تھا مگر وہ تو جانے کا نام ہی نہیں لے رہے..... مزے لگ گئے ہیں گھر کے آرام کے..... ویسے بھی سچ تو یہ ہے کہ اماں کہ اس طرح غیر محرم کو گھر میں رکھنا کسی طور بھی صحیح نہیں ہے۔" گل نین کی دل کی بات زبان پر آگئی تھی۔

"اے ہے.....! مجھے دینی علوم مت پڑھاؤ..... اتنا تو مجھے بھی پتا ہے..... لوگ کرائے دار نہیں رکھتے کیا.....؟ کیا سارے محرم، رشتے دار، کرائے دار بن کر آتے ہیں..... وہ کون سا چوبیسوں گھنٹے تیرے یا میرے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ مٹرگشت کرتا ہے..... وہ تو خود ہی جب سے آیا ہے ایک بار بھی نیچے نہیں اترا غیر ضروری..... سیدھا اوپر چلا جاتا ہے۔ مجھے سلام کرنے کے علاوہ کوئی بات نہیں کرتا..... پھر وہ رشتے دار ہے ہمارا کوئی غیر آدمی نہیں ہے..... وہ تو کھانا، چائے تک نہیں لیتا یہاں سے۔ بس سرچھپانے کو جگہ ہی دی ہے اسے....." ساجدہ بیگم نے مفصل انداز میں گل نین کی خبر لی۔

"کچھ بھی سہی مگر اس سے کہو کہ اب رستہ ناپ لے۔" گل نین کہاں چپ ہونے والی تھی۔

"اماں! حمود بھائی کہہ رہے ہیں کہ وہ بازار جارہے ہیں تو میں بھی ساتھ چلوں ناشتے کے بعد..... چلا جاؤں کیا.....؟" ارسل جو پراٹھے دے کر واپس آیا تو ناشتا کرتی اماں کو مخاطب کیا۔

"ہاں ہاں چلے جانا....." ساجدہ بیگم نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا وہ خوش ہوگیا..... ارسل بازار سے واپس لوٹا تو اس کے پاس الگ شاپرز تھے۔

"اماں! دیکھیں یہ حمود بھائی نے مجھے کپڑے اور جوتے خرید کر دیے ہیں، بہت منع کیا میں نے مگر زبردستی یہ کہہ کر دلائے کہ میں تمہارا بڑا بھائی ہوں یار تم اپنی آپا سے بھی تو چیزیں لیتے ہو ناں....." ارسل خوشی، خوشی چیزیں دکھا رہا تھا۔

"ارے بھئی! حمود، کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی؟" ساجدہ بیگم کی نظر اوپر جاتے حمود پر پڑی تو ملائمت سے بولیں۔

"چاچی شرمندہ تو نہ کریں ہم نے کیا ہی کیا ہے آپ لوگوں کے لیے..... ارسل میرا بھائی ہے۔ مجھے اچھا لگا اس کو یہ چیزیں دلاتے ہوئے۔ یہ کوئی اتنی بڑی

بات نہیں چاچی......'' واپس نیچے اترتے ہوئے حمود نے سعادت مندی سے سر جھکا کر کہا، اس وقت چاروں لڑکیاں اندر کمرے میں تھیں۔ برآمدے میں ساجدہ بیگم اکیلی ہی تھیں، ساجدہ بیگم نے بغور اسے دیکھا اس کے چہرے پر خلوص نمایاں تھا...... ہمدردی کے آثار نمایاں تھے۔

''اے کاش! کاش بھابی، حمود کے لیے گل نین کا رشتہ مانگ لیں......'' نہ جانے کیوں عجیب اور ناممکن سی خواہش ان کے دل میں ابھری تھی مگر...... وہ خود ہی اپنی سوچ پر مسکرانے لگیں...... بھلا یوں آنکھوں دیکھے مکھی کون نگل سکتا ہے...... بتول آرا تو خود دو دن رہ کر گل نین کو دیکھ کر گئی تھیں کیسی نک چڑھی اور آدم بیزار لڑکی ہے۔

''اچھا چاچی میں چلوں، ذرا ایک دو کام نمٹانے ہیں۔'' حمود کی آواز پر ساجدہ بیگم اپنے بے تکے خیالات سے چونکی تھیں۔

یونہی دس دن گزر گئے...... گل نین اسکول سے واپس آئی تو پتا چلا کہ ابھی تک موصوف موجود ہیں اسے بے تحاشا غصہ آ گیا۔ اسے یہ خبر ہی نہیں تھی کہ حمود جانے کی تیاری کر رہا ہے اور آج شام کو ہی واپس جا رہا تھا...... یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ آج گھر پر ہی ہے۔

ساجدہ بیگم ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر جائے نماز تہ کر رہی تھیں کہ وہ دندناتی ہوئی سر پر پہنچ گئی۔

''اماں......! میں پوچھتی ہوں آپ ان سے پوچھتی کیوں نہیں کہ کب واپس جا رہے ہیں وہ...... اگر آپ کو شرم آ رہی ہے تو میں خود پوچھ لیتی ہوں شام کو آنے دو ذرا۔ یہ کون سا طریقہ ہے...... کسی کے گھر آ کر یوں جم جانا......''

''چپ کر ایسے نہیں کہتے مہمان ہے وہ عمر بھر کے لیے نہیں آیا چلا جائے گا...... پڑوس سے نہیں آیا، دوسرے شہر سے آیا ہے جانے میں وقت لگتا ہے۔'' ساجدہ بیگم نے دھیمی آواز میں کہا۔

''اماں! مہمان، مہمان ہی بن کر آتے اور چلے جاتے ہیں...... یوں وبالِ جان نہیں بنتے میں پوچھتی ہوں آخر کس رشتے سے وہ دھرنا دے کر بیٹھے ہیں...... ابا کے مرنے کے بعد کیا رشتہ ہے ہمارا...... اور ابا کی زندگی میں کون سا گھاس ڈالی ہے ہمیں۔ اماں میں سب سمجھتی ہوں یہ چالاکیاں تم تو بھولی ہو، چار چیزیں کیا ملیں ان لوگوں کے سارے عیب چیزوں کے نیچے دفن کر دیے تم نے...... کوئی برائی، برائی رہی اور نہ ہی کوئی شکایت باقی رہی۔ یہ جو چند چیزیں تحفے کے نام پر ہم پر پھینکی جا رہی ہیں ناں یہ گھنٹی ہے، خطرہ ہے، اس بات کا جس کا احساس تم نے ہمیشہ دلایا ہے...... جو ہماری تائی اماں نے بھی شال میں لپیٹ کر ہمارے منہ پر دے مارا تھا۔ دیکھ لینا...... کل کو آ جائیں گے وہ لوگ گھر میں حصہ مانگنے...... میں تو کہتی ہوں ان لوگوں سے دشمنی ہی بھلی تھی ہم جیسے جی رہے تھے ٹھیک تھے...... جب سے تمہاری مہربانی بڑھی ہے۔ تب سے مجھے گڑبڑ نظر آنے لگی ہے...... آج کل کے حالات تم کو

بیادِ معراج رسول

دیکھتے ہی دیکھتے معراج رسول صاحب کی برسی کا دن آن پہنچا۔ ابھی تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا مگر میں یہ بات یہاں ضرور کہوں گی کہ جس طرح ان کی اہلیہ اور شریک کار محترمہ عذرا رسول نے ادارے کو سنبھالا، چاروں ڈائجسٹوں کی ذمے داری اٹھائی اور سب بہنوں سے، لکھنے والیوں سے رابطے میں رہیں وہ قابلِ ذکر ہے۔ ان شاء اللہ یہ ادارہ معراج صاحب کے زمانے جیسا ہی چلتا رہے گا اگرچہ بہت سے مصنفین بھی اللہ کو پیارے ہو گئے مگر پھر بھی نئے لکھنے والے سامنے آ رہے ہیں اور ان رسالوں کے ذریعے دور دراز کے علاقوں کے لوگوں سے بھی تعارف ہوتا ہے اور بہت اچھی اچھی باتیں، کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ہماری دعائیں آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔ اللہ پاک معراج رسول کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور گھر والوں کو دلی صبر دے۔ الٰہی آمین!

از: سعیدہ بانو......کوہ مری

کیا پتا گھر میں بیٹھنے والی ہو تم...... میں کہتی ہوں فوراً چلتا کرواسے یہاں سے...... ہمارے پاس اس گھر کے سوا کوئی قارون کا خزانہ نہیں اگر یہ بھی نہ رہا ٹکڑے، ٹکڑے ہو گیا تو......"

"بس کرو...... ایک لفظ بھی آگے منہ سے نکالا تو گدی سے زبان کھینچ لوں گا تمہاری......" جملہ ادھورا چھوڑ کر حیرت اور غیر یقینی انداز میں گل نین بھاری اور کرخت آواز کی سمت پلٹی...... عین سامنے حمود کھڑا تھا غیظ وغضب میں بھرا ہوا...... غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا۔

"گل نین! تمہارے بارے میں سن تو رکھا تھا...... تمہاری کڑواہٹ کو محسوس بھی کرتا رہا...... مگر...... تم اتنی تلخ ہو، اس قدر زہر بھرا ہوا ہے تمہارے روم، روم میں...... مجھے اندازہ نہیں تھا۔ تمہاری رگوں میں تو خون کی جگہ زہر ہے اتنی تلخی، اتنی غلط فہمیاں، اتنی کدورت، اتنی نفرت، اتنی گھٹیا سوچ...... اُف، تم اتنی سی عمر میں کس قدر سخت ہو۔ کسی کے بارے میں اتنی منفی باتیں، اتنے خدشات اپنے اندر پال رکھے ہیں تم نے۔ ہر کسی کو اپنی نظر سے دیکھتی ہو، اپنی سوچ کے انداز سے پرکھتی ہو تم...... ارے جانتا ہوں کہ بچپن سے محروم رہی ہو...... تمہیں خاص توجہ نہیں ملی مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکو۔ کس سے ناراض رہتی ہو تم...... اپنے گھر والوں سے......؟ اپنی ماں سے......؟ بھلا کس وجہ سے؟ اپنی شخصیت کی نفی تو تم خود کر رہی ہو گل نین...... تم کوئی انوکھی لڑکی نہیں ہو جس پر بچپن میں گھر کی کچھ ذمے داریاں ڈالی گئی ہیں، ہمارے معاشرے میں بے شمار ننھی، ننھی بچیاں گھر داری کرتی ہیں مگر ہر کوئی اتنا کڑوا نہیں ہو جاتا۔ میں نے کئی بار یہ جملہ سنا ہے کہ کیا رشتہ ہے تمہارا ہمارا...... تو میں بتا دوں ہمارا خون کا رشتہ ہے، بے شک ہمارے بڑوں کی کچھ غلطی تھی کہ ہم ساتھ، ساتھ نہیں رہ سکے مگر جو رشتہ وقتی طور پر ختم ہو چکا تھا میں اس رشتے کو جوڑنے کے لیے آیا تھا۔ سچ کہوں تو مجھے یہاں پر کوئی کام نہیں تھا...... کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میری اماں اور ابا جب سے گئے بس تم لوگوں کی باتیں کرتے رہے، میں وہی ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے آیا تھا۔ میں رشتوں کے بیچ دراڑ کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ میں تو صدقِ دل سے پورے ایمان کے ساتھ صرف اور صرف محبت کا پیغام دینا چاہتا تھا مگر میں پاگل تھا اور شاید مجھ سے زیادہ پاگل میرے بوڑھے ماں، باپ اور ان سے بھی زیادہ پاگل تمہاری ماں، ہم سب کو تمہاری نفرت نے مار ڈالا ہے گل نین...... ہماری خواہشات مر چکی ہیں کیونکہ تم ایک ضدی، بدتمیز اور کٹھور لڑکی ہو، اپنی ذات کے خول میں قید رہنے والی۔ تمہیں کسی کے جذبات کا احساس ہی نہیں...... بہت دکھ اور افسوس ہو رہا ہے مجھے تمہاری گھٹیا سوچ پر۔ ہمیں گھر کا حصہ چاہیے اور نہ ہی مجھے غیر ضروری ایلفی لگا کر یہاں جمنے کی تمنا ہے۔ میں آج ہی واپس جا رہا ہوں...... اس گھر سے بھی اور تم لوگوں کی پُرسکون دنیا سے بھی۔ جیو اپنی زندگی تم...... مجھے امید تھی کہ میں تمہیں ضرور بدل دوں گا، تمہیں اپنانا چاہتا تھا میں، میں تمہارا ساتھ چاہتا تھا گل نین مجھے امید تھی کہ میں اپنے پیار سے، اپنے رویے سے تمہیں جیت لوں گا کیونکہ مجھے روپے، پیسے، حسن اور خوب صورتی کی لالچ نہیں تھی۔ میرے دل میں محبت تھی، خلوص تھا، اپنے والدین کی خواہش میرے لیے مقدم تھی مگر...... افسوس...... شدید افسوس کہ میں غلطی پر تھا۔" وہ ہانپ گیا تھا۔ اب اس کا رخ ساجدہ بیگم کی طرف تھا۔

"چاچی آئی ایم سوری...... شاید میں زیادہ کہہ گیا۔ اللہ حافظ...... دو گھنٹے بعد میں نکل جاؤں گا......"

وہ سانس لینے کو ایک لمحے کے لیے رکا ایک نظر ساجدہ بیگم پر ڈالی اور تیز، تیز سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا......

گل نین کی حالت دیکھنے والی تھی...... وہ سکتے جیسی کیفیت میں تھی، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ حمود اتنا کچھ کہہ گیا...... کیا کہہ گیا تھا وہ ساجدہ بیگم ہونق بنی بیٹھی تھیں...... تینوں لڑکیاں اور ارسل بھی دم سادھے چپ کھڑے تھے، ہر شخص اپنی جگہ ساکت تھا۔ یہ سب کچھ اتنا غیر یقینی تھا سب کے دماغ ماؤف ہو رہے تھے......

گل نین کو لگ رہا تھا کہ اس کے کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ حمود کا غصہ، جاہ وجلال اور اس کے الفاظ، جذباتی لہجہ، کرخت آواز اس کی سماعتوں میں ابھی تک گونج رہی تھی۔ کیسی کھری، کھری سنا گیا تھا وہ.... بظاہر خاموش اور چپ چاپ رہنے والا بندہ اتنی گہرائی سے اس کے بارے میں سوچتا ہے...... تمام تر بدتمیزیوں کے باوجود اسے اپنانا چاہتا ہے...... یہ کیسا جذبہ تھا......؟ کون سا رشتہ تھا......؟ شاید...... خلوص، ہمدردی اور خون کے رشتے کا عمل دخل تھا...... یا پھر...... اللہ کی طرف سے کوئی ہدایت......؟

''یا اللہ......!'' دماغ تھا کہ پھٹنے لگا تھا...... کچھ سمجھ نہیں آیا تو دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر اندر کمرے کی جانب بھاگی نہ جانے کیوں...... پلنگ پر گر پڑی اور پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

''اماں...... اماں دیکھو تو آپا کتنا رو رہی ہیں......''

جب کچھ دیر گل نین مسلسل روتی رہی تو ازمہ نے روتے ہوئے آکر ماں سے کہا...... ساجدہ خود بھی رو رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں آج بے تحاشا رونا آرہا تھا۔ ازمہ کی آواز پر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ساجدہ بیگم کی کل کائنات یہی بچے ہی تو تھے۔ جانے انجانے میں دلوں میں دوریاں پیدا ہوئی تھیں غلط فہمیوں نے دل میں جگہ بنالی، ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھ کر کبھی بھی ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ گل نین کو ہمیشہ ماں سے شکایت ہی رہی، ماں سے شاکی، رہ، رہ کر اس کے اندر تلخی بھر گئی۔ اسے ہر بات میں منفی پہلو ہی نظر آتا۔ اماں، خود غرض اور...... بے پروا نظر آتیں۔ اسی احساسِ کمتری نے اسے سب سے الگ تھلگ کر دیا تھا۔ اوپر سے تینوں بہنوں کے مقابلے میں وہ صورت شکل کے لحاظ سے بھی تھوڑی کم تھی۔ سو سارا کچھ مل ملا کے گل نین کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر گیا تھا۔ یوں آپس میں فاصلے بڑھتے چلے گئے۔ یہ کام تو ساجدہ بیگم کا تھا کہ بڑھتے ہوئے فاصلوں کو ختم کرتیں لیکن جہاں گل نین ماں کو قصوروار سمجھتی، خود کو مظلوم سمجھتی وہیں ساجدہ بیگم اسے بدزبان، بدتمیز اور خودسر سمجھ کر ہمیشہ ہی اسے یہ احساس دلاتیں کہ تمیز ہے اور نہ ہی شرم کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ کیسی باتیں کرتی ہے۔ گل نین کو عدم تحفظ کا احساس ہوتا۔ اسے لگتا اس کا کوئی ہمدرد نہیں یہاں تک کہ سگی ماں نے بھی اسے صرف استعمال کیا ہے۔ بچپن سے آج تک وہ صرف اور صرف ضرورتیں پوری کرتی چلی آئی ہے۔

جب گھر کے بڑوں میں سرد جنگ تواتر سے جاری رہے آپس میں نہ ختم ہونے والے فاصلے بڑھتے ہی چلے جائیں تو قدرتی طور پر چھوٹے ڈرے سہمے اور محتاط ہو جاتے ہیں۔ اپنی مرضی سے زیادہ اپنے بڑوں کے موڈ پر انحصار کرتے ہیں، ہر وقت کے جھگڑوں اور جلے بازیوں سے وہ خود ذہنی اذیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے یہی حال اس گھرانے کا تھا۔ پہلے گل نین اور اب حمود کی باتوں سے ساجدہ بیگم کی آنکھ کھلی تو احساس ہوا کہ انہوں نے اس کے لیے تو کبھی ماؤں والا کردار ادا ہی نہیں کیا تھا، اپنا محاسبہ کیا تو اپنے اندر ہی خامی نظر آئی، انہوں نے گل نین کو کبھی سینے سے لگا کر کوئی دعا نہیں دی تھی ہمیشہ گھر کا تھا، اسے اپنے پاس بٹھا کر اس کی پسند ناپسند یا مرضی کے حوالے سے کوئی میٹھی بات نہیں کی کبھی اس سے اس کے بارے میں، اس کی مصروفیت کے حوالے سے کوئی بات، کوئی سوال نہ کیا...... کیا...... غلطی صرف گل نین کی تھی......؟ نہیں......'' ساجدہ بیگم خیالات سے چونکیں آنسو متواتر جاری تھے وہ تیزی سے اٹھیں اور...... کمرے کی جانب بھاگیں، کمرے میں شازمہ اور کاظمہ کونے میں کھڑی رو رہی تھیں، ارسل بیچارہ سہا ہوا ایک طرف بیٹھا تھا۔

''میری بیٹی! میری جان......!'' ساجدہ بیگم نے آگے بڑھ کر گل نین کو پکڑ کر اٹھایا اور اسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا...... اس اچانک حملے سے وہ حیرت زدہ تھی۔

''مجھے معاف کردے میری بچی، مجھے معاف کردے...... میں ذمے دار ہوں میں نے ساری زندگی

تجھے سمجھنے کی، تجھے جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ شاید میں نے اچھی ماں ہونے کا فرض ہی نہیں نبھایا...... تیرے مزاج میں کڑواہٹ، میرے رویے کی وجہ سے بھری۔ تیرے دل میں کیا ہے، میں نے یہ بھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ مجھے اچھی ماں بننا نہیں آیا بیٹا...... جب "ماں" ہی اچھی نہ ہو تو بھلا بیٹی اس سے کیا سیکھے گی؟ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی میری بچی تیرے اندر جتنا بھی زہر بھرا ہے اس کے پیچھے میرا ہی رویہ ہے۔ مجھے معاف کردے میری بچی......" ساجدہ بیگم روتے ہوئے مسلسل بولے جارہی تھیں۔ ساتھ ہی اسے سینے سے لگا کر اس کے سر پر پیار کررہی تھیں، ان کا لہجہ بکھرا ہوا تھا۔ ندامت اور پچھتاوے کے سوا ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

گل نین پہلے تو حیرت سے ماں کو دیکھتی رہی پھر وہ بھی اماں سے لپٹ گئی۔

"نہیں اماں......! ایسا مت کہو، مجھ سے معافی مانگ کر مجھے اپنی نظروں میں مزید مت گراؤ۔ میں پہلے ہی بہت گناہ گار ہوں...... نہ جانے کیا، کیا اول فول بکتی رہی۔ تمہارے ساتھ کتنی بدزبانی کی، کتنی بدتمیزیاں کیں...... ہمیشہ خود کو مظلوم جانا کبھی تمہارے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی کبھی تمہارا دکھ، تمہارے مسائل سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ تم سے، اپنی بہنوں اور بھائی سے ہمیشہ کھنچی کھنچی رہی ہمیشہ خود کو الگ اور بڑا ہی سمجھا۔ بھی بہنوں کے مسائل نہیں بانٹے، بھی چھوٹے بھائی سے پیار و محبت سے بات نہیں کی۔ اماں، میں بہت بری ہوں...... معافی تو مجھے مانگنی چاہیے...... تم سے، بہنوں سے، اپنے منے بھائی سے، تم سب، تم سب لوگ مجھے معاف کردو...... میں بہت بری ہوں۔" وہ بولتی جاتی روتی جاتی تھی۔

"اماں میں کتنی نادان، کتنی بیوقوف، عاقبت نا اندیش تھی خود ہی اپنے اوپر خوشیوں کے محبت اور رشتوں کے دروازے بند کرتی رہی، اماں! میں بہت بری ہوں...... بہت ہی بری...... مجھے معاف کردو، پیاری اماں، معاف کردو...... تم سب مجھے معاف کردو......" وہ ہذیانی انداز میں ہاتھ جوڑے بے تحاشا روتے ہوئے ایک، ایک کی جانب دیکھ رہی تھی، بلک رہی تھی...... آگہی کے دروازے جو کھلے تو کھلتے ہی چلے گئے۔

"آپا، آپا...... بس کرو آپا...... ہم سب نے تمہیں معاف کردیا تم بری نہیں ہو...... بس تمہیں غلط فہمیاں تھیں۔ تم خود سے ناراض تھیں آپا...... اب...... سب ٹھیک ہوگیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے آپا...... اللہ پاک نے سب کچھ اچھا، اچھا کردیا ہے۔" ازمہ، شازمہ، کاظمہ اور ارسل روتے ہوئے چاروں جانب سے آکر اس سے لپٹ گئے۔ ساجدہ بیگم نے سب کو اپنی بانہوں میں بھرلیا۔ نفرتوں کے بادل چھٹ گئے، محبتوں نے دروازے پر دستک دے ڈالی تھی۔ دلوں کی کدورتیں ہوا ہوگئی تھیں، لگتا تھا جیسے ہر شخص کا نیا جنم ہوا ہے۔ محبت، پیار اور خلوص کی مٹی سے گندھا ہوا۔ ایک دوسرے کے لیے محبتیں لٹاتا ہوا۔ شازمہ جلدی سے لیموں کا شربت بنالائی...... رو، رو کر سب ہی ہلکان ہورہے تھے۔ تب گل نین کو حمود کا خیال آیا...... جوس کا خالی گلاس میز پر رکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سبج، سبج کر سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے گل نین کا دل عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ حمود سے معافی مانگنی تھی، وہ جانے ہی والا تھا ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے...... گل نین یہی سوچ کر اوپر آئی تھی۔

"اوہو......! زہے نصیب......" آخری سیڑھی پر تھی کہ کمرے کے دروازے پر کھڑے حمود کی نگاہ اس کی طرف اٹھی، بے ساختہ طنزیہ جملہ منہ سے نکلا وہ سنی ان سنی کرکے آگے بڑھی۔

"جی محترمہ کیا اب بھی آپ کے ترکش میں کوئی زہر میں ڈوبا ہوا تیر باقی بچا ہے جو آخری وار کرنے تشریف لائی ہیں۔" لہجہ ویسا ہی طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔

"جس زبان سے زہر میں ڈوبے ہوئے الفاظ نکلتے تھے۔ آج وہ زبان اتنی چپ ہے یہ کس طوفان کی آمد کے آثار ہیں بھئی تسلی رکھیں، میں جارہا ہوں اپنا

مشکوک وجود لے کر یہاں سے...... معافی چاہتا ہوں کہ آپ کی زندگی میں آکر اتنا طوفان مچا دیا میں نے کہ اب تو اپنے آپ سے بھی نفرت ہوگئی ہے کہ میں واقعی اتنا گھٹیا انسان ہوں، میری تربیت اتنی خراب اور گھٹیا ہے کہ لوگ میرے خلوص کو، میری نیک نیتی اور میری محبت کو الٹے سیدھے خیالات اور گھٹیا انداز سے تول کر میرے اوپر تہمتیں لگائیں...... میری نیت پر شک کریں۔" کچھ لمحے چپ ہو کر وہ پھر بولا۔

"بہت ہی برا اور یادگار تجربہ رہا میرا...... بہت اذیت ناک یادیں لے کر جارہا ہوں میں۔ محترمہ آپ کی بہت عنایت کہ اتنے سارے تحفے سمیت مجھے یہاں سے روانہ کر رہی ہیں۔ ہمیشہ، ہمیشہ یاد رکھوں گا میں آپ کی اس مہربانی کو......" ایک بار پھر حمود بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ چپ چاپ اور ساکت، حمود نے ایک لمحے کو رک کر اسے بغور دیکھا ٹپ، ٹپ بے شمار آنسو تواتر سے گرتے ہوئے نیچے فرش تک آرہے تھے۔

"حمود! خدا کے لیے...... بس بھی کردیں مانا کہ میں بہت بری ہوں...... بہت چھوٹی سوچ ہے میری، میں نے آپ کے حوالے سے بہت غلط باتیں کیں مگر...... پلیز ایک بار میری جگہ خود کو رکھ کر سوچیں، ٹھنڈے دل سے اس دس، گیارہ اور بارہ سال کی معصوم بچی کے بچپن، لڑکپن اور جوانی کو اپنے ذہن میں کچھ لمحوں کے لیے محفوظ کر کے دیکھیں۔ میں، میں احساسِ کمتری کا شکار ہوگئی۔ حالات نے مجھے ابنارمل بنا دیا۔ میں، میں نہ رہی میں جان بوجھ کر ایسی نہیں بنی حمود بلکہ خود بخود سارے منفی انداز واطوار میرے اندر اترتے چلے گئے۔ میرے دل و دماغ سے مثبت سوچیں نکل گئیں۔ خدا کی قسم حمود مجھے بہت دکھ ہے...... کہ میں اتنی بری تھی مگر اب...... آپ کی باتوں نے مجھے احساس دلایا ہے، میری آنکھیں کھل گئیں...... میری اماں کو بھی احساس ہوگیا۔ میں نے جان لیا ہے کہ میں ہی غلط تھی...... جانے، انجانے میں کتنے دل دکھائے، اس بات کا اندازہ مجھے آج ہوا ہے اور حمود یہ آپ کا احسان ہے کہ آپ نے میری آنکھیں کھولیں میں آپ کی احسان مند رہوں گی ہمیشہ...... مگر...... خدا کا واسطہ ہے آپ مجھے معاف کردیں۔ میری غلطیوں کو، میری بدتمیزیوں اور میری تلخی کو میری نادانی سمجھ کر معاف کردیں۔ میں بہت نادم ہوں اپنی باتوں پر، اپنے رویے پر اور اپنے خیالات پر...... پلیز، پلیز میری طرف سے اپنا دل صاف کرلیں۔" وہ ہاتھ جوڑے اس کے سامنے کھڑی تھی، اس کے چہرے پر ندامت تھی...... دکھ، شرمساری، پچھتاوا، نہ جانے کیا کچھ تھا۔ حمود حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا ہمیشہ زہر اگلنے والی زبان، کرخت اور بیزار چہرہ، نہ جانے کہاں غائب ہوچکا تھا۔ اب وہاں پر معصوم...... بے تحاشا روتی ہوئی سوجی سوجی آنکھوں والی سیدھی سادی اور شرمندہ، شرمندہ سی لڑکی کھڑی تھی۔ "گل مین......" جو اپنی تمام تر بدتمیزیوں اور بداخلاقی کے باوجود روزِ اول سے ہی اسے اچھی لگی تھی...... سیدھی سادی، اکھڑ مزاج سی...... اپنے آپ میں گم رہنے والی۔

"واہ جی واہ! بہت اچھے......" حمود نے طنز سے قہقہہ لگا کر تالی بجائی۔

"یہ بہت اچھا طریقہ ہے بھئی پہلے تو اچھے بھلے شریف انسان کو دل بھر کے ذلیل و خوار کردو، اس کی سات پشتوں کو قبر سے کھینچ کھینچ کر درگت بنا ڈالو، اچھی طرح سے کھال ادھیڑ کر اور پھر آکر معذرت کرلو...... واہ بھئی واہ......"

"مان رہی ہوں کہ غلطی ہوئی ہے مجھ سے...... بھول ہوگئی...... اور غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے اور اچھا انسان وہی ہے جو کسی کی غلطی کو معاف کردے......"

"ہاہاہا...... نہیں ہوں میں یہ اچھا انسان...... میں...... بس تو لالچی ہوں...... چھچھورا ہوں، ایلفی لگا کر جم گیا ہوں، میری نیت تو گھر کے چھوٹے سے ٹکڑے پر خراب ہے، ہے ناں...... یہی پھول جھڑتے تھے ناں تمہاری زبان سے......" وہ تو گن، گن کر سارے بدلے نکالنے کی ٹھانے

ہوئے تھا کہ آج کے بعد موقع ملے نہ ملے۔"

"مطلب آپ معاف نہیں کریں گے......؟"

معصومیت سے کیے گئے سوال پر ایک لمحے کے لیے حمود بھی گڑبڑا گیا۔۔۔۔ حمود نے جواب دینے کی زحمت بھی نہیں کی اور منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔ گل نین نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

"ارے، اتنا بھاؤ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ انسان غلطی کرتا ہے تو معافی کا بھی راستہ اور حق اس کے پاس محفوظ رہتا ہے۔ ایک گھنٹے سے شرافت سے اپنی غلطی مان کر عاجزی سے دل سے معافیاں مانگ رہی ہوں اور موصوف ہیں کہ مزاج ہی نہیں مل رہے۔ حد ہوتی ہے اکڑ کی بھی، میں ہوں کہ معافی مانگ رہی ہوں اور آپ ہیں کہ نخرے دکھا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے، رکھیں اپنا attitude اپنے پاس میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ کسی کے پیچھے برباد کروں۔۔۔۔ نہ جانے خود کو کیا سمجھ رہے ہیں طرم خان۔۔۔" وہی انداز' وہی لہجہ، جو اس کی شخصیت کا خاص حصہ تھا۔

"ہائیں۔۔۔!" حمود تیزی سے پلٹا اور گھور کر اس کی جانب دیکھا۔

"اچھا، اچھا، سوری۔۔۔" دفعتاً اسے اندازہ ہوا کہ وہ پھر سے غلط کہہ گئی۔۔۔ کان پکڑ کر جس انداز سے سوری کہا حمود اسے دیکھتا رہ گیا۔ اسے ہنسی آ گئی۔

"اچھا کر دیا معاف۔۔۔۔ اب رات دو مجھے۔۔۔" حمود نے خود کو کنٹرول کر کے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا مگر اب معاف کر کے احسان کر ہی دیا ہے تو جا کہاں رہے ہیں۔" وہی معصومانہ انداز۔

"ایک اور احسان کرنے جا رہا ہوں۔" حمود کا لہجہ یک دم ہی بدل گیا ہے۔

"مطلب۔۔۔؟" وہ چونکی۔

"مطلب یہ کہ اماں، ابا کو کال کر کے پہلی فلائٹ سے بلوالوں تاکہ اس بدتمیز اور بے لگام لڑکی کو اپنے نام کی لگام ڈال کر فوراً سے بیشتر اپنے ساتھ لے جاؤں۔۔۔۔ تاکہ بیچاری چاچی کو بھی سکون نصیب ہو اور وہ بھی سکھ کی سانس لیں۔ کیونکہ میں اچھی طرح جان چکا ہوں کہ یہ صرف میرے قابو میں ہی آ سکتی ہے۔۔۔۔ اسے مجھ جیسے استاد کی ضرورت ہے۔" حمود کی بات پر گل نین ایک لمحے کو چونکی۔۔۔۔ پھر احساس ہوا کہ حمود کیا کہہ رہا ہے۔

"کچھ زیادہ نہیں بول گئے آپ۔۔۔۔" گل نین نے اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں غلط کہہ رہا ہوں کیا۔۔۔۔؟ اگر راضی نہ ہو۔۔۔۔ یا میری بات غلط لگے تو کہہ دو کہ میں غلط ہوں، تمہیں میری بات سے اختلاف ہے۔" حمود دو قدم آگے آیا تو وہ گڑبڑا گئی۔

"بولو! فیصلہ تمہارے پاس ہے گل نین۔۔۔۔ میری بات منظور ہے یا نہیں۔۔۔۔؟" تھوڑا سا جھک کر وہ مزید قریب آ گیا، گل نین بری طرح گھبرا گئی۔ ساری تیزی، طراری اور ایٹی ٹیوڈ ہوا ہو گئے۔

"بولو ناں۔" اسے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر وہ مزے لے رہا تھا۔

"او کے، مطلب کہ تمہیں منظور نہیں۔۔۔۔"

"نہیں۔۔۔۔ یہ میں نے کب کہا۔۔۔۔" گل نین کی بے ساختگی اور گھبراہٹ پر نہ چاہتے ہوئے بھی حمود اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

"پھر کیا کہا جناب نے۔۔۔۔؟" ستا کر اسے مزہ آ رہا تھا۔

"آپ کی ساری باتیں منظور ہیں۔" سادگی سے اعتراف کرتی ہوئی۔۔۔۔ گندمی رنگت والی عام سی شکل صورت کی یہ سادہ دل معصوم سی لڑکی حمود کے دل میں اترتی چلی گئی۔۔۔۔ تب حمود کو احساس ہوا کہ دنیا میں صرف حسن اور خوب صورتی ہی متاثر کن نہیں ہوتی۔۔۔۔ محبت کے لیے حسین ہونا ضروری نہیں، دل کے رشتے دل سے طے ہوتے ہیں۔ نگاہوں سے پرے وہ تعلق جو دل سے ہوتے ہیں ان میں خلوص، سچائی، لگاؤ اس تعلق کے لیے بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔۔۔۔ ایسی محبت کی عمارت میں کبھی دراڑ نہیں آتی۔



شمعِ ہدایت

اختر شجاعت

عبادت..... بندگی الٰہی

تمام تر حمد و ثنا اللہ رب العزت کے لیے جو تمام جہانوں کا مالک، خالق اور رازق ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ وہ ذات ہے جو توحید کے اعتبار سے یکتا ہے اور تمجید کے اعتبار سے قابلِ تعریف ہے۔ اس ذات کو بندوں کی صفات نہیں پا سکتیں۔ وہی ہر چیز کی ابتدا کرنے والا ہے۔ وہ جو ارادہ فرمائے اسے کر دینے والا ہے۔ اس کے تمام افعال لغزشوں سے پاک ہیں اس کی نہ ہی ایسی حد ہے جس کی مثال دی جا سکے۔ وہ ہمیشہ عالم اور خبیر رہا ہے۔ اس کا علم کل اشیاء سے پہلے ہے۔ کسی چیز کو بھی تخلیق کرنے میں اسے مشقت اور تھکان نہیں ہوئی۔ اس کی ربوبیت کی عزت کے سامنے بڑے، بڑے عاجز ہوئے۔ عقلمندوں کی عقل و دانش اس کی بادشاہی میں متحیر ہو گئیں۔ اس کے کلمے کے سبب ساتوں آسمان قائم ہوئے، فرشِ زمین نے قرار پایا۔ بلند و بالا پہاڑ وجود میں آئے۔ آندھیاں چلیں، سمندر اپنی حدود میں قائم ہوئے۔ وہی اللہ واحد و یکتا ہے زبردست ہے جس کے سامنے طاقتور جھکتے اور بلند رتبہ رکھنے والے انکساری کرتے ہیں۔ وہ بے مثال رب ہے اور اس کی بے مثال تخلیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

کروڑوں درود و سلام ہو پیارے آقا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کی آلؑ پر اور ان کے اصحابؓ پر......

☆☆☆

آج ہمارا موضوع عبادت ہے۔ عبادت کے لغوی معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی بندگی، عبادت کرنا، پرستش کرنا، نماز، قرآن وغیرہ پڑھنا۔

انسان کی تخلیق رب نے کسی ضرورت کے تحت نہیں بلکہ اپنی محبت کی وجہ سے کی۔ عبادت کے لیے تو فرشتے بہت تھے۔ انسانوں کی اکثریت تو عبادت سے گریزاں ہے بلکہ ان انسانوں میں ہی ایک گروہ ایسا بھی ہے جو رب کو مانتا ہی نہیں.....اس کے وجود سے ہی منکر ہے، ایک گروہ وہ ہے جو رب کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتا ہے اور ایک گروہ وہ ہے جو عبادات کرتا ہے.....اگر بات صرف عبادت کی ہوتی تو فرشتے جو اتنے زیادہ ہیں جو ہر لمحہ عبادت اور تسبیح کرتے ہیں اس کے احکامات کی بہت خوش دلی سے پیروی کرتے ہیں۔ لہٰذا رب کو محض عبادت کی ضرورت نہ تھی..... اللہ کریم نے انسان کو محبت سے پیدا کیا.....اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ میں نے انسان کو بہترین میزان، بہترین انداز اور توازن میں پیدا کیا۔ اگر انسان ان صفات پر قائم رہتا ہے جن پر رب نے اسے پیدا کیا اور رب کی فرمانبرداری کرتا ہے تو وہ تقویٰ کی طرف چلا جاتا ہے۔ تقویٰ انسان کو روحانیت کی طرف اور روحانیت انسان کو رب کے قریب لے جاتی ہے۔

ہم ایک لفظ ''عبادت'' روزانہ کئی بار استعمال کرتے ہیں۔ یہ لفظ عبادت پانچ حروف سے مل کر بنا ہے......ع۔ب۔ا۔د۔ت

ع سے مراد ہے عجز۔

ب سے مراد ہے بندگی۔

ا سے مراد ہے اللہ اور یہ اس کے احد ہونے کی صفت کو ظاہر کرتا ہے۔

د سے مراد ہے درستگی سمت انسان کی۔
ت سے مراد ہے تقویٰ۔

پہلے حرف "ع" سے مراد عجز اور عاجزی ہے وہ دونوں لحاظ سے ہونی چاہیے۔ اول تو عبادت عاجزی کے ساتھ کی جائے دوئم انسان کی زندگی میں عجز آجائے۔ ایک کوتاہی جو ہم سے اکثر سرزد ہوتی ہے کہ ہم صرف عبادت کو اپنی منزل سمجھ لیتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہم نے رب کی عبادت کرلی یہی کافی ہے تو صرف عبادت کے لیے تو ہمہ وقت تسبیح میں مصروف فرشتے بھی کافی ہیں۔

عبادت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر وہ تمام صفات attributes پیدا ہوجائیں جو رب انسان میں دیکھنا چاہتا ہے اور عاجزی کا وصف ان ہی صفات میں سے ایک ہے۔

اللہ تعالیٰ جو ہمارا رب ہمارا مالک اور خالق ہے اس کی بزرگی اور عظمت الفاظ میں بیان کیے جانے سے کہیں آگے ہے۔ ہم بہت حقیر اور چھوٹے ہیں جب ہم رب کے حضور کھڑے ہوں تو ہمارے اندازِ نشست اور طور طریقوں سے اس بات کا اظہار ہونا چاہیے کہ ہم اپنے رب کو کتنا بڑا اور عظیم اور خود کو کتنا حقیر سمجھتے ہیں۔ ایسی عبادت میں عاجزی کا رنگ ہوگا۔

لفظ عبادت میں استعمال ہونے والا حرف "ب" بندگی کو ظاہر کرتا ہے اپنے خالق کے ساتھ جو آقا اور بندگی کا رشتہ ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہم بہت با ادب ہوں، ہماری ایک، ایک حرکت سے یہ پتا چلے کہ ہم بندۂ حق ہیں۔ لفظ عبادت میں جو حرف "الف" استعمال ہوا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ہم اللہ کو وحدہ لاشریک جانیں...... اسے یکتا جانیں جو اپنی ذات میں تنہا ہے اس کا مثل کوئی نہیں بندگی کی بنیادی شرط یہ ہوگی کہ ہم اپنے رب کو یکتا و واحد سمجھ کر اس کی عبادت کریں۔

حرف "د" ہماری درستگی سمت کے بارے میں ہے جب ہم رب تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ عبادت کرلی اس کے اثرات ہم پر مرتب ہونے چاہئیں جو ہماری سمت کو درست رکھنے میں مددگار ہو اور ہمارا ہر فعل اللہ کے لیے ہو۔

اگلا حرف "ت" ہے جس سے مراد تقویٰ ہے جو ہمیں عبادت کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے اندر یہ سوچ آجائے کہ ہم اللہ کے بڑے حقیر بندے ہیں رب کی عبادت کرنا ہم پر فرض بھی ہے اور رب کا ہم پر حق بھی۔

ہم عبادت کے نتیجے میں برائیوں اور گناہوں سے دور ہوجائیں اللہ کو وحدہ لاشریک اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا آخری رسول مانیں، وہ کام کریں جس کی اس نے تلقین فرمائی اور ہر اس کام سے دور رہیں جس سے اس نے منع کیا ہے۔

اگر یہ ساری چیزیں نہیں پیدا ہو رہی ہیں تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کہاں پر کوتاہی ہو رہی ہے۔ محض نام کی عبادت کا کیا فائدہ......؟

☆☆☆

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جو کچھ تم کرتے ہو...... بے شک اللہ اس کی خبر رکھتا ہے اور اس کا اسے علم ہے۔"

حدیث میں آیا ہے کہ عرش کے پائے پر تحریر ہے جو میری اطاعت کرے گا میں اس کی بات مانوں گا جو مجھ سے محبت کرے گا اسے محبوب بناؤں گا جو مجھ سے مانگے گا میں اسے عطا کروں گا اور جو کوئی بخشش کا طلبگار ہوا اسے بخش دیا جائے گا۔"

یہ فرمان ہر ذی شعور کے سمجھنے کے لیے بہت کافی ہے کہ خوف اور بھرپور خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اور راضی برضا رہنا چاہیے۔ مصائب پر صبر کرے، اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرے اور قانع رہے...... اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو میری قضا پر راضی، مصائب پر صابر اور نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا اور ان پر قانع نہیں وہ میرے سوا کوئی اور رب تلاش کرے۔

ایک بار کسی نے حضرت حسن بصریؒ سے کہا۔ عجیب بات ہے کہ عبادت میں مجھے لطف نہیں آتا آپؒ نے جواب دیا تو نے کسی ایسے شخص کو دیکھ لیا ہے جو اللہ سے نہیں ڈرتا...... بندگی کا حق تو یہ ہے کہ اللہ کی رضا کے لیے تمام چیزوں کو چھوڑ دیا جائے۔

ایک شخص نے نماز پڑھنی شروع کی......وہ جب ''ایاک نعبد'' پر پہنچا تو اس کے دل میں خیال آیا کہ کیا میں خالص اللہ ہی کی عبادت کررہا ہوں؟ غیب سے آواز آئی تو نے جھوٹ بولا تو مخلوق کی عبادت کرتا ہے......تب اس نے مخلوق سے قطع تعلق کرکے پھر نماز شروع کی اور پہلے کی طرح پھر اسی آیت پر پہنچا تو پھر پہلا خیال آیا......اس پر آواز آئی کہ تو اپنے مال کی عبادت کرتا ہے......تب اس نے اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں بانٹ دیا پھر نماز شروع کی پھر ''ایاک نعبد'' پر پہنچا اور سوچا کہ میں خالصتاً اللہ کی عبادت کرتا ہوں پھر آواز آئی تم جھوٹے ہو تم اپنے کپڑوں کی عبادت کرتے ہو......اس پر اس نے اپنے تمام فالتو کپڑے بانٹ دیے پھر دوبارہ پڑھا اور جب اس آیت پر پہنچا اور سوال دُہرایا تو آواز آئی۔ ''اب تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو۔''

ایک شخص کی عبائیں گم ہوگئیں اور معلوم نہیں ہورہا تھا کہ کون لے گیا۔ اس شخص نے نماز پڑھنی شروع تو اسے یاد آگیا کہ فلاں شخص لے گیا تھا۔ اس نے نماز کے بعد غلام کو آواز دی کہ فلاں شخص سے جاکر عبائیں لے آؤ......غلام نے کہا، آپ کو یہ کیسے یاد آیا؟ مالک نے کہا نماز میں......غلام نے کہا آپ نے پہلے نماز عباؤں کے لیے پڑھی اب دوبارہ اللہ کے لیے نماز پڑھ لیجیے......اس کی اس بات پر مالک نے خوش ہوکر غلام کو آزاد کردیا۔

ہر ذی شعور کے لیے ضروری ہے کہ وہ دنیا کو ترک کرے اور اللہ کی عبادت کے ساتھ مستقبل کی فکر کرکے اپنی عاقبت سنوارے۔

☆☆☆

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے۔'' (سورۃ حجر)

شرک کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے پیغمبر بھیجے اور سب نے اپنا فرض ادا کیا اور اللہ کا پیغام حق پہنچایا اور اپنی قوم کو دعوت دی کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا دوسروں کو نہ پوجو......تو جہاں، جہاں ایمان رکھنے والے آباد ہیں ان سب کے لیے ایک ہی دین ہے اور وہ ہے اسلام اور اس پر چلنے والے امتِ واحدہ ہیں اور ان سب کے لیے یہی حکم ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''رحمٰن'' کی عبادت کرو......لوگوں کو کھانا کھلاؤ، سلامتی کرو یا سلام کرو اور جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہوجاؤ......''

عبادت کے متعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ایک قول ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کی عبادت میں سستی عام لوگوں کے لیے بدتر لیکن عالموں اور طالب علموں کے لیے بدترین ہے۔'' عبادت کی حقیقت کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا ''عبادت ایک پیشہ ہے، دکان اس کی خلوت......راس المال اس کا تقویٰ اور اس کا نفع جنت ہے۔ اللہ مخلوق پر سے کبھی کوئی مصیبت اور برائی نہیں ہٹاتا جب تک مخلوق عبادت کی طرف نہ جھک جائے۔''

حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ ''میں نے اپنے نفس پر زیادتی کی مگر اللہ کا کرم ہے کہ میں مسلمان ہوں اور اس کی عبادت کرتا ہوں۔ مزید فرمایا کہ کم سونا عبادت ہے۔''

حضرت عثمان غنیؓ کا قول ہے کہ ''اگر تم معبودِ حقیقی کی پرستش اور عبادت کرنا نہیں چاہتے تو اس کی بنائی ہوئی چیزوں کو استعمال بھی نہ کرو......مزید فرمایا کہ ایک پرہیزگار عابد شیطان پر حاوی ہوتا ہے۔''

مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا قول ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے عبادت کو سمجھ دار لوگوں کے لیے نفع بخش بنایا ہے۔ عاجز و کمزور اس میں سستی کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جو لوگ شوق میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں ان کی عبادت تاجرانہ ہے۔ جو خوف میں عبادت کرتے ہیں ان کی عبادت غلامانہ ہے اور جو شکرِ نعمت کے طور پر عبادت کرتے ہیں ان کی عبادت آزادانہ ہے۔'' مزید آپؓ کا فرمان ہے کہ ''خیرات افضل ترین عبادت ہے۔ صدق یعنی یقین کے ساتھ سونا اس غفلت کی عبادت سے بہتر ہے جو شک کے ساتھ کی جائے۔''

☆☆☆

حضرت ابوعلی دقاقؒ کا کہنا ہے کہ عبادت کے تین درجات ہیں.....عبادت، عبودیت اور عبودت۔

عبادت عام مومنین کا کام ہے۔ عبودیت خواص کا اور عبودت خاص الخاص کا۔ عبودیت، عبادت سے زیادہ کامل ہے۔

عبادت علم الیقین والوں کے لیے۔ عبودیت عین الیقین والوں کے لیے اور عبودت حق الیقین والوں کے لیے ہے۔

جس نے اپنے نفس کو اللہ سے دور نہیں رکھا وہ صاحب عبادت ہے۔ اور جس نے اپنے دل کے ساتھ اللہ پر بخل نہیں کیا وہ صاحب عبودیت ہے اور جس نے اپنی روح کے ساتھ اللہ کے معاملے میں بخل نہیں کیا وہ صاحب عبودت ہے۔ اللہ کی عبادت پر کامل طور پر پابند رہنا اور جو عبادت تم سے صادر ہو اسے ناقص سمجھتے رہنا اور جو نیک اعمال تم کرو انہیں تقدیر الٰہی جاننا عبودیت کہلاتا ہے۔ اسی طرح جن امور کے کرنے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے ان کو گلے لگانا اور جن سے منع کیا گیا ان کو چھوڑ دینا عبودیت ہے۔

عبودیت سے بڑھ کر کسی اور چیز میں شرف نہیں پایا جاتا اور نہ ہی مومن کے لیے عبودیت سے بڑھ کر کوئی اور نام زیادہ مکمل ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف میں معراج کی رات یہ الفاظ کہے اور معراج کا وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے دنیا میں اشرف ترین وقت تھا۔

حضرت سہل بن عبداللہ کا قول ہے کہ جب تک انسان کی یہ حالت نہ ہوجائے کہ ان چار چیزوں یعنی بھوک، ننگا رہنا، فقر اور ذلت سے گھبراہٹ نہ ہو تب تک اس کی عبودیت بھی صحیح نہیں ہوتی۔

حضرت ابن عطاؒ کا ارشاد ہے کہ چار باتوں میں عبودیت پائی جاتی ہے۔

۱۔ وعدہ پورا کرنا۔ ۲۔ حدود اللہ کی نگہداشت کرنا۔ ۳۔ جو اپنے پاس موجود ہو اس پر راضی رہنا۔ ۴۔ اور جو کچھ حاصل نہ ہو اس پر صبر کرنا۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ عبودیت یہ ہے کہ تو ہر حال میں اس کا بندہ بنا رہے جس طرح ہر حالت میں وہ تمہارا رب ہے۔

☆☆☆

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت زیادہ عبادت گزار تھے۔ اعلانِ نبوت سے قبل بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غارِ حرا میں قیام و مراقبہ اور ذکر و فکر کے طور پر اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ نزول وحی کے بعد آپ کو نماز کا طریقہ بھی بتادیا گیا پھر شب معراج میں نماز پنجگانہ فرض ہوئی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پنجگانہ کے علاوہ نمازِ اشراق، چاشت، تحیۃ الوضو، تحیۃ المسجد، صلوٰۃ اوابین وغیرہ۔ سنن و نوافل بھی ادا کرتے تھے۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر نمازیں پڑھتے۔ تمام عمر نمازِ تہجد کے پابند رہے۔ آپ نمازِ عشا کے بعد کچھ دیر سوتے پھر کچھ دیر اٹھ کر نماز پڑھتے پھر سوجاتے۔ پھر اٹھ کر نماز پڑھتے۔ غرضیکہ صبح تک یہی حالت قائم رہتی۔ صبح صادق تک نمازوں میں مشغول رہتے.......پھر ساری رات بستر پر پیٹھ نہیں لگاتے تھے۔ لمبی، لمبی سورتیں نماز میں پڑھا کرتے.......کبھی رکوع و سجود طویل ہوتا کبھی قیام طویل ہوتا.......رمضان شریف میں خصوصاً آخری عشرے میں آپ کی عبادت بہت زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری رات بیدار رہتے گھر والوں کو نمازوں کے لیے جگاتے اور عموماً اعتکاف فرماتے۔ نمازوں کے ساتھ، ساتھ کبھی کھڑے ہوکر کبھی بیٹھ کر کبھی سجدے میں نہایت آہ و زاری اور گریہ کے ساتھ گڑگڑا کر راتوں میں دعائیں مانگا کرتے۔ رمضان شریف میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن عظیم کا دور بھی فرماتے۔ کبھی، کبھی ساری، ساری رات دعاؤں میں کھڑے رہتے یہاں تک کہ پاؤں اقدس میں ورم آجایا کرتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقات و خیرات کا یہ عالم تھا کہ اپنے پاس سونا چاندی یا تجارت کا کوئی سامان نہیں رکھتے تھے جو آتا سب اللہ کی راہ میں مستحقین میں تقسیم فرمادیتے۔ غرضیکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر وقت، ہر گھڑی، ہر لحظہ ذکر الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ یہاں تک کہ بوقتِ وصال بھی جو فقرہ زبان پر تھا وہ اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الاعلیٰ کی دعا تھی۔

☆☆☆

حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ جب نماز کا ارادہ فرماتے تو ان کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ اور فرماتے اس امانت کے ادا کرنے کا وقت آ گیا جس کا بار زمین و آسمان اٹھانے سے عاجز رہے تھے۔

حضرت حاتم اصم فرماتے ہیں کہ جب نماز کا وقت آتا ہے تو ایک ظاہری وضو کرتا ہوں دوسرا باطنی وضو..... ظاہری وضو پانی سے اور باطنی وضو توبہ سے۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ تین سو نفلیں ہر شب میں پڑھا کرتے تھے..... ایک روز ایک عورت نے دوسری عورت کو اشارہ سے بتایا کہ یہ شخص روزانہ رات میں پانچ سو نوافل پڑھا کرتے ہیں۔ آپؒ نے ان کی گفتگو سن لی پھر اسی رات سے آپؒ نے پانچ سو نوافل پڑھنا شروع کر دیے پھر کسی نے راستے میں یہ کہہ دیا کہ یہ ایک ہزار نوافل پڑھتے اس روز سے آپ نے ہزار نفلیں پڑھنے کا معمول بنا لیا۔ پھر کسی شاگرد نے عرض کیا کہ یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ پوری رات بیدار رہتے ہیں تب آپؒ نے شب بیداری کو اپنا معمول بنا لیا۔ فرمایا کہ بعض بندے اپنی ایسی تعریف کو پسند کرتے ہیں جو اُن میں نہیں ہے اور میں ایسے گروہ میں شامل ہونا نہیں چاہتا اور اس دن سے آپؒ نے مکمل بیس سال تک عشا کے وضو سے صبح فجر کی نماز پڑھی اور طویل سجدوں کی وجہ سے آپؒ کے گھٹنوں میں اونٹ کے گھٹنوں جیسے گٹے پڑ گئے تھے۔

حضرت مالک بن دینار کا کہنا ہے کہ جب آپؒ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ قرات کرتے تو مضطرب ہو کر رونے لگتے اور فرماتے کہ اگر یہ آیت قرآن کی نہ ہوتی تو میں کبھی نہ پڑھتا کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ! میں تیری عبادت کرتا ہوں اور تجھ سے مدد مانگتا ہوں حالانکہ ہم نفس کے پجاری ہیں کہ خدا کو چھوڑ کر دوسروں سے اعانت کے طالب ہوتے ہیں۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ جنگل سے گھاس لا کر فروخت کیا کرتے تھے۔ اور اس سے حاصل ہونے والی رقم کو خیرات کر کے پوری شب مصروف عبادت رہتے اور جب آپؒ سے سوال کیا گیا کہ آپؒ کو نیند کیوں نہیں آتی؟ آپؒ نے فرمایا کہ جس کی آنکھوں سے ہمہ وقت آنسو بہتے رہتے ہوں تو اس کو بھلا نیند کیونکر آ سکتی ہے۔ اور آپؒ کا یہ معمول تھا کہ نماز کی فراغت کے بعد اپنا چہرہ چھپا کر فرماتے کہ مجھے یہ خوف رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری نماز کو منہ پر نہ مار دے۔

حضرت امام جعفر صادقؒ کی عبادت و ریاضت خالصتاً توجہ اللہ ہوتی تھی۔ آپ کو اس عبادت میں وہ کیف و سرور حاصل ہوتا تھا جو اللہ تعالیٰ مخلصین ہی کو اپنے فضل و کرم سے عطا کرتا ہے۔ چنانچہ ایک بار آپؒ قرآن شریف کی تلاوت کرتے، کرتے بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آنے پر لوگوں کے پوچھنے پر آپؒ نے بتایا کہ جب بندہ قرآنی آیتوں کو دل لگا کر پڑھتا ہے اور ان میں محو ہو جاتا ہے تو قرآن کی اصل لذت اسے محسوس ہوتی ہے میں اسی طرح محویت کے عالم میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا کہ یکا یک محسوس ہوا میں اللہ تعالیٰ کی زبان سے میں یہ آیتیں سن رہا ہوں۔ اس کیفیت کی میں تاب نہ لا سکا اور بے ہوش ہو گیا..... سبحان اللہ.....!

حضرت سفیان ثوریؒ جب بصرہ میں بیمار ہوئے تو حاکم بصرہ نے آپؒ کو تلاش کرنے کا حکم دیا۔ اور جب لوگ آپؒ کو تلاش کرتے، کرتے پہنچے تو آپؒ کو مویشیوں کے باندھنے کی جگہ پایا۔ اس وقت آپؒ شدید دردِ شکم اور اسہال کی بیماری میں مبتلا تھے۔ اور شدید اضطراب میں تھے لیکن ایسی حالت میں بھی ذکرِ الٰہی سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہوئے اسی شب لوگوں نے دیکھا کہ آپؒ رات بھر میں ساٹھ مرتبہ بیت الخلا گئے اور ہر مرتبہ وضو کر کے نماز میں مشغول ہوئے اور جب لوگوں نے عرض کیا کہ آپ ایسی حالت میں بار، بار وضو نہ کریں تو فرمایا کہ میں باوضو مرنا چاہتا ہوں تاکہ اپنے اللہ کے سامنے نجس حالت میں نہ پہنچوں..... اللہ اکبر

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ نے عابد کی تعریف یوں فرمائی ہے کہ عابد انہیں کہتے ہیں جن کا ظاہر و باطن صدق و خلوص سے آراستہ ہو اور ریاکاری کا شائبہ تک موجود نہ ہو۔ فریب، دھوکا، حسد وغیرہ ان کے دل میں نہ ہو جو اطاعت بھی کریں تو خالصتاً اللہ کے لیے کریں۔ مخلوق

میں نمود و نمائش کے لیے نہ ہو...... کیونکہ ایسے عبادت گزار جن کا ظاہر تو اطاعتِ حق سے آراستہ ہو اور باطن خراب ہو تو اس کی تمام اطاعت عبادت لپیٹ کر اس کے منہ پر ماردی جائے گی یعنی مسترد کردی جائے گی۔

عابد چار طرح کے ہوتے ہیں۔ اول وہ عبادت گزار جن کا ظاہر اطاعتِ الٰہی سے آراستہ ہو لیکن باطن خراب ہوتا ہے...... دوسرا وہ گروہ جن کا ظاہر خراب ہوتا ہے اور باطن آباد...... تیسرے وہ لوگ جن کا ظاہر و باطن دونوں خراب ہوں۔ چوتھے وہ حضرات جن کا ظاہر و باطن یادِ الٰہی سے آباد ہو...... وہ لوگ جن کا ظاہر تو آراستہ ہوتا ہے لیکن باطن خراب یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ظاہری طور پر نمود و نمائش کے لیے تو بہت عبادت و اطاعت کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کی عزت کریں لیکن ان کے دل دنیا داری میں مشغول ہوتے ہیں۔

بنی اسرائیل میں ایک زاہد تھا جس نے بہت سال اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تھی جب اس کا انتقال ہوا تو لوگوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آتشیں طوق اس کے گلے میں پڑا ہوا ہے...... اور اس کے پاؤں کو بھی آگ میں تختہ بند کیا ہوا ہے، آگ نے اسے چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے...... جل رہا ہے، فرشتے آگ کے گرز لیے مار رہے ہیں تو وہ لوٹ، پوٹ کر فریاد کرتا ہے کہ میری توبہ...... اس سے پوچھا کہ تو، تو بڑا زاہد و عابد تھا اور اتنے سال تو نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی اب عذابِ الٰہی میں کیوں گرفتار ہے؟ اس نے جواب دیا...... یہ جو عبادت گزاری تم لوگ دیکھتے تھے سب نمود و ریا تھا، خلق کو دکھانے کے لیے تھا۔ میرا باطن تو دنیا میں مشغول رہا۔ پس وہ ساری ریاکاری کی عبادتیں میرے منہ پر ماردی گئیں۔ اور حکم ہوا کہ اسے سخت عذاب دو یہ شخص عذاب کے قابل ہے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کی ظاہری حالت خراب لیکن ان کا باطن بے حد منور و مزین ہوتا ہے۔ یہ لوگ اہلِ جنون کہلاتے ہیں بظاہر بے سروسامان ہوتے ہیں لیکن باطن میں مشغول و مصروف اپنے اللہ کے ساتھ رہتے ہیں...... حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ حق میں اسی طرح مستغرق ہوتے ہیں کہ دنیا و مافیہا سے...... بے خبر ہو جاتے ہیں۔

تیسرا گروہ جن کا ظاہر و باطن خراب ہے۔ وہ اطاعت و عبادت کے بارے میں بالکل بے خبر ہیں۔

چوتھا گروہ ان حضرات کا ہے جن کا ظاہر و باطن نورِ عرفان و اطاعتِ حق سے منور ہوتا ہے۔ یہی لوگ درویش و مشائخ ہوتے ہیں۔ ان کی اطاعت میں اگر ریاکاری کا ذرا سا بھی شبہ ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو اتنے سخت مجاہدہ میں ڈالتے ہیں کہ وہ دور ہو جاتی ہے اور یہی لوگ جب اپنے اللہ کی عبادت میں اس حال و وجد کی کیفیت میں ہوتے ہیں تلوار سے ان کے سر پر ضرب لگا کر ٹکڑے، ٹکڑے کیا جائے تو بھی انہیں پتا نہیں چلے۔

حضرت رابعہ بصریؒ کی پوری زندگی اپنے اللہ اپنے خالق کی محبت کے گرد گھومتی ہے۔ آپؒ نے اپنے خالقِ کائنات سے رشتہ جوڑ رکھا تھا وہ کہتیں۔ سرِ خاک پر رکھ کر "بس! تو ہی ہے اور تیرے سوا کوئی نہیں......" آپؒ کے مسلک کی بنیاد عشقِ الٰہی پر ہے۔ حضرت رابعہ بصریؒ کی سجدہ گاہ ہمیشہ آنسوؤں سے تر رہتی تھی۔

حضرت رابعہ بصریؒ "عشق الٰہی" میں اس قدر غرق رہتی تھیں کہ خوشی اور غم اپنی حیثیت کھو بیٹھے تھے۔ عبادت کے بارے میں آپ کا طرزِ عمل بڑا عجیب تھا۔ آپ خوف و طمع سے بے نیاز ہو کر اپنے خالق کو پکارتی تھیں۔

ایک بار آپؒ پر جذب کی کیفیت طاری تھی۔ اہلِ بصرہ نے دیکھا کہ آپؒ ایک ہاتھ میں آگ اور دوسرے ہاتھ میں پانی لیے ہوئے بھاگی چلی جارہی ہیں۔ لوگوں نے آپؒ کو اس حال میں دیکھا تو پوچھا...... "یہ کیا ہے؟ آپ کہاں جارہی ہیں؟" حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا۔ "میں اس پانی سے دوزخ کی آگ کو بجھانے جارہی ہوں کہ لوگ اسی کے خوف سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔" لوگوں نے پوچھا۔ "اور یہ آگ کس لیے ہے؟"

"میں اس آگ سے جنت کو پھونک ڈالنا چاہتی ہوں تاکہ جو لوگ جنت کی لالچ میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں انہیں جنت نہ مل سکے۔"

ایک بار آپؒ ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگ رہی تھیں۔ "اے میرے معبود! اگر میں تیری عبادت دوزخ

کے خوف سے کرتی ہوں تو تو مجھے دوزخ ہی میں ڈالنا...... اور اگر میری ریاضت حصولِ جنت کے لیے ہے تو اسے مجھ پر حرام کر دینا...... اور اگر میں صرف تیرے ہی لیے تیری پرستش کرتی ہوں تو تو مجھے اپنے دیدار سے ہرگز محروم نہ رکھنا۔“ یہی وہ عشق ہے جس نے حضرت رابعہ بصریؒ کو ولایت کے منصب تک پہنچایا اور پھر آپؒ کا نام قیامت تک کے لیے محبت کی علامت بن کر رہ گیا۔

☆☆☆

حضرت امام غزالیؒ نے عبادات کی دو اقسام بتائی ہیں۔

ا۔ اکتساب۔ ۲۔ اجتناب

اکتساب اطاعت کو بجالانے کا نام ہے اور اجتناب گناہوں اور برائیوں سے رک جانے کا نام ہے۔

اہلِ عبادت میں صاحبِ بصیرت اور متقی لوگ اجتناب یعنی گناہوں سے گریزاں رہنے کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔

اگر عبادت کی دونوں صورتوں میں سے کسی ایک تک رسائی ممکن ہو سکے تو اجتناب کی صورت کو اختیار کر تو ہر آفت سے محفوظ ہو جائے گا۔ کیونکہ اکتساب کی نسبت اجتناب گناہوں سے پرہیز زیادہ اہمیت رکھتی ہے جیسے مریض کے علاج کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک دوا، دوسرا پرہیز اگر دونوں پر عمل کیا جائے تو مریض جلد صحت یاب ہوگا۔ ورنہ پرہیز تو اس کے لیے اولیٰ ہے۔ کیونکہ اگر پرہیز کو ترک کر دیا جائے تو دوا کوئی اثر نہ کرے گی...... اسی طرح اعمال کی بجا آوری کے ساتھ گناہوں سے پرہیز برتا جائے تو بڑی جلدی منزلِ مراد نصیب ہو جاتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ ”ہر بیماری سے نجات کی اصل پرہیز ہے۔“

بارگاہ رب العزت میں انسان کا سب سے پسندیدہ عمل اس کی عبادت ہے۔ عبادت کا اصل مقصد تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا ہے مگر اس کا بنیادی فائدہ خود انسان کو ہی پہنچتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسان میں اچھے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں جو انسانِ کامل بننے کا ذریعہ ہیں۔

تو ہمیں اپنے رب سے بہت محبت کرنی چاہیے ہر لمحہ اس کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ ہمارا مالک، خالق اور رازق ہے۔ عبادت صرف اور صرف اسے اپنا مان کر اپنا جان کر اپنا خالق سمجھ کر کریں۔ نہ جنت کے لالچ میں اور نہ دوزخ کے خوف سے......

اے اللہ! ہمیں بھی اپنی ایسی عبادت کرنے کی توفیق عطا فرما...... جو ہر طرح کی ریاکاری سے پاک اور خالصتاً صرف تیرے لیے ہو...... آمین الٰہی آمین......

حرفِ آخر

اپنے بہت پیارے رب کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ اس مضمون میں دانستہ یا نادانستہ کوئی غلطی کوئی کمی یا کوتاہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات یا فرمودات کے خلاف ہوگئی ہو تو اے میرے مہربان رب...... اپنی اس گناہ گار کم فہم کنیز کو معاف فرما دے کہ اے رب تو بہت معاف کرنے والا عظیم الشان خالق ہے۔

یہ مضمون اپنے اندر بہت زیادہ وسعت رکھتا تھا اپنے عنوان کے لحاظ سے اور بہت کچھ لکھا بھی جا سکتا تھا مگر طوالت کے خوف سے بس اتنا ہی لکھ سکی...... معذرت۔ اس کے لیے میں نے جن قابلِ احترام اور قابل ترین ہستیوں کی کتب سے یہ مضامین منتخب کیے ہیں...... اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے...... آمین۔ الٰہی آمین

قابلِ احترام ہستیوں کے کتب اور ان کے نام جن کی مدد سے میں نے یہ مضمون تیار کیا۔

1۔ منہاج العابدین...... امام محمد الغزالیؒ
2۔ مکاشفۃ القلوب...... امام محمد الغزالیؒ
3۔ سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم...... حضرت مولانا عبدالمصطفیٰ اعظمیؒ
4۔ اللہ سے دوستی...... حضرت علامہ عالم فقری
5۔ اللہ کے سفیر...... جناب خان آصف صاحب
6۔ کہے فقیر...... جناب سرفراز اے شاہ صاحب
7۔ کشف المحجوب...... حضرت سید علی ہجویریؒ

بچھڑا کچھ اس ادا سے

سلمیٰ غزل

تو کیا گیا کہ زندگی ویران ہو گئی
خود اپنے زندہ رہنے پہ پشیمان ہو گئی

زندگی کیا ہے؟ پانی کا بلبلہ بچپن سے یہی سنتے آرہے تھے مگر انسان کی فطرت حقیقت سے آنکھیں چرانا اور امیدوں کے محل بنانا ہے، مجھے لگتا تھا دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش نصیب شاید ہی کوئی ہو تینوں بچوں کی کامیاب زندگی اور میاں کا ساتھ ایک عورت کو اور کیا چاہیے مگر اندازہ نہیں تھا کہ ایک جھٹکے میں آسمان سے زمین پر آجاؤں گی بالکل خالی ہو گئی ہوں۔ یکم جنوری 2020ء وہ دن تھا جب میں نے اپنے رفیقِ حیات عبدالقادر کو کھو دیا۔ لگتا ہے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہوں کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میری دعائیں میرے وظیفے اور میرا گڑگڑانا عرش کو ہلا دے گا اور میرا رب مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا مگر الٹی ہو گئیں سب تدبیریں۔ کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ کیونکہ میرا دل یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ وہ چلے جائیں گے۔

میں بحیثیت اردو اسپیکنگ اور وہ پنجابی اکثر مذاق میں کہتے تھے۔ ”تم اہلِ زبان میں بے زبان۔“ میرا جواب ہوتا تھا۔

”آپ جتنے اوپر میں ہیں اتنے ہی اندر ہیں۔“ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی ضد تھے وہ بے حد بااصول، منظم، وقت کے پابند اور کم گو...... میں سب بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے بے پروا، ضدی اور بے حد باتونی ہم دونوں کسی ایسی تقریب میں جاتے تھے جہاں ان کا کوئی جاننے والا نہ ہو تو وہ بغیر موڈ خراب کے لیے دو تین گھنٹے خاموش بیٹھے رہتے تھے اور میں انجان لوگوں سے بھی گھل مل جاتی تھی۔ غصہ ان کو منٹ میں آتا تھا لیکن اترتا بھی منٹوں میں تھا، میں نے کبھی سوری نہیں کہا لیکن خاموش ہو جاتی تھی اور ان کی خوبی یہ تھی کہ سوری کر کے فوراً منا لیتے تھے۔ ”یار تم تو جانتی ہو مجھے غصہ جلدی آجاتا ہے اب تک تو تمہیں عادی ہو جانا چاہیے۔“ 1984ء میں جب اپنا گھر خود کھڑے ہو کر بنوایا تو سب یہی سمجھتے رہے کہ ٹھیکدار ہیں کیونکہ مزدوروں کے ساتھ خود بھی لگے رہتے تھے، بے حد ذہین، زیرک اور معاملہ فہم میری باجی اکثر کہتی تھیں۔ ”تو اپنے میاں کی زبان بند رکھا کر کالی زبان ہے جو کہتے ہیں ہو جاتا ہے۔“ تب یہ جواب دیتے۔ ”باجی آپ لوگ جذبات سے سوچتے ہیں اور میں عقل سے۔“ اور اس معاملے میں میرے تینوں بچے باپ پر گئے ہیں۔ میں ہر ایک پر بھروسا کر لیتی ہوں اور پھر بعد میں پچھتاتی ہوں۔ میرے دونوں بیٹے جاتے وقت ماں کو نصیحت کر گئے ہیں۔ ”امی آپ دل کی بہت اچھی ہیں، ہر ایک پر بھروسا کر لیتی ہیں مگر اب ابو نہیں ہیں اس لیے جلد بازی میں کسی پر بھی بھروسا مت کرنا۔“ بڑی پوسٹ سے ریٹائرڈ ہوئے مگر نخرہ نام کو نہیں تھا ہاں رعب اور دبدبہ اتنا تھا کہ دونوں بیٹے میرے ذریعے سے ہی باپ سے بات کرتے تھے البتہ بیٹی سر چڑھی اور بے حد لاڈلی ہر بات باپ سے منوا لیتی اس کے کہنے پر بیماری میں دوا بھی کھا لیتے تھے اور اسپتال بھی چلے جاتے تھے۔ سارا محلہ کہتا ”تمہارے میاں اوور ایکٹو ہیں۔ کیونکہ گاڑی ہوتے ہوئے بھی

میلوں پیدل چلے جاتے ہیں" اور مجھے غصہ آتا تھا۔ اپنی کوئی شاپنگ بھی خود نہیں کی، میں ہی خریدتی تھی کیونکہ ایک دو مرتبہ گئے تو ایک دکان پر ہی جم گئے۔ "بس جو کچھ خریدنا ہے خرید لو۔ بھاؤ تاؤ مت کراؤ......" اور ہم عورتیں یہ کیسے کریں، دس دکانیں جھانکنے کی عادت جو ٹھہری۔ لیکن جب سے بچوں کے پاس امریکا جانا شروع کیا شاپنگ کا بے حد شوق ہو گیا تھا۔ نزدیکی مال پیدل ہی چلے جاتے تھے اور جب شاپنگ کرکے آتے تو میں ناراض ہونے لگتی تھی کہ پاکستان کیسے لے کر جائیں گے تو ان کا ایک ہی جملہ ہوتا۔

"یار اتنی دور سے آئے ہیں، امریکن کیا سوچیں گے پاکستانی کنجوس ہوتے ہیں، کچھ خریدتے نہیں۔" ابھی تک سیکریٹریٹ سے لوگ مشورہ کرنے آتے تھے اور میں مذاق کرتی تھی کہ "درخواست لکھوانے اور مشورہ دینے کی فیس مقرر کرلیں۔" بڑا بیٹا بضد تھا کہ میں گرین کارڈ کے لیے اپلائی کردوں مگر صاف منع کردیا کہ "گھومنے پھرنے کے لیے امریکا صحیح ہے مگر پاکستان کے علاوہ میرا کہیں دل نہیں لگتا۔"

2 جولائی 2019ء کو انہیں اسٹروک ہوا تب مجھے اپنے رب کی مصلحت سمجھ میں آئی، میں بڑے گھر سے تنگ ہوگئی تھی اس لیے کہ ہم دو میاں بیوی ہی تو تھے۔ تو میرے اصرار پر انہوں نے اوپر گھر بنوانا شروع کیا اور بیٹی کو دعوت دے دی کہ تم نیچے آؤ، گھر کرائے پر دینے کو وہ تیار نہیں تھے۔ بیٹی ریزیڈنسی کر رہی تھی اور انہیں بے حد ارمان تھا کہ وہ مکمل کرلے اور جب دو سال بعد فرسٹ attempt میں اس نے امتحان پاس کرلیا تو سب سے زیادہ خوش وہی تھے، یہ بیٹی کا آخری سال ہے اور بیماری میں بھی وہ مجھ سے کہتے رہتے، اسے سمجھاؤ ہر کام چھوڑ کر صرف پڑھے۔

جب بیٹی نیچے شفٹ ہوئی تو ہر، ہر ایک نے یہاں تک کہ اس کی دوست تک نے کہا۔ "کیوں بلالیا، بیٹیاں تو دور ہی بھلی لگتی ہیں۔" لیکن رب کی مصلحت کو ہم نہیں سمجھتے نہ گھر بنتا اوپر اور نہ بیٹی نیچے رہنے آتی کہ دونوں بیٹی، داماد کا ڈاکٹر ہونا بے حد کام آیا۔ دونوں نے بہت ساتھ دیا۔ خاص طور پر بیٹی تو ہر جگہ اور ہر قدم، ڈاکٹرز کے اپائمنٹ سے لے کر ڈسکشن تک ساتھ، ساتھ رہی۔ حالانکہ دونوں بچے بیماری کے دوران آگے پیچھے امریکا سے آئے۔ pace maker لگا اور جب بڑا بیٹا فیصل آیا تو چلنے لگے تھے حماد سے فرمائش کی: "میں گھر میں پڑے، پڑے بور ہوگیا ہوں۔" وہ ماموں کے گھر لے گیا فیصل سے فرمائش کی۔ "مجھے چائنیز کھانا ہے۔" وہ ہم سب کو لے کر گیا اور پھر گھر پر بھی چائنیز لایا بہت خوش ہوئے، میں خوش تھی کہ بہتری کی طرف گامزن ہیں اسی لیے روز یاد دلاتی تھی کہ میں نے عمرہ مانا ہے جلدی سے ٹھیک ہوجائیں۔ کبھی انہیں یاد دلاتی ہم نے شادی کی سلور جوبلی بہت دھوم دھام سے منائی تھی اب شادی کی گولڈن جوبلی تین سال بعد منائیں گے۔ ان شاءاللہ..... انہوں نے کبھی مجھے نام سے نہیں پکارا لیکن بیماری کے دوران جب میں فجر کی نماز پڑھنے انہیں بتا کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی تھی تو آوازیں دینا شروع کردیتے تھے۔ "مس سلمٰی سلطانہ کہاں ہو......؟" سلام پھیرنا مشکل ہوجاتا تھا کبھی ہنسی آجاتی اور کبھی جھنجلاہٹ، افسوس اب فجر کی نماز پڑھنے کھڑی ہوتی ہوں تو دم گھٹتا ہے۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے اور ان کی آواز کانوں میں گونجتی رہتی ہے اور اپنی جھنجلاہٹ پر اللہ سے معافی مانگتی رہتی ہوں۔ میں شادی سے پہلے رسالوں میں لکھتی تھی اور سلمٰی غزل کے نام سے شاعری بھی کرتی تھی لیکن شادی کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ گھرداری، بچوں کی تربیت کیونکہ میں نے ٹھٹہ سے پرائیویٹ پڑھا تھا۔ ڈبل ایم اے کراچی یونیورسٹی سے پرائیویٹ کیا تھا اور جو میں نہ کرسکی تھی، وہ میں چاہتی تھی میرے بچے کریں۔ خاص طور پر میرے والد محترم کی ہمیشہ مجھے سپورٹ حاصل رہی اور مجھے خاص طور سے کہتے تھے۔ "اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا" اور میرے مرحوم شوہر کی بھی یہی خواہش تھی جو بیٹی نے پوری کی۔ مگر انہیں میرے لکھنے اور شاعری سے قطعی دلچسپی نہ تھی بلکہ کہتے تھے "شاعری فالتو لوگوں

UUNOVELS.COM

کا کام ہے۔ بے مقصد اور بیکار...... ''جب میں انہیں علامہ اقبال کی مثال دیتی تھی اور جواب ملتا تھا۔ ''ان کی شاعری لب و رخسار اور دلربائی کی نہیں۔ بامقصد شاعری تھی۔'' رسالے بہت شوق سے پڑھتے تھے مگر بقول ان کے '' مردانہ میں پڑھوں گا زنانہ تم پڑھو۔'' سسپنس، جاسوسی، نئے افق، سرگزشت، اردو ڈائجسٹ اور سیارہ ڈائجسٹ اور سچی کہانیاں ہمیشہ ان کے سرہانے رہتے تھے۔ میرے افسانوں پر ایسی قدر زبردست تنقید کرتے تھے کہ میں حیران ہو جاتی تھی کہ واقعی تنقید صحیح ہے مگر جب اچھا لگتا تو تعریف بھی ضرور کرتے۔ ان کی ایک ہی چھوٹی بہن شیخوپورہ میں ہے جس کے پاس ہر سال جاتے تھے اور ان کے بیوہ ہونے کے بعد ان کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھتے تھے اور میں خوش ہوتی تھی کہ وہ بیماری میں پندرہ دن رہ کر گئیں اب روتی ہیں کہ ...'' مجھے پتا ہوتا تو وہ واپس ہی نہ آتی۔'' اٹینڈنٹ نے کہا کہ ''میں کرسمس کرنے پنجاب جاؤں گا۔'' تو میں پریشان ہوگئی کیونکہ رات کو تو میں ہی سنبھالتی تھی لیکن دن کا تو شروع سے اٹینڈ تھا البتہ رات کا میں نے 15 اگست سے ہٹا دیا تھا فوراً بھانجے کو فون کیا جو پہلے بھی دو مرتبہ آچکا تھا میرے میاں کا قد 6 فٹ 2 انچ تھا اور امجد بھی ماموں کی قامت کا...... بڑا ساتھ دیا اس نے اٹینڈنٹ کو 4 جنوری سے واپس آنا تھا لیکن اس سے پہلے میرے میاں نے رخت سفر باندھ لیا۔

جب تک دونوں بیٹے ساتھ تھے شوہر کی جدائی کا احساس کم رہا...... میں اللہ کی اس بات پر بے حد شکر گزار ہوں کہ 31 کی صبح بروز منگل ڈاکٹر نے بیٹی سے کہا کہ اپنے بھائیوں کو امریکا سے بلالیں اور دعا بھی کریں کہ امریکا سے وہ بروقت پہنچ جائیں۔ دونوں کو معلوم تو تھا لیکن بکنگ نہیں کرائی تھی حالت اتنی سیریس ہے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ خدا کی قدرت ایک نے شکاگو سے قطر ایرویز بک کرائی چھوٹے نے شارلیٹ سے اور دونوں دوحہ سے پھر ایک ہی فلائٹ میں کراچی پہنچے۔ گو والد کی تو وفات بروز بدھ ساڑھے آٹھ بجے ہوگئی تھی لیکن انہیں یہ سعادت نصیب ہوگئی کہ باپ کو خود نہلایا، کفنایا اور لحد میں اتارا، بیٹے ہونے کا فرض ادا کردیا ورنہ بعض اوقات دور سے بچے پہنچ نہیں پاتے جب تک دونوں رہے مجھے کیا بیٹی اور نواسے، نواسیوں کو تنہائی کا احساس کم رہا مگر جب آگے پیچھے دونوں چلے گئے تو پتا چلا میں کتنی اکیلی ہوں حالانکہ بیٹی، داماد اللہ انہیں دونوں جہان کی خوشیاں نصیب کرے بے حد خیال رکھتے ہیں، بیٹی میں تو ویسے بھی باپ کی جان تھی کبھی اسپتال سے بہت تھکی ہوئی آتی اور اوپر چکر نہ لگاتی تو شکل دیکھتے ہی کہتے تھے۔ ''تم روزانہ آیا کرو تمہیں دیکھ کر میں زندہ ہو جاتا ہوں مجھ میں انرجی آجاتی ہے۔'' اب وہ بھی باپ کی باتیں یاد کر کے روتی ہے۔ ایک شخص کے جانے سے پورا گھر ویران ہوگیا۔ سناٹا ہی سناٹا ہے۔

میں اپنے تمام رشتے داروں، دوستوں اور پڑوسیوں سے دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے اس مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا۔ میرے بیٹوں کے دوست جنہوں نے بیٹوں کی جگہ پرذے داری سنبھالی بلکہ اسپتال آکر بلڈ بھی دیا پھر پاکیزہ اور جاسوسی ڈائجسٹ کی لبنیٰ خیال، آمنہ حماد اور پھر نزہت اصغر تعزیت کے لیے گھر تشریف لائیں۔ اختر شجاعت اپنے شوہر کے ساتھ آئیں اور عذرا رسول نے فون پر تعزیت کی اور علیل ہونے کی وجہ سے انہوں نے آنے سے معذرت بھی کی۔ اگر عام دنوں میں یہ لوگ آتے تو میں بے حد خوش ہوتی۔ میں خاص طور پر آنچل کے طاہر بھائی کی بھی ممنون ہوں جنہوں نے بہت اچھے الفاظ میں فیس بک پر میرے شوہر کے انتقال کی خبر لگائی۔

اب آپ سب لوگوں سے درخواست ہے کہ میرے شوہر کی مغفرت اور میرے لیے صبر کی دعا کریں کہ میرے دل کو کسی طرح قرار نہیں جتنا بھی پڑھوں ان کی بخشش کی دعا کروں لیکن لگتا ہے کسی جنگل میں رہ رہی ہوں اس قدر لوگ آرہے ہیں مگر دل کو جیسے قرار ہی نہیں، نیند، چین، قرار اور ہنسی جیسے میاں اپنے ساتھ ہی لے گئے۔

☆☆☆



محبت واخلاص کا پیکر... انسان دوست،

علم دوست معاشرے کے محروم طبقے

کی خدمت کا عزم رکھنے والی ہستی

عالمہ سعدیہ حبیب سے ایمان افروز گفتگو

عزیز قارئین...... ماہِ مارچ جہاں امتحانات کا مہینہ گردانا جاتا ہے وہیں دنیا بھر میں عالمی یوم خواتین بھی اسی ماہ منایا جاتا ہے کہ جب چند سیمنارز کانفرنس یا ذرائع ابلاغ پر چند پروگراموں کے ذریعے خواتین کی اہمیت اور حقوق بتائے جاتے ہیں جو اللہ پاک کے بہترین پسندیدہ دین، اسلام نے تقریباً ساڑھے چودہ

سو برس پہلے ہی بتا دیے ہیں۔ اب اس چارٹر پر عمل نہیں ہوتا تو وہ الگ بات ہے مگر حقوق و فرائض تو واضح ہیں۔ آپ کی بزم کے ان صفحات پر ہم زیادہ تر اپنی مصنفات سے بات چیت کرتے ہیں۔ اس مرتبہ اسی یوم کی مناسبت سے ہم نے سوچا کیوں نہ ایسی شخصیت کو متعارف کروایا جائے جو عین اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی صنف کی قابلیت و اہمیت کو اجاگر کر رہی ہیں اور دنیا پر یہ ثابت کر رہی ہیں کہ اسلام ہی وہ واحد جدید ترین اور روشن بین دین ہے جو ہر جاندار کے حقوق کی حفاظت کی تعلیم دیتا ہے اور جب بات اشرف المخلوقات کی ہو تو مرد و زن کی ذمے داریاں بیان کرتے ہوئے ان کے حقوق بھی واضح کرتا ہے۔ اگر ایک طرف حق ہے تو دوسری طرف اس کا کچھ فرض بھی ہے۔

آج خواتین مغرب کی تقلید میں مصنوعی آزادی کے نعرے بلند کرتی ہوئی اپنے گھروندے توڑنے کی کوشش میں خود ہی سرگرداں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک خاص مقصد کے تحت زندگی گزارنے کے لیے تخلیق کیا مگر اکثریت اس مقصدِ حیات کو بھول کر دنیاوی آسائشوں میں گم ہو کر زندگی گزار رہی ہے۔ مگر اسی میں چند مٹھی بھر افراد زندگی میں کوئی خاص مقصد لیے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایسا مقصد جو دوسروں کو فیض پہنچائے مخلوقِ خدا کے کام آئے...... ان چند افراد کو دیکھ کر ان کے کام اور ان کے جذبوں کی سچائی دیکھ کر اوروں کو بھی شاید احساس ہو کہ ہمیں بھی اپنی ذات کو دوسروں کے لیے نافع بنانا چاہیے۔ محبت، خلوص، ہمت و جرأت سے بھرپور یہ دبلا پتلا سا نازک، دھان پان سا وجود اپنے اندر بے حد محبت بھرا دل لیے ہوئے ہے۔

آج ہم ایک خاص شخصیت سے ملاقات کروا رہے ہیں جو ایک نہایت سادہ و سہل انداز میں دینِ حق کا عملی پرچار کر رہی ہیں اور خواتین کی اصل ذمے داریوں سے معاشرے کو روشناس کروا رہی ہیں۔ جی ہاں ہم بات کر رہے ہیں محترمہ سعدیہ حبیب صاحبہ کی جنہوں نے علم اور انسان ان دونوں چیزوں کو فوکس کیا کہ ہر ایک کے لیے قلم اور کتاب کتنی ضروری ہے کیونکہ علم ہی آپ کو شعور عطا کرتا ہے۔ سعدیہ صاحبہ نے سب سے زیادہ توجہ ان بچوں کی طرف دی جو ہمارے معاشرے کے دھتکارے ہوئے ہیں۔ سڑکوں پر بھیک مانگتے بچے، کچرا چنتے بچے، جن سے لوگ کراہیت کھائیں، آپ نے بہت ہمت و حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان بچوں کے لیے ایک اِن فارمل اسکول کھولا۔ ان کے لیے مفت یونیفارم، کتابیں اور دوسری ضروری اشیا کا



بچوں کو قرآنی درس دیتے ہوئے عالمہ سعدیہ حبیب



سعدیہ حبیب اپنے شریک سفر اور پیاری بیٹی کے ہمراہ

انتظام کیا۔ آج تقریباً 200 بچے وہاں پڑھ رہے ہیں۔ وہ غریب بچے جن میں پڑھنے کی امنگ ہے، جذبہ ہے مگر وسائل نہ تھے۔ آج ان بچوں کے چہروں پر جو معصوم خوشی نظر آتی ہے یہ سب محترمہ سعدیہ حبیب صاحبہ کی بے لوث محبت اور خلوص ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ یہ بچے دنیاوی اور دینی تعلیم سے آراستہ ہو کر معاشرے کے کارآمد فرد ثابت ہوں۔

ان کے بے لوث جذبوں اور مخلوقِ خدا سے محبت دیکھ کر دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ اللہ پاک ان کی نیک خواہشات کی تکمیل فرمائے، آمین۔ تو قارئین آیئے ہم ان سے معلوم کرتے ہیں یہ سب کیسے ممکن ہوا۔

پاکیزہ ✧......جی سعدیہ حبیب پاکیزہ کی طرف سے پہلے تو سلام عقیدت قبول کریں کیسا لگ رہا ہے ہمارے قارئین سے بات کرنا؟

سعدیہ حبیب ❖......وعلیکم السلام...... جہاں خلوص، اپنائیت اور قدر دانی ہو وہاں بات کرنا بے حد اچھا لگتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... اگر دیکھا جائے تو ہمارے معاشرے میں کئی ایسے افراد ہیں جو سماجی بہبود کے کام اور انسانیت کی خدمت کے کام کر رہے ہیں آپ کا کام کیسے ان سے جدا ہے؟

سعدیہ حبیب ❖......درست کہا نزہت آپ نے......کئی لوگ ہیں ہمارے معاشرے میں جو اس طرح کے کام کر رہے ہیں۔ مگر یہ بہت ناکافی ہیں، ہمیں بہت زیادہ ایسے لوگ چاہئیں جو اسی جذبے سے آگے آئیں اور یہ کام کریں......میرا کام تھوڑا سا مختلف اس لیے ہے کہ میں نے فوکس کیا ہے ان غریب بچوں پر جو سڑکوں پر بھیک مانگتے ہیں۔ گجرے لیے، جھاڑن لیے گاڑیوں کے پیچھے دوڑ رہے ہوتے ہیں اور ہر شخص ان کو دھتکار رہا ہوتا ہے۔ میں نے ان دھتکارے ہوئے، ٹھکرائے ہوئے بچوں کو اپنے ادارے میں لاکر تعلیم و تربیت کر کے معاشرے کے لیے فعال شہری بنانے کا سوچا اور اسی سوچ کے ساتھ میں ان کے لیے کام کر رہی ہوں تاکہ معاشرے میں وہ چور، ڈاکو یا لٹیرے بننے کے بجائے ایک فعال کردار ادا کریں۔ (یہ تو بہت ہی اچھی سوچ ہے۔)

پاکیزہ ✧......زندگی تو بہت قیمتی نعمت ہے اور آپ اپنے رب کی اس نعمت کا استعمال بہت عمدگی سے کر رہی ہیں۔ کیسے یہ سب کرنے کا خیال آیا؟

سعدیہ حبیب ❖......یقیناً زندگی اللہ کریم کی بہت قیمتی نعمت ہے۔ عمدگی سے تو نہیں بس کوشش کر رہی ہوں اور یہ میرے رب کی مجھ پر بہت مہربانی اور کرم ہے۔ اللہ کریم نے مجھے کچھ زیادہ ہی حساس دل عطا کیا ہے۔ لوگوں کی غربت، ان کی بے بسی، لاچاری نے میرے اندر بے حد دکھ بھر دیا پھر سوچا کہ ان کی بہتری کے لیے کام کیا جائے بس یہی سوچ تھی۔

پاکیزہ ✧......آپ کے گھر والے اور دوست احباب کس حد تک اس کام میں معاون ثابت ہوتے ہیں؟

سعدیہ حبیب ❖......گھر والوں کا بے حد تعاون

حاصل ہے۔ان کی بہت زیادہ سپورٹ ہے۔ بالخصوص میرے شوہر خالد اقبال نے ہر قدم پر، ہر جگہ میرے ساتھ تعاون کیا۔ اسی لیے میں اپنا کام سکون سے کر رہی ہوں اور یہ سب میرے اللہ کا خاص کرم ہے۔ (جی ہاں، گھر والوں کے تعاون کے بغیر یہ کام ناممکن ہے)

پاکیزہ ✧...... ویسے کچھ فلاحی کام کرنے لگو تو مختلف طبقوں اور گروہوں کی جانب سے عجیب، عجیب باتیں سننے کو ملتی ہیں۔آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟

سعدیہ حبیب ❖...... بالکل ٹھیک کہا ہے آپ نے...... ہر شخص اپنی ذہنیت، اپنی سوچ اور اپنے ظرف کے لحاظ سے بات کرتا ہے۔ کبھی بہت عجیب، عجیب جملے سننے کو ملتے ہیں۔مگر ان منفی سوچ کے حامل افراد کے ساتھ، ساتھ بہت مثبت سوچ کے لوگ بھی ہیں جو بے حد حوصلہ افزائی کرتے ہیں...... اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ منفی سوچ کے حامل افراد اس لیے بھی عجیب باتیں کرتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی نیکی یا بھلائی کا کام کرنے کی قوت ہوتی ہے اور نہ صلاحیت اور یہ دوسروں کو بھی کامیابی سے کام کرتا دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔ (بالکل درست کہا کچھ لوگوں کا یہ مزاج ہوتا ہے نہ خود اصلاحی کام کریں گے نہ کرنے دیں گے۔)

پاکیزہ ✧...... حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو ساتھ، ساتھ کیسے نبھایا جاسکتا ہے؟

سعدیہ حبیب ❖...... اگر ہم حقوق اللہ محبت اور خلوصِ نیت سے اپنے رب کے لیے ادا کریں تو یقیناً ہمارا رب ہمیں حقوق العباد کی ادائیگی کی توفیق عطا کرتا ہے وہی تو ہے جو ہمارے دل میں محبت اور رحم کے جذبات پیدا کرتا ہے اور پھر اللہ تک پہنچنے کا راستہ ہی اس کی مخلوق کے لیے نافع ہونا ہے۔

پاکیزہ ✧...... کہتے ہیں کہ حقوق العباد اپنے گھر سے شروع کرو یہ بات کہاں تک ٹھیک ہے؟

سعدیہ حبیب ❖...... یہ بات بالکل ٹھیک ہے اس کی ابتدا ہمیں اپنے گھر سے کرنی ہے۔ایسے کیسے ممکن ہے کہ ہم باہر والوں کی خدمت میں لگے رہیں اور ہمارے اپنے گھر والے ہماری ہمدردی و توجہ سے محروم رہیں۔ہمیں یہ توازن برقرار رکھنا ہے۔ (جی بالکل)

پاکیزہ ✧...... آپ کا شروع سے ہی ایسے مثبت اور فلاحی امور کی طرف دھیان تھا؟

سعدیہ حبیب ❖...... جب نوعمری کو چھوڑ کر شعور کی منزلیں طے کیں اور تعلیم مکمل ہوئی تو اپنے لوگوں کی غربت، بھوک افلاس، تعلیم سے محرومی ان چیزوں کو دیکھ کر بہت ڈھیر سارا دکھ میرے اندر اتر گیا۔ اپنے لوگوں کو اس حال میں دیکھتی ہوں تو بہت شدت سے دل کرتا ہے۔ کاش میں یہ سب کچھ بدل سکتی...... جہالت کو تعلیم میں، بھوک اور غربت کو خوشحالی میں، میں اپنے لوگوں کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں، ہمارے معاشرے میں سب سے بڑی کمی اور خامی تعلیم اور شعور کی کمی ہے۔تو بس شروع ہی سے ان امور کی طرف دھیان رہا۔

پاکیزہ ✧...... ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کو ایک خاص حد تک آزادی ہے آپ تمام شرعی حدود و قیود کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کیسے اپنے امور انجام دیتی ہیں؟

سعدیہ حبیب ❖...... یہ اللہ کا بہت کرم ہے کہ میں اپنے تمام کام شرعی حدود و قیود کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بہ آسانی سرانجام دیتی ہوں۔دیکھیے اسلام نے عورت کو بے حد عزت بخشی ہے، عورت کو کہیں پر بھی کام کرنے سے روکا نہیں...... حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ گھر اور باہر کے کام کس کامیابی سے سرانجام دیتی تھیں۔ (بے شک)

پاکیزہ ✧...... آج کی نسل کے پاس معلومات کا انبار ہے، بے انتہا ذرائع ہیں، ہم کیسے انہیں ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے تربیت دے سکتے ہیں جبکہ گمراہی اور بے راہ روی کی چکا چوند زیادہ طاقتور معلوم دیتی ہے؟

سعدیہ حبیب ❖...... دورِ جاہلیت میں جہاں نہ

سوشل میڈیا تھا اور نہ معلومات کے دوسرے ذرائع اور نہ اتنی ترقی تھی اس تاریک اور جاہل معاشرے میں میرے آقا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد نے اس جاہل معاشرے کو انتہائی تہذیب یافتہ بنادیا اور مسلمانوں کی ترقی کو بے مثال بنایا......وہ ان کے عروج کا زمانہ تھا۔ تو ان کا کردار ہمارے لیے رول ماڈل ہے اور ہم ان کے اسوۂ کو اپنا کر ہی ایک سچے مسلمان کی تربیت دے سکتے ہیں۔ (بالکل درست کہا اور اللہ پاک اس بات کی توفیق ہر صاحب ایمان کو دے، آمین۔)

پاکیزہ ◇......کیا اس طرح کے فلاحی اور دینی امور کی انجام دہی میں خطیر پیسہ ہونا شرط ہے؟

سعدیہ حبیب ❖......خطیر رقم ہونا شرط نہیں جذبے کا سچا ہونا ضروری شرط ہے۔ جب آپ کی نیت میں سچائی اور خلوص ہو تو پروردگار ان امور کے لیے غیب سے انتظام کردیتا ہے کہ وہی مسبب الاسباب ہے۔ (بے شک)

پاکیزہ ◇......سعدیہ صاحبہ! یہ کام بلاشبہ اللہ کی مدد اور توفیق سے ہی ممکن ہے آپ بچوں کو کیا درس دیتی ہیں؟

سعدیہ حبیب ❖......بچوں کے لیے پہلا درس تو یہی کہ نہایت سنجیدگی اور دل جمعی سے اپنی تعلیم حاصل کرنے پر توجہ دیں، دین کی تعلیم کے ساتھ، ساتھ دنیاوی تعلیم بھی حاصل کریں کہ علم روشنی ہے اور اس کی روشنی میں ہی آپ کو آگے بڑھنے کا راستہ مل سکتا ہے۔ (بے شک اسی سے معاشرہ بھی ترقی کرتا ہے)

پاکیزہ ◇......کیا ایک عورت، لڑکی شرعی پردے میں رہ کر روزمرہ کے امور بخیر وخوبی انجام دے سکتی ہے۔ مثلاً جس طرح آپ کام کررہی ہیں؟

سعدیہ حبیب ❖......ہماری کچھ خواتین نے اسے مسئلہ سمجھ لیا جبکہ ایسا قطعاً نہیں ہے تھوڑا مشکل ضرور ہے جو کہ عادت نہ ہونے کی وجہ سے لگے گا مگر ناممکن ہرگز نہیں مجھ جیسے بہت لوگ ہیں جو شرعی پردے میں رہ کر اپنے تمام کام بہت خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔

پاکیزہ ◇......کچھ اپنی مصروفیات کی تفصیل بتائیں گی کہ کس طرح سے کاموں کی منصوبہ بندی کرتی ہیں؟

سعدیہ حبیب ❖......صبح میں میری گھریلو مصروفیات ہوتی ہیں، دوپہر میں، میں ادارے میں ہوتی ہوں جہاں کلاسز بھی لیتی ہوں، بچوں کے معاملات دیکھتی ہوں۔ شام میں بہت ساری خواتین ہیں جو اپنے مسئلے مسائل کے ساتھ آتی ہیں۔ ان کے لیے جو کچھ ہوسکتا ہے کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ ادارے میں دوسری اور بھی نشستیں، محافل، مجالس دیگر تقریبات ہوتی ہیں ان کو بھی دیکھنا ہوتا ہے اور پھر رات میں پڑھنا ہوتا ہے کہ ہمارے لیے مطالعہ بہت زیادہ ضروری ہے تو بقیہ وقت اسٹڈی میں گزر جاتا ہے۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ◇......ان امور کے علاوہ کیا مشاغل یا مصروفیات ہیں؟

سعدیہ حبیب ❖......یقین کیجیے گا نزہت! اتنی زیادہ مصروفیات ہیں کہ اپنے مشاغل کے لیے وقت ہی نہیں۔

پاکیزہ ◇......ایسی مصروفیات میں تو گھر والوں کے ساتھ مل بیٹھنا، دکھ سکھ کہنا سننا کس طرح کرتی ہیں؟

سعدیہ حبیب ❖......گھر والے میرے بہت ہی کوآپریٹو ہیں میرے معاملات میری مصروفیات دیکھ کر بہت جگہ انڈر اسٹینڈ کرلیتے ہیں...... مگر پھر بھی میری کوشش ہوتی ہے جتنا بھی ہوسکے میں ان کے ساتھ وقت گزاروں۔

پاکیزہ ◇......امورِ خانہ داری سے کس حد تک دلچسپی ہے؟

سعدیہ حبیب ❖......امور خانہ داری سے دلچسپی تو بہت ہے مگر وقت کی کمی کے باعث یہ صرف ذمے داری تک ہی محدود ہے۔



سعدیہ حبیب کے اسکول میں معصوم نونہال حصول علم کرتے ہوئے

پاکیزہ ✧...... کچھ اپنی پسند نا پسند...... جیسے پسندیدہ لباس، موسم، پھول، ذائقہ، ڈش، کوئی تفریح مقام، کوئی کتاب، پسندیدہ شخصیت، پسندیدہ جملہ، وقت، رشتہ وغیرہ......؟

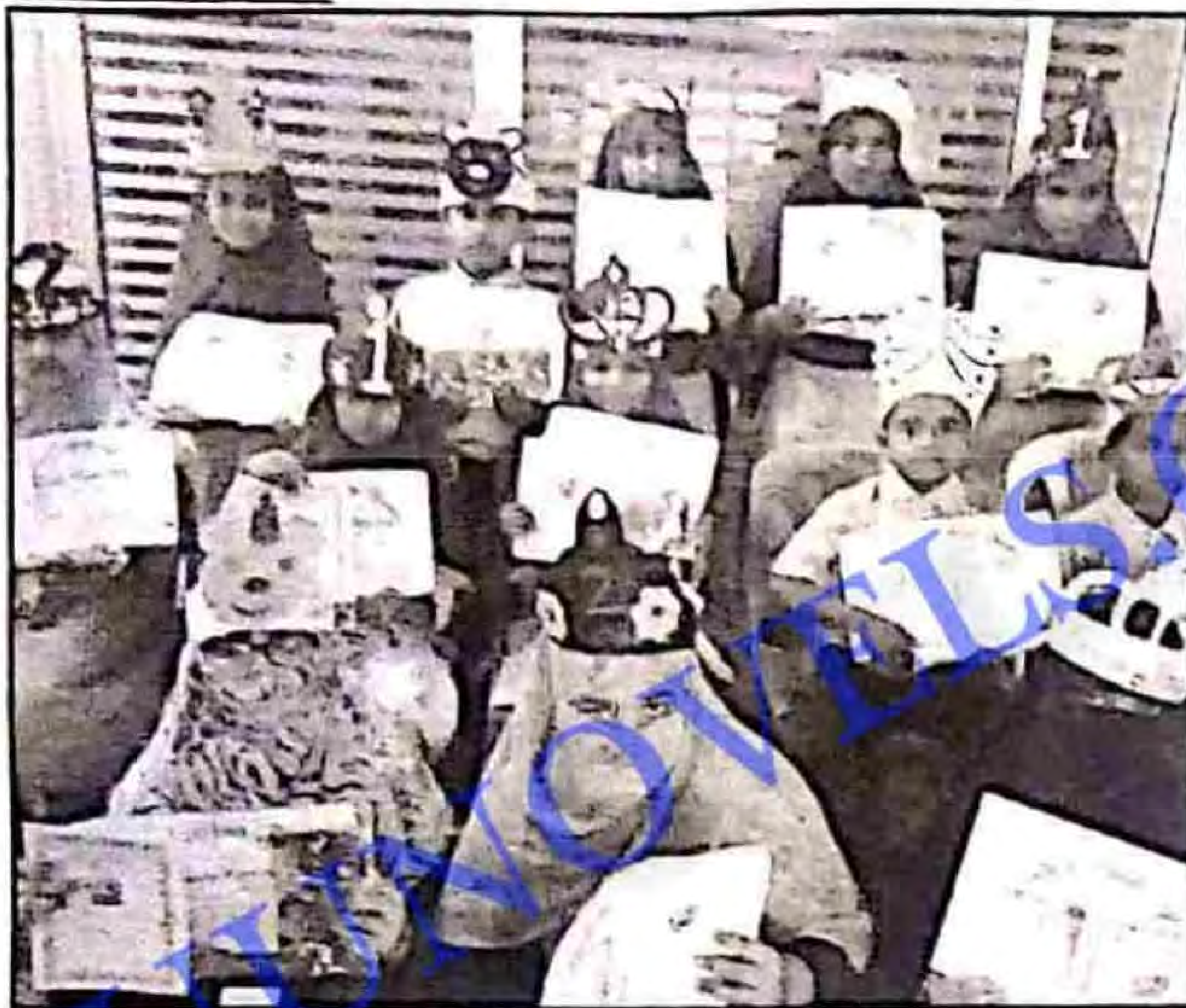
سعدیہ حبیب ❖...... پسندیدہ لباس انتہائی سادہ لباس جو شلوار قمیص پر مشتمل ہے۔ موسم، سردی کا پسند ہے۔ پھول تو سارے ہی اچھے لگتے ہیں۔ کھانے میں ہر چیز کھالیتی ہوں کوئی خاص پسند نہیں، ذاتی طور پر مجھے کھانے سے کوئی شغف نہیں۔ بس اتنا کھانا جتنا جینے کے لیے ضروری ہے۔ پسندیدہ تفریحی مقام بھی میرے لیے میرا ادارہ ہے جو میرا مقصدِ حیات ہے۔ (ماشاءاللہ) ...... قرآن کریم سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں، پسندیدہ شخصیت میرے پیارے آقا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔ رشتہ والدین کا جو بے لوث ہے۔

پاکیزہ ✧...... آپ کے نزدیک دنیاوی تعلیم اور دینی تعلیم کس حد تک ایک نوجوان کے لیے ضروری ہے؟

سعدیہ حبیب ❖...... ایک نوجوان کے لیے دونوں ہی تعلیم ضروری ہیں، دینی تعلیم اور دنیاوی تعلیم دونوں ہی حاصل ہونے پر آپ کی شخصیت میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔ اپنے معاشرے پر ہی نظر ڈالیں جن کے پاس یہ دونوں تعلیمات ہیں وہ معاشرے میں کس قدر مثبت رول ادا کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس آپ کسی ایک کو نظر انداز کریں تو کمی رہ جاتی ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں اس قدر جو بگاڑ ہے وہ دینی تعلیم سے محرومی ہے۔ جو کہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ایک ضروری وضاحت کردوں کہ دینی تعلیم کبھی انتہا پسندی کی طرف نہیں لے جاتی۔ کئی ڈاکٹرز ہیں انجینئرز ہیں جو عالمہ اور مفتی ہیں۔ دونوں تعلیمات آپ کی شخصیت اور کردار کو نکھارتی ہیں۔ (بالکل درست کہا۔ سعدیہ، قرآن پاک کی تفسیر آپ کو زندگی گزارنے کا سلیقہ بتاتی ہے، تبھی تو اسے مکمل ضابطہ حیات کہا جاتا ہے۔)

پاکیزہ ✧...... کیا دین سے بے بہرہ لڑکی ایک نسل کی تربیت اچھی طرح کر سکتی ہے؟

سعدیہ حبیب ❖...... آج معاشرے میں جتنی تکلیف دہ برائیاں نظر آرہی ہیں وہ دین سے دور رہنے والی ماؤں کی وجہ سے ہیں۔ اگر ان کے پاس دینی سمجھ بوجھ ہوتی تو آج ہم اخلاقی طور پر اس قدر پستی کا شکار نہ ہوتے...... یہ تو قطعاً ناممکن ہے کہ ایک دین سے بے بہرہ لڑکی ایک نسل کی بہتر تربیت کر سکے کیونکہ اس کے پاس



غلط اور صحیح کا شعور ہی نہیں...... جانور بھی اپنے بچوں کو پال لیتے ہیں۔ بچوں کا پالنا اور ان کے کردار کو بنانا دو الگ باتیں ہیں......اور ماں کی گود بچے کے لیے پہلی درس گاہ ہے۔ (آپ نے بالکل درست کہا ہے اکثر خواتین یہ جملے دُہراتی ہیں کہ ہم نے ایسے ہی تو بچے نہیں پال لیے ہیں۔ بے شک بچے تو سبھی پال لیتے ہیں مگر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تعلیم و تربیت کرنا ہی اصل حقِ پرورش ادا کرنا ہے تاکہ وہ اپنا مقصدِ حیات جان لیں۔)

پاکیزہ ✧......فی زمانہ بیرونی ثقافت ہم پر اپنا رنگ جما چکی ہے چاہے پڑوسی ملک ہو یا دیگر اسلامی و غیر اسلامی ممالک......اس سے کس طرح بچا جا سکتا ہے؟

سعدیہ حبیب ❖......بالکل درست کہا آپ نے......بیرونی ثقافت کی یلغار نے ہماری نسل کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے......پھر موبائل فون کا بے جا استعمال اور پھر میڈیا کی آزادی نے کسر پوری کردی ہے۔ فیشن کے نام پر عریانیت نے معاشرے میں حد درجہ بگاڑ پیدا کر دیا ہے۔ اور اس سے صرف اسی طرح بچا جا سکتا ہے کہ ان کردار تباہ کرنے والی چیزوں کو کنٹرول کیا جائے۔ اس پر چیک رکھا جائے اور اپنی اولاد کو برے بھلے کی تمیز سکھائی جائے اور یہ جب ہی ممکن ہوتا ہے جب آپ ان کے لیے خود رول ماڈل بنیں۔ اسی لیے کہتی ہوں کہ آج کے والدین کو اپنی اولاد پر انتہائی توجہ کی ضرورت ہے ان کو وقت دیں۔ ان کی اخلاقی تربیت کریں......کیونکہ جب ایک بچے کی بنیاد کو مضبوط کر دیا جائے تو پھر بگڑنے کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں......اور یہاں ماؤں کی بھرپور توجہ درکار ہے۔ مگر افسوس آج کی ماں کو جو وقت اپنے بچے کو دینا چاہیے وہ نہیں دے رہی۔ انہیں سہولیات تو دیتی ہیں مگر جو اصل تربیت دینی چاہیے اس سے آگاہ نہیں۔

پاکیزہ ✧......ایک مثالی مسلمان لڑکی، عورت کیسی ہونی چاہیے؟

سعدیہ حبیب ❖......دینی اور دنیاوی تعلیم سے آراستہ......شرم و حیا کی پیکر، سچائی کی حامل اور پاکیزہ کردار کی مالک۔

پاکیزہ ✧......لوگوں کے تلخ رویوں پر کس طرح کا ردِعمل دیتی ہیں؟

سعدیہ حبیب ❖......صرف مسکرا کر خاموش ہو جاتی ہوں۔ کبھی کوئی ردِعمل نہیں ظاہر کرتی۔

پاکیزہ ✧......اپنی ماؤں، بہنوں کو کیا پیغام دیں گی؟

سعدیہ حبیب ❖......ماؤں اور بہنوں سے یہ ضرور کہنا چاہوں گی کہ خدارا کائنات کی سب سے عظیم کتاب قرآن کریم سے جڑ جائیں محض تلاوت نہیں بلکہ اسے سمجھ کر پڑھیں۔ اس کو جانیں اور اسے اپنی زندگی میں شامل کریں پھر دیکھیے کہ آپ کی زندگی کس قدر آسان اور

پُرسکون ہو جائے گی۔ (بے شک، سبحان اللہ)

پاکیزہ ✧...... ہماری بزم میں آمد کا بہت شکریہ کہ آپ نے ہماری درخواست کو قبول کیا اور اپنی بے پناہ مصروفیات سے وقت نکالا۔ آپ کیا کہیں گی اس بارے میں؟

سعدیہ حبیب ❖...... سب سے پہلے تو آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے اپنی خوب صورت بزم میں آمد کی دعوت دی اور مجھے اپنی بات کہنے کا موقع دیا...... جزاک اللہ خیر۔

پاکیزہ ✧...... مزید اس سلسلے میں کس قسم کا تعاون درکار ہے یا آپ اپنے اردگرد کے لوگوں سے کیا امید کرتی ہیں؟

سعدیہ حبیب ❖...... امید تو میں نے ہمیشہ اپنے رب سے لگائی لوگوں سے قطعاً نہیں اور یہ سب میرے رب کا کرم اور اس کا فضل ہے کہ وہی میرے تمام دینی اور فلاحی کاموں کو چلا رہا ہے...... جہاں تک لوگوں کے تعاون کا معاملہ ہے تو ابھی کچھ حساس دل رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ مجھے بھی خیر پُرخلوص اور محبت کرنے والوں کا تعاون حاصل ہے مگر یہ آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ کاش کارِ خیر کے کاموں میں ہر صاحبِ حیثیت کے دل میں یہ جذبہ اجاگر ہو جائے۔ (آمین)

پاکیزہ ✧...... اب تک کی زندگی کا نچوڑ اور ہماری حیات کا جوہر آپ کے نزدیک کیا ہے۔ تین جملوں میں بیان کریں۔

سعدیہ حبیب ❖......

1 اللہ تعالیٰ کی معرفت۔

2۔ حیات طیبہ کی پیروی۔ 3۔ فکرِ آخرت۔

پاکیزہ ✧...... کیا آپ صرف خواتین اور لڑکیوں کی ہی تربیت پر زور دیتی ہیں یا پھر نوعمر لڑکے اور بچوں کو بھی ان ہی امور کی تعلیم و تربیت دیتی ہیں؟

سعدیہ حبیب ❖...... تعلیم دونوں کے لیے ہی یکساں اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں صنف کی کوئی شرط نہیں اور یہی میرے دین کا حُسن بھی ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے لیے تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ میرے ادارے میں خصوصاً نوعمر لڑکے (دس سال کی عمر تک) ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... ہم آپس میں ایک مسلمان اور پھر ایک پاکستانی کی حیثیت سے کس طرح ایک دوسرے کے لیے منفعت بخش ہو سکتے ہیں کہ جس سے ہمارا رب راضی رہے؟

سعدیہ حبیب ❖...... اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور یہ ہمیں سب سے پہلے انسانیت کا درس دیتا ہے۔ ایک مسلمان بھائی کے حقوق دوسرے مسلمان بھائی پر کیا ہیں، یہ میرے اللہ نے اپنی کتاب میں واضح طور پر بتا دیا ہے کہ ہمیں ان کے ساتھ کس طرح کے معاملات کرنے ہیں...... محبت، حسنِ اخلاق، عفو و درگزر، رواداری ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کے کاموں میں تعاون...... اور بھائی چارہ...... پھر بحیثیت پاکستانی ہمیں ایک قوم ایک ملت بن کر رہنے کی ضرورت ہے کسی بھی قسم کی گروہ بندی، فرقہ بندی اور عصبیت سے بالاتر ہو کر ایک بہترین مسلمان اور پاکستانی بن کر سوچیں گے تو یقیناً ایک دوسرے کے لیے منفعت بخش ثابت ہوں گے۔

پاکیزہ ✧...... آپ نے تو اپنا مقصدِ حیات پالیا...... ان نوجوان بچوں کی رہنمائی کے لیے کیا کہیں گی جو دینی تعلیم کو دقیانوسیت خیال کرتے ہیں؟

سعدیہ حبیب ❖...... میں قطعاً دینی تعلیم کو دقیانوسیت نہیں قرار دے سکتی یہ تو بیمار سوچ ہے جو مرہونِ منت ہے ان گودوں کی جہاں یہ نوجوان پروان چڑھے ہیں۔ بیمار ذہنیت، بیمار سوچ، درحقیقت ہم نے دینی تعلیم کو سمجھا ہی نہیں، جانا ہی نہیں...... دورِ جاہلیت میں جب اسلام آیا اور قرآن کی تعلیم عام ہوئی تو یہ دورِ اول کے مسلمان (صحابہ کرامؓ) ہی تھے کہ مسلم معاشرے نے کس قدر عروج پایا...... اور آج آپ دنیاوی تعلیم میں آگے بڑھ رہے ہیں اور اسے حاصل کر کے آپ

نے اب تک کون سا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ موازنہ کیجیے آج کے دور کا اس دور سے...... رزلٹ آپ کے سامنے آجائے گا۔ آج صرف دنیاوی تعلیم نے مسلمانوں کو بے بس، مجبور لاچار اور پستیوں میں گرا دیا ہے۔ جبکہ آج غیر مسلم ہمارے اس قرآن پاک کو کہ جس میں علوم کا خزانہ پوشیدہ ہے اس پر تحقیق کر رہے ہیں اور اس الہامی کتاب سے متاثر ہو کر وہ مسلمان ہو رہے ہیں۔ ایسے کتنے سائنس دان ہیں جو قرآنی ریسرچ کے بعد مسلمان ہوئے ہیں...... پھر آپ بتایئے یہ دقیانوسیت کیسے ہو سکتی ہے؟ (جی ہاں ریاضی کے اصول، کائنات کی بناوٹ، سورج، چاند، ستاروں کا علم ہمارے ہی مسلمان سائنسدانوں نے دریافت کیا اور یہ سب ان کی قرآنی علوم سے وابستگی کا ہی ثمر تھا جسے غیروں نے اپنا لیا اور ہم نے بھلا دیا)

پاکیزہ ✧...... قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں جدید علوم کی تعلیم کس حد تک اہمیت کی حامل ہے؟

سعدیہ حبیب ❖...... یہ تفریق ہماری اپنی پیدا کردہ ہے...... علم ہے جاننا...... اور قرآن تو پوری کائنات کا علم اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ ہر خشک و تر کے علوم ہیں اس میں۔ اس میں قیامت تک کے واقعات، ایمانیات، اخلاقیات، معاشرے میں ہونے والے تمام انسانی مسائل ان کا حل اور دنیا کا ہر علم قرآن میں موجود ہے۔ یہ تو ہماری اپنی کمی، اپنی کوتاہی ہے کہ ہم یہ بات سمجھ نہیں پا رہے...... جبھی اس کی معرفت سے دور ہیں۔ یہ قرآن کا علم ہی تو ہے جو جدید علوم کی رہنمائی کر رہا ہے۔

پاکیزہ ✧...... کیا آج نوجوانوں کا طرزِ فکر بدلنے کی ضرورت ہے یا پھر انہیں زمانے کی گردشوں کی زد میں چھوڑ دینا چاہیے کہ خود ہی اپنی راہ چن لیں؟

سعدیہ حبیب ❖...... بے شک آج کے نوجوان کا طرزِ فکر بدلنے کی یقیناً ضرورت ہے اور انہیں کسی صورت ان کے حال پر چھوڑا نہیں جا سکتا۔ ان کی سوچ بدلیں ان کی کاؤنسلنگ کریں۔ انہیں بتائیں کہ ہمارے نزدیک آئیڈیل شخصیت ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے...... ان کی حیات ہمارے لیے عملی نمونہ ہے اور اس کو اپنا کر اس کی پیروی کر کے ہی آپ اپنی دنیا اور آخرت سنوار سکتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... ایک اسلامی معاشرے میں گھر کا مثالی ماحول کیسا ہونا چاہیے......؟

سعدیہ حبیب ❖...... اسلامی معاشرے میں مثالی گھر کا ماحول...... جہاں محبت ہو، امن ہو، حسن سلوک، رواداری ہو ایک دوسرے کے لیے برداشت، عفو و درگزر ہو اور جہاں [illegible] وہ گھر امن و سکون کا گہوارہ ہوگا۔ ([illegible])

پاکیزہ ✧...... بہت شکریہ سعدیہ صاحبہ کہ آپ نے اپنی قیمتی مصروفیات سے ہمارے لیے بھی وقت نکالا اور آپ کے زریں خیالات سے یقیناً ہمارے قارئین بھی مستفیض ہوئے۔ کیونکہ جو خود عملی طور پر اپنے خیالات کا پرچار کر رہا ہوتا ہے اسی کی بات میں اثر بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے اس نیک کام میں ثابت قدم رکھے اور آپ کے ذریعے دوسروں کو بھی اس کی ترغیب ملتی رہی۔

☆☆☆

جی تو قارئین! یوم خواتین کے حوالے سے اس مرتبہ عالمہ سعدیہ حبیب کی آمد کیسی لگی ضرور بتایئے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ صرف نعرے بازی سے خواتین کو حقوق نہیں ملتے، اس کے لیے علم اور آگہی کی ضرورت ہے۔ بس اسی پیغام کے ساتھ اجازت کہ خواتین اپنے منصب، منزلت اور اپنی طاقت کو پہچانیں اور اپنے مثبت اور تعمیری طرزِ فکر اور عمل کے ذریعے آنے والی نسلوں کی تربیت کریں۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

خواتین کی اعلیٰ تعلیم اور منصب مسئلہ کیوں؟

شائستہ زریں

زندگی بھر ایک ہی کارِ ہنر کرتے رہے
اِک گھروندا ریت کا تھا، جس کو گھر کرتے رہے

محبت، وفا، ایثار، قربانی اور گھر کو گھر بنا کر رکھنے کی آرزو عورت کی جبلت میں شامل ہے۔ خواہ اُس کے لیے خود کو مٹانا ہی کیوں نہ پڑے۔ اپنے گھر کو جنت نظیر بنانے کے لیے عورت ہر قربانی دیتی ہے۔ "ایک کامیاب عورت وہ ہے جو اُن ہی پتھروں سے گھر تعمیر کرے جو لوگ اُس پر پھینکتے ہیں" کے مصداق خود کو منوا لیتی ہے۔ گھریلو سطح پر بیشتر مرد یہ تیشے خود سے بڑھ کر تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدے پر فائز عورت پر برساتے ہیں تو دفتر میں ساتھی خواتین کی یہ برتری بھی اُن پر سخت گراں گزرتی ہے۔ شاید اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ صنفِ قوی ہونے کے ناتے وہ اس فوقیت پر اپنا حق صنفِ نازک سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُن کے اندر یہ خوف کنڈلی مارے بیٹھا ہوتا ہے کہ کہیں تعلیم اور عہدے کی طاقت اس ناتواں عورت کو اس حد تک توانا نہ بنادے کہ وہ اُن پر حاوی ہو جائے۔ نتیجتاً عورت کو کمتر ثابت کرنے کے لیے ہر مرد اپنی فطرت کے مطابق مختلف حربے استعمال کر کے اُن پر وار کرتا ہے اور ضرب جتنی کاری ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ شاید اُن کی مردانگی کو تسکین ملتی ہے لیکن مضروب عورت کی ذہنی و جسمانی صحت اِس قدر متاثر ہوتی ہے کہ دفتری ذمّے داریاں اور گھریلو اُمور دونوں ہی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ باشعور خواتین اِن تکلیف دہ حالات کا مقابلہ نہایت صبر، تحمل، استقامت، حوصلے اور دانائی سے کرتی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اس صورتِ حال میں خواتین اپنے رویّے سے یہ بھی ثابت کردیں کہ اُن کو اپنی تعلیم، عہدے، ترقی اور کامیابی پر گھمنڈ نہیں فخر ہے۔ جب مرد حضرات اُن خواتین کی آنکھوں اور رویّے میں اپنے لیے حقارت کے بجائے عزت واحترام دیکھیں گے تو اخلاقی طور پر ہی نہیں نفسیاتی طور پر بھی اُن پر اس کا خوشگوار اور مثبت اثر پڑے گا کہ بہر حال وہ اُن خواتین سے برتر ہیں۔ یوں تمام وسوسے اپنی موت آپ مرجائیں گے اور خواتین کے ساتھ اُن کے منفی رویّوں میں مثبت تبدیلی بھی آجائے گی۔

تعلیم اور ملازمت کے میدان میں خواتین کی ان تھک محنت، کامیابی اور ترقی پر نا سمجھ مردوں کے بے رحم رویّوں، خواتین پر اس کے اثرات اور مردوں کی سوچ میں تبدیلی کے حوالے سے یہ ہمارے خیالات تھے لیکن اس ضمن میں دیگر خواتین کی کیا رائے ہے یہ جاننے کے لیے ہم نے چند خواتین سے معلوم کیا کہ......

سوال ۱:: عموماً دیکھا گیا ہے کہ بیشتر مرد خود سے زیادہ تعلیم یافتہ اور بڑے عہدے پر فائز خواتین سے خائف ہوتے ہیں؟ آپ کے خیال میں اِس کا بنیادی سبب کیا ہے؟

سوال ۲:: مردوں کے یہ رویّے خواتین پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں؟

سوال ۳:: اِس سوچ میں تبدیلی کیسے ممکن ہے؟

افسر سلطانہ
(معلمہ، قلمکار)

۱: بیویاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں یا اعلیٰ عہدوں پر فائز۔ اکثر دونوں صورتوں میں شوہر کے لیے خطرے کی گھنٹی ثابت ہوتی ہیں، اِس کا اصلی سبب مردوں کا احساسِ کمتری ہے۔ ساتھ میں پھلجڑی چلانے والے، آگ

لگانے والے، انگارے دہکانے والے اور ہوا دینے والے ہوتے ہیں۔ کم تعلیم یافتہ شوہر بات، بات پر بیوی کو طعنوں تشنوں سے چھلنی کرتا رہتا ہے، بیوی سے مشورہ کرنا توہین کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر وہ دکھی ہے، کسی دفتری الجھن میں گرفتار ہے یا خاموشی اختیار کر لے تو مغرور ہونے کا لیبل لگانے کو تیار۔ کسی جھنجلاہٹ کا تعلق فوراً اس کی تنخواہ سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کی تنخواہ صرف واجبات کی ادائیگی میں ہی نہیں بلکہ دعوتوں میں بھی اڑائی جاتی ہے اور جو ماں اور کنواری نندیں بھی جاہلِ مطلق ہوں تو اس کی کمبختی یقینی ہے۔ ہاں میں ہاں ملانے میں جو قلابے لڑاتی ہیں اس کا کوئی جواب ہی نہیں۔ ستم بالائے ستم وہ پڑھی لکھی ہے اس لیے خدمت بھی کرتی ہے' بالکل اسی طرح جس طرح کم پڑھی لکھی خواتین کرتی ہیں لیکن اس کو پاسنگ مارکس بھی نہیں ملتے۔



۲: بس یہ سب ان خواتین پر اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ...... کچھ کہا بھی نہ جائے اور چپ رہا بھی نہ جائے۔

پڑھی لکھی عورت ہو، ماں کے درجے پر فائز ہو تو بھی ٹینشن فری نہیں ہو سکتی۔ اس کا تو ہائی جین کے اصولوں کے مطابق چلنا بھی مشکل بنا دیا جاتا ہے۔ میری دوست کا پہلا بچہ تھا، گھر کے تمام افراد اس کے لبوں کو چوم، چوم کر بچے کا برا حال کر رہے تھے۔ دادی ٹائپ خواتین کا تھوک اور کھانسی کے جراثیم اس محبت میں شامل ہو رہے تھے۔ بچہ بے چین ہونے لگا تو پڑھی لکھی ماں نے ادب سے مشورہ دیا کہ گالوں پر یا ہاتھ پر پیار کریں، منہ پر پیار کرنے سے جراثیم لگ جاتے ہیں۔ قصہ مختصر خواتین جراثیم بن کر بچے کی ماں کو لگ گئیں۔

۳: سوچ میں تبدیلی کھلے دل و دماغ کی متقاضی ہے۔ جب تک شوہر اپنی ذہنی سطح بلند نہیں کرتے جب تک یہ نہ سوچ لیں کہ "تعلیم یافتہ مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں، دونوں بہتر انداز میں سوچ سکتے ہیں، دونوں کی عقلی سطح بھی برابر ہو سکتی ہے۔ تعلیم دونوں کو برابر سنوارتی ہے۔ یہ صرف مرد کا ہی حق نہیں" تو تبدیلی آسکتی ہے ورنہ زیادہ تعلیم یافتہ خواتین کو یا تو کم تعلیم یافتہ مردوں سے شادی ہی نہیں کرنی چاہیے اور اگر کر بھی لیں تو وہ اور ان کے گھر والے کم از کم ان کی مثبت سوچ کو پرکھ لیں۔

نیر رباب
(قلمکار، براڈکاسٹر)

۱: میں سمجھتی ہوں اس کا سب سے بڑا سبب تربیت ہے۔ وہ مائنڈ سیٹ ہے جو بچپن ہی سے لڑکوں کے دماغ میں ڈالا جاتا ہے۔ اور جس طرح وہ اپنے والد کو اپنے گھر کی خواتین سے برتاؤ کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ بات سکھائی اور بتائی جاتی ہے کہ عورت کم عقل ہے، بیوقوف ہے اور مرد کی محتاج ہے۔ اس لیے جب مرد کی زندگی میں ایسی عورت آجائے جو اس کے برابر ہو یا برتر ہو تو اس کے اندر ایک جنگ شروع ہو جاتی ہے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ پھر اس میں کبھی برتاؤ خراب ہو جاتا ہے اور کبھی خوف شک کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مرد جب سمجھتا ہے کہ میں اس سے کم ہوں (عام طور پر) تو وہ کہتا ہے اس کو دبا کر رکھو، جلاؤ مت جاؤ تا کہ عورت اپنی عزت کی خاطر خاموش رہے یا پھر چھوڑ کر چلی جائے

۲: کئی انداز سے مرد کے برے رویے کا اثر پڑتا ہے۔ وہ اپنے اندر بند ہو جاتی ہے۔ introvert۔ بچوں کے ساتھ اس کا رویہ برا ہو جاتا ہے کیونکہ ان ہی پر اس کا بس چلتا ہے۔ نوکروں کے ساتھ بھی ایک حد تک رویہ برا ہو جاتا ہے۔ سسرال کے ساتھ برتاؤ بدل جاتا ہے۔ شوہر کے ساتھ محض وقت گزارا جاتا ہے خوشگوار زندگی کہیں چھپ جاتی ہے۔ اپنی ضروری



باتیں، مسائل اور پیسہ شوہر سے چھپانا شروع کر دیتی ہے۔

۳: ایک بالغ تعلیم یافتہ (ڈگری یافتہ) شخص کو تبدیل کرنے کے لیے بہت بڑا اجھگا چاہیے۔ ویسے تبدیل نہیں ہوگا۔ اس لیے یہ کام بچپن ہی سے شروع کرنا ہوگا۔ یہ کام اس عورت کو کرنا ہوگا جس کی زندگی ایسے مرد سے وابستہ ہوئی ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنے بیٹوں کو عورت کی عزت کرنا سکھائے۔ یہ بتائے کہ آپ کی بہن بھی آپ کے برابر ذہین ہے۔ آپ کی ماں ایک کامیاب پروفیشنل ہے۔ اس کا خیال کرو، عزت کرو، کم تر مت سمجھو، ان کے ساتھ مل کر سب کام کرو۔ یہاں سب سے بڑا عمل خود عورت کا ہوگا کہ وہ ایک بدمزاج شوہر کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے بھی، بچوں کو انتقامی رویے کی بھینٹ نہ چڑھائے بلکہ ان کا مائنڈ سیٹ ایسا بنائے کہ بڑے ہو کر ان کے رویے مثبت ہوں۔ یہ کام صرف ایک ماں کر سکتی ہے اور کوئی نہیں۔ جو کہ ایک عورت ہی ہوتی ہے۔

غزالہ نگار اورکزئی
(معلمہ، قلمکار)

۱: مغربی ممالک ہوں ہو یا مشرقی ایسے مرد ہر کہیں ہوتے ہیں اور اس کا سب سے بڑا سبب اعتماد کی کمی ہے خود اپنی ذات پہ بھی اور جس سے واسطہ ہے (چاہے وہ اپنی بیگم صاحبہ ہوں یا دفتر میں افسر اعلیٰ یا جامعہ میں خاتون استاد) ان کی عقل و دانش اور قوتِ فیصلہ پر بھی جب پدر سری معاشرے میں اپنی تحریر و تقریر سے، اپنی معاشرتی قدروں سے، اپنے رویے سے



بار بار "عورت ناقص العقل ہے، عورت کمزور ہے، عورت ناقابلِ اعتبار ہے" کی تکرار کرے گا تو ان معاشروں میں کیسے مرد سامنے آئیں گے؟ لیکن اس کے بھی دو اہم پہلو اور ہیں۔ ایک معاشرتی کہ کسی ملک یا قوم کا عمومی ماحول کیسا ہے؟ اور وہ ایک عورت کی صلاحیتوں کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے؟ اور دوسرا پہلو ہے گھریلو۔ ہر گھر کی اپنی ایک معاشرت بھی ہوتی ہے۔ اب وہاں گھر کی ماں، بیوی، بیٹی حتیٰ کہ ملازمہ سے بھی کیسا سلوک کیا جاتا ہے؟ اور اسے کس درجے پر رکھا جاتا ہے یہ سب بچے کی ذہنی و سماجی تربیت کرتے ہیں۔ اس کی فطری خامیوں اور خوبیوں کے لیے مہمیز ثابت ہوتے ہیں۔ وہی مرد اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت سے خائف رہتا ہے جو اسے، اس کی صلاحیتوں کے ساتھ قبول نہیں کر پاتا اور پھر اپنے رویے سے بڑی بدصورتی سے اس کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ لیکن جس مرد کو اپنی ذات اور قابلیت کا ادراک ہوتا ہے وہ اپنے کردار اور عمل کی شائستگی سے اس اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت کی پشت پر چٹان بن کر کھڑا رہتا ہے۔

۲: بداعتمادی کے رویے، عدم تعاون کا سلوک عورت کو آگے بڑھنے سے اور اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرنے سے روک دیتے ہیں۔ بہت کم عورتیں ایسے رویوں کا مقابلہ کر پاتی ہیں۔ غیر شادی شدہ ہوں تو پھر بھی اپنا مستقبل خود تراش لیتی ہیں۔ شادی شدہ ہوں تو ہزار مجبوریوں کی زنجیروں میں جکڑی عورت اس جدوجہد میں عمر کا بیشتر حصہ گزار دیتی ہے کہ دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلے۔ ایسی عورت جو مرد کے نشانے پر ہو بہت کم ایک متوازن اور روشن دماغ بچہ تخلیق کر پاتی ہے۔ اب یہ بھی سوچ لو اگر باصلاحیت عورت کو پُراعتماد مرد کا تعاون حاصل ہو تو وہ کیسا خاندان اور کیسی معاشرت تخلیق کریں گے۔ ہمارا ادب، افسانے اور کہانیاں ان مثالوں سے بھرپور ہیں۔ خود ہمارے معاشرے میں جو عورت سر اٹھائے کھڑی یا بولتی نظر آئے گی اس کی پشت پر ایک محبت کرنے والا باپ، بھائی یا شوہر ضرور ہوگا۔

۳: ویسے تو اس سوچ میں تبدیلی مرد کے تعاون سے آسان ترین راستہ ہے لیکن مرد کا تعاون ہی تو کار دارد ہے۔ بیشتر مرد یہ تو چاہتے ہیں کہ عورت ملازمت کے ذریعے اضافی آمدنی کا ذریعہ بنے لیکن گھریلو فیصلوں میں عموماً مرد ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ جہاں پر بھی بگاڑ پیدا ہوتا ہے ملبہ عورت کی آزادی اور تعلیم پر گرا دیا جاتا ہے یا پھر ساس اور بہو کی مسابقت کو ذمے دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ اب چاہے

ساس ہو یا ماں اس کا عموماً بچے کے ساتھ ایک بہت فطری اور خاص رشتہ ہوتا ہے۔ میاں اور ساس، بچے کو چوبیس گھنٹے تو نہیں رکھ سکتے (رکھتے ہیں تو غالباً بہت کم کیسز میں) ماں کا فرض ہے کہ بچے کو بہت محبت اور اعتماد کی فضا دے۔ جو بچہ ماں سے بے لوث محبت کرے گا اور کرتا ہی رہے گا وہ اسی آئینے میں دوسری خواتین کو بھی دیکھے گا۔ صرف اپنی محبت ہی نہیں عمر کے ساتھ تراش خراش بھی لازمی ہے۔ جس بچے کو زندگی کے پہلے سترہ اٹھارہ سالوں میں احتیاط اور محبت سے پالا جائے گا وہ اتنا ہی مضبوط اور پُراعتماد انسان بنے گا۔ ہر فرد کا معاشرے کی تشکیل میں متعین کردار ہوتا ہے۔ ماں سے آگے ان دیگر افراد کو بھی قدم، قدم پہ بچوں کو، نوجوانوں کو یاد دلانا چاہیے کہ خاندان کی معاشرے کی ان سے کیسی توقعات ہیں؟

تحریم زبیری
(ٹی وی آرٹسٹ)

ا: ہاں کسی حد تک یہ بات درست ہے لیکن اب مرد اور خواتین ایک ساتھ کام کرتے ہیں اس لیے اس رویے میں کافی فرق آ گیا ہے۔



۲: کچھ خواتین پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ کبھی مثبت کبھی منفی لیکن آج کی عورت کو ان سب چیزوں سے نمٹنا آ گیا ہے۔

۳: ناتجربہ کار خواتین ضرور تھوڑی دیر کے لیے پریشان ہوتی ہیں لیکن وہ لوگ جو اپنا کام جانتے ہیں ان کو ان چیزوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

راحیلہ مغل
(صحافی)

ا: یہ سچ ہے کہ بیشتر مرد خود سے بڑے عہدے پر فائز خواتین سے خائف ہوتے ہیں اس کی بنیادی وجہ ان کا احساسِ کمتری اور مردانگی دونوں ہیں۔

۲: شادی شدہ مرد اپنی بیوی کے اعلیٰ عہدے سے جیلس ہوتے ہیں اور اسے احساس دلاتے رہتے ہیں کہ



میں کم عہدے کے باوجود تم پر حاوی ہوں۔

۳: سوچ میں تبدیلی زیادہ سے زیادہ تعلیم اور علم کی وسعت حاصل کر کے کی جا سکتی ہے ورنہ جو مرد کم پڑھے لکھے ہوں وہ عورت کی تعلیم کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں اور اپنا احساسِ کمتری ختم کرنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح عورت کو مینٹل ٹارچر کیا جاتا ہے۔ ایسی عورتوں کو چاہیے کہ ایسے مردوں کی باتوں کی پروا نہ کریں۔

نورالعین نوید
(آر جے ایف ایم ۹۳)

ا: ممکن ہے کہ مرد یہ سوچتے ہوں کہ شرعی طور پر عورت پر مرد کو فضیلت حاصل ہے اور ہمارا معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے تو مجھ سے پڑھی لکھی عورت سر چڑھ کر بول سکتی ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ جس گھر میں مرد سے زیادہ پڑھی لکھی عورت آتی ہے تو سسرال والوں کو اس سے توقعات بھی بہت ہوتی ہیں کہ زیادہ تعلیم یافتہ ہے تو ذمے داریاں بھی زیادہ اٹھانی چاہئیں۔ خواتین ہی زیادہ بڑھ چڑھ کر بول رہی ہوتی ہیں۔ عورت ... خواہ مرد سے کتنی ہی پڑھی لکھی اور بڑے عہدے پر ہو آخری فیصلہ مرد کا ہی ہوتا ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کا کڑوا سچ ہے۔ لیکن سب جگہ تو ایسا نہیں ہوتا کیونکہ جو شوہر روشن خیال ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں آپ اپنی ویلیو کے حساب سے چلیں میں اپنی ویلیو کے حساب سے چلتا ہوں۔



۲: عموماً کم تعلیم یافتہ شوہر کی تعلیم یافتہ بیوی کی بہت ناقدری ہوتی ہے۔ گھر والے سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی تعلیم اور عہدے کا رعب جتائے گی چونکہ ہر عورت اپنا گھر بنا کر

رکھنا چاہتی ہے اس لیے ایسی صورت حال میں جب اس کی اعلیٰ تعلیم اور عہدہ مسئلہ بنیں تو وہ اپنی ڈگری ایک جانب رکھ کر خود کو ڈاؤن کر لیتی ہے۔ اور خود کو گھر، شوہر اور بچوں تک محدود کر لیتی ہے۔ اور جن خواتین کو ان کے شوہر اور گھر والے سپورٹ کرتے ہیں وہ معاشرے میں اچھی مثال قائم کرتی ہیں۔

۳: عموماً اس بارے میں شوہر سے زیادہ اس کے گھر والے سوچتے ہیں۔ اس لیے سوچ میں تبدیلی کے لیے مردوں کے ساتھ ساتھ ان خواتین کو بھی خود کو بدلنا ہوگا جو مردوں کو بہکاتی ہیں کہ بیوی زیادہ پڑھی لکھی ہے تو اس کو دبا کر رکھنا زیادہ بولنے نہ دینا۔

نازمین سلیمان

(نیوز کاسٹر پی ٹی وی کراچی مرکز)

۱: فرد کسی بھی معاشرے کا ایک حصہ ہوتا ہے اور پھر افراد سے مل کر ہی معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ لہٰذا جب کوئی ایک فرد کسی دوسرے فرد کو اپنے سے اعلیٰ درجے پر فائز ہوتے دیکھے اور خائف ہو تو یہ سوچ معاشرے کی عکاسی کر رہی ہوتی ہے کہ ہماری ذہنی بالیدگی کس طرح کے معاشرے میں پروان چڑھ رہی ہے۔ اس لیے ایسی سوچ کی وجوہات ہی معاشرے میں یکطرفہ فیصلوں کی بنیاد بنتی ہے اور پھر انفرادیت کو اجتماعیت پر ترجیح دی جانے لگتی ہے۔ چونکہ پیدائش سے بلوغت اور بلوغت سے بڑھاپے تک گھر سے لے کر، تعلیمی اداروں، دفتر یا کسی بھی ادارے میں یہ بات دیکھنے کو عام ملتی ہے کہ مرد کچھ بھی حاصل کرنے میں آزاد ہے کہ وہ گھر یا خاندان کا مختار ہے۔ لہٰذا یہی سوچ بچوں میں بھی منتقل کی جاتی ہے یا پھر فطری طور پر ہو جاتی ہے۔ معاشرے کو دیکھ دیکھ کر لڑکے کو لڑکی پر فوقیت ہوتی ہے اور عموماً ایسا گھر سے ہی ہوتا ہے کہ گھر والے بیٹے اور بھائی کی بات کو جو توجہ دیتے ہیں وہ بیٹی یا بہن کی بات کو نہیں دیتے۔ اور یہی سوچ بیٹے اور بھائی کو اس نوعیت تک لے جاتی ہے کہ وہ کہیں بھی خواتین کو اپنی صلاحیت سے زیادہ صلاحیت رکھتے نہیں دیکھ سکتا۔



۲: خواتین کی صلاحیتوں کو اہمیت نہ دینا اور ہمیشہ ان کو ایک ماتحت سمجھ کر رکھنا ان کی شخصیت کا نکھار ختم کرنے کو کافی ہوتا ہے۔ گھر داری سے ہٹ کر خواتین اچھی ٹیم لیڈر بھی ثابت ہو سکتی ہیں مگر جب اس بات کو پسند نہیں کیا جاتا تو وہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر نہیں کر پاتیں اور ذہنی دباؤ کا شکار رہتی ہیں۔ جب خواتین ایسی صلاحیت رکھتی ہیں جس کا استعمال وہ مکمل اعتماد سے اور فائدے کے طور پر کر نا جانتی ہوں اور اپنی اس مہارت پر ان کو مکمل گرفت ہو مگر باوجود اس کے اس کے انہیں آگے نہ بڑھنے دیا جائے تو ذہنی انتشار سے ان کا اعتماد ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور احساس کمتری کا شکار ہونے میں بھی انہیں دیر نہیں لگتی۔

۳: کسی بھی فرد کی سوچ کی بنیادی درسگاہ گھر ہوتا ہے۔ بیٹی کے ساتھ، ساتھ بیٹے کی تربیت میں بھی یہ بات شامل کریں کہ وہ گھر کی عزت ہیں۔ ان پر حرف آیا تو ان کے گھر پر حرف آئے گا۔ یہ بات بیٹی کو تو بتائی جاتی ہے بیٹے کو عموماً ایسا نہیں کہا جاتا اور یہی چیز دراصل شخصی امتیاز پیدا کرتی ہے یہی شخصی امتیاز اس مسئلے کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ مرد کا ایک وقار اور عزت ہے جو اسے معاشرے میں پوری، پوری ملنی چاہیے اور ملتی بھی ہے لیکن عورت کی صلاحیتوں کو تسلیم کرنے اور ان کو اجاگر کرنے میں پوری کوشش فراہم کرنی چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ دفتر میں ایک عہدہ صرف اور صرف مرد ہی سنبھال سکتا ہے اگر کوئی باصلاحیت خاتون اس عہدے کی اہل ہے تو اسے وہ عہدہ اس کی صلاحیتوں کے بدلے ملنا چاہیے۔

رشنا بتول

(منیجر ایڈورٹائزنگ ایجنسی)

۱: اس کا بنیادی سبب میں سمجھتی ہوں کہ ایک مدت سے عورت خاص کر برصغیر کی عورت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہوا ہے کہ عورت مشرقی ہے، چہار دیواری میں رہنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو بہت طاقت دی ہے۔ اگر عورت کی اچھی تعلیم ہے اور وہ کسی مرد پر انحصار

نہیں کرتی تو مرد ذات کو اس سے بہت خطرہ ہے۔ کیونکہ ایک عرصے سے وہ اسی خاص سانچے میں ڈھلی عورت کو دیکھنے کے عادی ہیں اور اپنے سے زیادہ تعلیم اور بڑے عہدے پر عورت کو دیکھنا ان کو اس لیے ناگوار گزرتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ "اعلیٰ" کا لفظ مردوں کے لیے ہی مختص ہے اور وہی اس تک پہنچ سکتا ہے۔ جیسا کہ انسانی فطرت ہے کہ کسی کو ہم کمتر سمجھتے ہیں ہر لحاظ سے تو بالخصوص جسے صنفِ نازک کہہ کر نازک سمجھ لیا ہے تو مرد کو اسی طرح دیکھنے کی عادت اور خواہش ہو جاتی ہے اور نہ دیکھے تو مرد کی انا کو ٹھیس پہنچے گی کہ جس کو ایک مدت سے میں ادنیٰ سمجھتا ہوں کیسے وہ مجھ سے بڑے عہدے پر ہو سکتی ہے اور اسی بات سے مرد خائف ہوتا ہے اور ایک وجہ یہ بھی ہے بچپن سے لڑکوں کو یہ نہیں بتایا جاتا کہ انسانی حقوق میں مرد عورت برابر ہیں اور اسلام میں بھی انسانی سطح پر مرد اور عورت کو برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ یہ جو بنیادی فرق بچپن سے رکھا گیا ہے جس کو عورتیں ہی آگے بڑھاتی ہیں بچپن سے ہی بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح دے کر۔



غلط چیز آسانی سے ہضم نہیں ہونی چاہیے لیکن جب بہت عرصے تک غلط کو صحیح بنا کر پیش کیا جائے تو بری نہیں لگتی یا کوئی بات ایسی نہیں لگتی کہ وہ عورت کی آزادی کے لیے مفید نہیں ہے۔ کرائسز کے وقت بیٹی کی بہ نسبت بیٹے کی تعلیم کو زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے کہ کون سا لڑکی کو گھر چلانا ہے۔ یہی سوچ جب وہ بچہ بڑا ہوتا ہے تو اس کے اندر آجاتی ہے کہ اعلیٰ کے لیے پہلا حق اس کا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ خود کو برتر سمجھ کر ناانصافی کرتا ہے۔

۲: خواتین سوچتی ہیں کہ میں نے جو بھی حاصل کیا ہے اپنے برتے پر کیا ہے کسی کا حق نہیں مارا تو پھر مجھ سے نفرت کیوں؟ جب وہ اس کا اظہار کر دیتی ہیں تو ان کے خلاف نازیبا باتیں کی جاتی ہیں جس سے بھی تہلکہ مچ جاتا ہے۔

عورت کے اعصاب متاثر ہوتے ہیں تو وہ خود کو اکیلا محسوس کرتی ہے، اپنے آپ کو دبا دیتی ہے، جاب چھوڑ دیتی ہے۔

۳: ہم کو شاہوں کی عدالت سے توقع تو نہیں
آپ کہتے ہیں تو زنجیر ہلا دیتے ہیں

اس کے لیے ضروری ہے کہ بچپن ہی سے لڑکوں کی تربیت میں یہ بات شامل کر دیں کہ لڑکا اور لڑکی برابر ہیں اور کائنات کی ہر چیز پر ہر انسان کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ اس کا۔ اپنی قابلیت اور اپنے بل بوتے پر لڑکی بھی کچھ بھی پا سکتی ہے۔ اس کی کامیابی سے حرص نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی اس کا برا مناکر اسے کمتر سمجھنا چاہیے۔

☆☆☆

قارئین من!

انسانی سطح پر مرد و زن کے مساوی حقوق، بلاصنفی امتیاز کامیابی اور ترقی کا شعور ہی دراصل خواتین کی کامیابی سے خائف ہونے سے مردوں کو روک سکتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں تعلیمی میدان میں لڑکوں کی بہ نسبت اعلیٰ سند یافتہ لڑکیوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔ جہاں اس فرق کے باوجود لڑکا لڑکی ازدواجی بندھن میں بندھ جاتے ہیں وہاں شادی کے بعد مرد کا احساسِ کمتری اُسے ستاتا ہے تو اُس کے بدترین رویے بیوی کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں اور کبھی بیوی کا اپنی تعلیم اور عہدے پر گھمنڈ مرد کی مردانگی کے لیے تازیانہ ثابت ہوتا ہے۔ جس سے رشتے کی ڈور کمزور پڑنے لگتی ہے اس صورتِ حال میں خود کو مٹا کر جب سمجھدار عورت گھر کو ترجیح دیتی ہے اور گھریلو محاذ پر کامیابی کے جھنڈے گاڑتی ہے تو جہاں یہ افتخار اس کے حصے میں آتا ہے کہ

میرے دم سے گھر جائے اماں ہے

وہاں بیوی کے ایثار سے شوہر کی سوچ میں مثبت اور خوشگوار تبدیلی آجاتی ہے اور وہ وقت بھی آتا ہے کہ عورت کو مغلوب کرنے والا مرد خود اس کی قربانیوں کا اعتراف کر کے اُس کی کامیابیوں پر فخر کرتا ہے تو عورت بھی بصد افتخار کہتی ہے کہ......

میں بندھے پر بھی اُڑنے کا ہنر جانتی ہوں
میری پرواز نظر آتی ہے سیاروں میں

☆☆☆



گوشۂ ظرافت

ادارہ

مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں...... مگر ایسی نشتر زنی بخاطرِ اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرز تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

شفیق الرحمن ...... اردو مزاح نگاری کا ایک نہایت معتبر و معروف نام ہے۔ اس ماہ اپنے باذوق پڑھنے والوں کے لیے ہم نے انہی نامور مزاح نگار کی تصنیف **پرواز** سے اقتباس منتخب کیا ہے۔ جس سے یقیناً آپ جیسے باذوق قارئین لطف اندوز ہوں گے۔

شیطان کی خالہ جان

شیطان چوری چھپے ڈاکٹر صاحب کو لے آئے۔ گھر میں مریضوں کی پلٹن تیار تھی۔ معائنہ شروع ہوا۔ اسپتال کا لطف آرہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب تھک جاتے تو کرسی پر گر پڑتے تھوڑی دیر سانس لے کر پھر معائنہ شروع کردیتے۔ ابھی ایک بچہ باقی تھا کہ شیطان کی خالہ جان آگئیں۔ انہوں نے اس دلکش اور روح پرور نظارے سے لطف اندوز ہونے کے بجائے یوں ظاہر کیا جیسے انہیں برا معلوم ہورہا ہو۔ ڈاکٹر صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد شیطان نے نسخوں کا پلندہ اپنی خالہ کے حوالے کیا۔ انہوں نے پہلے تو ناک بھوں چڑھائی پھر مریضوں کا مکرر معائنہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مریض اس معائنہ نمبر دو کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔ وہ منتشر ہوچکے تھے۔ کوئی چھلانگیں لگا رہا تھا، کوئی درخت پر چڑھا بیٹھا تھا۔ چند فٹ بال کھیل رہے تھے۔ ان سب کو دوبارہ گھیرا گیا۔ اور قطار میں کھڑا کردیا گیا۔ شیطان کی خالہ جان نے ملاحظہ شروع کیا۔ ”ارے ننھے تجھے کیا ہوگیا؟ دیکھوں تیرے کان (خادمہ سے مخاطب ہوکر) بنو تھوڑے سے بنولے گلقند میں کرا دینا۔“

شیطان بات کاٹ کر بولے۔ ”بنولے باقاعدہ تجسس کے ساتھ ملا کر نہ دیے جائیں۔ انہوں نے دوسرے مریض کو دیکھا اور کہا۔ ”اس کی ناک کو سردی لگ گئی ہے۔ اسے تربوز کے بیج، پیپل کی چھال میں پیس کر گاؤزبان کے ساتھ چٹادو۔“

”گاؤ زبان کی جگہ بھینس زبان کیوں نہ استعمال کی جائے؟“ شیطان نے پھر پوچھا۔

”اور تو تو اچھا بھلا تھا...... بنو اس کے لیے گل بنفشہ، ہلدی کی گرہ، کیلے کے بیج اور املتاس کی جڑھ۔“

”کیا فرمایا آپ نے؟ فساد کی جڑ؟“ شیطان نے پوچھا۔

”لڑکے تو چپ رہ...... ہاں بنو تو املتاس کی جڑ...... ان سب چیزوں کو میٹھی میٹھی آنچ میں پکا کر پلٹس بنا کر باندھ دیجیو۔“

اتنے میں شیطان نے چھینک ماری۔

”کیا تجھے بھی ٹھنڈ لگ گئی؟ دیکھوں تیرا حلق؟“

شیطان نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کچھ نہ بنا۔ شیطان کا حلق دیکھا گیا اور یہ نسخہ تجویز ہوا کہ جائفل اور املی کو عرقِ گلاب میں پیس کر تھوڑی سی پیاز اور مولی ملائی جائے۔ اس کے بعد سب کو کپڑے میں چھان کر امرود کے چھلکے اور ذرا سی راکھ کا اضافہ کیا جائے۔ اور خوب گرم کرکے یہ سب الابلا ابلتی، ابلتی شیطان کے گلے پر باندھ دی جائے اور سونے سے پہلے شیطان ڈیڑھ سیر کا جوشاندہ نوش فرمائیں۔ علی الصباح ان کی ٹھنڈ رفع ہوجائے گی۔

اب شیطان بہت سٹپٹائے، بولے۔ ”خالہ خان! کچھ ہدہد کے پر، الو کی دم، اود بلاؤ کی مونچھیں اور کتے کے کان لے کر خوب پیسے جائیں اور گلے پر باندھ دیے جائیں۔“

”لڑکے مذاق اڑاتا ہے؟“ وہ بولیں۔ ”تجھے کیا معلوم؟ یہ ٹوٹکے ہیں اور کبھی خطا نہیں جاتے۔ نہ جانے تجھے دیسی علاج سے چڑ کیوں ہے۔ پرسوں جب حکیم احمد غازی نے کھانسی کی دوا بھیجی، وہ بھی تو نے نہیں پی۔“

”اس خیال سے نہیں پی کہ وہ خود تو ماشاء اللہ غازی ہیں کہیں ہمیں شہید نہ کردیں، خالہ جان جوشاندے کی جگہ تو ناریل کا تیل پلا دیجیے۔ تھوڑی سی بھنگ یا چرس ملا کر۔“

لیکن ایک نہ سنی گئی اور شیطان کو لٹا، لٹا دیا گیا۔ جب یہ آپریشن ختم ہوا اور شیطان کے گلے پر سب کچھ باندھ گیا گیا تو وہ بولے۔ ”یار یہاں تو بیمار ہونے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ یہ ایسی جگہ ہرگز نہیں ہے جہاں انسان خوب اطمینان سے بیمار ہوسکے اور جتنی دیر چاہے بیمار رہے۔“

”کیا خوب! تو جناب رومی صاحب یہاں بیمار ہونے تشریف لائے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”ہم......؟“ شیطان نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ہم کمان کے تیر ہیں، ایک مرتبہ نکل جائیں تو واپس نہیں لوٹتے۔“

☆☆☆

ہوا یوں کہ میں دلی کے اسٹیشن پر یوں ہی گھوم رہا تھا۔ اتنے میں ایک گاڑی کہیں سے آکر رکی اور شیطان نازل ہوئے۔ انہوں نے مجھے پکڑلیا، بولے آگرے چلو۔ ان دنوں آگرے میں شیطان کے خالہ اور خالو رہتے تھے۔ میں نے بہانے پیش کیے اور شیطان نے پلیٹ فارم پر باقاعدہ کشتی شروع کردی۔ جب اسٹیشن پر ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا تب میں نے مجبوراً ہاں کی۔ معلوم ہوا کہ آپ دارجیلنگ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے دارجیلنگ اور آس پاس کے علاقے کا کتابوں سے خوب مطالعہ کیا ہے۔ پہاڑ کے لیے وہ اتنے گرم کپڑے ساتھ لائے ہیں کہ کئی حضرات کے لیے کافی ہوں گے۔ ساتھ پہاڑی جوتے، کیمرہ، تھرماس، برساتی، چھتری وغیرہ سب لوازمات ہیں لیکن صرف ایک چیز کی کسر ہے، وہ یہ ہے کہ روپے نہیں ہیں۔

میرا بٹوہ نکلا۔ روپے گنے گئے، ایک سو کچھ تھے۔ کئی سالوں کے بعد یہ شبھ گھڑی آئی تھی کہ میرے بٹوے سے روپے برآمد ہوئے۔ شیطان کے روپے بھی ملائے گئے۔ ایک کاغذ پر ہندسے لکھ کر میزان کیا گیا۔ جواب ڈیڑھ سو کے لگ بھگ نکلا۔

"اب صرف ڈھائی سو روپے کی کمی ہے۔" شیطان بولے۔

"اگر محض ڈھائی سو روپے کی حقیر رقم کی کمی ہے تو آگرے کیوں جارہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"خالہ جان سے روپے لینے..... بلکہ روپے اینٹھنے۔" وہ بولے۔

واقعی تجویز نامعقول تھی۔

آگرے پہنچے۔ بڑی دھوم دھام سے ہمارا استقبال ہوا۔ شیطان نے میرا تعارف کرایا۔ تعارف کراتے وقت یہ فقرہ ضرور کہتے۔ "یہ صاحب دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے۔" واقعی میں کئی سال سے لنچ نہیں کھاتا لیکن شیطان نے تو باقاعدہ اشتہار بازی شروع کردی آخر تنگ آکر پوچھا کہ یہ کیا الغویت ہے؟ بولے..... "پھر بھی بتادینا اچھا ہے، خصوصاً لڑکیوں کو۔ کیونکہ وہ اس شخص کو کبھی پسند نہیں کریں گی جو لنچ نہ کھاتا ہو۔ کم از کم وہ اسے شوہر کے روپ میں تو ہرگز نہیں دیکھ سکتیں کہ دوپہر کا وقت ہے اور بیگم صاحبہ اکیلی بیٹھی کھانا کھا رہی ہیں۔"

"لیکن شوہر بننا کون کمبخت چاہتا ہے اور پھر تم تو ہر شخص سے کہہ دیتے ہو۔ کل تم نے حجام سے بھی کہا۔ بجلی کے مستری، ڈاکیے اور شوفر سے بھی۔"

"آئندہ خیال رکھیں گے۔"

شیطان نے وہاں عجب دھماچوکڑی مچائی۔ ایک لمبا چوڑا کتا نہ جانے کہاں سے پکڑلائے (شیطان کو لمبے چوڑے کتے نہایت پسند ہیں) جو کتا کم اور گدھا زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ شیطان کے خالو اور خالہ دونوں کو کتوں کا بے حد شوق تھا۔ ان کے ہاں تقریباً ہر سائز اور ہر نمبر کے کتے موجود تھے۔

شیطان کے کتے اور ان کتوں کے خیالات مختلف تھے، چنانچہ ہر روز رائے میں اختلاف رہنے لگا۔ پہلے بحث مباحثے ہوتے پھر باقاعدہ جنگ وجدل تک نوبت پہنچی۔ ادھر شیطان نے بات، بات پر سب کا مذاق اڑانا شروع کردیا۔ بچوں سے بھی مذاق، بڑوں سے بھی، بزرگوں سے بھی۔ میں نے سمجھایا کہ مولانا اس طرح تم ڈھائی سو روپے کیا ڈھائی روپے بھی اینٹھ نہیں سکتے۔ لیکن شیطان شاید اپنی عادت سے مجبور تھے۔ وہ دونوں کانوں سنتے اور فوراً دونوں کانوں نکال دیتے۔

میں دارجیلنگ ہو آیا تھا۔ شیطان رات کو سونے سے پہلے وہاں کی آب وہوا، باشندے، پیداوار، ذرائع آمدورفت وغیرہ پر گفتگو کرتے۔ ٹائیگر ہل سے طلوعِ آفتاب کے نظارے کا ضرور ذکر ہوتا۔ ان کی فرمائش ہوتی کہ اس نظارے کو مفصل طور پر بیان کرو۔

میں شروع کرتا "ٹائیگر ہل کے چاروں نہایت اونچے اونچے برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں۔ سورج نکلنے سے پہلے شفق پھوٹتی ہے اور برف پر طرح طرح کے رنگ جھلکتے ہیں۔ رنگوں کا یہ کھیل کنچن چنگا پر سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس کے بعد سورج طلوع ہوتا ہے۔ سرخ رنگ کی ایک بڑی ساری گیند گھومتی ہوئی یک لخت برف سے باہر نکل آتی ہے۔ تب ماؤنٹ ایورسٹ نظر آتی ہے۔ دنیا کی سب سے اونچی چوٹی۔"

"بس، بس..... اس سے زیادہ سننے کی تاب نہیں۔" شیطان کہتے۔ "ورنہ نیند نہیں آئے گی۔ اب تو بس یہی تمنا ہے کہ دارجیلنگ جاؤں، ماؤنٹ ایورسٹ اور کنچن چنگا دیکھوں اور بھلا چنگا واپس آجاؤں..... بھلا گاڑی کتنے بجے وہاں پہنچتی ہے؟"

"سلی گری سے دو گاڑیاں چلتی ہیں، ایک تو دو بجے دوپہر کو پہنچتی ہے اور ایک شام کو..... موٹریں بھی جاتی ہیں۔"

"تمہارے خیال میں کون سی گاڑی بہتر ہوگی؟ دوپہر والی یا شام والی؟"

"شام والی بہتر ہوگی؟"

"نہیں دوپہر والی سے چلیں گے۔ شام والی اگر لیٹ ہوگئی یا راستے میں بگڑ گئی تو راستے ہی میں منجمد ہوجائیں گے۔"

"لیکن وہ گاڑیاں لیٹ نہیں ہوتیں۔ دارجیلنگ ہمالیہ ریلوے ہلکی، ہلکی سی ریل ہے اور اس کے انجن بڑے طاقت ور ہیں۔"

"جی نہیں! ہم تو دوپہر کی گاڑی سے چلیں گے۔"

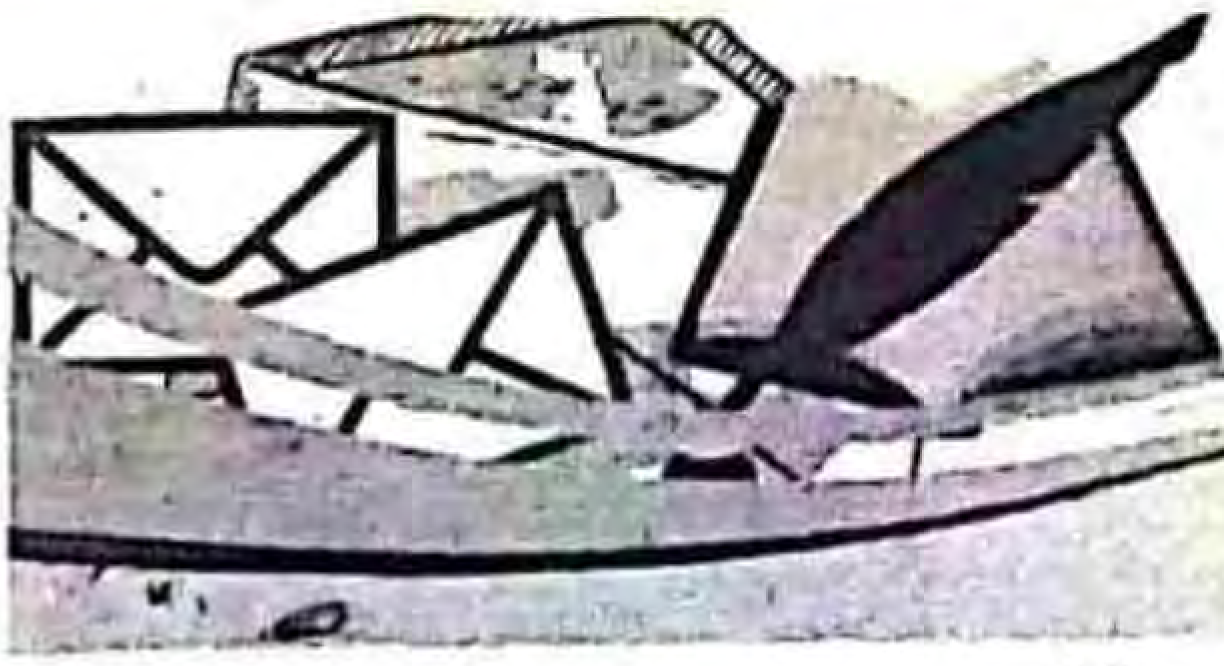
"لیکن ناشتا....."

"ہرگز نہیں..... ہم نے ایک بار کہہ جو دیا کہ....."

غرضیکہ خوب جھگڑا ہوتا۔ میں تنگ آکر کہتا۔ "بھئی اس بحث کا فائدہ.....؟ حالات تو ایسے ہیں کہ ہم دارجیلنگ صرف پیدل جاسکتے ہیں یا پھر واپس چلیں۔"

"ہم....." شیطان اپنے سینے پر تھپڑ مار کر کہتے۔ "ہم کمان کے تیر ہیں، ایک مرتبہ نکل جائیں تو واپس نہیں لوٹتے۔"

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل:jdpgroup@hotmail.com

03316266612,021.35386783.021.35802552.Ext:122.107

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ وبرکاتہ!

تمام حمد وستائش اس ذات والا صفات کو زیبا جو کل کائنات کا خلق کرنے والا ہے۔ یکتا و وحدہ لاشریک ہے اور کروڑوں درود و سلام حبیب خدا رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر جو وجہِ تخلیق کائنات ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور دست بستہ دعا گو ہیں کہ اپنے خزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا کرے جو ہمارے حق میں بہترین ہو۔ ہمارے وطن پاکستان میں امن وسکون کی فضا اور خوش حالی رہے اور تمام اہلِ وطن اس کی ترقی ونیک نامی کے لیے کوشاں رہیں۔ (الٰہی آمین)

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

عزیز بہنو! صحت وسلامتی کی دعائیں لیے آپ کی محفل میں حاضر ہوں۔ امید ہے آپ لوگ اپنے اہلِ خانہ سمیت خیریت سے ہوں گی۔ سردیاں تو اب اختتام پزیر ہیں اور کراچی میں تو سردی تقریباً ختم ہی ہوگئی اب تو ہر طرف بہار رنگوں کی آمد ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک اور اہلِ وطن پر ہمیشہ خوشیوں کی بہار رکھے۔ آمین...... بہنو جیسا کہ میں نے پچھلے شمارے میں تذکرہ کیا تھا کہ معراج رسول صاحب کی برسی آرہی ہے اور ہم ادارے میں ایک محفل دعائے مغفرت رکھیں گے تو اس سلسلے میں 4 فروری بروز منگل قرآن خوانی و فاتحہ خوانی رکھی گئی جس میں سب نے بھرپور شرکت کی اور خلوصِ نیت سے ان کو ایصالِ ثواب کیا گیا۔ ادارے کے تمام ملازمین اور دیگر لوگوں نے ان کے حق میں بھرپور دعائے مغفرت کی اور جن اداروں میں معراج صاحب یتیموں اور مساکین کی کفالت کرواتے تھے تو وہاں بھی ہدیہ بھیج کر دعائے مغفرت کروائی گئی۔ آفس میں ایصال ثواب کے علاوہ گھر پر بھی قریبی عزیزوں، رشتے داروں کو لے کر فاتحہ خوانی کی گئی۔ اس کے علاوہ ذیشان رسول کی طرف سے غریب رشتے داروں، گھر کے اور آفس کے ملازمین کی مالی مدد بھی کی گئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ایصال ثواب کے سلسلے میں کیے گئے ان اقدامات کو اپنی عظیم بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے اور معراج صاحب کے درجات کو بلند فرمائے۔ (الٰہی آمین) ہماری مصنفات اور بیشتر قاری بہنوں نے بھی دعائے مغفرت کی اس میں سب سے پہلے مجھے اختر شجاعت نے اطلاع دی کہ انہوں نے ایک مکمل قرآن پاک پڑھ کر معراج صاحب کو بخشا۔ اختر اللہ تمہیں جزائے خیر دے۔ میں عقیلہ حق کے خلوص اور محبت بھرے الفاظ کا بھی دلی شکریہ ادا کرتی ہوں کہ عین اسی روز یعنی 22 فروری کو اتنے خوب صورت اور دل پزیر انداز میں میری دلجوئی کی۔ اللہ عقیلہ تمہیں ہمیشہ خوشیاں دکھائے۔ الٰہی آمین...... اسی طرح تسنیم ماپارا، ہما بیگ، شائستہ اعجاز، شگفتہ شفیق نے یہ تاریخ یاد رکھی اور بذریعہ ٹیلی فون اپنے پُرخلوص جذبات کے ذریعے میرے غم میں برابر کی شریک رہیں۔ سب کو اللہ اس کی جزا دے۔ میں خاص طور پر اپنی ایک قاری بہن اور قلم کار صبا آصف، گلشن حدید، کراچی کا بھی دلی شکریہ ادا کروں گی کہ جنہوں نے بطورِ خاص فون کر کے بہت اچھے انداز میں معراج صاحب کو یاد کیا اور ہماری فیملی کے لیے پُرخلوص دعاؤں کا تحفہ دیا۔ صبا تم بہت خوب صورت گفتگو کرتی ہو تم ملنے کے لیے بھی ضرور آنا۔ اسی طرح بختاور ابڑو، بلوچستان۔ حیا ترمذی، وادیِ کاغان۔ افتخار شوق، میاں چنوں کا بھی بے حد شکریہ کہ اتنی دور دراز سے اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں اور ہماری خوشی غمی میں شامل رہتی ہیں۔ یوں تو دنیا کے بیشتر ممالک سے اور اپنے وطن سے بھی ہماری قاری بہنیں اظہارِ خیال کرتی رہتی ہیں۔ چند نام لینے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ دیگران کی اہمیت کم ہے۔ میرے لیے تو میری تمام رائٹرز اور ریڈرز اہم ہیں۔

اللہ پاک تمام پُرخلوص چاہنے والوں اور دعائیں دینے والوں کو سلامت رکھے۔ جانے والے کی کمی تو کوئی پوری نہیں کرسکتا بس پُرخلوص دوستوں اور بے لوث چاہنے والوں کی، کی گئی دلجوئی، تسلی اور محبت بھرے الفاظ کسی حد تک مداوا کرنے کی کوشش ضرور کرسکتے ہیں۔ اللہ پاک ہم سب کو ایک دوسرے کے لیے خیرخواہی کے جذبات رکھنے والا بنائے رکھے، الٰہی آمین۔

اچھا بہنو اب اجازت...... اس دفعہ گفتگو خاصی طویل ہوگئی..... ان شاء اللہ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

اللہ نگہبان...... دعا گو عذرا رسول......!

☆☆☆

بہنو! حسبِ روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوصِ دل سے درودِ ابراہیمی اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہلِ وطن کو بھی یاد رکھیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ مسز یٰسین، لیہ کے کزن مبشر کے ہاں بیٹا ہوا ہے جس کا نام تہجد مبشر رکھا گیا ہے۔ (مبارک ہو)

☆ شاعرہ فریدہ خانم، لاہور کو پبلک پولیس پیس سیل اور ایک چینل کی جانب سے تعریفی و توصیفی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ یہ شاندار تقریب الحمرا آرٹس کونسل لاہور میں منعقد ہوئی۔ فریدہ خانم کے حوالے سے دوسری خبر یہ کہ انہیں الحمرا آرٹس کونسل اور گوشۂ گیان کی طرف سے گولڈ میڈل سے بھی نوازا گیا۔ (کامیابیوں پر ڈھیروں مبارک باد)

☆ سائرہ مشال، کراچی پچھلے دنوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئیں۔ (بہت مبارک ہو)

☆ عابش جنجوعہ، تونسہ شریف ایک پیاری سی بھتیجی کی پھپھو جان بن گئی ہیں۔ (مبارک ہو)

☆ پاکیزہ کی مایہ ناز شاعرہ و مستقل قاری پیاری شگفتہ شفیق ان دنوں خوب مشاعرے اٹینڈ کررہی ہیں اور اپنی شاعری کی خوب داد وصول کررہی ہیں۔ (مبارکباد)

☆ مصنفہ بشریٰ ماہا، بدین ایک پیارے سے بیٹے کی امی جان بن گئی ہیں۔ (بہت مبارک ہو)

☆ شاعرہ، مصنفہ اور سسپنس ڈائجسٹ کی ایڈیٹر یمنیٰ احمد کے ہاں بھتیجی تولد ہوئی ہے جس کا نام انزلہ رضوان رکھا گیا ہے۔ (مبارکاں)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسرت رانی خلیل، کراچی کے بیٹا، بہو نے عمرے کی سعادت حاصل کی۔ (مبارک ہو)

سالگرہ مبارک

☆ مصنفہ، شاعرہ اور پاکیزہ کی مستقل قاری ہما علی کی اس ماہ سالگرہ ہے اور حُسنِ اتفاق ان کی شادی کی سالگرہ بھی اسی ماہ ہے اور ان کے شوہر کی بھی سالگرہ اسی ماہ ہے۔ (بے حد مبارک ہو)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ پاکیزہ سے وابستہ ڈاکٹر زکیہ بلگرامی کی مکمل صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کی درخواست ہے۔

☆ ہماری نامور رائٹر اور مستقل تبصرہ نگار طیبہ عنصر مغل، راول پنڈی کی مکمل صحت کے لیے خصوصی دعا۔

☆ پاکیزہ سے وابستہ شائستہ زریں کی والدہ محترمہ کی مکمل صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کی درخواست ہے۔

☆ مستقل قاری و تبصرہ نگار رفیعہ ابدالی، کراچی ان دنوں علیل ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری، مصنفہ اور تبصرہ نگار صبا آصف، کراچی کی طبیعت پچھلے دنوں کافی ناساز رہی۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری حنا زین کی والدہ محترمہ سلمیٰ نگار، واہ کینٹ کی مکمل صحت و تندرستی کے لیے دعا کی درخواست ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری نادیہ، راول پنڈی کی تائی امی فالج کے باعث شدید بیمار ہیں اور خود نادیہ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اللہ پاک مکمل صحت دے، الٰہی آمین۔

انتقالِ پُرملال

☆ نامور ٹی وی آرٹسٹ فہمید احمد خان مختصر علالت کے بعد انتقال کرگئے۔ یہ اتفاق ہے کہ ان کا یوم ولادت اور یوم وفات 12 فروری ہی ہے۔ قارئینِ پاکیزہ کو یاد ہوگا کہ پچھلے برس شائستہ زریں نے ان کا تفصیلی انٹرویو بھی کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کرے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری و تبصرہ نگار عصمت، اوکاڑہ کو پچھلے دنوں کئی عزیزوں کی وفات کا صدمہ سہنا پڑا۔ پہلے ان کی چچی اقبال بیگم کا ماہ دسمبر میں انتقال ہوا پھر کزن رخسانہ انتقال کر گئیں۔ 25 دسمبر کو خالو کا انتقال ہو گیا اور پھر ماموں زاد بھائی داغ مفارقت دے گئے اور ماہ جنوری میں بھی ان کی بہن نصرت کی برسی کے دن بڑی آپا ثریا بیگم انتقال کر گئیں سدھائے مغفرت کی درخواست ہے۔

☆☆☆

اب بہنوں آتے ہیں آپ کے پیارے، پیارے خطوط کی طرف۔

✿ انجم انصار، کراچی سے۔ ”عزیز از جان بہنو...... اللہ آپ کو سلامت رکھے اور آپ ہمیشہ شاد و آباد رہیں، آمین۔ بہنوں کی محفل میں بارہا آپ کے خطوط نظر سے گزرتے ہیں۔ آپ کی بے لوث محبت میرا قیمتی اثاثہ ہے۔ آپ سب کی دعاؤں سے میں خیر و عافیت سے ہوں۔ اکتوبر میں چھوٹے بیٹے سے ملنے آسٹریلیا گئی تھی۔ جنوری میں واپس آئی ہوں، وہاں بہت اچھا وقت گزرا۔ بچوں اور بچوں کے بچوں کے ساتھ وقت گزر رہا ہے اور بہت مزہ آ رہا ہے۔ دوبارہ جب بھی لکھنے کا موڈ ہوا تو یقیناً پاکیزہ کے لیے ضرور لکھوں گی۔ پچھلے دنوں تو خوب نٹنگ کی...... اپنے پوتے، پوتیوں کے سوئیٹر، ٹیکپی، جوتے، دستانے، خوب بنائے۔ ایک طویل عرصے کے بعد نٹنگ کی اور بہت لطف آیا۔ پہلے بھی نٹنگ کرنے کا کوئی زیادہ شوق نہیں تھا مگر اب بہت اچھا لگ رہا ہے...... میرا وقت اسی شوق و ذوق کے ساتھ گزر رہا ہے مگر مطالعہ سب سے پہلے...... 2020ء بھی بڑی تیزی سے گزر رہا ہے۔ یقیناً آپ دورد پاک باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں گی۔ اگر نہیں پڑھ رہی ہیں تو لازمی پڑھیے گا۔ زندگی کی ہر پریشانی از خود ختم ہو جاتی ہے اور دل میں ایک سکون سا آ جاتا ہے۔ اپنی رائٹرز دوستوں سے بھی کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی ہے۔ آپ سب کی تحریروں میں انتہائی ذوق و شوق سے پڑھ رہی ہوں۔ ماشاءاللہ آپ سب بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ قلم کے حوالے سے کی گئی مثبت باتوں کا ہم سب کو اجر عطا فرمائے اور ہمیں تاریکیوں میں لفظوں کے دیے روشن کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ آپ سب کا حامی و ناصر رہے۔ آمین...... ثمہ آمین“۔ (بہت شکریہ انجم باجی)

✿ نگہت سیما، چکوال سے۔ ”میں نے اپنی کہانی میں ایک چھوٹی سی غلطی کی طرف اشارہ کیا تھا جسے بہت معمولی سمجھا جاتا ہے لیکن بعض اوقات یہ معمولی سی غلطی ایک بڑا جرم بن جاتی ہے۔ (جی بالکل ٹھیک کہا) عذرا رسول صاحبہ اور آمنہ حماد کو میرا سلام کہیے گا۔ (جی ان کی طرف سے وعلیکم السلام۔) میری کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ افشاں آفریدی کے ناول کی اقساط پڑھ رہی ہوں...... اچھا لکھ رہی ہیں، باقی سب بھی اچھا لکھ رہی ہیں، شمیم فضل خالق کی کہانیاں بھی اچھی لگتی ہیں...... آپ سب کے لیے بہت سی دعائیں اور محبتیں......“ (بہت شکریہ سیما...... آپ کی تحریریں تو بہت کچھ پیغام دیتی ہیں اور اندازِ بیاں بھی بہت عمدہ ہوتا ہے۔ اللہ آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے۔ دیگر تحریروں پر آپ کی رائے کے ہم منتظر رہتے ہیں۔)

✿ اختر شجاعت کا خوب صورت نامہ، کراچی سے۔ ”پیاری عذرا اور نزہت آپ کی خدمت میں پُرخلوص سلام اور دعائیں۔ سب سے پہلے تو میں اپنی ان تمام بہنوں کی بے حد شکر گزار ہوں جو میرا کالم بہت دلچسپی سے پڑھتی ہیں اور محبت بھرے تبصرے کرتی ہیں۔ میں نے ہمیشہ اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ آپ لوگوں کی محبتیں مجھے نئی انرجی عطا کرتی ہیں۔ میری تحریروں کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ انہیں پڑھیں اور اس میں جس بات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے سارا فوکس اس طرف کر کے اس مغز کو حاصل کریں اور اپنی اصلاح کر لیں...... اپنے معاملات درست کرنے کی کوشش کریں۔ مجھے اپنی تعریف نہیں درکار ہے بلکہ جو ایک خاص بات کہنی ہے کہ میں اپنے کالم کے آخر میں ان تمام قابل ترین ہستیوں کی شکر گزار ہوتی ہوں جن کی کتب سے میں مضامین کا انتخاب کرتی ہوں۔ اور وہ یقیناً علم کے اعلیٰ درجے پر فائز لوگ ہیں۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھتی یہ ان استادوں کا علم اور ان کی ریسرچ ہے جسے میں بڑی محنت سے یکجا کرتی ہوں اور یہ سب بے حد معتبر اور مستند علما اور مصنفین ہوتے ہیں۔ بہرحال وضاحت کی ضرورت اس لیے پڑی کہ ایک تبصرہ نگار محترمہ ساجدہ ظفر صاحبہ، کمالیہ نے فروری کے شمارے میں اپنے خط میں دو نکات کی وضاحت چاہی ہے۔ 1۔ حضرت عمر فاروقؓ کے حوالے سے کتاب کا نام۔ مکاشفۃ القلوب از حضرت امام ابو حامد الغزالیؒ۔ ترجمہ: علامہ عنصر صابری چشتی صفحہ نمبر (117) 2۔ دنیاوی حاجت والی بات...... کتاب ہے۔ ہمارا اخلاق۔ مصنف۔ حضرت علامہ عالم فقری۔ صفحہ نمبر (60) ہے۔ اس میں یہی تحریر ہے جو میں نے اپنے مقالے میں لکھا ہے۔ (امید ہے ساجدہ ظفر آپ کی تسلی ہو گئی ہوگی) ہم نے ہمیشہ اپنے قابل ترین استادوں سے یہی سیکھا ہے کہ کوئی بھی تحریر پڑھنے کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم اس میں سے مثبت اور روشن

UUNOVELS.COM

پہلو لے لیں اور اس مقصد کو جان لیں، سمجھ لیں کہ اس تحریر میں کیا پیغام دیا جا رہا ہے یا کیا درس دیا جا رہا ہے تا کہ ہم غیر ضروری طور پر حجت میں پڑ کر اس مغز سے محروم رہ جائیں...... بہر حال...... اب مضمون ''رحم'' میں لوگوں کو یہ سمجھایا جاتا تھا کہ ہمیں لوگوں کی حاجتیں پوری کرنے کا درس دیا جا رہا ہے۔ آپ کا فوکس لوگوں کی حاجتیں پوری کرنا ہونا چاہیے تا کہ اس کا اجر ایک یا 72 ویسے بھی یہ کئی جگہ پر ہے کہ ایک نیکی کا ثواب صرف ایک نہیں کئی گنا ہوتا ہے۔ دوسرا درس جانور کے ساتھ رحم کا معاملہ کرنا ہے اب کتا ہو یا بھیڑ کا بچہ...... اس طرح سبز درخت، فائدہ بخش پودوں کے بھی کاٹنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ بہر حال وضاحت کر دی اور کتابیں اور ان کے ریفرنس دے دیے ہیں۔ جنہیں آپ پڑھ کر اپنی تسلی کر سکتی ہیں۔ باقی بہت ڈھیر سارا شکریہ کہ آپ انتہائی محنت، لگن اور دلچسپی سے کالم پڑھتی ہیں...... جزاک اللہ...... دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے معاملات کی اصلاح کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ اور میرا بنیادی مقصد بھی صرف یہی ہے۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔'' (اختر شجاعت جزاک اللہ، آپ تو ہر مرتبہ ہی کتب کے حوالہ جات لکھتی ہیں جو طوالت کی وجہ سے کبھی نہیں لکھے جاتے ہاں کوئی قاری بہن دریافت کرتی ہے تو ہم ضرور وضاحت دے دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دینی تعلیمات حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ الٰہی آمین)

✍ سونیا کنول، چیلیان والہ، منڈی بہاؤالدین سے ''باجی یوں تو میں آپ کی خاموش قاری ہوں مگر مجھے اس دفعہ نایاب جیلانی کے ناول میں حسن ہوں نے لکھنے پر مجبور کیا۔ میری باجی ثوبیہ خان بھی آپ کی دس سال پرانی قاری ہیں۔ (بہت خوب سونیا) پلیز ہمیں بھی محفل میں شامل کر لیں۔'' (جی کر لیا اب خوش اور کہانیوں پر بھی تبصرہ بھیجو، ہمیں خوشی ہوتی ہے جب دور دراز سے ہماری بہنیں محفل میں شرکت کرتی ہیں)

🖂 اقرار ریاست، چیلیان والہ۔ آپ کو پاکیزہ محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں، اپنی رائے سے بھی آگاہ کریں۔

🖂 سحرش فاطمہ، کراچی۔ تسلی رکھو تحریر بھی لگ جائے گی۔ رسالہ پڑھ کر اپنی رائے سے بھی آگاہ کرو۔

🖂 فاطمہ، بہاول پور۔ ایک خط لکھ کر کہاں غائب ہو گئیں یا اپنا نام دیکھ کر ابھی تک حیرت میں ہو۔ پاکیزہ پر اپنی رائے بھی دو۔

🖂 نرگس نسیم، چکوال...... کیسی ہو بہن، آپ تو کراچی آ رہی تھیں پھر کیا ہوا۔ اللہ پاک سب طرف خیریت رکھے آمین۔

✍ حدیث اختر، حاصل پور سے۔ ''پیاری بہنا اس مرتبہ تو آپ نے چمن کے گوشہ ظرافت میں ڈاکٹر یونس بٹ کا مضمون لگایا ہے۔ پاکیزہ ڈائری کا انتخاب بھی بہت خوب ہے، باقی تحریریں بھی اپنا حصار قائم کرنے میں کامیاب رہیں۔ شروع بہنوں کی محفل سے کر کے دین کی باتیں پڑھیں۔ پھر برادر معراج رسول کے لیے دعائے مغفرت کی، پتا نہیں کیوں ان کے نام کے ساتھ اپنے والد محترم آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں وہ کبھی جاسوسی اور کبھی سسپنس پڑھتے تھے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہمارے سب پیاروں کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین)۔ اختر شجاعت کے لیے یہ کہنا ہے کہ بہنا آپ کی تحریر کو اللہ کریم لکھنے والی، پڑھنے والی، چھپنے والی اور سب پڑھنے والوں کے لیے توشۂ آخرت بنائے آمین۔ پاکیزہ کی ساری ٹیم کو دعا۔ (جزاک اللہ حدیث بہن) عذرا رسول کے لیے بطورِ خاص عرض ہے کہ جب یاد جن کی آئے پلکوں کو جھکا لینا، دیکھنا دل کی طرف نظر آئیں گے وہ تم کو۔ تیرے دل کی مسند پر آپ کے لیے بہت دعائیں۔'' (پرخلوص جذبات کے اظہار کے لیے بے حد شکریہ)

✍ سلمٰی، لاڑکانہ سے۔ ''باقاعدگی سے رسالہ پڑھتی ہوں۔ بیٹیاں بھی پڑھتی ہیں، مشکل سے ملتا ہے، بہت اچھا رسالہ ہے، سلسلے سب پسند ہیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ ہمیں پاکیزہ بہت پسند ہے۔'' (بہت شکریہ)

✍ انیس جبار خان، آزاد کشمیر سے۔ ''مجھے پاکیزہ کے سلسلے وار ناول زیادہ پسند ہیں اور ان کا بے چینی سے انتظار بھی رہتا ہے۔ نایاب جیلانی کی تحریر پڑھتے کردار گویا اپنے ارد گرد چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ میرا سارا زنگ اتار دو بہت سے معاشرتی رویوں کو اجاگر کرتی ایک زبردست تحریر ہے، اللہ کے رزق میں سے کسی یتیم محتاج کو دیتے نہ جانے ہمارا دل کیوں تنگ پڑ جاتا ہے۔ اور اگر دے بھی دیں تو احسان جتا کر اذیت دیتے ہیں باقی سب سلسلے بھی اچھے جا رہے ہیں سب کے لیے سلام اور ڈھیر ساری دعائیں۔'' (شکریہ چھوٹے سے تبصرے کا)

✍ یاسمین کنول، پسرور سے۔ ''نئے سال کا نیا پاکیزہ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ سردی کے حوالے سے سرورق کی حسینہ ٹوپی پہنے بھلی لگی۔ اس دفعہ تو کراچی والوں نے بھی سردی محسوس کی ہے ورنہ تو سردی کی حقیقت کو وہ بھولتے جا رہے تھے۔ بہر حال سالِ نو کہتا پاکیزہ کا سرورق پسند آیا۔ (بہت شکریہ) دردانہ نوشین سے آپ نے اچھی ملاقات کروائی، بہت اچھی رائٹر اور با اخلاق

شخصیت کی مالک ہیں۔ اداریہ کیا تھا نئے سال کے حوالے سے ایک منصوبہ بندی ایک پلاننگ تھی اگر ہر شخص آنے والے وقت کے لیے تھوڑی سی منصوبہ بندی کرلے تو کئی مسائل حل ہوجائیں۔ (جی بے شک) بہنوں کی محفل میں آپ نے خط شامل فرمایا جس کے لیے شکر گزار ہوں، دعاؤں کا بھی شکریہ..... اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے ادارے کو سلامت رکھے اور پاکیزہ کو بہنوں کی ذہنی تربیت کا ذریعہ بنائے رکھے۔ (آمین ثم آمین) پاکیزہ ڈائری کا آغاز میری حمد سے ہوا بے حد اچھا لگا۔ بہت شکریہ اس کرم فرمائی کا۔ پاکیزہ کے مستقل سلسلے پڑھے ہیں اے ون ہیں، باقی سردی کی وجہ سے زیر مطالعہ ہے۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔" (جی ضرور ملیں اور جلدی تبصرہ بھیجا کریں۔ ہاں تمام اہل وطن کے لیے دعائیں ہیں)

طیبہ عنصر مغل، راولپنڈی سے۔ "آج میں پاکیزہ کی تمام بہنوں سے معذرت چاہتی ہوں یہ کہہ کر کہ پچھلے دو شماروں کی ہر تحریر ایک ستارہ تھی اور ان کے درمیان چمکتا چاند میری بے حد پسندیدہ مصنفہ عقیلہ حق جی کی تحریر محبت، اعتبار، اعتماد، عشق نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں آج صرف اسی تحریر پر بات کرنا چاہوں گی۔ عقیلہ کی ہر تحریر ہی متاثر کن ہوتی ہے لیکن اس بار کے ناول نے تو دل کی دنیا کو اتھل پتھل کر دیا۔ محبت کے موضوع پر لکھ کر عقیلہ لگتا ہے جیسے صرف محبت پہ ہی لکھتی ہیں اور جب معاشرت پہ قلم چلاتی ہیں تو قلم صرف معاشرتی المیے لکھنے کا ماہر لگتا ہے۔ ہر بار تنوع لانے والی مصنفہ کو ڈھیروں مبارک باد۔ کہانی کا اسلوب ایسا ہے کہ ہر اقتباس کو بار بار پڑھنے کا دل چاہا ہر جملہ ایک پھول لفظ لفظ خوشبو لگا، کہانی کے مختلف کرداروں کو کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ جوڑا اور کس طرح سے داستان کے پیچ و خم سنوارے یہ عقیلہ ہی کا خاصہ ہے کہ اس پیچ انہوں نے اپنے طرز تحریر کو بھی ماند نہیں پڑنے دیا۔ آگیت نایاب ایک ایسا کردار جو ہمیشہ دل پر لکھا رہے گا۔ والدین کی مجبوری ان کو کیسے بیٹیوں سے منہ موڑنے پر مجبور کرتی ہے جبکہ مائیں جان بھی لیں کہ بیٹی بے گناہ ہے۔ عورت کی بے بسی کا ایک اور تکلیف دہ روپ دکھایا پیاری مصنفہ نے، اتنی اچھی تحریر کے لیے مصنفہ عقیلہ حق بہت سے خراج تحسین کی حقدار ہیں میں دل سے چاہوں گی ایسے ہی وہ ہمیشہ لکھتی رہیں اور ہم ان کے قلم سے نکلے موتیوں سے مستفید ہوتے رہیں۔ عقیلہ کے ہاں ادب کی چاشنی ملتی ہے، کردار نگاری میں ان کے جیسی مہارت کم، کم مصنفین میں پائی جاتی ہے ان کے ہاں وقار، روایات کی پاسداری کا درس اس طرح ملتا ہے کہ دل لبھاتا ہے۔ (واہ بہت خوب باریک بینی سے تبصرہ کیا۔ عقیلہ کے موضوعات بہت مختلف اور حقیقت سے قریب ہوتے ہیں) ایما جانی عذرا جی یوں لگتا ہے کہ وقت کو پر لگے ہیں لیکن یہ تو ہمیں لگتا ہے آپ کو تو ہر لمحہ ایک صدی لگتا ہوگا اپنے پیارے ہم سفر سے بچھڑنے کے بعد ہمیں معلوم ہے آپ بہت بہادر ہیں لیکن بہرحال اپنے ہم سفر کے بغیر عورت تنہائی میں کمزور پڑ جاتی ہے۔ کوئی گزرا پل آپ کی آنکھوں کے سامنے آکر سر محفل بھی نم کر جاتا ہوگا۔ کبھی لگتا ہوگا کچھ کہیں رکھ کر بھول گئی ہیں۔ کبھی کوئی فیصلہ بہت کٹھن لگتا ہوگا کہ کاش..... اے کاش میں اپنے شریک حیات پر اس کو چھوڑ کر آنکھیں نیند کے حوالے کر دیتی، راتیں سونی لگتی ہوں گی تو دن تمام نہ ہوتا ہوگا۔ لیکن کیا، کیا جائے کہ مشیت ایزدی یہی تھی۔ سال کیسے گزرا آپ اور صرف آپ جانتی ہوں گی، آج میں کسی اور حرف پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتی ہوں میرے الفاظ ایک بار پھر دہرانا چاہتی ہوں، ہماری پیاری ایما عذرا رسول جی کے مرحوم شوہر کے لیے جان شاہ اللہ جنت الفردوس میں ہوں گے دکھ کے ان لمحوں میں ہم آپ کے ساتھ ہوں اور میری بیٹی نے قرآن پاک کی پڑھ کر ایصال ثواب کیا ہے، میں کی مقدور بھر جو پڑھ سکی ہوں پڑھتی ہوں۔ سلامت رہیں آمین۔" (جزاک اللہ طیبہ، دوستوں کی دلجوئی مرہم کا کام کرتی ہے اور دعائے مغفرت جانے والے کی منزلیں آسان کرتی ہے۔ بیٹی کے لیے خصوصی دعا ہے اللہ صحت وسلامتی سے رکھے)

پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ "اس بار پاکیزہ فروری کا شمارہ پانچ تاریخ کو ملا اور سات تاریخ کو تبصرہ ارسال کررہی ہوں۔ (بہت خوب) سرورق پر خوب صورت ماڈل ہما خان کو دیکھ کر یہ شعر یاد آگیا..... ان کے چہرے کی بات کرتے ہیں..... آج ذکر گلاب رہنے دو۔ دین کی باتیں پڑھ کر ایمان کو تازہ کیا۔ معراج بھائی کی یاد میں شمارہ ترتیب دیا گیا تھا۔ اللہ انہیں جنت میں جگہ دے، آمین۔ یاد معراج رسول میں بہنوں نے انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ پاکیزہ کے مہمان میں اسما عباس کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ بہنوں کی محفل میں آسیہ عامر، طیبہ عنصر مغل، ساجدہ ظفر، سلمیٰ غزل، فریدہ افتخار، پاکیزہ ڈائری میں یاسمین کنول، ماہ نور خان، میں اکثر گنگناتی ہوں میں فریدہ جاوید فری، نگینہ ضیا بخش، حمیرا انجم، بزم پاکیزہ میں ماہین مسعود، جمی قندیل، محدث اختر، تسنیم کوثر چھائی رہیں۔ دعا ہے پاکیزہ ہمیشہ ایسے ہی دلوں پر چھایا رہے۔ آمین۔" (کہانیوں کے بارے میں کیا خیال ہے پروین)

UUNOVELS.COM

☆ ساجدہ ظفر، بکھالیہ سے۔ "فروری کا پاکیزہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ ٹائٹل پر ماڈل کو دیکھ کر منہ سے بے اختیار ہائے ماشاءاللہ نکل گیا۔ اداریہ اس بار پہلے سے ذرا مختلف قسم کا تھا۔ موسم بہار اور خزاں کے ذکر کے بعد پاکیزہ کے بانی انکل معراج رسول کا ذکر لیے ہوا تھا کیونکہ فروری کا مہینہ ان کی برسی کا تھا۔ قارئین بہنوں کے خیالات پڑھ کر آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ عذرا آنٹی کے لیے دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت انہیں صحت و تندرستی کے ساتھ عمر خضر عطا فرمائے۔ ان کے غم کا مداوا تو کوئی نہیں کرسکتا مگر وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین) ورنہ بخاری کا مختصر ترین افسانہ اولاد، زینت اور امتحان اگرچہ سبق آموز تھا مگر عنوان کے لحاظ سے نامکمل محسوس ہوا۔ کیونکہ اولاد مفت اسے زینت ضرور ملی تھی مگر اولاد نے اسے کسی امتحان میں نہیں ڈالا۔ (اولاد کی بہترین تربیت اس کا بھی امتحان ہوتی ہے جس کا نتیجہ اولاد دیتی ہے۔) عائشہ خان کا افسانہ کڑوا بادام ایک دلچسپ تحریر تھی کہ بچوں کے والد کی دعا سے کڑوا بادام میٹھے بادام میں بدل گیا۔ اس سے ماں باپ کی اطاعت بھی ثابت ہوگئی کہ ایک بچے نے ماں کے خیالات بدل دیے۔ ہاں ایک جگہ بچوں کے چہرے کی جگہ جگہ کرتی روشنی کے الفاظ لکھے گئے ہیں جبکہ بچوں کے چہرے تو جگمگ جگمگ کرتے ہیں۔ شاید یہ کتابت کی غلطی ہو۔ (پیاری ساجدہ روشنی جگہ جگہ بھی کرتی ہے اور چہرے جگمگاتے بھی ہیں، بہت شکریہ باریکی سے مطالعہ کرنے کا) شمع ہدایت میں اس بار اختر شجاعت صاحب نے توحید وحدت الٰہی پر سیر حاصل مضمون تحریر کیا ہے۔ ماشاءاللہ بہت عمدہ لکھا ہے اس مضمون نے ہماری معلومات میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ دل کو فرحت بھی بخشی۔ اس مضمون کے ذریعے توحید کے کئی درجوں کا علم ہوا۔ یہ بھی پتا چلا کہ توحید آدم میں چار مراتب میں پائی جاتی ہے۔ (اختر شجاعت ہمیشہ ہی بہت محنت، دلچسپی اور تحقیق سے سطر سطر کا انتخاب کرکے مضامین ترتیب دیتی ہیں) پاکیزہ کے مہمان میں اسماء عباس کا انٹرویو دلچسپ اور خوب صورت تھا۔ اسماء عباس صاحبہ شرافت سے [illegible] کی طرح وراثت کی اداکارہ ہیں اور اپنی خوب صورت پروقار [illegible] سے دلوں میں سما جاتی ہیں۔ گوشۂ ظرافت میں [illegible] کی تصنیف خندہ زن سے لیا گیا اقتباس، شرح خاوندگی فروری کی عشقیہ تھا رسیچ میں بہار کے بغیر [illegible] بٹ ویسے بھی میرے پسندیدہ مزاح نگار ہیں۔ رات کو سونے سے قبل میں لحاف میں منہ چھپا کر موبائل کی لائٹ سے شرح خاوندگی پڑھنے لگی۔ جوں جوں میں تحریر پڑھتی جا رہی تھی، ہنسی کا فوارہ چھوٹتا جا رہا تھا۔ ہنسنے سے میری رضائی ہل رہی تھی تو پاس لیٹی مہمان بھتیجی مجھے ہلا کر پوچھنے لگی۔ آنٹی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے، کیا آپ سردی سے کپکپا رہی ہیں؟ اگلے دن شوہر صاحب نے بھی یہ اقتباس پڑھا تو بہت محظوظ ہوئے اور پھر اپنے اسکول کے ایک بچے کا واقعہ سنانے لگے جس نے تعلیم کے موضوع پر مضمون میں لکھا تھا کہ تعلیم چونکہ ایک زیور ہے اور سونا مردوں پر حرام ہے اس لیے ہم تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتے (واہ بھئی)۔ پاکیزہ ڈائری میں حمد و نعت سبحان اللہ تعریف کے لیے الفاظ کی پٹاری خالی ہے۔ نئے سال کے حوالے سے تحریریں بہت عمدہ تھیں مگر کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ جنوری کے شمارے میں شائع ہوتیں اور پڑھنے کا مزہ دوبالا ہو جاتا۔ (ایک دو ماہ تک تو نئے سال کا ذکر چلتا ہے اسی لیے تو کہتے ہیں وقت سے کافی پہلے بھیجا کریں) میں اکثر سوچتی ہوں [illegible] شعر و اشعار [illegible] تھے۔ بزم پاکیزہ میں اپنی دوست ماہین کا اچانک سوال دیکھا تو بے اختیار منہ سے چیخ نکل گئی۔ [illegible] کہ ایک طویل عرصے کے بعد الحمد للہ [illegible] کے حصے میں آیا۔ فوراً فون کرکے ماہین کو مبارک باد دی۔ خوش ذائقہ میں آخرکار اخروٹ کے [illegible] ڈش پڑھنے کو مل ہی گئی۔ زرینہ خان کا میری فرمائش پوری کرنے پر از حد شکریہ۔ روحانی مشورے اس بار عمدہ تھے۔ خاص طور پر اسم اعظم اور سورہ یٰسین کا مجرب عمل تو میں نے اپنی ڈائری کی زینت بنا لیے۔ بہنوں کی محفل حسب معمول خوب پررونق تھی۔ خوشیوں کے جھولے جھولنے والی بہنوں کو مبارک باد قبول ہو۔ شیریں حیدر کی ساس اور حدیث اختر کی بہن کی ساس کی رحلت پر افسوس ہوا۔ بیمار بہنوں خصوصاً آمنہ عندلیب اور فریدہ فری کے لیے خصوصی دعا کی کہ اللہ رب العزت انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ ہاں گزشتہ ماہ آپ کی بیٹی کی شادی کی مبارک باد دینا بھول گئی بعد میں قلق ہوا۔ بہرکیف دیر سے ہی سہی۔۔۔۔اب مبارک باد قبول فرمائیں۔" (مبارک باد کا بے حد شکریہ۔ دلچسپی سے لکھے گئے تبصرے کا بھی بے حد شکریہ، آپ لوگوں کی تنقید و تعریف ہی رسالے کو مزید بہتر بناتی ہے)

☆ افشاں علی، ہنڈو جام، حیدرآباد سے۔ "نام تو سنا ہوگا کے بجائے میں یہ کہوں گی اب ان شاء اللہ آپ یہ نام سنتے رہیں گے۔ اگر مدیرہ آپا نے چاہا تو ہم یونہی محفل میں شامل رہیں گے۔ (جی ضرور) فی الحال تو پاکیزہ کی محفل میں یہ میری پہلی حاضری ہے اور امید واثق ہے کہ مجھے خوش آمدید کہا جائے گا۔ (خوش آمدید کہہ دیا گیا ہے) پاکیزہ جس کا نام اتنا منفرد اس کا معیار بھی تو

منفرد ہی ہوگا ناں۔ بلاشبہ پاکیزہ کی انفرادیت اس کے نام ہی کی طرح صاف شفاف ومنفرد ہے۔ اس میں موجود تحریریں ہر موضوع کا احاطہ کرتی نظر آتی ہیں۔ چاہے وہ معاشرتی موضوع ہو، دینی یا دنیاوی اصلاحی ہو یا رومانی۔ پاکیزہ سے میرا تعلق جب کا ہے جب مجھے اردو ٹھیک سے پڑھنی بھی نہیں آتی تھی کچھ موٹے، موٹے پیچیدہ لفظ یا تو ہجے سے پڑھ لیتی یا پھر چھوڑ چھاڑ کر آگے بڑھ جاتی یعنی کلاس فورتھ سے پاکیزہ کو چھپ، چھپ کر کیونکہ امی کہتی تھیں کہ چھوٹے بچے ڈائجسٹ نہیں پڑھتے۔ بے قاعدگی سے پڑھا اور شعور کی دہلیز کو انہی کے ہمراہ پار کرتے ہوئے ان کا مطالعہ باقاعدگی سے جاری رکھا۔ پر اتنے سالوں بعد ہی کسی دل میں خواہش ہی جاگی کہ اس خاموشی کے پیراہن کو اتار کر اس دلی وابستگی کو ایک نیا روزن مہیا کیا جائے اور بس کچھ مصروفیات کو پس پشت رکھ کر اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہم نے کاغذ قلم تھاما اور دل سے نکلتے لفظوں کو محبت کی سیاہی سے خلوص کا لبادہ اوڑھا دیا۔ اب امید ہے یہ تعلق، یہ سلسلہ، یہ وابستگی، یہ حاضری یوں ہی قائم رہے (جی بالکل)......... مدیرہ آپا کا شکریہ جنہوں نے پاکیزہ میں میری پہلی تحریر کو جگہ دی، میں تہہ دل سے آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے لکھے افسانے اشکِ ندامت کو پاکیزہ کی زینت بنایا۔ ان قارئین بہنوں کا بھی شکریہ جنہوں نے میرے افسانے کو پسندیدگی کی سند بخشی......اب بات ہو جائے فروری کے شمارے کی۔ سرورق پر سر پر ٹوپی سجائے خوب صورت سی ماڈل بہت پیاری لگی۔ فہرست میں جانی پہچانی دوستوں کے نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ دین کی باتوں سے مستفید ہو کر آگے بڑھے۔ معراج رسول سر کا نام گوکہ نیا نہیں، ان کا نام ان کا کام ادب کی دنیا میں اپنی پہچان رکھتا ہے ان کے بارے میں پڑھ کر مزید جان کر دل نے بے ساختہ ان کی مغفرت کی دعا مانگی۔ پاکیزہ کی مقبولیت کا سہرا انہی کے سر جاتا ہے ان کے لیے بس یہی کہوں گی۔ مدت کے بعد ہوتے ہیں پیدا کہیں وہ لوگ...... مٹتے نہیں ہیں دہر سے جن کے نشاں کبھی (بہت خوب) مکین دل، دانیہ آفرین کا بہت ہی پیارا سا افسانہ رہا۔ لاحاصل افسانے کی آخری لائن امی تمہارے لاڈ بہت اٹھاتی تھیں تم ان کا جنازہ نہ اٹھا سکے۔ ہائے بدنصیب انسان...... نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ٹائٹل بھی عام سا تھا کہانی بھی روایتی سی ہاں مگر یہ حقیقت ہے کہ اکثر والدین اولاد میں برابری کے بجائے بیٹے کو بیٹیوں پر ترجیح دیتے ہوئے یکسر فراموش کر جاتے ہیں کہ بیٹیاں بھلے پرایا دھن ہوں مگر انہی کے دم سے گھر آباد ہوتے ہیں اور وہی سکھ دکھ کی ساتھی ہوتی ہیں۔ ناہید فاطمہ حسنین کے افسانے معانی میں لفظوں وفقروں کا چناؤ خوب رہا ہاں مگر اک تشنگی سی لگی کہ آخر تک بھی نادیہ نے اپنی بیٹی زویا کو کیوں معاف نہ کیا۔ ضد اور انا ممتا سے اتنی اوپر ہوگئی کہ اسی ضد میں دونوں نے ایک دوسرے کو کھو دیا۔ بہاریں چکن گونیا کی ہلکے پھلکے... پُرمزاح انداز میں لکھا ہلکا پھلکا افسانہ شمع تفسیر کا اندازِ بیاں اچھا لگا۔ کیسی لاگی یاری، سیما بنت عاصم تو لکھتی ہی اچھا ہیں اس افسانے کے لیے بس اتنا کہوں گی کہ دیر آید درست آید۔ اولاد، زینت اور امتحان مختصر افسانہ مگر پُرسوچ بات بتا گیا۔ کڑوا بادام منفرد نام اور پُراثر تحریر خوب صورت افسانہ لکھا عائشہ خان آپ نے۔ کیسی ذلت دل کو چھوتا افسانہ کتنی آسانی سے لوگ کسی کی غربت ومجبوری کو تذلیل کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔ اللہ ہدایت دے ایسے بے حس لوگوں کو۔ خانم، صائمہ قریشی کا لکھا تو کمال ہی ہوتا ہے جیسے خانم کی مہندی، محبت بھی تو مہندی کی طرح پہلے نئی انوکھی منفرد سی لگتی ہے اور پھر نکھر کر مزید خوب صورت ہو جاتی ہے۔ خوب صورت پیرائے میں لکھا خوب صورت ناولٹ، رعِ عورت طاہرہ ہر ماہ کی طرح اس بار بھی کہانی پسند آئی۔ باقی ناول ابھی پڑھنے باقی ہیں۔ خط لکھنے کی کچھ جلدی وبے صبری ہی ایسی تھی کہ جتنا پڑھا فوراً ہی کاغذ اٹھا کر لکھ ڈالا۔" (بہت شکریہ افشاں، چلیں آپ کی تاخیر سے آمد پر معذرت قبول، اب حاضری دیتی رہنا)

✉ حمیرا انجم وحید، واہ کینٹ سے۔ "میری دعا ہے پاکیزہ روز بروز نکھرتا جائے، میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ایک افسانہ لکھنے کی کوشش کی ہے، مزدور ڈے کے حوالے سے امید کرتی ہوں معیاری ہوا تو آپ اسے ضرور پاکیزہ کے صفحات کا حصہ بنائیں گی۔ (پڑھ کر بتائیں گے) پاکیزہ کے تمام سلسلے، معیاری ہیں، افسانوں کی تعریف کے لیے مجھے الفاظ نہیں مل رہے، آپ کے اچھے اخلاق کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگتا ہے۔ جہاں رہیں خوش رہیں۔ اجازت چاہتی ہوں۔" (آپ بھی خوش وخرم رہیں اور پاکیزہ کو پسند کرتی رہیں، رائے، مشورے بھی دیتی رہیں)

✉ تہمینہ عباسی، بہاول پور سے۔ "سلام کے بعد سب سے پہلے نزہت آپی کو ان کی بیٹی کی شادی پر مبارک باد...... دعا ہے کہ اللہ پاک آپ کی بیٹی کو بہترین نصیب سے نوازے۔ آمین، (جزاک اللہ، بہت شکریہ) فروری کا پاکیزہ حسب معمول بہت اچھا لگا۔ دین کی باتیں اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے گرامی سے روح کو سرشار کرنے کے بعد اس بار سب سے پہلے

سعدیہ رئیس کا منی ناول، میں انمول پڑھا۔ کہانی بے حد دلچسپ لگ رہی ہے اور اگلے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ فرحین اظفر کی عورت کہانی ہمیشہ ہی لاجواب ہوتی ہے۔ رابعہ پر جو بیتی اس پر بہت دکھ ہوا۔ کتنا مکمل اور پیارا رشتہ تھا اس کا بابر کے ساتھ مگر افسوس بابر کی غلط فہمی اور جلد بازی سے ٹوٹ گیا۔ سچ ہے کہ بھروسا اور مان ایک بار بگاڑ کا شکار ہو جائے تو کبھی پہلے سی بناوٹ دوبارہ حاصل نہیں کر سکتا۔ ناہید سلطانہ اختر کا اندازِ تحریر مجھے بہت اچھا لگتا ہے لیکن چونکہ ان کے مکمل ناول بساط کا ابھی دوسرا حصہ آنا باقی ہے اس لیے اس پر تفصیلی رائے اگلے ماہ ہی دوں گی۔ (اب ضرور دے دینا) افسانوں کی باری آئی تو سب ہی افسانے اپنی جگہ عمدہ لگے۔ قرۃ العین سکندر کا کیسی ذلت پڑھ کر شہناز پر بہت زیادہ ترس آیا۔ غربت، افلاس، بھوک کی وجہ سے کئی والدین کو اپنی اولاد کی خاطر اپنی عزتِ نفس کی بھی قربانی دینی پڑتی ہے اور روپے پیسے والے لوگوں کو احساس تک نہیں ہوتا کہ مال و دولت کی وجہ سے ان کے لہجوں میں شامل تخی اور رعونت ان سے کم حیثیت انسان کس مجبوری کے تحت برداشت کر رہا ہے۔ (جی بالکل ٹھیک کہا، اللہ ہدایت دے) میں عشق ہوں تو جیسے، جیسے آگے بڑھ رہا ہے دل پر نایاب جیلانی کے لفظوں کے سحر میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پاکیزہ کے مہمان میں اسما عباس سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ بلاشبہ وہ کمال کی باصلاحیت اداکارہ ہیں اور مجھے بے حد پسند ہیں۔ آخر میں، میں آپی طیبہ عنصر مغل کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ انہوں نے میری کاوش طربِ کامل کو سراہے جانے کے قابل جانا۔ سینئر رائٹرز سے ہم نئی لکھاریوں کو ملنے والی داد و تحسین کسی بہت بڑے اعزاز سے کم نہیں ہوتی۔ مزید اچھا لکھنے کا شوق اور لگن بڑھ جاتی ہے۔ ماہنامہ پاکیزہ کی ترقی اور اس کے سارے عملے کے لیے خیر و برکت کی ڈھیروں دعائیں۔" (بہت نوازش، اللہ پاک آپ سب کو بھی خوش و خرم رکھے)

✉ مشی علی، ضلع سانگھڑ سے۔ "سب سے پہلے میں بات کروں گی میم عذرا رسول کی۔ اللہ پاک ان کو ہمت و حوصلہ دے اور ان کے شوہر معراج رسول کے جنت میں درجات بلند کرے (آمین) یہ میرا پہلا خط ہے امید کرتی ہوں کہ آپ اس کو ضرور شائع کریں گی تاکہ میرا حوصلہ بڑھے...... پاکیزہ ہمیشہ کی طرح بہترین کہانیوں کا مجموعہ رہا ہے...... فروری کے سب افسانے ایک سے بڑھ کر ایک تھے...... اگر پھر بھی ان آٹھ افسانوں کو نمبر دیے جائیں تو 1۔ مکین دل۔ 2۔ کیسی ذلت۔ 3۔ معافی...... یہ تو ہو گئی افسانوں کی بات...... بامراد اور خانم دونوں ہی ناول بہت اچھے لگے۔ بساط کہانی پڑھ کر مجھے انسپریشن ملی۔ فرحین اظفر کی کہانی کا سچ کڑوا تھا لیکن ان کی بات دل کو لگی...... سلسلے وار ناول میں افشاں آفریدی کا ناول اور عکرمہ دونوں مجھے پسند ہیں۔ میں عشق ہوں، نایاب جیلانی بہت اچھا لکھ رہی ہوں...... عمائم کے پاس جس رانگ نمبر کے میسج آتے ہیں مجھے لگتا ہے کہ وہ احتشام ہی ہوگا۔ یہ میرا اندازہ ہے بھئی سینئر آرٹسٹ اسما عباس میری فیورٹ ایکٹریس وہ جس ڈرامے میں کام کرتی ہیں اس ڈرامے میں جان ڈال دیتی ہیں۔ اس کے بعد ہم دین کی باتیں اور شمع ہدایت سے فیضیاب ہوئے...... بہنوں کی محفل میرا فیورٹ سیگمنٹ ہے۔ شبیر علی خان کی غزلیں تو ایک دم چھا گئیں۔ زیادہ کچھ نہیں تو شگفتہ یاسمین کی امی کی ریسپی سبزیوں کی سندھی بریانی تو ہم ضرور بنائیں گے کیونکہ ہمارے ابو کی سبزی کی دکان ہے۔" (ارے واہ خط لکھنے کا شکریہ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں، پیاری بہن پاکیزہ پسند کرنے کا شکریہ...... آپ کی کہانیاں موصول ہوئی ہیں، پڑھ کر فیصلہ کیا جائے گا۔ آپ تبصرہ بھی ضرور بھیجیں اور ساتھ ساتھ سینئر رائٹرز کی تحریریں بھی پڑھتی رہیں۔ اگر صلاحیت ہو تو کہانی لکھنا مشکل نہیں مگر بہت ساری باتیں دوسروں کو پڑھ کر سمجھ آتی ہیں، اس سے اپنی اصلاح ہوتی ہے۔ مشق ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ پہلی ہی کہانی رد ہو یا پھر منتخب ہو، لکھنے والے کو اپنی ہر تحریر عمدہ ہی لگتی ہے۔ ان شاء اللہ کوشش جاری رکھیں)

✉ ثمینہ کوکب، ضلع جہلم سے۔ "فروری کے پاکیزہ کا سرورق بہت دلکش و جاذب نظر تھا۔ نزہت اصغر صاحبہ کا اداریہ معراج صاحب کی برسی کے ذکر کے ساتھ اور موسم کی باتوں کو ان کے ذکر کے ساتھ ملا کر بہت زبردست تھا۔ دین کی باتیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے گرامی پڑھ کر ایمان تازہ کیا۔ بیادِ معراج رسول پڑھ کر ہمیشہ کی طرح آنکھیں نم ہو گئیں۔ شرح خاوندگی گوشۂ ظرافت بے حد پسند آیا۔ پاکیزہ کے مہمان میں شائستہ زریں صاحبہ کے ساتھ اسما عباس سے ملاقات بے حد پسند آئی۔ توحید، وحدت الٰہی، اختر شجاعت صاحبہ کی بہت پُراثر اور ایمان سے بھرپور تحریر ہے اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ آمین...... اختر شجاعت صاحبہ سے گزارش ہے کہ مکافاتِ عمل پر بھی کوئی پُراثر مضمون تحریر کریں۔ (جی ضرور ان تک آپ کا پیغام پہنچ جائے گا) بیادِ معراج رسول میں پروین افضل شاہین کے قلم سے عذرا آپی کا معراج بھائی کے نام کلام ہمیں رُلا گیا۔ ناولز میں نایاب جیلانی کا میں

عشق ہوں اور افشاں آفریدی کا میرا سارا زنگ اتار دو بہت ہی شاندار لگے۔ اپنی تحریر کے حساب سے۔ منی ناول، میں انمول، ناہید سلطانہ اختر صاحبہ بساط دونوں ناولٹ اور تمام افسانے اپنی، اپنی جگہ پر بے مثال ہیں۔ ع عورت طاطرہ بہت اچھی لگی۔ دعائے صحت میں نگینہ ضیا بخش، ان کے بھائی، امینہ عندلیب، ذکیہ آپا اور طیبہ عنصر مغل صاحبہ کو اللہ تعالیٰ صحت وزندگی اور شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ انتقالِ پُرملال میں معراج بھائی، سلمٰی غزل صاحبہ کے شوہر اور باقی جن کے نام درج ہیں ان کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لیے بارگاہِ خداوندی میں دستِ دعا بلند ہیں۔ اللہ پاک ان سب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔ میں اکثر تشنگی ہوں، پاکیزہ ڈائری، بزم پاکیزہ، حسن نکھاریے، گوشۂ ظرافت، روحانی مشورے غرض کہ پاکیزہ کے تمام سلسلے خوش ذائقہ سمیت لاجواب ہیں۔ تازہ بہ تازہ سرگرمیوں میں فریدہ افتخار صاحبہ کے بہو اور بیٹے کو عمرے کی مبارک۔ دیگر بہنوں کو خوشیاں مبارک ہوں۔ محمد نیب اعجاز اور سیما رضا ردا کو ان کی کتابوں کی اشاعت پر مبارک باد...... عذرا آپی کی کچھ باتیں اپنی بہنوں سے۔ معراج بھائی کے ذکر کے ساتھ آنکھوں کو اشک بار کر گئیں۔ اللہ ہمارے معراج بھائی صاحب کو کروٹ، کروٹ جنت نصیب کرے۔ بہت شکریہ انعامی کتاب مل گئی ہے۔ پاکیزہ رسالے کے لیے دعا ہے۔ سدا اسی طرح اپنی پُراثر تحریروں سے روشنیاں پھیلاتا رہے اور پھولوں کی طرح مہکتا رہے۔ آمین یارب العالمین۔'' (بہت پیارے پُرخلوص خط کا بے حد شکریہ)

☜ تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ''اس بار شمع تفسیر کی بہاریں چکن کونیا کی نے خوب مزہ دیا۔ بہانہ بنانے کا نیا اسٹائل ذرا منفرد لگا اتنا دلچسپ افسانہ بے حد تعریف کے قابل ہے اور دانیہ آفرین کا مکین دل کچھ بناوٹی بلکہ زیادہ اچھا نہیں لگا۔ اس کے برعکس رفعت شبانہ کا لاحاصل کو کچھ بہتر کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح ناہید فاطمہ حسنین کا افسانہ معافی بھی تھوڑا سا ہی اچھا لگا۔ اور سب سے عمدہ تو اس بار عورت کہانی لگی۔ فرحین اظفر نے بلاشبہ ایک لاجواب، دل گداز کہانی رقم کی اور ناولٹ میں صائمہ قریشی کی خانم کچھ عجیب سی لگی۔ بھئی ایسی کون سی انوکھی مہندی ہوتی ہے جو سات دنوں میں مکمل ہوتی ہے ارے بھئی آج کل تو منٹوں میں مہندی کا رنگ آجاتا ہے اتنا مبالغہ آمیز انداز نہیں پسند آیا، لگتا ہے مصنفہ نئی، نئی ہیں۔ (ہیں تو پرانی مگر خالص افسانہ لکھا جس کا یہی تقاضا تھا) اور جناب ناہید سلطانہ اختر کا خوب صورت ناول بساط بہت پسند آیا مضبوط اور جاندار جامع طرزِ تحریر ناول کو عروج پر لے جائے گی مگر معذرت کے ساتھ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ہیبہ اتنا عمدہ لکھنے والی شہرت کی بلندیوں کو چھونے والی ڈھیروں پیسہ کمانے کے باوجود بھی ان کے ابا محترم نے دو کمروں کے مکان کو چھوڑ کر کسی ڈھنگ کے علاقے میں جانے کی کوشش کیوں نہیں کی جبکہ دماغ تو بہت اونچا رکھتے تھے۔ نزہت آپ کا کیا خیال ہے (ہمارے خیال کو چھوڑیں، مصنفہ کو کہانی تو مکمل کرنے دیں اس میں بھی راز ہی تھا۔) اور ہاں بھئی آسیہ عامر کا کارنر، جلترنگ کے ٹکڑے نے خوب مزہ دیا اس کے علاوہ کارنر شاعری میں فریدہ افتخار کا مدینہ واپسی پر دل کو لگا کیونکہ چند سال پہلے جب ہم حج کر کے واپس آئے تھے تو بالکل ایسی ہی کیفیت تھی کہ میرے لب پر ہر دم دعا ہو یہی وسیلہ بنے پھر سے جاؤں وہاں سبحان اللہ...... (وہاں کے لیے تو بار، بار جانے کو دل تڑپتا ہے، اللہ سب کو زیارت کروائے، آمین) پاکیزہ کے مہمان میں اسما عباس سے ملاقات پیاری لگی۔ اختر شجاعت کا شمع ہدایت ہمیشہ کی طرح دل کو چھو گیا... توحید وحدت الٰہی پر مضمون گو کہ ذرا مشکل سا لگا مگر سمجھ کر پڑھنے پر عمدہ ترین لگا انہیں میرا سلام اور دعا کہیے گا۔'' (جی ضرور ان کی طرف سے بھی سلام و دعا حاضر ہے)

☜ فرخندہ جعفری، گجرات سے۔ ''ماہ فروری کے پاکیزہ ڈائجسٹ میں خوب صورت ٹائٹل سے سجا خوب صورت تحریروں کا شمارہ پڑھنے کو ملا۔ کیسی ذلت، قرۃ العین سکندر کی کہانی بالکل حقیقت ہے، آج کل لوگ شادی بیاہ اور بڑی، بڑی دعوتوں پر اتنا کھانا ضائع کرتے ہیں مگر کسی غریب کو نہیں دیتے، بچی نے اگر ایک کھیرے کا ٹکڑا منہ میں ڈال لیا تھا تو کیا گھاٹا پڑ گیا تھا۔ رب ایسے لوگوں کو اتنا رزق آزمانے کے لیے دیتا ہے...... جو دیتا ہے وہ چھین بھی سکتا ہے۔ اولاد، زینت اور امتحان...... وردہ بخاری۔ پرانے دور کی طرح آج بھی لڑکی پیدا ہو تو لوگوں کے منہ بن جاتے ہیں، لڑکا ہو تو دادی، نانی اور سارے رشتے دار مبارک باد دیتے نہیں تھکتے۔ (ہاں بے شک فرخندہ، اللہ ہدایت دے) لاحاصل، رفعت شبانہ بہت ہی سبق آموز کہانی ہے اکثر گھروں میں جہاں لڑکیاں زیادہ ہوتی ہیں وہاں بیٹوں کے ساتھ زیادہ پیار کیا جاتا ہے اور لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی پرایا دھن سمجھ لیا جاتا ہے بعض لوگ تو لڑکیوں کو پڑھاتے بھی نہیں۔ (یہی تو جہالت ہے) تمام رائٹرز نے جان مار کر ایک سے بڑھ کر ایک کہانی پاکیزہ میں ڈالی ہے۔ تبصرے کے لیے تو کچھ چھوڑا ہی نہیں ہے یہ بھی ایک عبادت کے زمرے میں آتا ہے کہ جو کچھ اچھا مواد ان کے دماغ

میں ہوتا ہے اسے دوسروں میں تقسیم کرتی ہیں اچھی سوچ دیتی ہیں، اچھا پیغام دیتی ہیں۔ یہ پڑھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ اسے کس طرف لے کر جاتے ہیں۔ پاکیزہ رسالہ ایک واحد رسالہ ہے جس کو پڑھ کر انسان اپنی سوچ بہتر کر سکتا ہے۔(بہت نوازش فرخندہ) جناب معراج رسول صاحب کو دنیا سے گئے 22 فروری کو ایک سال ہو جائے گا مگر وہ اپنے ادارے، اپنے رائٹرز، اپنے ریڈرز، اپنے عزیز و اقارب، اپنے گھر والوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے مگر کچھ موتیں بھلائے نہیں بھولتیں۔ جتنا نذرانۂ عقیدت معراج رسول صاحب کو پیش کیا گیا ہے اور جتنا ہو رہا ہے اور جتنا ہر موقع پر پیش ہو گا شاید ہی کسی کو پیش ہوا ہوگا۔ اچھے لوگ دلوں میں ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ ایک اچھی تحریر بھی صدقۂ جاریہ ہے۔ توحید، وحدتِ الٰہی، اختر شجاعت صاحبہ نے اسلام میں داخل ہونے کے لیے ایک ایسے دروازے کو چنا ہے جس کے بغیر اور جس کو مانے بغیر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں مسلمان ہوں، وہ بہت ہمت اور محنت سے مضامین کو اجاگر کر رہی ہیں ان کی لکھی ہوئی کتاب مجھے مل گئی ہے۔ اتنی عمدہ اور اسلامی کتاب لکھنے پر بہت، بہت مبارک باد۔ ہمیشہ کی طرح اس ماہ بھی ڈائری بہترین تحریروں سے سجائی گئی ہے۔ اتنے اچھے اور سبق آموز آشتم اپنی، اپنی جگہ پر موتیوں کی طرح سجائے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ لکھنے والوں کو مزید اچھا لکھنے کی توفیق دے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی صاحبہ کو صحت و تندرستی دے، بہت پیاری نعت رسول مقبول ﷺ لکھی ہے۔“ (پیارے سے تبصرے کا شکریہ)

جبینا، کراچی سے۔ ”2 فروری کو رسالہ ملا یہ میرے ہر مہینے کا گفٹ ہے جو میری چھوٹی بہن شبینا کی طرف سے ہوتا ہے، سیلری ملتے ہی وہ اپنے لیے، جاسوسی اور سسپنس اور میرے لیے پاکیزہ لیتی ہے۔ فہرست میں بڑے اچھے، اچھے نام دیکھنے کو ملے۔ بیادِ معراج رسول میں رائٹرز بہنوں نے محترم کے لیے اپنی عقیدت کا اظہار بہت دلکش انداز میں کیا واقعی ادارے کے نگرانِ اعلیٰ کا شمار ایسی ہی ہستیوں میں ہوتا ہے جن کے لیے جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ محترمہ عذرا رسول صاحبہ کے الفاظ نے رُلا دیا اللہ تعالیٰ انہیں مزید صبر اور حوصلے سے نوازے۔ (آمین) اسما عباس کا انٹرویو ویلڈن انہیں دوبارہ سے صحت یاب ہونا مبارک ہو۔ نیلم احمد بشیر سے پاکیزہ کے ذریعے تعارف برسوں پرانا ہے۔ بہنوں کی محفل میں سب بہنوں کے حالات سے آگاہی ہوئی دنیا چھوڑنے والوں کی مغفرت اور بیماروں کی صحت کی دعا کی۔ محترمہ عذرا رسول کی باتیں پڑھیں اچھا لگا اور خاص طور پر ان کا کنیز زہرا کی کہانی کی تعریف...... اتنے بڑے ادارے کی نگران کا اتنا کہنا حوصلہ بڑھانا...... مجھے تو ایسا ہی لگا جیسے ایک ماں اپنے بہت سارے بچوں پر یکساں نظر رکھتی ہے اور پھر ان میں سے کسی کے اچھے کام کو بھی خوب سراہتی ہے اور اپنا پیار نچھاور کرتی ہے میری جانب سے ان گریٹ خاتون کے لیے عذرا ماں کا خوب صورت لقب حاضر ہے۔ (واہ بہت خوب، تمہاری محبت ہے) واقعی کنیز زہرا کی کہانی قابلِ تقلید ہے۔ پاکیزہ ڈائری اس ماہ بھی بہترین رہی۔ افسانوں میں مکین دل سو سو رہی اور اس میں شامل آزاد نظمیں بہت خوب صورت بول تھے اینڈ بھی اچھا رہا مگر دانیہ آفرین تھوڑا بتا دیتیں آخر فائل میں کیا تھا جو بیڈ پر رکھی ہوئی تھی۔ لاحاصل میں رویتے کے معاملے میں بیٹی پر بیٹے کو ترجیح کی صحیح عکاسی تھی۔ میں انمول اور بساط پر تبصرہ بھی اگلے ماہ بشرطِ زندگی۔ کیونکہ ابھی ادھوری ہیں ناں اس لیے...... معافی میں ماں کو اتنی سختی نہیں دکھانی چاہیے تھی کیونکہ ماں اگر پتھر ہے تو پھر موم بھی تو وہی ہے چلیں جیسے رائٹر کو صحیح لگا۔ بہاریں چمن گویا کی مزہ آ گیا۔ رابی کو بھی خوب سوجھی چلو بھئی کرو بیڈ ریسٹ ویسے مصروفیت بہت اچھی چیز ہے۔ فارغ رہنے سے خالی دماغ شیطان کا گھر بن جاتا ہے۔ کیسی لاگی یاری...... اچھا سبق دیا ہے سیما نے کچھ یونیک سی کہانی لگی سوائے دو لوگوں کے سارے کردار خاموش تھے اینڈ بھی پاورفل تھا۔ میری ایک گزارش ہے اپنی عزیز لکھنے والی بہنوں سے کہ انگلش کا استعمال کم کریں۔ (بالکل ٹھیک کہا تم نے، آئندہ ہم بھی خیال رکھیں گے) میں ایسی خواتین کی چشم دید گواہ ہوں جو صرف اور صرف اردو پڑھنا جانتی ہیں وہ بھی مشکل سے۔ وردہ بخاری نے بھی بہت اچھا پیغام دیا زبردست عائشہ خان...... کیا کہنے ماشاء اللہ معصوم بچوں کے چہروں پر آتی ہوئی خوشی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اللہ ہماری زندگیوں میں پھیلے کڑوے باداموں کی تلخی کو بھی اسی طرح دور کردے۔ (آمین) میں اگر نمبرز دیتی تو ماہ فروری کے پاکیزہ میں سے کڑوے بادام کو پہلا نمبر دیتی کیونکہ صرف بادام کڑوے تھے الفاظ میٹھے ہیں، عورت کہانی بہت دکھ بھری تھی۔ آخری حصہ وقفے، وقفے سے بہت روتے ہوئے پڑھا۔“ (تفصیلی تبصرے کا ڈھیروں شکریہ)

سمارا انعم بھٹی، ڈیرہ غازی خان سے۔ ”ایک بار پھر محفل میں حاضرِ خدمت ہوں فروری کا شمارہ قدرے لیٹ موصول

ہوا اور سرپڑھا پھر انکل معراج کے لیے ڈھیروں دعائیں کیں پھر بہنوں کی محفل میں تانکا جھانکی کی تمام بہنوں کے خط لاجواب و مفصل تھے۔ آپی میرے خط میں آپ نے آری والی بات کے متعلق پوچھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ آری کا..... اختر شجاعت آنٹی سے استفسار کیا تھا۔ (اچھا اب ان سے جواب لے لیں گے) اب بات ہو جائے کہانیوں کی تو اس مرتبہ پسندیدہ مصنفہ ناہید سلطانہ اختر موجود تھیں اور ہمیشہ کی طرح بہترین تحریر نے کرائیں، ویلڈن آنٹی اس کے بعد افسانے پڑھے جو کہ ایک سے بڑھ کر ایک تھے خاص طور سے سیما بنت عاصم کی کی اور ناہید فاطمہ کا معانی بہترین تھے۔ اسماعباس کا انٹرویو بہترین تھا اور ان کے جوابات تو ہوتے ہی لاجواب ہیں۔ اس سے میں کرنا بھی یاد رکھیں تاں۔" (جی ضرور کوشش کریں گے۔ تبصرے کا شکریہ، سمارا آپ کو ابھی مطالعے کی ضرورت ہے)

✽ زرتاشہ نعمان، ملتان سے۔ "فروری کے رسالے میں اپنا خط دیکھ کر ایسے خوشی ہوئی جیسے کسی نو آموز لکھاری کو اپنی پہلی تحریر کے چھپنے پر ہوتی ہے۔ یہ میرا پہلا شکایتی خط تھا جسے بہنوں کی محفل میں جگہ ملی۔ (خط شکایتی ہوں یا محبتی جگہ ضرور ملتی ہے اور یہ تو آپ کی اپنائیت بھری شکایت تھی جو سر آنکھوں پر) آپی مجھے یہ پوچھنا تھا...... نومبر میں ایک تحریر ارسال کی تھی ع عورت م محبت ہی ہی کے نام سے کیا وہ آپ کو موصول ہوئی ہے؟" (زرتاشہ کہانی موصول ہوئی، پڑھ لی گئی ہے۔ ابھی آپ مطالعے پر ہی زور دیں)

✽ نادیہ نواز، کراچی سے۔ "آپا جان ماہ اکتوبر میں جب میں نے پاکیزہ سے متاثر ہو کر بہنوں کی محفل میں شرکت کے لیے پہلا خط لکھا تب مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ معراج رسول صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن جیسا کہ میں نے اپنے پہلے خط میں آپ سے کہا تھا کہ اب میں ہر ماہ پاکیزہ باقاعدگی سے پڑھا کروں گی تو پھر جب میں نے نومبر کا شمارہ پڑھا تو مجھے بے حد افسوس ہوا کہ عذرا صاحبہ اتنے بڑے صدمے سے گزر کر دوبارہ ہمارے درمیان آئی ہیں۔ آپا کا دکھ بہت بڑا ہے اور ہمارے الفاظ اس دکھ کا مداوا نہیں کر سکتے مگر دعا ہے کہ اللہ رب العزت معراج رسول صاحب کے درجات بلند فرمائے اور آپ کو اور آپ کے اہلِ خانہ کو صبر و استقامت عطا فرمائے۔ (آمین) اس ماہ بہت سی بہنوں نے آپ سے اپنی کہانی بھیجنے کی اجازت طلب کی مگر میں بغیر اجازت ہی اپنی ایک ادنیٰ سی کاوش آپ کی جانب بھیج رہی ہوں، امید کرتی ہوں کہ آپ کو برا نہیں لگے گا۔" (کہانی ضرور بھیجیں اس کے لیے کوئی منع نہیں مگر ہمیں تو یہ دیکھنا ہوتا کہ وہ پاکیزہ کے معیار کے مطابق ہے یا نہیں، کہانی میں کوئی سبق ہو، کوئی اچھی بات دلچسپ پیرائے میں، اندازِ تحریر رواں اور شستہ ہو)

✽ فائزہ فاروق سحر، لاہور سے۔ "دیر سے آنے کی معذرت کے ساتھ کہ سال بھر پڑھتی تو ضرور رہی پر حاضری باقاعدگی سے نہ دے سکی۔ اب بھی لیٹ تبصرے کے ساتھ حاضرِ خدمت ہوں۔ جنوری اور فروری کا پاکیزہ اکٹھے جوڑ کر پڑھا اور چند تحریروں نے بہت مزہ دیا۔ خطوط بھی بہنوں کے سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ پاکیزہ ڈائری بھی خوب رہی اور گوشۂ ظرافت میرا فیورٹ ہے۔ موسم خوب صورت کروٹ لے چکا ہے اور بہار آنے والی ہے۔ اب کے مارچ کا پاکیزہ تو پارک میں جا کر فرینڈز کے ساتھ پڑھوں گی (جی ضرور ان شاء اللہ) شعر و شاعری میں صفحہ جو نامور شعرا کا ہے وہ مجھے بہت پسند ہے اور اکثر میری پسند کے شاعرہ شاعر کی میری فیورٹ غزل ہی ہوتی ہے۔ چناؤ بھی خوب ہے رچاؤ بھی خوب ہے۔" (دیر سے آنے کی معذرت قبول کر لی مگر پھر بھی تاکید کرتے ہیں کہ تفصیلی تبصرہ کیا کریں)

✽ زرینہ خانم لغاری، مظفر گڑھ سے۔ "بچوں جیسی ٹوپی پہنے مسکراتی حسینہ عجیب لگ رہی تھی۔ ہمارا رسالہ پاکیزہ ہے سو بری سی تصویر ٹائٹل پر لگایا کریں (جی بہتر)۔ سالِ نو مبارک ہو۔ دسمبر پر تبصرہ بھیجا تھا شاید آپ نے لفٹ نہیں کرائی خیر جو مزاج یار میں آئے (دیر سے ملا ہوگا ناں) مذہبی صفحے پڑھے پھر آگے بڑھے۔ زنگ اترنے میں تو دیر لگے گی، ٹھوکر بہترین کہانی تھی سبق آموز لے پاک دکھ خواہ مخواہ حسد کرنے والے جلتے ہی رہتے ہیں ناشکرے لوگ۔ رب کے نواز ہے واقعی رب نوازتا ہے۔ عاشق بامراد واقعی سچے مخلص دوست نعمت ہوتے ہیں، رشنا کو سہارا مل گیا۔ ماہ ز ما ما سچ پوچھیں جہاں بہو اچھی بھی ہو تو ساس کو یقین نہیں آتا وہ اس کے پیار کو خوشامد اور چاپلوسی سمجھتی ہے۔ حاصلِ زندگی عورت کو بھی مرد پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے جوان بچوں کے باپ بھی دوسری شادی کی تڑپ رکھتے ہیں۔ ریاض صاحب آپا کہتے، کہتے بیوی بنا بیٹھے لیکن سارہ نے حوصلے سے زندگی گزاری خود کو روگ نہیں لگایا اس کی خود کشی کی کوشش کو خوشگوار موڑ دے دیا گیا۔ انمول رشتے شہلا وقار کا ٹھکانا شیلٹر ہوم ہی ہونا چاہیے اس نے اپنی حرکتوں سے انمول رشتے کھو دیے۔ تریا چلتر چوہدری کو غرور کی خوب سزا ملی۔ اپنی کمزوری نہ دیکھی عورتوں پر الزام اور سوکن پر سوکن چوتھی بیوی نے خوب انتقام لیا گو کہ کیا تو اس نے برا کام لیکن چوہدری جیسوں کے ساتھ ایسا ہی

ہونا چاہیے۔ مسبب الاسباب کم تنخواہ فیملی کے لیے یہ اچھا پیغام ہے اس طریقے سے بھی آمدنی بڑھائی جاسکتی ہے (جی بالکل)
نگہت سیما کی کہانی نے رونے پر مجبور کردیا اتنی پاکیزہ زندگی گزارنے والی لڑکی کے ساتھ اتنا برا ہوا ہے۔ یہ دنیا ہے اس میں سب کچھ ممکن ہے یہی تو بیٹیوں کا نصیب ہوتا ہے جس سے مائیں ڈرتی ہیں اختر شجاعت کو اللہ دے زورِ قلم اور زیادہ سیدھی راہ دکھاتی ہیں۔ دردانہ نوشین تو ہمارے مظفر گڑھ کی بیٹی ہے میں ذاتی طور پر ان کو اور ان کی فیملی کو جانتی ہوں انہیں پڑھ کر خوشی اور فخر محسوس ہوا (بے شک دردانہ ہمارے لیے بھی قابلِ قدر ہیں) گوشہ ظرافت پر نگاہ ڈالی۔ بہنوں کی محفل تو ہے ہی اپنی جان تمام قاری بہنوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ کمالیہ کی بہن ساجدہ ظفر نے میرے پیارے بھیا کی رحلت کا افسوس کیا ہے، بہت، بہت شکریہ بہن آپ نے میرے دکھ کو محسوس کیا۔" (تبصرے کا شکریہ)

☜ عظمیٰ نواز، لاڑکانہ سے۔" یہ میرا پہلا خط ہے سمجھ نہیں آرہا کہ کیا لکھوں (آتو گیا سمجھ پریشان کیوں ہوتی ہو) پچھلے پانچ سال سے آپ کی خاموش قاری ہوں صرف میں نہیں بلکہ میری دو بہنیں بھی۔ پانچ سال میں ایسا کوئی شمارہ نہیں جو ہم نے نہ پڑھا ہو (بہت اچھا کیا) کہانیاں تو بہت سی ہیں جو میری فیورٹ رہی ہیں پر اب خط لکھنے بیٹھی ہوں تو کچھ یاد ہی نہیں آرہا (چلو یاد کر کے تفصیلی خط لکھ دینا) بات کو آگے بڑھاتی ہوں پلیز میرا خط پورا پڑھیے گا۔ پاکیزہ نمبرون ہے پھر چاہے وہ کہانیاں ہوں یا یہ اسلامی باتیں، پاکیزہ سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملا ہے۔ خاص کر گرمیوں کے دنوں میں ہمارا بہت ہی وفادار ساتھی ہے کہنا تو بہت کچھ ہے پر آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔" (پیاری بیٹی عظمیٰ پیارے سے مختصر خط کا شکریہ کہانیوں پر بھی تبصرہ لکھو۔ ابھی پڑھنے پر دھیان دیں۔ یہ والی تحریریں تو نا قابلِ اشاعت ہیں)

☜ روحی صبا، کراچی سے۔ فروری کا پاکیزہ تو میرے گھر آ گیا ہے مگر پہلے آپ کو ایک خوشی کی بات بتاتی ہوں ڈھائی ماہ پہلے میں گاؤں گئی اپنے بہن بھائیوں سے ملنے اور میں کافی عرصے سے اپنے بیٹے کے رشتے کے لیے پریشان بھی آپ سے کئی بار دعا کی اپیل بھی کی اور یقین کریں کہ بس مجھے لگ رہا تھا خدانخواستہ میرے بیٹے کا رشتہ کبھی نہیں ہوگا (ارے اتنی بھی کیا مایوسی؟) مگر جب میں اپنے گاؤں صوابی گئی اور دو مہینے گزار کر واپسی کی بکنگ کروائی تو بس اچانک ایک لڑکی کا کسی نے کہا اور دو تین بار جانے کے بعد بات پکی ہوگئی اور بس ایک ہفتے کے اندر منگنی ہوگئی ماشاءاللہ بہت پیاری بچی اور بہت اچھی دین دار فیملی سے تعلق ہے تو میں اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے، بے شک اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں (جی بالکل) اللہ کریم کے شکر کے بعد نزہت میں آپ کی آپ کے ادارے کی اور پاکیزہ بہنوں کی بھی شکر گزار ہوں کہ پتا نہیں کب کس کی دعا کو شرفِ قبولیت حاصل ہوا (جی بالکل پاکیزہ بہنیں اسی طرح سب کے دکھ سکھ میں شریک رہتی ہیں) اچھا نزہت وقت کی کمی کی وجہ سے اس بار اتنا ہی آخر میں اپنی پیاری پاکیزہ بہنوں کے نام یہ پیغام کہ اللہ کی ذات سے کبھی بھی مایوس نہ ہوں مسلسل اپنے رب سے رابطے میں رہیں اور دوسری اہم بات ہے خوشیاں ملنے پر بھی مغرور نہ ہوں نہ ہی اترائیں بلکہ اپنے رب کا شکر بہت عاجزی سے ادا کرتے رہیں۔" (بہت پیاری بات کی روحی، اللہ آپ کو خوشیاں مبارک کرے، آمین)

پیاری بہنو! اب محفل برخاست کرنے کا وقت آ گیا۔ اس دفعہ خطوط بہت زیادہ تھے تو اگلے شمارے کے لیے اٹھا رکھنا پڑے جس میں صبا آصف کا بھی محبت نامہ ہے۔ اگلا شمارہ تو سالگرہ نمبر ہوگا لہٰذا جلد ہی مراسلات ارسال کردیجیے گا۔ یہ بتادیں کہ سالگرہ نمبر میں محفل کچھ مختلف انداز میں سجے گی لہٰذا خطوط مختصر ہوں تو اچھا ہے۔

آپ سب کے لیے صحت وسلامتی کی دعائیں ہیں۔ نیک تمنائیں ہیں...... اپنے رب سے گناہانِ کبیرہ وصغیرہ کی بخشش کے طلب گار رہیں۔ یا اللہ تو ہی دعاؤں کا مستجاب کرنے والا ہے۔

والسلام

آپ کی خیر اندیش......نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.C فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,118



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمد باری تعالیٰ

اب نمازوں ہی نمازوں میں مزہ آنے لگا
سجدے میں جوں ہی گئی جلوہ نظر آنے لگا
سارے عالم کو بتایا نور سے اللہ نے
پھر اندھیری رات میں جگنو نظر آنے لگا
روشنی ہی روشنی ہے کوئی غم باقی نہیں
پھول صحرا میں کھلے سن کر مزہ آنے لگا
کہیں دعاؤں پر دعائیں سُن رہا ہے میرا رب
ہم گنہگاروں کی بخشش کا مزہ آنے لگا
میں تو ہوں راضی مگر اس کی رضا درکار ہے
آسرا ہی آسرا ہے کچھ مزہ آنے لگا

کلام: ڈاکٹر ذکیہ، بلگرامی

نعتِ رسول مقبولؐ

نام تیرا جب لکھے میرا قلم
ان گنت بوسے بھی دے میرا قلم
نام کو جب چوم لے یا مصطفیٰؐ
خود پہ بھی نازاں رہے میرا قلم
نہ رہی اس کی سیاہی جب لکھا
نور ہی لکھتا رہے میرا قلم
خواہشیں اب کچھ نہیں اس کے سوا
نعتیں ہی لکھتا رہے میرا قلم
نعت پوری جو تیری میں لکھ چکوں
دیر تک روتا رہے میرا قلم

عقیدت گزار: جینا، کراچی

سنہری باتیں

☆ سب سے افضل عمل اللہ کے واسطے محبت کرنا اور اللہ ہی کے واسطے دشمنی رکھنا ہے۔ (حدیث رسولؐ)

☆ خاموش رہو کہ صرف خدا ہی تمہارے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتا ہے۔

☆ (اے رسول) میرے بندوں کو اطلاع دو کہ بے شک میں بخشنے والا مہربان ہوں۔ (سورۂ حجر ۴۹)

☆ رشتے ایک دوسرے کا خیال کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کا استعمال کرنے کے لیے نہیں۔

☆ دین داری لوگوں کو مت جتاؤ...... بلکہ لوگ تمہارے عمل سے .... تمہیں سچا دین دار سمجھیں۔

از: نگہت غفار، کراچی

نماز کے لیے سکون کے ساتھ جانا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”نماز کے لیے دوڑتے ہوئے مت آیا کرو بلکہ اطمینان اور سکون کے ساتھ آیا کرو۔ جتنی نماز مل جائے وہ پڑھ لیا کرو جو رہ جائے اسے مکمل کر لیا کرو....“ (مسند احمد، جلد چہارم حدیث 3606)

مرسلہ: رابعہ محمد عمر تانچ، شہداد پور

UUNOVELS.COM

حضرت ادریسؑ کی خصوصیات

حضرت ادریسؑ کو اللہ تعالیٰ نے دس چیزوں میں منفرد فرمایا تھا۔

1۔ آپؑ نبی مرسل تھے۔
2۔ 30 صحیفے آپؑ پر نازل فرمائے۔
3۔ علم نجوم کی تعلیم سے انہیں بہرہ ور فرمایا۔
4۔ یہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم سے لکھنے کی ابتدا کی۔

5۔ کپڑا سینا انہوں نے ایجاد کیا ان سے پہلے لوگ چمڑے کا لباس پہنتے تھے۔
6۔ جنگ کے اسلحے بھی انہوں نے ایجاد کیے۔
7۔ جہاد کی بنیاد انہوں نے قائم کی۔
8۔ کفار اور ان کی اولاد کو گرفتار کرنے کی بنیاد انہوں نے قائم کی۔
9۔ لباس سینا اور پہننا ان کی ایجاد ہے۔
10۔ خدا نے انہیں سب سے پہلے زندہ آسمان پر اٹھالیا ہے۔ مورخین کا بیان ہے انہوں نے دنیا میں سو شہر آباد کیے۔ کشف انعمہ میں ہے کہ آپ کو 72 زبانیں بتائی گئی تھیں اور آپؑ ہر زبان میں تبلیغ کرتے تھے۔

از: علامہ عبدالواحدین محمد المفتی الحھی
مرسلہ نگار: مشی علی، شاہ پور چاکر ضلع سانگھڑ

رزق میں کمی کے پانچ اسباب

1۔ مغرب اور عشا کے درمیان سونا۔
2۔ قبرستان میں ہنسنا۔
3۔ نماز کی پابندی نہ کرنا۔
4۔ سجدہ تلاوت نہ کرنا۔
5۔ اندھیرے میں کھانا کھانا۔

از: زرینہ خانم لغاری، مظفر گڑھ

مخلص دوست

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ مخلص دوست کے اندر اتنا پیار چھپا ہوتا ہے کہ جیسے چھوٹے سے بیج کے اندر پورا درخت چھپا ہوتا ہے۔

مرسلہ: حمیرا انجم وحید، واہ کینٹ

امن

آنگن، آنگن پھول کھلاؤ امن کے
دیواروں پر دیپ جلاؤ امن کے
اس سے ملے گا دل کو سکوں سکھ نین کو
مل کر یارو گیت تو گاؤ امن کے
گاتی ہیں جو چڑیاں پیڑ پہ مل کر ساتھ
لوگوں کو نغمے وہ سناؤ امن کے
کب سے جمال سوختہ جاں یہ کہتا ہے
اس دھرتی میں پھول کھلاؤ امن کے

شاعر: سمیع جمال
انتخاب: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

پھول

☆ سرخ پھول، محبت کے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔
☆ سفید پھول، پاکیزہ جذبات کا ترجمان ہوتا ہے۔
☆ نرگس کا پھول، انتظار کا اظہار کرتا ہے۔
☆ زرد گلاب، نفرت کے اظہار کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔
☆ کالا گلاب، افسردگی اور غم کا ذریعہ ہوتا ہے۔
☆ نیلا گلاب، سچا اور پاکیزہ دوست ہونے کا اظہار کرتا ہے۔

از: پروین، پنجاب

صحت

تندرستی ہزار نعمت ہے
ایک مشہور انگریزی کہاوت کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے کہ کہا۔
ایک صحت مند جسم ہی صحت مند دماغ کا ضامن ہے۔
آج کے مشینی دور میں یہ بھی خدا کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ جہاں ایک طرف تیزی اور مار دھاڑ ہے وہاں دوسری طرف بیماریوں کی بھرمار ہے۔
وزن کم کرنے کے لیے جہاں لوگ لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں وہاں دو قدم چلنا پسند نہیں کرتے۔ انٹرنیٹ اور موبائل کے اس دور میں بچے بھی کھیلنا، بھاگنا، دوڑنا کم کرچکے ہیں۔ چلنا، سائیکل چلانا، تیرنا یہ تین سب سے آسان ورزشیں ہیں لیکن ہم لوگ سب بھول چکے ہیں۔ کہتے ہیں پیسہ نہ رہے تو کوئی نقصان کی بات نہیں پر، صحت نہ رہے تو پیسہ بھی بیکار ہے۔ اور اگر کردار نہ رہے تو کچھ نہیں بچتا۔

از: فریدہ فضل ڈیلاس، یو ایس اے

لائف ٹپس

☆ بعض لوگ اچھا بننے کے لیے اتنی کوشش نہیں کرتے جتنی کہ اچھا نظر آنے کے لیے کرتے ہیں۔

☆ ناکامی ایک برستا بادل ہے اور تمہارا ارادہ ایک چھتری۔

☆ کشتیاں باہر کے پانی سے نہیں، اندر کے پانی سے ڈوبتی ہیں اور گھر بھی۔

☆ خوش اخلاق انسان سب سے زیادہ خوب صورت اور باعزت ہوتا ہے۔

☆ ہمیشہ سمجھوتا کرنا سیکھو کیونکہ تھوڑا سا جھک جانا کسی رشتے کے ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جانے سے بہتر ہے۔

☆ نظر اس وقت تک پاکیزہ رہتی ہے جب تک ارادی طور پر دوسری بار نہ اٹھائی جائے۔

از: نادیہ، راول پنڈی

غزل

نئے زمانے نئے اِک شہر میں رہتی ہوں
میں گھر میں رہتے ہوئے بھی سفر میں رہتی ہوں
خلوصِ دل سے دعائیں جو مجھ کو ملتی ہیں
جہاں بھی جاؤں انہی کے اثر میں رہتی ہوں
میرا وجود ضروری ہے اس جہاں کے لیے
اسی لیے تو فسانوں خبر میں رہتی ہوں
یہ میرے پاؤں ٹھہرتے نہیں زمین پہ بھی
میں روز ہی کسی اندھے سفر میں رہتی ہوں
ٹھکانا کوئی بھی مجھ کو کبھی نہ راس آیا
اسی لیے تو ہمیشہ سفر میں رہتی ہوں

کلام: یاسمین کنول پسرور

تپسیا

ارون کمال کئی ہفتوں کی مسافت کے بعد ہمالیہ کی چوٹیوں میں دنیا کے ٹھنڈے ترین مقام پر جوگی سے ملنے پہنچا۔ ارون نے جوگی سے کہا۔ ''اس جگہ پر آپ کیسے رہ رہے ہیں، میرے لیے تو چند منٹ گزارنا مشکل ہوا جا رہا ہے۔'' جوگی نے کہا۔ ''اس کے دو سبب ہیں، اکیس سال کی تپسیا اور سبز چائے۔ آپ کیا لیں گے تپسیا یا چائے......''

ارون کمال گھبرا کر بولا۔ ''سبز چائے۔''

جوگی نے آواز لگائی۔ ''تپسیا! دو پیالی چائے تو لانا۔''

از: ساجدہ ظفر، کمالیہ

غزل

میرے گلے پہ جمے ہاتھ میرے اپنے ہیں
جو لڑ رہے ہیں میرے ساتھ میرے اپنے ہیں
شکست کھا کے بھی میں فتح کے جلوس میں ہوں
کہ دے گئے جو مجھے مات میرے اپنے ہیں
مری طرح سے یہ کچے گھروں میں رہتے ہیں
جو گھیر لائے ہیں برسات میرے اپنے ہیں
گر نہیں ہیں یہ شمس و قمر میرے بس میں
یہی بہت ہے کہ یہ دن رات میرے اپنے ہیں
کوئی سنے نہ سنے کوئی داد دے کہ نہ دے
یہی بہت ہے خیالات میرے اپنے ہیں
کسی کے دل میں بسا ہوں کسی کی آنکھوں میں
یہ ٹوٹے پھوٹے کمالات میرے اپنے ہیں

شاعر: ظفر خان نیازی
پسند: فرخندہ جعفری، گجرات

نہلے پہ دہلا

شوہر نے بیوی سے کہا۔ ''میں غیر ملک جا رہا ہوں۔'' بیوی خوش ہو کر بولی۔ ''انڈیا جاؤ تو ساڑی، دبئی جاؤ تو جیولری، فرانس جاؤ تو پرفیوم بھیجنا۔''

شوہر نے غصے سے کہا۔ ''اگر دوزخ میں جاؤں تو کیا بھیجوں؟''

بیوی نے اطمینان سے کہا۔

''اپنی وڈیو بھیجنا، آخر مجھے بھی تو پتا چلے کہ ہمیں ستانے والے کس حال میں ہیں۔''

مخلص: ثمینہ کوکب، جہلم

ہائے افسوس

خنجر سے مارنے کی ضرورت نہیں پڑی
ہم کو تو بس اپنوں کے لفظوں نے مار ڈالا

☆☆☆

کچھ کھو گئیں خوشیاں میری
کچھ ٹوٹ گئے ہیں خواب میرے
کچھ لوگوں نے برباد کیا
کچھ وعدے ہوئے سراب میرے

کاوش: اریبہ ارشد، واہ کینٹ

غزل

پہلے لگا کہ دل یہاں میرا اداس ہے
پھر یہ کھلا کے سارا زمانہ اداس ہے
یہ آنکھ تیرے نام تھی یہ شام تیرے نام
اب میں اداس ہوں یا ستارہ اداس ہے
اس کے بغیر لگتا نہیں تھا کہیں یہ دل
جب سے وہ مل گیا ہے زیادہ اداس ہے
ہر شخص اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے جہاں
ہر شخص اپنے آپ میں تنہا اداس ہے
کرنے چلی ہوں تازہ محبت کی رسم کو
کچے گھڑے کو دیکھ کر دریا اداس ہے
پاگل ہوا نے رات چراغوں سے یہ کہا
اس کے بغیر چاند بھی کتنا اداس ہے

کلام: ثمیلہ لطیف، پسرور

پگلی

چپ، چپ تنہا، تنہا
رہتی کیوں ہو ہر دم جاناں
زلفِ پریشاں زرد سا چہرہ
ٹوٹا گجرا کاجل بکھرا
میں نے یہ جب اس سے پوچھا
کس نے کیا ہے حال یہ تیرا
آنکھ میں اس کے آگئے آنسو
زخمی نظر سے مجھ کو دیکھا اور پکاری
تیری نظر سے ہوگئی گھائل
تیرے پیار میں ہوگئی پاگل

کلام: فریدہ فری، یوسف زئی، لاہور

اپنوں سے کچھ باتیں

☆ خلوص اور اچھائی اپنے لفظوں میں نہیں بلکہ اپنی نیت اور فطرت میں شامل کرو تا کہ تم دوسروں کے عیب نہیں بلکہ ان کی خوبیاں جان سکو۔

☆ اس سے پہلے کہ ہمیں کفن پہنایا جائے، اللہ پاک ہمیں تقویٰ کی پوشاک پہننا نصیب فرمائے۔

☆ جو شخص اپنی روح کو اللہ تعالیٰ سے جوڑ لیتا ہے دنیا اس کی غلام ہو جاتی ہے۔

☆ ایک اچھے شخص کی زندگی کا بہترین حصہ اس کے خلوصِ نیت، محبت اور رحم دلی سے کیے گئے معمولی اور گمنام اعمال ہیں۔

☆ احتیاط بڑی ضروری ہے چاہے آپ سڑک پار کر رہے ہوں یا حد۔

از: صبا نور، لیہ

جو چاہو وہ مل جائے اگر

☆ اگر سکون چاہتے ہو تو دوسروں کے لیے سکون کا باعث بنو۔

☆ اللہ سے معافی کے طلب گار ہو تو لوگوں کو معاف کرنے کا حوصلہ پیدا کرو۔

☆ اللہ کا احسان چاہتے ہو تو دوسروں پر احسان کرو۔

☆ رزق میں فراوانی چاہتے ہو تو اپنے مال میں سے غریبوں، مسکینوں کا حصہ نکالو۔

☆ مثبت ردِعمل چاہتے ہو تو پہلے اپنے عمل کو مثبت بناؤ۔

☆ اللہ پاک سے آسانیوں کے طالب ہو تو دوسروں کی زندگیوں کو آسان بناؤ۔

از: تہمینہ عباسی، بہاول پور

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆فرخندہ جعفری......گجرات

آساں نہیں ہے کشمکش ذات کا سفر
ہے آگہی کے بعد غمِ آگہی بہت
ہر شخص پُر خلوص ہے ہر شخص باوفا
آتی ہے اپنی سادہ دلی پر ہنسی بہت

☆فریدہ شاہین......ویہنہ

میں سمندر تھا مگر ویراں تھا صحرا کی طرح
میرے گھر تک چل کے آتا، اتنا پیاسا کون تھا

☆پروین افضل شاہین......بہاول نگر

ان ہواؤں سے تو اچھا تھا قفس میں رہنا
اب تو ہر سانس مرے واسطے مشکل ٹھہری
جس طرح پھول پہ کھلنے سے قیامت ٹوٹے
میری شہرت مری عزت کی بھی قاتل ٹھہری

☆عرشیہ جنید......کراچی

کسی غریب کو زخمی کرے کہ قتل کرے
نگاہِ ناز یہ جرمانے تھوڑی ہوتے ہیں
شعور تم نے خدا جانے کیا، کیا ہو گا
ذرا سی بات کے افسانے تھوڑی ہوتے ہیں

☆شاہین......پنجاب

میری نیندیں اجاڑنے والے
اب تیرے خواب کون دیکھے گا

☆حمیرا انجم وحید......واہ کینٹ

بہاریں جس کی شاخوں کی گواہی مانگتی ہیں
وہی موسم ہمیں بے ثمر کیوں لگتا ہے

☆ثمرینہ شہزادی......وزیر آباد

غلطی سے ہی سہی آپ نے مانا تو
مجرم آپ ہیں تو سزا مجھے ہی کیوں

☆ساجدہ ظفر......کمالیہ

بدلا جو وقت گہری رفاقت بدل گئی
سورج ڈھلا تو سائے کی صورت بدل گئی
اک مدت تو میں اس کی ضرورت بنی رہی
پھر یوں ہوا کہ اس کی ضرورت بدل گئی

☆عظمیٰ نواز......وزیر آباد

زندگی کے بھی کیا اصول ہیں یارو
مرنے کے لیے بھی جینا پڑتا ہے

☆ایمن رانی......ٹوبہ ٹیک سنگھ

خود اپنی ذات اسیرِ عذاب رکھتے ہیں
ہمارے عہد کے انسان خواب رکھتے ہیں
یہ تاجرانِ محبت بھی خوش گماں ہیں بہت
گناہ کر کے امید ثواب رکھتے ہیں

☆مشی علی......شاہ پور چاکر

غیروں کو کیا پڑی کہ وہ رسوا ہمیں کریں
ان سازشوں میں ہاتھ کسی آشنا کا ہے

☆حنا......کراچی

کہیں، کہیں تو عداوتوں نے پیراہن بدلے
کہیں، کہیں یہ اشک چارہ گری نے بھی دیے

☆تسنیم کوثر......کراچی

اِک عکس میرے خوابوں سے باہر نکل گیا
آنکھیں کھلیں تو پردے پہ منظر بدل گیا
ہم تھامتے ہی رہ گئے زنجیرِ وقت کو
آیا، رکا ہنسا مڑا اور ایک پل گیا

☆ارم کمال......فیصل آباد

کانٹوں کے خوف سے بھی لرزتے ہو تم منیر
اور گھر بھی چاہتے ہو سجانا گلاب سے

☆تسنیم......ایف بی ایریا
مکاں کے سارے دریچے کھلے رکھو محسن
نہ جانے کون سی جانب سے روشنی آئے
☆فریدہ فری یوسف زئی......لاہور
جو الجھن تھی در پیش حل ہو گئی
تجھے دیکھتے ہی غزل ہو گئی
میرے دل میں جب سے مکین تم ہوئے
یہی کوٹھڑی اک محل ہو گئی
☆ونیزارزاق وانی......ضلع اٹک
محبت بھی ہے وعدہ بھی ہے وفا بھی ہے
پھر کیا تو میرے حال سے آشنا بھی ہے
☆سائرہ ارم......کمالیہ
جہاں جاتا ہے میرا ذکر وہ کرتا ہے نفرت سے
یہ اس کی مہربانی ہے، مجھے بھی ساتھ رکھتا ہے
☆جبین نیاز......ملتان
یہ جو ڈوبی ہیں میری آنکھیں اشکوں کے دریا میں
یہ مٹی کے پتلوں پر بھروسے کی سزا ہے
☆ثمینہ کوکب......جہلم
لوگ کیوں بس کر اجڑتے ہیں کبھی سوچا ہے
کس لیے جاں سے گزرتے ہیں کبھی سوچا ہے
جو نظر آتے ہیں آئینہ سی پوشاکوں میں
وہ بھی مٹی میں اترتے ہیں کبھی سوچا ہے
☆روحی صبا......کراچی
کونپلیں پھر پھوٹ آئیں شاخ پر، کہنا اسے
وہ نہ سمجھا ہے نہ سمجھے گا مگر کہنا اسے
ہم سفر کی چاہ میں تنہا سفر کرتے ہوئے
آ گیا ہے ختم ہونے پر سفر، کہنا اسے
☆فصیحہ آصف خان......ملتان
سنو ہم بیٹھ کر تنہا کسی ویران گوشے میں
ہوا کو دکھ سنائیں گے تجھے ہم بھول جائیں گے
☆ثمرینہ قیصر......کمالیہ
جس طرح سے بدلی ہیں لکیریں مری ناصر
موسم کو بھی یوں میں نے بدلتے نہیں دیکھا

☆عروبہ ناز......کوٹلی
میرا سیدھا سادہ مزاج تھا مجھے عشق ہونے کی کیا خبر
ترا اک نظر مجھے دیکھنا میرے سارے شوق بدل گیا
☆رعنا مشتاق......سرگودھا
آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے
☆جویریہ سہیل......کراچی
عجب اصول ہیں اس کاروبارِ دنیا کے
کسی کا قرض کسی اور نے اتارا ہے
کہیں پہ ہے کوئی خوشبو کہ جس کے ہونے کا
تمام عالم موجود استعارا ہے
☆فاطمہ......صوابی
خواہشوں کے زہر میں اخلاص کا رس گھول کر
وہ تو پتھر ہو گیا دو چار دن ہنس بول کر
بند ہاتھوں کا مقدر تھیں کبھی کرنیں مگر
سارے جگنو اڑ گئے، دیکھا جو مٹھی کھول کر
☆یاسمین کنول......پسرور
جن لفظوں کے کچھ معنی تھے وہ لفظ تو خواب ہوئے لیکن
اب شہر میں لگتا جاتا ہے اک میلا نئی کتابوں کا
ہم لوگ جنوں کے عالم میں منزل کی طلب بھی بھول گئے
اب دل کو بھلا سا لگتا ہے صحرا میں عکس سرابوں کا
☆زرینہ خان......بہارہ کہو
کس طرح سے ممکن تھا ایک شاخ پر کھلتے
میں کہ ہجر کا لمحہ تو وصال کا موسم
کس نے کھیل کھیلا ہے کس نے ہجر جھیلا ہے
اب گزر گیا جاناں اس سوال کا موسم
☆یاسمین......ضلع قصور
پھر دل نے کیا ترکِ تعلق کا ارادہ
پھر تجھ سے ملاقات کے پہلو نکل آئے
☆نگینہ ضیا......کیماڑی
بہت بلند نہ کر اپنے گھر کی دیواریں
ذرا سی دھوپ میرے صحن میں بھی آنے دے



خوش ذائقہ

شگفتہ یاسمین

پیاری بہنو! خوش ذائقہ کے ان صفحات میں ہم آپ کے لیے معروف میزبان اور شیف شگفتہ یاسمین کے تیار کردہ کھانوں کی تراکیب بعنوان "امی کی ریسپیز" لے کر آئے ہیں۔ (مدیرہ)

آلو کے چائنیز کباب

اشیا: آلو، آدھا کلو۔ چکن، (بغیر ہڈی) ایک پاؤ۔ مکھن، دو کھانے کے چمچ۔ کالی مرچ، آدھا چائے کا چمچ۔ نمک، ایک چائے کا چمچ۔ اجینوموتو، آدھا چائے کا چمچ۔ زیرہ بھنا پسا، آدھا چائے کا چمچ۔ میدہ، چار چائے کے چمچ۔ چاٹ مسالا ایک چائے کا چمچ۔

ترکیب: آلو اور چکن کو علیحدہ علیحدہ ابال لیں۔ اب آلوؤں کو چھیل کر میش کرلیں اور چکن کے ہاتھوں سے باریک، باریک ریشے کرلیں۔ اب اس میں بھنا زیرہ، چاٹ مسالا، نمک، کالی مرچ، اجینوموتو شامل کرلیں۔ مکھن کو ہلکا سا گرم کرلیں اور اس میں شامل کرلیں۔ ان سب کو اچھی طرح مکس کرلیں اب ان کو کبابوں کی شکل دے کر دونوں طرف میدہ لگا کر تل لیں۔

بروکلی کا شربت

اشیا: جسم میں وٹامن K کی کمی، چوٹ لگنے یا کسی بھی حادثاتی صورتِ حال میں جسم سے بہتے ہوئے خون کے نہ رکنے کا سبب بنتی ہے جو بعض اوقات سنگین صورت اختیار کرسکتی ہے۔ اپنے جسم میں وٹامن K کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے بروکلی پر مشتمل مشروب استعمال کریں۔ بروکلی، پھول گوبھی کی طرح کی ہرے رنگ کی چائنیز سبزی ہے۔

اشیا: بروکلی، 125 گرام (پھول) سیب دو عدد، کالی مرچ، حسبِ پسند۔ لیموں کا رس، ایک کھانے کا چمچ۔ آئس کیوبز، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: بروکلی اگر سائز میں بڑی ہو تو اس کے پھولوں کو مزید کاٹ کر چھوٹا کرلیں سیب کو چھیل کر چوپ کرلیں۔ دونوں کو ایک ساتھ جوسر مشین میں ڈال دیں۔ رس نکالنے کے بعد اس میں لیموں کا رس شامل کرلیں۔ گلاس میں آئس کیوبز ڈال لیں اور اس میں جوس ڈال کر سرو کریں۔ اور پسند ہو تو نمک، کالی مرچ بھی چھڑک دیں۔

ہمیشہ یاد رکھیں امی کی ریسپیز کیونکہ یہی ہے راز ہوم شیف بننے کا۔

قیمے کی کچوریاں

اشیا: قیمہ، آدھا کلو۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ ثابت دھنیا، ایک کھانے کا چمچ۔ ہری مرچ، تین سے چار عدد۔ گھی، تلنے کے لیے۔ اجوائن، آدھا چمچ۔ میٹھا سوڈا اور سفید زیرہ، ایک چمچ۔ ادرک، لہسن، ایک چمچ۔ لال مرچ، ایک کھانے کا چمچ۔ پسی کالی مرچ، آدھا چمچ۔ ہرا دھنیا، ایک گٹھی باریک۔ لیموں کا رس، دو چمچ۔ میدہ، ایک کلو۔

ترکیب: میدے میں نمک، میٹھا سوڈا، اجوائن اور چار کھانے کے چمچ گھی ڈال کر دس سے پندرہ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ ایک برتن میں ایک کھانے کا چمچ گھی درمیانی آنچ پر گرم کریں۔ قیمہ، ادرک، لہسن، کالی مرچ اور لال مرچ ڈال کر اتنی دیر پکائیں کہ پانی خشک ہوجائے۔ پھر ثابت دھنیا اور زیرہ ڈال کر تین منٹ بھونیں پھر چولھے سے اتار کر اس میں پیاز، ہری مرچیں، ہرا دھنیا، لیموں کا رس ملالیں۔ کچوریوں کے لیے آٹے کے پیڑے بنالیں۔ ہاتھ کو گیلا کر کے پیڑے کو ذرا سا پھیلالیں۔ پیڑے میں قیمہ بھر کر اچھی طرح بند کردیں اور پندرہ منٹ کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ کڑاہی میں گھی گرم کریں اور بنائے گئے پیڑوں کو ڈیپ فرائی کر کے گولڈن

براؤن کرلیں چٹنی یا کچپ کے ساتھ گرم، گرم پیش کریں۔
از: زرمینہ خان، بہارہ کہو

چکن چیز مکھنی

اشیاء: مرغی (بون لیس کیوبز) آدھا کلو۔ تیل، تین کھانے کے چمچ۔ ادرک پیسٹ، ایک چائے کا چمچ۔ لہسن پیسٹ، ایک چائے کا چمچ۔ پیاز، دو عدد۔ (سلائس کاٹ کر ابال لیں اور پیس لیں) ٹماٹو پیوری، دس کھانے کے چمچے۔ سرخ مرچ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ ہلدی پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ زیرہ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ تندوری مسالا پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ شکر، ایک چائے کا چمچ۔ کاٹیج چیز، (کیوب کیا ہوا) سوا پاؤ۔ کریم، چھ کھانے کے چمچ۔

ترکیب: تیل گرم کر کے اس میں گوشت، لہسن، ادرک پیسٹ ڈال کر پانی خشک ہونے تک تلیں۔ اس کے بعد پیاز پیسٹ ڈال کر اتنا بھونیں کہ تیل الگ ہو جائے۔ اب ٹماٹو پیوری، سرخ مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، زیرہ پاؤڈر، تندوری مسالا پاؤڈر اور نمک ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ گوشت گلنے تک ڈھک کر پکائیں۔ آہستہ ہاتھ سے کاٹیج چیز ڈالیں اور ایک منٹ پکانے کے بعد آنچ سے اتار لیں۔ اوپر سے کریم ڈال کر گرما گرم سرو کریں۔

از: شمیم ناصر، کراچی

فروٹ جیلی ڈیلائٹ

اشیاء: دودھ، چار کپ۔ کسٹرڈ پاؤڈر (ونیلا) دو کھانے کے چمچ۔ ٹھنڈا دودھ، ایک چوتھائی کھانے کا چمچ۔ چینی، آدھا کپ یا حسب ضرورت۔ جیلی، ایک پیکٹ (اسٹرابیری) پانی، ایک کپ۔ (ابلتا ہوا)۔ سیب، (کیوب میں کٹا ہوا)، موسمی، (چھلی ہوئی ٹکڑوں میں)۔ کیلا، (گول کٹا ہوا)۔ سب ملا کر ایک کپ۔ اخروٹ، دو ٹکڑوں میں چوتھائی کپ۔ چاکلیٹ اسٹک، حسب ضرورت۔

ترکیب: پہلے دودھ میں چینی ڈال کر پکائیں۔ ٹھنڈے دودھ میں کسٹرڈ ڈال کر مکس کرلیں اور اس کو ابلے دودھ میں ڈال کر پکالیں اور ٹھنڈا کرلیں۔ ایک کپ ابلتے پانی میں پیکٹ میں موجود جیلی کو اس میں ڈال لیں اور اس وقت تک ہلاتے رہیں جب تک جیلی حل نہ ہو جائے۔ اب اس جیلی کو سانچے میں ڈال کر ٹھنڈا کرلیں اور پھر اپنی پسند کے ٹکڑوں میں کاٹ لیں اور سانچے سے نکال لیں۔ باؤل میں پہلے فروٹ پھر کسٹرڈ اور آخر میں جیلی، اخروٹ کے اوپر پیس میں رکھ دیں اور چاکلیٹ کی اسٹک کے پیس لگادیں۔ فریش کریم، جیلی، فروٹ اسٹک کے ساتھ سرو کریں۔

از: بینا عباس، کراچی

دہی چنا چاٹ

اشیاء: دہی، آدھ کلو۔ ٹماٹر، حسب ضرورت۔ زیرہ، دو چائے کے چمچ، (بھنا ہوا) ہری مرچ، حسب ضرورت۔ ہری مرچ کا پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ ہرا دھنیا، حسب ضرورت۔ نمک، آدھا چائے کا چمچ۔ پودینہ، حسب ضرورت۔ چنے آدھا کلو (ابلے ہوئے) گول مرچ، چھ عدد۔ پھلکیاں، ایک کپ۔ (بھیگی ہوئی) زیرہ ایک چائے کا چمچ۔ آلو، دو عدد۔ (ابلے ہوئے) ثابت دھنیا، ایک چائے کا چمچ۔ املی کی چٹنی، آدھا کپ۔ اجوائن، ایک چائے کا چمچ۔ پیاز، حسب ضرورت۔

ترکیب: پہلے دہی کو پھینٹ کر اس میں بھنا زیرہ، ہری مرچ کا پیسٹ اور نمک ڈال کر مزید پھینٹ لیں۔ اب سرونگ باؤل میں پہلے ابلے چنے اور اس میں دہی ڈال دیں۔ پھر بھیگی ہوئی پھلکیاں اور ابلے آلو کاٹ کر ڈال دیں۔ اس کے بعد املی کی چٹنی، پیاز، ٹماٹر، ہری مرچ، ہرا دھنیا اور پودینہ ڈال دیں۔ آخر میں گول مرچ، زیرہ، ثابت دھنیا اور اجوائن کو بھون کر پیس لیں اور چاٹ پر چھڑک دیں۔

از: سنبل ملک، شاہدرہ

چنا کباب

اشیاء: سفید چنے، ایک پیالی۔ ہری مرچ، تین سے چار عدد۔ بیسن، چار چمچ۔ ہرا دھنیا، آدھی گڈی۔ نمک، آدھا چمچ۔ تیل، تلنے کے لیے۔ لال مرچ، حسب ذائقہ۔ سوڈا، دو چٹکی۔

ترکیب: چنے رات بھر کے لیے سوڈا ڈال کر بھگو دیں پھر ان کو دھو کر پیس لیں۔ پسے ہوئے چنے میں سارے اجزا ڈال کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر اس کو کباب کی شکل میں تل لیں۔ کچپ اور چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

از: عروبہ ناز، کوٹلی

بزمِ پاکیزہ

پاکیزہ بہنیں



پہلا انعام یافتہ سوال

☆جبینا......کراچی (پہلا سوال

سوال ﴿ انسان اپنے دو دماغوں کے باوجود چار مغز کیوں کھاتا ہے؟

جواب ﴿ ڈبل کے چکر میں جو رہتا ہے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ سائرہ ارم ڈوگر......کمالیہ

سوال ﴿ اس سالگرہ پر میں اپنے سرتاج کو کون سا عجیب وغریب تحفہ دوں کہ وہ حیران رہ جائیں؟

جواب ﴿ ہرنی دے دو......جنگل والی نہیں۔

☆سعدیہ ہما شیخ......سرگودھا

سوال ﴿شوہر کا فورٹی 40 ناٹی کا بخار کیسے اتاروں؟

جواب ﴿تم سویٹ سکسٹین کا روپ دھار لو ناں!

☆ جبین نیاز......ملتان

سوال ﴿دل کے اندر بھی وہ دماغ کے اندر بھی وہ پر گھر کے اندر ہم، ہم ایسا کیوں؟

جواب ﴿تم نے بھی صرف دل و دماغ پر ہی اکتفا کرلیا......گھر میں قید کرو قید!

☆روحی صبا......کراچی

سوال ﴿ دنیا چاہے اِدھر کی اُدھر ہو جائے بس میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ......؟

جواب ﴿ اب اپنی باجی سے ملنے پاکیزہ کے دفتر ضرور آؤں گی......ہے ناں۔

سوال ﴿ اس محفل میں ہے کوئی ہم سا ہم سا ہو تو سامنے آئے......؟

جواب ﴿ارے یہاں تو سب ہی اپنی مثال آپ ہیں کیا کہنے۔

☆ حسنیٰ قندیل......کمالیہ

سوال ﴿ بند آنکھوں سے خواب اکثر خوفناک اور جاگتی آنکھوں سے خواب حسین ہی کیوں نظر آتے ہیں؟

جواب ﴿ اپنی پسند کے خواب حسین ہوتے ہیں، فطری طور پر...... دیکھے گئے خواب مبہم اور گہرے ہوتے ہیں اشارے سمجھنے کی بات ہے۔

سوال ﴿ روپیہ انسان کو اوپر لے جاسکتا ہے لیکن انسان روپے کو اوپر نہیں لے جاسکتا۔ پھر روپے سے اس قدر محبت کیوں؟

جواب ﴿ کیوں نہیں، ماؤنٹ ایورسٹ پر لے جانا۔

☆ فرخندہ جعفری......گجرات

سوال ﴿ بے شک نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ جانتا ہے پھر ایک انسان دوسرے انسان کو یہ کیوں کہتا ہے تیری نیت خراب ہے؟

جواب ﴿ بدگمانی کی وجہ سے۔

سوال ﴿ آٹے کا گھاٹا تو سب کو نظر آگیا ہے مگر ایمان کا گھاٹا کب نظر آئے گا؟

جواب ﴿ یہ تو اللہ کی توفیق سے ہی ممکن ہے۔

سوال ﴿شوگر مہنگی ہوگئی ہے تو پروا نہیں ویسے بھی 80 پرسنٹ پاکستانیوں کے اندر شوگر موجود ہے۔ غلط ہے کیا......؟

جواب ﴿ہاہا......بالکل ٹھیک کہا۔

سوال ﴿لوگ کانٹے بو کر پھولوں کی خواہش کیوں کرتے ہیں؟

جواب ﴿ خوش فہم ہیں بیچارے۔

☆ پروین افضل شاہین...... بہاول نگر

سوال ﴿ میرے میاں جانی پرنس افضل شاہین شادی سے پہلے ساون میں ہمارے گھر کے آگے ہی کیوں پھسلتے تھے؟

جواب ﴿ آپ ساری کیچڑ وہیں جو جمع کر دیتی تھیں۔

سوال ﴿ گھر میں آنے والے مہمانوں پر زیادہ پیار آتا ہے یا گھر سے جانے والوں پر؟

جواب ﴿ آنے والے اگر تحفوں کے ساتھ آئیں اور جانے والے چائے کے لوازمات چھوڑ کر جائیں پھر تو دونوں پر ہی پیار آنا چاہیے۔

☆ حمیرا انجم وحید...... واہ کینٹ

سوال ﴿ فرسٹ ایمپریشن از دا لاسٹ امپریشن کیوں کہتے ہیں؟

جواب ﴿ کیونکہ فرسٹ ٹائم جو بات ذہن میں بیٹھ جائے وہ شاید ہمیشہ رہتی ہے۔

سوال ﴿ ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑے سے محفوظ رکھنے والی چیز کیا ہے؟

جواب ﴿ اخلاق۔

☆ سائرہ .... کمالیہ

سوال ﴿ میاں بیوی زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ پہیے کی ایجاد سے پہلے یہ دونوں کیا تھے؟

جواب ﴿ پہیے والا بھی تو بعد کی ہی پیداوار ہے ناں......

☆ تسنیم کوثر...... کراچی

سوال ﴿ کوئی بہت اچھی سی ایسی دعا بتایئے جو ہم سب کو دے سکیں؟

جواب ﴿ اللہ تعالیٰ ہدایت دے، دانستہ و نادانستہ گناہوں کی بخشش کرے۔

سوال ﴿ ہر خوشی کے موقع پر جو لوگ کنجوس بلکہ مکھی چوس بن جاتے ہیں وہ کس ٹائپ کے ہوتے ہیں؟

جواب ﴿ خود ہی تو بتا دیا...... اب ہم کیا بتلائیں بھئی۔

سوال ﴿ کہیں پڑھا تھا اکثر سستے لوگ ہمیں زندگی کے مہنگے سبق دے جاتے ہیں...... مطلب کیا ہوا؟

جواب ﴿ ارے سستے نہیں، ستے مارے لوگ پڑھا ہوگا۔

☆ ایمن رانی...... کمالیہ

سوال ﴿ گلی میں کتا کھڑا ہو یا برا شخص، عورت ڈر کر اپنا راستہ بدل لیتی ہے۔ دونوں میں سے زیادہ برا کون ہے؟

جواب ﴿ جو انسانیت کی تذلیل کرے۔

☆ مہ جبیں...... عارف والا

سوال ﴿ آپ سردیوں کا استقبال کیسے کرتی ہیں؟

جواب ﴿ اللہ کا شکر ادا کر کے کہ اتنے خوب صورت موسم دیے۔

☆ ثمرینہ قیصر...... ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال ﴿ دانت خوب صورت ہوں تو لڑکیاں ہر بات پر مسکرا دیتی ہیں اگر دانت پیلے ہوں تو؟

جواب ﴿ خوب صورت دانتوں پر تو قہقہہ بنتا ہے...... پیلے دانتوں پر صرف ہونٹ پھیلاتا۔

☆ ساجدہ ظفر...... کمالیہ

سوال ﴿ بیوی کو اہلیہ کہا جاتا ہے خاوند کو اہل کیوں نہیں کہا جاتا؟

جواب ﴿ بڑا چُبھن کے لائی ہو سوال...... بیوی پل بھر میں اسے نااہل بھی کر سکتی ہے...... سمجھیں۔

سوال ﴿ غلطی کرنے اور غلطی ماننے میں کتنا فرق ہے؟

جواب ﴿ ضمیر کے جاگنے کا۔

☆ ثمینہ کوکب...... جہلم

سوال ﴿ اگر آئینہ ایجاد نہ ہوتا تو عورتیں میک اپ کیسے کرتیں؟

جواب ﴿ شوہر کی آنکھوں میں جھانک کر۔

☆ منشی علی...... شاہ پور چاکر

سوال ﴿ کہتے ہیں مرنے کے بعد جنت ملے گی اگر کسی زندہ کو اس دنیا میں ہی جنت مل جائے تو اسے مرنے کے بعد کیا ملے گا؟

جواب ﴿ وہاں کی جنت کا یہاں سے کیا مقابلہ!

سوال ﴿ ماں کی دعا جنت کی ہوا...... اور بیوی کی دعا؟

جواب ﴿ اسی کے لیے شفا۔

سوال ﴿ کہاوت کے حساب سے ”جنگل میں منگل“ ہوتا ہے تو باقی کے چھ دن کہاں جاتے ہیں؟

جواب ﴿ وہ بھی اِدھر اُدھر چھپ کر منگل کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

☆☆☆

ادارہ

روحانی مشورے

کرشمہ ہائے اسمائے ربانی جل شانہٗ

یَا عَلِیُّ
جو اسے بہت پڑھے تو آدمیوں کی نظروں میں عزیز و مکرم ہو۔

یَا کَبِیْرُ
جو شخص دو سو بتیس مرتبہ پڑھ کر دعا کرے تو... ان شاء اللہ مستجاب ہوگی۔

یَا حَفِیْظُ
جو نو سو اٹھانوے بار پڑھا کرے تو اس پر خوف غالب نہ ہوگا۔

یَا حَسِیْبُ
جو سات ہفتوں تک اس اسم کو بکثرت پڑھے تو اس کے کام پورے ہوں گے۔ لیکن جمعرات سے شروع کرے اور ہر روز ستر مرتبہ پڑھا کرے۔

یَا جَلِیْلُ
جو اسے بہت پڑھے دیکھنے والے اس کی تعظیم کریں۔

یَا کَرِیْمُ
جو کوئی وقتِ خواب پڑھے تو ملائکہ بیدار ہونے تک اس کے لیے استغفار کریں۔

یَا قَرِیْبُ
جو اس اسم کا بکثرت ورد رکھے تو خداوند عالم اسے ہر شے کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

یَا وَاسِعُ
جو اس اسم کو بہت پڑھے اس کی روزی میں وسعت ہو۔

یَا وَدُوْدُ
اگر یہ اسم مبارک کھانے پر پڑھ کر ایسے دو شخصوں کو کھلائیں جن میں عداوت یا رنج ہو تو ان دونوں میں پکی دوستی ہو جائے گی۔ شوہر اور زوجہ کی آپس میں موافقت کے لیے بہترین عمل ہے۔

یَا شَافِیُ
اس اسم کو بہت پڑھنے والا تمام بیماریوں سے محفوظ رہے گا۔ مریض ہر دوا پر بارہ مرتبہ پڑھ کر کھائے۔

یَا بَاعِثُ
سوتے وقت سینے پر ہاتھ رکھ کر سو مرتبہ پڑھے تو دل نورانی ہو۔

یَا وَکِیْلُ
اگر اس اسم کو لکھ کر پاس رکھے تو جلنے اور غرق ہونے سے محفوظ رہے۔

یَا قَوِیُّ
اگر کوئی دشمن ہو اور اس کے دفع کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو آٹے کی ہزار گولیاں بنائے اور ہر گولی پر یہ اسم پڑھ کر جانوروں کو کھلائے۔ دشمن... ان شاء اللہ دفع ہوگا۔

یَا حَیُّ
اگر اس اسم کو بیمار پر دم کریں تو بہ اذنِ خدا تندرست ہو۔

یَا قَیُّوْمُ
جو اس اسم کو انگوٹھی پر کندہ کرائے تو اس کا نام

مُردہ نہ ہوگا۔ اور وہ بہت مشہور ہوگا۔ نیک نام ہوگا۔

ان اسمائے مبارکہ کو ہر وقت پڑھ سکتے ہیں اگر باوضو رہیں تو بہت بہترین ہے۔

ایام ہفتہ

پروردگار عالم نے ہر دن میں اپنے بندوں کے لیے حکمتیں رکھی ہیں یہاں حضرت محمدؐ و آل محمدؐ کی تعلیمات سے دنوں کے اعمال اور ان کے خواص پیش کیے جا رہے ہیں۔

یکشنبہ: (اتوار) بعد نمازِ صبح ساعتِ اول میں اگر یَا فَتَّاحُ نواسی مرتبہ پڑھے تو فتح و نصرت حاصل ہو۔

دوشنبہ: (پیر) اگر ساعتِ اول میں بعد نمازِ صبح ایک سو انتیس بار یَا لَطِیفُ پڑھے تو باری تعالیٰ اپنی رحمت سے مال عطا فرمائے گا۔

سہ شنبہ: (منگل) اگر ساعتِ اول میں بعد نماز صبح نو سو تیس دفعہ یَاقَابِضُ پڑھے تو باری تعالیٰ اسے وہ چیز عطا فرمائے گا جس کی خواہش ہوگی۔

چہارشنبہ: (بدھ) بعد نماز ساعت اول میں اگر یَا مُتَعَالُ پانچ سو اکتالیس بار پڑھے تو عزت دنیا و آخرت حاصل ہو۔

پنجشنبہ: (جمعرات) اگر ساعت اول میں بعد نماز صبح یَا رَزَّاقُ تین سو آٹھ مرتبہ پڑھے تو سبحانہ تعالیٰ اپنے رحم سے اس قدر مال عنایت فرمائے گا جس کا حساب ناممکن ہوگا۔

جمعہ: ساعت اول میں بعد نماز صبح اگر دو سو چھپن مرتبہ یَا نُورُ پڑھے تو چشم خلائق میں عزیز ہوگا۔ اگر کوئی چیز گم ہوگئی ہو تو بہ وقتِ خواب دو رکعت نماز پڑھ کر یَا نُورُ دو سو چھپن دفعہ پڑھے تو ممکن ہے کہ خواب میں معلوم ہو جائے کہ چیز کس نے چرائی ہے۔

شنبہ: (ہفتہ) بعد نمازِ صبح ایک ہزار ساٹھ بار...... یَاغَنِیُّ کہے تو درگاہ خداوندی سے اس قدر مال مرحمت ہو کہ جملہ مالدار اس پر رشک کریں۔

نماز حاجات

قضائے حاجات

دو رکعت نماز حاجت پڑھے اور بعد سورۂ حمد تین بار پڑھے۔

اَللّٰہُ لَطِیفٌ بِعِبَادِہٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ وَھُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ۔

سلام پھیرنے کے بعد فوراً کھڑے ہو کر ایک سو انتیس مرتبہ یَا لَطِیفُ پڑھے پھر سجدۂ شکر میں جا کر اپنی حاجت کے لیے دعا کرے۔ ان شاء اللہ دعا قبول ہوگی۔ تین روز تک صبر کرے۔ اس عرصے میں اگر مقصد پورا نہ ہو تو بطریق مذکور دوبارہ نماز پڑھے مگر.. یالطیف نو سو تین مرتبہ پڑھے۔

حصول مطالب وسعت رزق و غلبہ بر دشمن

شب جمعہ کو طلوع صبح سے ایک ساعت قبل اٹھ کر دو رکعت نماز افتتاح اس طرح بجالائے کہ ایک رکعت اول میں بعد الحمد سورۂ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ اور دوسری رکعت میں بعد الحمد، سورۂ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پڑھے۔ بعد نماز سو مرتبہ درود پاک پڑھے۔

پھر ایک ہزار بار کہے۔

یَا لَطِیفُ اِرْحَمْ عَبْدَکَ الضَّعِیفَ

عدد کبیر اس کے اکتالیس اور عدد صغیر اکیس ہیں لہٰذا یہ عمل اکتالیس روز یا اکیس روز بجالائے۔

حصول مقاصد و حصول دولت و عزت وغیرہ

اگر کوئی شخص بلا یا بیماری یا فقر و فاقہ میں مبتلا ہو تو شب جمعہ کو ثلث آخر شب میں دو رکعت نماز حاجت پڑھ کر سو مرتبہ درود پڑھے۔ بعدہ ایک ہزار مرتبہ کہے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیمِ اور پھر سو مرتبہ درود بھیج کر خدا سے قضائے حاجت کی دعا کرے۔









شوابے
ہومیو کلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

یادداشت کی کمزوری

کوثر...... لاہور

میں میٹرک کی طالبہ ہوں۔ مجھے پڑھا ہوا یاد نہیں رہتا۔ اور پیپر والے دن تو گھبراہٹ میں سب بھول جاتی ہوں۔ ماہنامہ پاکیزہ میں کریٹکس (Cratex) کے بارے میں پڑھا۔ مہربانی فرما کر میری راہنمائی فرمائیں۔

اس دوا کے کوئی منفی اثرات تو نہیں؟ ماہواری کے دنوں میں استعمال کرسکتی ہوں؟ کوئی منفی اثرات تو نہیں ہوں گے؟ کریٹکس کب سے شروع کروں اور کب تک کھاؤں؟

جواب: بی بی دماغی صلاحیت اور جسمانی نشوونما کو بڑھانے کے لیے کریٹکس ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ایک بے مثال دوا ہے۔ اس کے اب تک کوئی منفی اثرات مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ ایام کے دنوں میں بھی اس کو لیا جاسکتا ہے اس سے ماہواری میں کوئی خراب اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ قوتِ اور توانائی برقرار رہتی ہے۔ اس کو کم از کم ایک ماہ تک استعمال کریں۔ صبح اور شام ایک ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ نگلیں اس کے علاوہ 30 Ancardium شوابے جرمنی کے 5 قطرے دن میں 3

ٹوکن
برائے شوابے ہومیو کلینک

اپریل 2020ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ______________

پتا: ______________

____

مرتبہ لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

نظر کی کمزوری

ارسلان...... سکھر

میری بچی کی عمر ساڑھے پانچ سال ہے۔ اسے عرصہ ڈیڑھ سال سے عینک لگی ہے۔ اس کے سر میں شدید درد ہوتا تھا اور متلی کی کیفیت ہوتی تھی۔ بائیں آنکھ کو ٹیڑھا کر کے دیکھتی تھی۔ اب یہ صورت حال ہے کہ ہر چھ ماہ بعد نظر چیک کروانے پر پہلے سے زیادہ کمزور نکلتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہر بات کی فکر کرتی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو خود پر سوار کر لیتی ہے۔ حد سے زیادہ حساس ہے۔ برائے کرم ایسی اچھی دوا تجویز کریں جو نہ صرف نظر کو ٹھہرنے میں مدد دے بلکہ بہتر بھی ہو جائے۔

جواب: ارسلان! بچی کو صبح سویرے سورج نکلتے ہوئے باغ کی سیر کرائیں...... سونف، مصری، بادام سب کو ہم وزن لے کر پیس کر رکھ لیں اور روزانہ نہار منہ ایک کھانے کا چمچہ کھلا کر دودھ ایک پیالی پلا دیں۔ گاجر کا استعمال خوب کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات تین ماہ تک استعمال کرائیں ... Physostigma 30, Calc Phos 30, Calc.Flour 30 کے 5، 5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کرائیں۔

بالوں کی سفیدی

ارم...... بھاولپور

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر کے تقریباً سارے بال سفید ہو چکے ہیں۔ میرے سر کے بال گرتے بھی ہیں جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ آپ پلیز کوئی اچھی سی دوا تجویز کریں کہ میرے بال کالے جائیں۔

جواب: غم، فکر، ناقص غذا، پانی غیر معیاری، شیمپو، تیل اور کچھ جسمانی تبدیلیاں جو وقت و عمر کے ساتھ ہوتی ہیں، بالوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ پھلوں، سبزیوں اور



گوشت کا استعمال بڑھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات Lycopodium-30، Cantharis 30 کے 5، 5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

گردے کی پتھری

شہناز...... ساہیوال

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عرصہ 4 سال سے گردے میں بار بار پتھری بن جاتی ہے۔ پہلی مرتبہ جب پتھری ہوئی تو ہومیو پیتھک دوائی لی جس سے پتھری نکل گئی۔ سال کے بعد پھر بن گئی علاج کرایا پھر نکل گئی۔ پتھری تقریباً ہر سال ہو جاتی ہے۔ آخری مرتبہ جب پتھری ہوئی تو الٹرا ساؤنڈ کرایا اس وقت تقریباً 5mm کی پتھری تھی دائیں گردے میں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ کوئی علاج نہ کرواتا صرف آپریشن ہوگا۔ آخر تنگ ہو کر آپریشن کرایا۔ اب تقریباً دو سال ہو گئے ہیں آپریشن کو۔ اب دونوں گردوں میں درد اور کھنچاؤ رہتا ہے۔ پیشاب میں کرسٹل آرہے ہیں۔ بائیں گردے میں تقریباً چنے کے برابر پتھری ہے۔ برائے مہربانی کوئی اچھی سی دوائی تجویز کریں تاکہ پھر آپریشن نہ کرانا پڑے۔

جواب: لگتا ہے کہ آپ علاج بے قاعدگی سے کراتی ہیں جبھی تو یہ بار، بار بن رہی ہے۔ کیلشیم کی گولی یا اس کے مرکبات کے استعمال سے بھی پتھری بننے کے چانس بڑھتے ہیں۔ پیشاب آنے پر اس کو روکنے سے بھی پتھری بنتی ہے۔ پانی کا کم استعمال کیا جائے تو بھی پتھری بنتی ہے۔ کیلشیم کی گولیاں استعمال نہ کریں۔ پانی کم از کم 15 گلاس روزانہ پئیں۔ پیشاب جیسے ہی آئے ویسے ہی کریں روکنے کی عادت ترک کر دیں۔ کیلا، پالک، ٹماٹر، دودھ کا استعمال فی الحال نہ کریں۔ وزن نہ



اٹھائیں۔ البتہ چلتی پھرتی ضرور رہیں بلکہ سیڑھیاں اترنے چڑھنے کی ورزش کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کریں پھر کیفیت سے مطلع کریں۔ Calc. carb-30 کے 7، 7 قطرے ایک گلاس پانی میں جبکہ Berberis Pentarkan 15 کی 1 ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ دن میں 3 مرتبہ لیں۔

خواتین کے مسائل

زبیدہ......راولپنڈی

کافی عرصے سے پاکیزہ میں آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں۔ سوچا آج اپنا مسئلہ بلکہ مسائل آپ کو لکھوں۔ میں بہت پریشان ہوں اور اب تو شدید مایوسی کا شکار ہو چکی ہوں۔ چہرے پر دانے اور داغ دھبے ہیں، پیٹھ پر بھی دانے ہیں جن کی وجہ سے زیادہ بیٹھنے سے جلن ہونا شروع ہو جاتی ہے، معدے کا مسئلہ، بالوں کا گرنا، سفید ہونا، دبلا پتلا جسم بالکل ہڈیاں ہیں گوشت بالکل بھی نہیں، نسوانی حسن بھی بالکل نہیں۔ خون کی کمی اور کیلشیم کی بہت کمی ہے۔ بلڈ ٹیسٹ، الٹرا ساؤنڈ، پیشاب ٹیسٹ رپورٹس بھجوا رہی ہوں۔ کوئی کریم یا میڈیسن بتا دیں۔ چہرے اور جسم کے لیے بھی دوا تجویز کر دیں۔ آپ کی بہت نوازش ہو گی اور آپ کی احسان مند رہوں گی۔

جواب: اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہم صحیح تشخیص کر کے صحیح قسم کا علاج کریں (ہومیو پیتھک) تو کوئی وجہ نہیں کہ مرض سے نجات نہ ملے۔ ہاں صحت کے اصولوں کی پابندی یقیناً صحت اور حصولِ صحت کے لیے شرط ہے۔ متوازن غذا کا استعمال کریں۔ لال گوشت (بکرا، گائے) ٹماٹر، پالک، سلاد، کدو، چھولے، آم، چیری، فالسہ، آلو بخارا، سیب، انار و سنگترہ وغیرہ کا بھرپور استعمال کریں۔ صبح سویرے اٹھیں۔ نمازوں کی پابندی کریں۔ کوشش کریں کہ صبح کی نماز کے بعد کسی پارک میں چہل قدمی کریں۔ پانی کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں کم از کم 12 گلاس روزانہ پئیں۔ کھانے سے پہلے اور کھانے کے دو گھنٹے بعد پانی کا استعمال کریں۔ شربت اور کولڈ ڈرنکس بالکل استعمال نہ کریں ان سے بھی دانے نکلتے ہیں۔ البتہ ستو، لسی اور تازہ پھلوں کے جوس مفید ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Calc. sulph-30، Ferrum met 30 کے 5، 5 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ جبکہ Alfalfa-Ø کے 11 قطرے ہر کھانے کے بعد آدھے کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ Asa foetida Petarkan Ptk 12,Nux vomica Pentarkan Ptk 63 کے 10 قطرے تھوڑے پانی میں ڈال کر پئیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

لیکوریا

ارحمہ.....سکھر

میرا سب سے اہم مسئلہ لیکوریا ہے۔ یہ تقریباً 7 سال سے ہے۔ ایام ویسے تو ٹائم پر ہوتے ہیں مگر ایک ہی دن کھل کر ہوتے ہیں اور باقی دن معمولی سے ہوتے ہیں۔ میرا پیٹ اسی وجہ سے بڑھ گیا ہے۔ میں نے لیکوریا اور پیٹ کے لیے کافی دفعہ لیڈی ڈاکٹر سے بھی علاج کرایا مگر دوائیوں سے وقتی طور پر افاقہ ہوتا ہے پھر بعد میں پہلے سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔

جواب: غم، فکر، ناقص غذا، پانی اور کچھ جسمانی تبدیلیاں جو وقت و عمر کے ساتھ ہوتی ہیں۔ جسم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ آپ لگ کر علاج نہیں کراتیں فائدہ ہوتا نہیں افاقہ ہونے پر علاج چھوڑ دیتی ہیں۔ ایسا نہ کریں بلکہ مستقل مزاجی کے ساتھ علاج کریں ورنہ مسئلہ گمبھیر ہو جائے گا۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔
Calc. carb-30،Pulsatilla-30،Borax-30

ہر بوتل میں سے 7،7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ Magnesium Phos Pentarkan Ptk 60 کی ایک ایک گولی دن میں 3 مرتبہ چوسیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

ڈس مینوریا

دعا...... فیصل آباد

مجھے جب ایام شروع ہوتے ہیں تو اسہال آنا شروع ہو جاتے ہیں اور کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔ یوں لگتا ہے کہ جان نکل جائے گی۔ ڈاکٹری دوائی کھانی پڑتی ہے۔ میری کمر کے نچلے حصے اور پٹھوں اور پنڈلیوں میں بھی درد ہوتا ہے۔ میرے جسم پر سرخ دانے نکل رہے ہیں اور کبھی کبھی ہاتھ بھی کانپتے ہیں۔ پیٹ اور کولہے پھیلتے جا رہے ہیں۔ رنگ بھی خراب ہو گیا ہے۔ صرف چہرے اور ہاتھوں کا رنگ خراب ہوا ہے۔ پانی پینے سے مجھے اپھارا ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی ہیں۔ چہرے پر بال نکل آئے ہیں جو پہلے نہیں تھے۔

جواب: پانچ وقت نماز کی پابندی کریں۔ صبح چہل قدمی کیا کریں۔ پانی کا استعمال کم از کم 12 گلاس روز کریں۔ متوازن غذا دودھ، گوشت، سبزیاں اور پھلوں کا استعمال بڑھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر اپنا حال تفصیل سے لکھیں۔ Sulphur-200 کی ایک خوراک سب سے پہلے لیں۔ صبح نہار منہ 7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر ہر 3 ہفتے بعد لیں۔ اس سے ایک دن پہلے اور بعد کوئی اور دوا نہیں لیں۔ پھر ایک دن بعد Magnesium Phos Pentarkan Ptk 60 کی ایک ایک گولی دن میں 3 مرتبہ میں چوسیں۔

معدے کا درد

عبید...... کراچی

میرا مسئلہ معدے کا ہے اور یہ تقریباً 2 سال سے ہے۔ معدے میں درد ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد بھی فوراً



اور کبھی کچھ دیر بعد جلن کی شکایت ہو جاتی ہے۔ کافی علاج کیا مگر افاقہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹر اس کو معدے کا السر بتا رہے ہیں۔ الٹرا ساؤنڈ کروایا تھا خط کے ساتھ رپورٹ منسلک کر رہا ہوں۔ برائے مہربانی میرا کوئی اچھا سا علاج تجویز کریں۔

جواب: کھانے کے ساتھ اور فوراً بعد پانی کا استعمال نہ کریں۔ کھانا اچھی طرح چبا کر کھائیں۔ مرغن اور بھاری کھانے سے پرہیز کریں۔ میٹھی، مرچیں، تلی ہوئی، بھنی ہوئی چیزیں اور ترش پھل بھی تیزابیت پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے چیک کریں کہ کس چیز سے تیزابیت پیدا ہوتی ہے؟ غم، فکر بھی تیزابیت کا باعث بنتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Nux Vomica Pentarkan Ptk 63 کے 10 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

جوڑوں کا درد

عرفان...... ضلع جھنگ

ڈاکٹر صاحب مجھے بچپن سے ہی گھٹنوں کے جوڑوں میں درد رہا ہے۔ جب میں ٹانگ ہلاتا تھا تو ٹک ٹک کی آواز آتی تھی اور مجھے سکون مل جاتا تھا۔ اب مجھے درد تو نہیں ہوتا البتہ اٹھتے اور بیٹھتے وقت گھٹنوں کے جوڑوں سے ٹک ٹک کی آوازیں آتی ہیں جیسے جوڑ کی دونوں ہڈیاں آپس میں رگڑ رہی ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے وقت ایسا ہوتا ہے۔ مجھے اس کا علاج بتائیں اور یہ بھی بتائیں کہ علاج کتنا عرصہ جاری رکھنا ہے۔

جواب: قرآن و حدیث کا مطالعہ کیجیے۔ نماز کی پابندی کیجیے۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیے اور پھر اپنی صحت کے لیے دعا کیجیے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر تمام حالت تفصیل سے لکھیں۔ Calc. phos-30

Staphisagria-30 کے 7،7 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

کانوں سے کم سنائی دینا

تبسم......ملتان

میرا مسئلہ میرے کان کا ہے۔ بچپن میں مجھے ہائی گریڈ فیور ہو گیا تھا جس سے میرے کان کی رگ متاثر ہوئی تھی۔ دائیں کان کی رگ جس کی وجہ سے میں سن نہیں سکتی۔ فیور کی وجہ سے میرا دایاں کان متاثر ہوا۔ ڈاکٹر کے مطابق دونوں کان کے پردے ٹھیک ہیں۔ میں مکمل بہری نہیں ہوں۔ بس یہ ہے کہ مجھے دور کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔ موبائل پر کال آ رہی ہو تو میں نہیں سن سکتی۔ کوئی سرگوشی میں بات کرے تو میں وہ بھی نہیں سن سکتی۔ میرے تعلیمی دور میں مجھے ٹیچرز کی کوئی بات سنائی نہ دیتی تھی۔ میری عمر 28 سال ہے میں اَن میرڈ ہوں۔ اسی نہ سننے کی وجہ سے میں کہیں جاب بھی نہیں کر سکتی۔ اذان... بھی مجھے نہیں سنائی دیتی۔ میرے دوسرے کان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔

جواب: ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کا Mullen Oil کے 1 سے 2 قطرے دونوں کانوں میں دن میں تین مرتبہ ڈالیں۔ 2 ماہ بعد حال بتائیں۔

منہ کے چھالے

نور زمان......سکھر

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے منہ میں ہر وقت چھالے رہتے ہیں جس کی وجہ سے منہ میں بہت درد رہتا ہے۔ کھانا بھی نہیں کھا سکتا۔ معدہ خراب رہتا ہے۔ گھٹنوں میں درد رہتا جس کی وجہ سے روزانہ دو گولی پونستان (فورٹ) کھاتا ہوں، میں گٹکا بھی کھاتا ہوں۔ برائے مہربانی میرے لیے کوئی علاج تجویز فرمائیں، تازیست دعا گو رہوں گا۔

جواب: یاد رکھیں نسوار، تمباکو پینا، مضر صحت ہے۔ اسی طرح گٹکا بھی ہے، اس کا استعمال فوراً ترک کر دیں۔ متوازن غذا کھائیں۔ دودھ دہی کا استعمال کریں۔ کھانا آہستہ آہستہ چبا کر کھائیں۔ کھانے کے ساتھ اور فوراً بعد پانی کا استعمال نہ کریں۔ Borax30, Calc.Carb Merc.sol30, Rhustox30 (ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی) کی ہر شیشی سے 5،5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد پھر کیفیت سے مطلع کریں۔

چہرے پر بال اور ایام کی خرابی

عائلہ......سکھر

میری شادی ہونے والی ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ ماہواری گزشتہ 5 سال سے ایک مہینہ آتی ہے اور 2 مہینہ نہیں آتی۔ میرے جسم خاص طور پر چہرے پر بہت زیادہ بال ہیں جب نکالوں تو خون نکلتا ہے اور جگہ کالی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے کسی تقریب میں نہیں جا سکتی، مہربانی کر کے کوئی اچھی دوا بتا دیں جس سے یہ مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کی دکھی بہن کی فریاد ہے۔ میرا مسئلہ ضرور شائع کریں۔

جواب: اللہ آپ کو صحت دے آمین۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc.Carb 200 کے 5 قطرے ہفتے میں ایک دفعہ لیں جبکہ روزانہ Pulsatilla 30 کے 5، 5 قطرے دن میں تین مرتبہ اور Oleum Jec30 کے بھی 5 قطرے دن میں تین مرتبہ لیں ایک گھونٹ پانی میں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

☆☆☆